پارہ الٓمّٓ

نعیم البیان فی تفسیر القرآن

الحمد للہ ترجمہ صحیحہ کتاب مجید از افاضات مجدد مائۃ حاضرہ اعلیٰحضرت مولانا مولوی
مفتی شاہ محمد احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہٗ موسوم باسم تاریخی

کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن (۱۳۳۰ھ)

مع

تفسیر حضرت صدر الافاضل مولانا مولوی سید محمد نعیم الدین صاحب قدس سرہ العزیز

خزائن العرفان فی تفسیر القرآن

از فاضل جلیل حضرت علامہ مولینا مفتی حکیم سید غلام معین الدین نعیمی (اکاکاخیل) دامت برکاتہم

ناشر
ادارہ نعیمیہ رضویہ سواد اعظم لاہور

نعیم البیان فی تفسیر القرآن

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا ازلی ابدی کلام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک صاحبِ لولاک سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں بتدریج نازل فرمایا، اور جسطرح نازل ہُوا، اُسی طرح ہم تک پہنچا۔ یوں تو تمام آسمانی کتابیں، اور صحیفے حق ہیں، اور سب کلام اللہ ہیں، اور اُن میں جو کچھ ارشاد ہُوا سب پر ایمان ضروری ہے، مگر یہ بات البتہ ہوئی کہ اگلی کتابوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اُمت کے سپرد فرمائی تھی، اُن اُمتوں سے اُسکی حفاظت نہ ہوسکی، کلامِ الٰہی جیسا اُترا تھا وہ اُن کے ہاتھوں ویسا باقی نہ رہا، بلکہ اُن اُمتوں کے شریروں نے اُن میں تحریفیں کرڈالیں، اور اپنی خواہش کے مطابق گھٹا بڑھا دیا۔ لہٰذا جب کوئی بات اُن کتابوں کی ہمارے سامنے آئے گی، تو وہ اگر ہماری کتاب یعنی قرآنِ کریم کے مطابق ہوگی ہم اُس کی تصدیق کرینگے، اور اگر مخالف ہوئی، تو یقین جانینگے کہ یہ ان کی تحریفات ہیں، اگر موافقت و مخالفت کچھ معلوم نہ ہو، تو حکم ہے کہ ہم اُس بات کی نہ تصدیق کریں اور نہ تکذیب۔ بلکہ یوں کہیں کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ یعنی ہم اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

چونکہ یہ دین ہمیشہ رہنے والا ہے لہٰذا قرآنِ عظیم کی حفاظت اللہ عزوجل نے اپنے ذمہ رکھی، چنانچہ فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ بیشک ہم نے قرآن اُتارا اور یقیناً ہم ہی اُسکے محافظ و نگہبان ہیں۔ لہٰذا اس میں کسی حرف یا نقطہ کی کمی بیشی محال ہے۔ اگرچہ تمام دنیا اسکے بدلنے پر جمع ہوجائے۔

قرآنِ مجید کتاب اللہ ہونے پر اپنے آپ دلیل ہے کہ خود اعلان کے ساتھ کہہ رہا ہے وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ وَادْعُوْا شُہَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ یعنی اگر تم اس کتاب جو ہم نے اپنے سب سے خاص بندے (احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر اُتاری کوئی شک ہو تو اسکی مثل کوئی چھوٹی سی سورۃ کہہ لاؤ، اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بلالو، اگر تم سچے ہو تو۔

قرآنِ کریم کی سات قراتیں سب سے زیادہ مشہور اور متواتر ہیں۔ اِن میں معاذ اللہ کہیں اختلافِ معنی نہیں، وہ سب حق ہیں۔ اس میں اُمت کے لیے آسانی یہ ہے کہ جسکے لیے جو قرأت آسان ہو، وہ پڑھے۔ اور حکم یہ ہے کہ جس ملک میں جو قرأت رائج ہو، عوام کے سامنے وہی پڑھی جائے، جیسے ہمارے ملک میں قرأتِ عاصم بروایت حفص، مروج ہے۔

قرآنِ کریم نے اگلی کتابوں کے بہت سے احکام منسوخ کردیئے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی بعض آیات نے بعض آیات کو منسوخ کیا ہے۔ نسخ کا مطلب یہ ہے کہ بعض احکام کسی خاص وقت تک کے لیے ہوتے ہیں، مگر یہ ظاہر نہیں کیا جاتا کہ یہ حکم فلاں وقت تک کے لیے ہے۔ جب میعاد پوری ہوجاتی ہے، تو دوسرا حکم نازل ہوتا ہے، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا حکم اُٹھا دیا گیا۔ اور حقیقۃً دیکھا جائے تو اُسکے وقت کا ختم ہوجانا بتایا گیا۔ منسوخ کے معنی بعض لوگ باطل ہونا کہتے ہیں، یہ بہت سخت اور شنیع بات ہے۔ احکامِ الٰہیہ سب حق ہیں، وہاں باطل کی رسائی نہیں۔

قرآن کی بعض باتیں محکم ہیں کہ ہماری سمجھ میں آتی ہیں، اور بعض متشابہ ہیں کہ ان کا پورا مطلب اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ متشابہ کے معنی کی تلاش اور تفحص وہی کرتا ہے جس کے دل میں کجی ہو۔ قرآنِ کریم کے احکام کی عملی تفسیر وہی ہے جسے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قولاً و فعلاً کیا۔ محض لغت دانی سے قرآنِ کریم کی تفسیر یا "تفسیر بالرائے" وہی کرتا ہے جسے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ضد ہو، یہ کھلی گمراہی اور بیدینی ہے۔

حضورِ اکرم سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو حکم دینے والا، تنبیہ کرنے والا، سیدھے راستہ کی ہدایت کرنے والا، مثالوں کے ذریعہ تم سے پہلی اُمتوں کی خبروں اور غیبی باتوں کا بتانے والا، تمہارے بعد والوں کے غیبی حالات و خبریں، اور جو تمہارے سامنے ہے اُن کا حکم بیان کرنے والا نازل فرمایا، جس کو بار بار پڑھنے کے باوجود پُرانا نہ ہو، اور نہ اُسکے عجائبات ختم ہوں، وہ حق ہے کھیل کود نہیں، جس نے اُسکے ساتھ سچ کہا، اور جس نے اُسکے موافق حکم دیا انصاف کیا۔ اور جس نے اُسکے ساتھ حجت کی، وہ کامیاب ہُوا، اور جس نے اُسکے ساتھ تقسیم کی عدل کیا، جو اس پر عمل کریگا ثواب پائیگا، اور جو اسکو مضبوط تھامے گا وہ صراطِ مستقیم کی ہدایت پائیگا، اور جس نے اسکے سوا کوئی اور راستہ ڈھونڈا اُسکو اللہ نے گمراہ کردیا، اور جس نے اسکے بغیر حکم دیا اللہ تعالیٰ اسکو ہلاک کریگا۔ قرآن، حکمت والا ذکر، نورِ مبین، صراطِ مستقیم، اللہ کی مضبوط رسّی اور نفع بخش شفا ہے۔ حفاظت اسکو اسکے ساتھ تمسک کرے، نجات ہے اسکو جو اسکا اتباع کرے، وہ کبھی کج رو نہ ہوگا کہ اُسے سیدھا کیا جائے، نہ وہ گم گشتہ راہ ہوگا کہ مستحقِ عتاب بنے، نہ اسکے عجائبات ختم ہونگے، اور نہ کثرتِ تلاوت اسے متغیر و پُرانا کرے گی۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں نہ اختلاف ہے نہ جدت طرازی اس میں اولین و آخرین کی خبریں ہیں۔ حضرت کعب سے مروی ہے، فرمایا کہ تم قرآن کو لازم پکڑو، کیونکہ یہ عقلوں کی سمجھ اور حکمت کا نور ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب! میں تم پر توریت کی باتیں اُتارونگا، جسکے ذریعہ اندھی آنکھیں، بہرے کان اور دلوں کے پردے کھلجائینگے، اسمیں علوم کے دریا بہتے ہونگے جو حکمتوں کا فہم اور دلوں کی بہار ہونگے۔

"نعیم البیان فی تفسیر القرآن"، یہ ایک معتبر مجموعۂ تفاسیر ہے۔ اس تفسیر میں پہلے پارہ کے پانچ رکوع تک بجنسہٖ وہ تفسیر ہے، جسے سیدی صدر الافاضل اُستاذ العلماء مولانا مفتی حکیم الحاج سید محمد نعیم الدین صاحب قدس سرہ نے اپنی تحریر کردہ تفسیر "خزائن العرفان" سے پہلے طویل تفسیر رقم فرمائی تھی۔ پھر اسکے بعد اُسے چھوڑ کر اعلیحضرت قدس سرہ کے ترجمہ مبارکہ "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" کے حاشیہ پر تفسیر "خزائن العرفان" مکمل فرمائی۔ جہانتک سیدی قدس سرہ کی طویل تفسیر میسر آسکی بجنسہٖ اُسے نقل کرکے اُسکے بعد تفسیر "خزائن العرفان" نقل کی گئی ہے۔ اسکے ساتھ ہی دیگر تفاسیر میں سے خازن، مدارک، تفسیر رازی، تفسیر مظہری، تفسیر عزیزی، تفسیر ابن کثیر، اور دیگر حسب ضرورت و اقتضاء [illegible]مؤلفین کرام سے استفادہ کیا گیا۔ اسوقت پہلا پارہ مکمل ہوکر پیش کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اُس کا فضل شاملِ حال رہا اور عمر نے مساعدت کی تو یہ سلسلہ آگے بھی جاری رکھنے [illegible] ہے۔ وباللہ التوفیق وبہٖ نستعین وعلیہ التکلان۔

خادمِ دین و ملت :- غلام معین الدین نعیمی غفرلہٗ

نعیم البیان فی تفسیر القرآن

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
سورۃ فاتحہ مکی ہے اس میں سات آیتیں ہیں	اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۵

سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا بہت مہربان رحمت والا روز جزا کا مالک ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

ہم کو سیدھا راستہ چلا راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ نحمدہ و نصلی علی حبیبہ الکریم

سورۃ فاتحہ کے اسماء

اس سورہ مبارکہ کے متعدد نام ہیں (۱) فاتحہ (۲) فاتحۃ الکتاب (۳) ام القرآن (۴) سورۃ الکنز (۵) کافیہ (۶) وافیہ (۷) شافیہ (۸) شفاء (۹) سبع مثانی (۱۰) نور (۱۱) رقیہ (۱۲) سورہ الحمد (۱۳) سورۃ الدعا (۱۴) تعلیم المسالہ (۱۵) سورۃ المناجاۃ (۱۶) سورہ التفویض (۱۷) سورۃ السوال (۱۸) ام الکتاب (۱۹) فاتحۃ القرآن (۲۰) سورۃ الصلوٰۃ (صاوی حاشیہ جلالین)

شان نزول

یہ سورہ مبارکہ مکہ مکرمہ اور بعض کے نزدیک مدینہ طیبہ اور بعض کے نزدیک دونوں میں نازل ہوئی مکہ مکرمہ میں نماز کی فرضیت کے وقت اور مدینہ طیبہ میں تحویل قبلہ کے وقت۔

عمرو بن شرجبیل سے منقول ہے کہ حضور انور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا۔ میں ایک ندا سنا کرتا ہوں جس میں اقراء کہا جاتا ہے۔ ورقہ ابن نوفل کو اس کی خبر دی گئی۔ انہوں نے عرض کیا کہ جب یہ ندا آئے آپ باطمینان سنیں۔ اس کے بعد حضرت جبریل نے حضور علیہ الصلوٰۃ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا فرمائیے بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العٰلمین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ نزول میں بھی پہلی سورت ہے۔ مگر دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سورۃ اقراء نازل ہوئی بہر تقدیر وحی کی ابتدا اور تنزیل جلیل کا آغاز کلمہ اقرا سے ہے جس کے معنی ہیں پڑھئے تو اب جو کلام اس کے بعد ہے وہ بندے کی زبان سے تعلیماً ہے جیسا سعادتمند طالبعلم کو مربی استاد تلقین کرتا ہے۔ اسی لئے مفسرین اس کی اول کلمہ قولوا مقدر مانتے ہیں اور اگر یہ تقدیر و بیان نہ بھی ہوتا تو مقام تعلیم ہی کا مقتضی تھا کہ بندے کو اس کی زبان میں حمد و ثنا کرنا سکھایا جا رہا ہے۔

سورۃ فاتحہ کے احکام

اس سورۃ کا نماز میں پڑھنا واجب ہے۔ لیکن امام و منفرد کے لئے تو حقیقۃً یعنی اپنی زبان سے اور مقتدی کے لئے بقراءت حکمیہ یعنی امام کی زبان سے صحیح حدیث شریف میں وارد ہوا قراۃ الامام لہ قراءۃ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کا پڑھنا ہے اور مقتدی پر خاموش رہنا اور امام کی قراءت کا سننا واجب ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا جب قرآن پاک پڑھا جائے تو اسکو سنو اور خاموش رہو۔ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ یہ آیت نماز کے حق میں نازل ہوئی مسلم شریف کی حدیث ہے اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا جب امام قراءت کرے تم خاموش رہو۔ امام جعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال من صلی رکعۃ فلم یقرء فیہا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے نماز پڑھی اور اسمیں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔ آیت و احادیث سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ وغیرہا کچھ نہ پڑھے خاموش رہے۔ نماز جنازہ میں دعا یاد نہ ہو تو اس جگہ سورۂ فاتحہ بہ نیت دعا پڑھنا جائز ہے بہ نیت قرأت جائز نہیں (عالمگیری) اس سورت میں سات آیتیں ستائیس کلمے ایک سو چالیس حرف ہیں۔ کوئی آیت ناسخ یا منسوخ نہیں۔

سورۂ فاتحہ کے برکات

احادیث شریفہ میں اس سورۂ مبارکہ کی بہت فضیلتیں وارد ہیں۔ حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بقسم فرمایا کہ توریت و انجیل و زبور میں اس کی مثل سورت نازل نہ ہوئی (الترمذی عن ابی ہریرۃ) آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا جو پہلے کبھی نازل نہ ہوا تھا اُس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سلام عرض کر کے دو نوروں کا مژدہ دیا جو حضور سے پہلے کسی نبی کو عطا نہ ہوئے ایک سورۂ فاتحہ دوسرے سورۂ بقر کی آخر آیتیں (مسلم عن ابن عباس) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا جب تم بیمار ہو یا تمہیں کوئی شکایت ہو تو سورۂ فاتحہ کو لازم کر لو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ امراض و مصائب کو دفع فرماتا ہے۔

عبد الملک بن عمیر سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا فاتحہ ہر مرض کی شفا ہے (رواہ الداری) خواہ وہ مرض جسمانی ہو یا روحانی اور خواہ فاتحہ پڑھ کر دم کی جائے یا لکھ کر پلائی جائے یا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکائی جائے۔ علامہ شیخ احمد دیربی شافعی تحریر فرماتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے حروف جدا جدا لکھ کر مریض کو پلائے جائیں تو مرض دفع ہو نسیان کے لئے پاک برتن میں لکھ کر دھو کر پلایا جائے فجر کی سنت و فرض کے درمیان اکتالیس مرتبہ پڑھ کر دم کرنا آنکھ کی بیماریوں کے لئے نافع ہے بچھو کے کاٹے کے لئے پانی میں نمک ملا کر سات مرتبہ سورۂ فاتحہ دم کر کے پلائیں اور ستر مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ کر جو دعا مانگیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔

استعاذہ

قرآن پاک کی تلاوت سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا سُنت ہے (خازن) قرآن پاک کے چھونے کے لئے طہارت ضروری ہے لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ بے طہارت چھونا جائز نہیں جس طرح طہارت ظاہری نہ ہونے سے آدمی قرآن پاک کے چھونے سے محروم رہتا ہے اسی طرح طہارت باطنی نہ ہونے سے اُس کے معانی اور اسرار تک رسائی سے محرومی رہتی ہے (افادہ الشیخ علی المہایمی فی تفسیرہ)

اس لئے قبل تلاوت اعوذ باللہ من الشیطان الرحیم پڑھنا چاہیئے تاکہ ظلمت وکدورت قلب اور اثر شیطان سے نجات ہو اور قاری انوار قرآن سے بہرہ مند ہو سکے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اعوذ باللہ کی برکت سے وساوس شیطانیہ سے امن رہتی ہے اور اس میں خلق کو چھوڑ کر خالق کی طرف رجوع ہے۔ کیونکہ شیطان جو شہوات کا انگیز کرنیوالا ہے اس کے شر سے پناہ مانگ کر بندہ فراغ قلب کے ساتھ تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہوتا ہے اسی حکمت سے تلاوت قرآن پاک سے پہلے اعوذ باللہ الخ پڑھنا سنت ہوا۔ لیکن شاگرد اُستاد سے پڑھتا ہو تو اُسکے لئے اعوذ پڑھنا سنت نہیں (شامی)

نماز میں مقتدی کے لئے تو نہیں مگر امام و منفرد کے لئے ثناء یعنی سبحانک اللّٰھم الخ سے فارغ ہونیکے بعد اعوذ الخ آہستہ پڑھنا سنت ہے (مستخلص و شامی) مقتدی اگر مسبوق ہے کہ اول نماز اُس نے امام کے ساتھ نہ پائی تو امام کے فراغ کے بعد جب وہ اپنی باقی نماز پڑھے اُس میں ثناء کے بعد تعوذ پڑھے (شامی) نماز عید کی پہلی رکعت میں امام نیت کر کے پہلے ثناء پڑھے پھر عید کی تکبیروں کے بعد تعوذ پڑھے۔

تسمیہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرآن پاک کی ایک آیت ہے مگر سورۂ فاتحہ اور کسی خاص سورت کا جزو نہیں بلکہ سورتوں میں فصل و تبرک کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ برکت کے لئے اس کے ساتھ ابتدا کی جائے۔ مدینہ طیبہ اور بصرہ و شام کے فقہا و قراء اسی پر ہیں اور یہی حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے اتباع کا مذہب ہے۔ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی ثابت ہے جس میں سورۂ فاتحہ کی تقسیم ہے اور ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے کی گئی ہے نہ بسم اللہ سے صحاح مصابیح کی یہ حدیث بتاتی ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں اسی لئے نماز میں جہر کے ساتھ نہ پڑھی جائے جیسا کہ بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما نماز اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے شروع فرماتے تھے اور اسی طرح طبرانی و ابن خزیمہ اور ابو داؤد وغیرہم محدثین کی روایات سے بھی ثابت ہے تو اگر بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہوتی تو ضرور حضور و شیخین نماز کو اُسی سے شروع فرماتے۔ یہاں سے یہ بھی خوب ثابت و روشن ہو گیا کہ بسم اللہ بجہر نہ پڑھی جائے۔ خلفائے اربعہ اور ابن مسعود و عمار بن یاسر اور ابن مغفل وغیرہم جلیل القدر صحابہ اور حسن و شعبی و ابراہیم نخعی و قتادہ و اعمش و ثوری وغیرہم تابعین اسی پر ہیں اور یہی امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب ہے کلام اُس بسم اللہ میں ہے جو سورتوں کی ابتدا میں مکتوب ہے کہ وہ یقیناً قرآن پاک کی آیت تو ہے مگر کسی سورت کا جزو نہیں اور جو بسم اللہ سورۂ نمل میں بعد آیت سجدہ ہے وہ مستقل آیت نہیں مگر آیت کا جزو ہے جب وہ آیت پڑھی جائے گی ضرور اس میں بسم اللہ پڑھی جائیگی اور اگر نماز جہری ہو تو جہر سے اسمیں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ تراویح میں جو ختم کیا جاتا ہے اس میں ایک مرتبہ کہیں نہ کہیں بسم اللہ بجہر ضرور پڑھی جائے تاکہ قرآن پاک کی ایک آیت رہ نہ جائے اور سامعین کا قرآن پاک پورا ہو جائے۔ قرآن پاک کی ہر صورت بسم اللہ سے شروع کی جائے مگر سورۂ برائت کہ حکم قتل کفار پر مشتمل ہے۔

مسلمانوں میں بچوں کی تعلیم کا آغاز بسم اللہ سے کیا جاتا ہے تعلیم بہت مبارک کام ہے جس طرح ہر کام کے آغاز کے لئے حدیث شریف میں بسم اللہ سے شروع کرنے کا امر فرمایا گیا بہت بہتر ہے کہ اس اعلیٰ کام کی ابتدا بسم اللہ سے کی جائے۔ یقیناً بسم اللہ کی مجلسیں حدیث شریف کا اتباع اور کتاب الٰہی کی اقتدا ہیں ان مجالس کو رقص و سرور وغیرہ محرمات سے مکدر کرنا۔ رنگ کھیلنا لشوخیاں کرنا سخت ترین جہالت اور انتہا درجہ کی بدنصیبی ہے اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنا اور دوسرا آجائے تو اس کی تواضع کرنا اور کہنا آیئے بسم اللہ کھایئے بسم اللہ یہ جائز ہے (شرح فقہ اکبر علامہ علی قاری) حرام و ممنوع کام پر بسم اللہ پڑھنا سخت ممنوع ہے ہر مباح کام کو بسم اللہ سے شروع کرنا مستحب مسلمان کی زندگی یادِ الٰہی سے مالا مال ہوتی ہے جب دنیا میں آتا ہے اُسکا استقبال بسم اللہ سے کیا جاتا ہے قابلہ بسم اللہ کہہ کر اس کو ہاتھ لگاتی ہے۔ جب تک زندہ رہتا ہے، ہر کام بسم اللہ پڑھ کر اللہ تعالےٰ کے نام سے شروع کرتا ہے۔ مومن جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے بسم اللہ پڑھ کر اسکو قبر میں اتارتے ہیں قبر سے اُٹھیگا تو انشاء اللہ تعالیٰ بسم اللہ پڑھتا اٹھیگا میدان حشر میں حاضر ہوگا تو بسم اللہ پڑھتا حاضر ہوگا۔ اس کی برکت سے عذاب نار سے محفوظ رہیگا۔ کبیر

کتاب مجید کا افتتاح کتاب پاک کا افتتاح سورۂ فاتحہ سے ہوا جو پروردگار عالم کی حمد و ثنا اور اُس کی ربوبیت و رحمت اور مالکیت و الوہیت عبادت اور توفیق خیر اور بندوں کی ہدایت اور توجہ الی اللہ اور اختصاص عبادت اور طلب رشد اور دعا کے آداب اور صالحین کے حال سے موافقت اور گمراہیوں سے اجتناب و نفرت ایسے اہم ترین مسائل پر تفصیلاً اور جملہ مسائل پر اجمالاً مشتمل ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ کتاب کا عنوان و دیباچہ اُس کے مضامین کا پتہ دیا کرتا ہے۔ اس سورۂ کریمہ کو تسمیہ سے شروع کیا گیا۔ کیا پاکیزہ تعلیم ہے۔ کہ بندہ جب کتاب الٰہی کو شروع کرے تو پہلے اللہ تعالیٰ کا نام پاک رحمت و کرم کے صفات کے ساتھ اسکی زبان پر آتا ہے اور اسم ذات کی تجلیات کو وہ صفات و اسماء کی وساطت سے طلب کرتا ہے اس سے پہلے کہ وہ مضامین کتاب کا مطالعہ کرے مقصد اہم جو ذات و صفات کی معرفت ہے بہت مختصر لیکن دلکشا اور روح افروز جملہ میں اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اس جملہ جمیلہ سے کتاب مقدس کی ابتدا کر کے اُس کو تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ اپنے ہر نیک کام کو (اور مسلمان کا ہر کام نیک ہی ہونا چاہیئے) اسی پاک جملہ اور اسی آیۂ مبارک کے ساتھ شروع کرے تاکہ اُس کے ہر کام میں برکت ہو۔ اور عالم کے مشاغل اور دنیا کے تعلقات کبھی یادِ الٰہی سے خالی نہ ہوں یہ ایسی روحانی دستگیری ہے جو بندے کو ہر حالی اور جملہ اعمال میں برکات اقدس سے فیضیاب فرماتی ہے اور وہ اپنے ہر عمل میں اپنی ہستی کے باطل حجاب سے گزر کر کارساز قدرت کے دست رحمت کو دیکھتا رہتا ہے اور نفس مغرور و متکبر جو روح کو مکدر کرنے کے لئے خود پرستانہ دعاوی کا خوگر ہے اس کو شکست ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی اس عملی تعلیم کی تصریح حدیث شریف میں ارشاد ہوئی کُلُّ اَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ اَبْتَرُ۔ ہر کام کی صوری و معنوی تکمیل جب ہوتی ہے جب کہ اس کو اللہ کے نام پاک سے شروع کیا جائے یہ آیۂ مبارکہ ہدایت فرماتی ہے کہ انسان کی دونوں منزلیں دنیا و عقبیٰ کی اور اس کی معاش و معاد کے دونوں امر کچھ اس کے زور دست اور قوت بازو سے کامیاب نہیں ہو سکتے نہ وہ کوئی ایسا استحقاق رکھتا ہے جس پر کامیابی کا حصول لازم ہو۔ بندہ کا مولیٰ پر مملوک کا مالک پر مخلوق کا خالق پر حق کیا ہو سکتا ہے جو ہستی دیا اور دیا ہے حقوق اس کے ہیں اور جو اُسکے کرم سے پیدا ہوا۔ اس کا کیا حق۔ تو دنیا اور عقبیٰ کی کامیابی کا مخلوق کو کوئی حق نہیں اس کا دار و مدار محض رحمت پروردگار پر ہے اس کو رحمٰن رحیم کی دونوں صفتوں نے بیان فرمایا کہ رحمٰن کی صفت امر معاش اور زندگانی دنیا میں نیک و بد سعید و شقی مطیع و عاصی فرمانبردار و نافرمان سب سب پر کرم فرما ہے اور شان رحیمی مخلص بندوں اور مومنوں کی آخروی زندگی کو بامراد کرتی ہے اور اسم ذات جامع جمیع صفات ہے اسی سے بندے کے دارین و نشاتین کے حوائج ضروریات متعلق ہیں، ہستی اور ہستی پر مرتب ہونے والے تمام امور کا وہی مرجع ہے الیہ المرجع والمآب اللہ اسم ذات ہے باقی تمام اسماء اسماء صفات ہیں قطب عالم غوث اعظم حضرت مولنا سیدی شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ اسم اعظم ہے اور اس کے لئے شرط یہ ہے کہ جب تم اس نام پاک کو زبان پر لاؤ دل غیر سے خالی ہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ

حمد ۔ تسمیہ کے ساتھ برکت حاصل کر لینے کے بعد بندے کو حمد و ثنا کی تعلیم فرمائی تاکہ سپاس گذاری اور نعمت شناسی کی بہترین صفات کے ساتھ اُس کا نفس متصف ہو اور ناسپاسی کی تاریکی سے اس کے قلب کو پاکی حاصل ہو پھر جمیع محامد کا اختصاص اللہ رب العزت تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے ساتھ دیکھ کر پروردگار عالم کی عظمت بندے کے دل میں جاگزیں ہو جو اسکی سعادت قصویٰ کے لئے بہترین نعمت ہے۔

جس طرح مومن کو ہر کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنا چاہئے اسی طرح ہر امر کے آغاز میں وہ اللہ کی حمد بھی کرتا رہے۔ کبھی تو حمد الٰہی واجب ہوتی ہے جیسے خطبۂ جمعہ میں اور کبھی مستحب جیسے خطبۂ نکاح و دعا اور ہر ذیشان امر میں اور کھانے اور پینے کے بعد اور کبھی سنت موکدہ ہوتی ہے جیسے چھینک آنیکے بعد۔
(طحطاوی علی مراقی الفلاح)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات پاک تمام کمالات کی جامع اور ہر عیب و نقص سے پاک ہے

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ جمیع محامد کے اللہ تبارک و تعالےٰ کے ساتھ مختص ہونے کی ایک برہان قوی کو رب العلمین کے لطیف جمال میں بیان فرمایا ہے۔ جس تک اہل علم ادنیٰ توجہ کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں ربوبیت پرورش کرنے کو کہتے ہیں اور اس کے لوازم سے ہے شئی کو عدم سے وجود میں لانا اور اس کی ترقی اور انتفاع کے عام اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان سے نفع حاصل کرنے کی قدرت دینا اور تمام موانع کو رفع فرمانا عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں اور وہ بہت انواع و اقسام پر مشتمل ہے اسلئے اوسکا ذکر بصورت جمع فرمایا اب رب العلمین کے معنی میں غور کرنے سے ہر عاقل تمام کائنات کے حادث و ممکن محتاج ہونے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے واجب، قدیم ازلی ابدی حی قیوم قادر و علیم ہونے پر استدلال کرسکتا ہے علم الٰہی کے کثیر مباحث ان ہی دو لفظوں میں طے فرما دیئے۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ جب معلوم ہو چکا کہ پیدا کرنے والا وہی پالنے والا وہی اپنی رحمت و کرم سے بندوں کو مالا مال کرنے والا ہے تو یقیناً معلوم ہو گیا کہ مالک اوسکے سوا کسی چیز کا کسیوقت کوئی بھی نہیں ہوسکتا ہے جو ہے وہ اوسکا مملوک جو ہے وہ اسکی پرورش و رحمت کا محتاج۔ حقیقی مالکیت اوسکے لیے اور حقیقی ملک و سلطنت ہر وقت و ہر آن اوسی کے لئے لیکن خاص و عام کی نظر میں مالکیت کے ظہور تام کے لئے ایک خاص دن ہے جس کا نام ہے یوم الدین روز جزا ہے جس روز وہ اپنے بندوں کو اونکے اعمال کی جزا دے گا اوسدن حکومت مجازی کے زبان غرور گونگی ہوگی اور اوسکی مالکیت ہر مومن و کافر مطیع و عاصی پر ظاہر ہوگی۔ ان اوصاف کمال کے بیان اور حسن ترتیب نے رہنمائی فرمائی کہ تمام عالم اپنی ابتدا یعنی پیدائش سے لے کر پرورش و ترقی اور حصول کمالات اور حیات اور بقا اور انجام یعنی جزائے اعمال جملہ امور میں ہر لمحہ اور ہر آن اوسکا محتاج ہے اور اوسکے احسانات حد و شمار سے باہر ہیں وہ موجد و خالق بھی رب و رحمن و رحیم بھی اور مالک یوم الدین بھی تو اب اوسکے سوا حمد کا استحقاق کسکو ہوسکتا ہے اور عبادت کا مستحق کسکو کہا جا سکتا ہے۔

اس ایک صفت نے کیا کیا عقدے حل فرمائے ان سب کی تفاصیل تو دفاتر میں بھی نہیں آسکتیں مگر اتنے مسائل بہت ظاہر طور پر معلوم ہو رہے ہیں کہ وہ مالک ہے اور باقی سب اوسکے مملوک وہی مستحق عبادت ہے اسکے سوا کوئی نہیں ہو سکتا پس وہی ایک معبود برحق ہے اوسکے سوا دنیا میں جو کوئی کسی مخلوق کو معبود مانتا ہے وہ گمراہی اور اعتقاد باطل میں ہے کہ مملوک معبود کیونکر ہوسکے گا۔ دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا جو دار العمل ہے اس کی عمر کے لئے ایک آخر ہے جہاں کے اس سلسلہ کو قدیم اور ازلی بتانے دہلے دہوکہ میں ہیں۔ ہندوستان کے کفار تناسخ کے قایل ہیں اور اونکے عقیدے میں ہر راحت و تکلیف کسی عمل کی جزا ہے اور ہر ایک مخلوق کو جو قالب ملا ہے وہ اونکے اعتقاد میں کسی پچھلی زندگی کے عمل کا بدلہ ہے اور ان کے نزدیک خدا جسکو وہ اپنی زبان میں ایشور کہتے ہیں ہر عمل کا بدلہ دینا خواہ وہ نیک ہو یا بد واجب و ضروری ہے۔ یہ نہیں ممکن کہ وہ کسی عمل کا بدلہ نہ دے اس لئے ان کے عقیدے میں نہ ان کا معبود کسی کا جرم معاف کرسکتا ہے نہ کسی پر بخشش و عنایت کرسکتا ہے رحم و کرم کی صفات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں اسی طرح اس کو قادر مطلق کہنا بھی محض ایک لفظ ہے جس کے معنی اون کے عقیدے کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں۔ وہ اپنے اختیار سے ایک چیونٹی نہیں پیدا کر سکتا اور ایک بھنگے کو نہیں مار سکتا۔ خلق کے گناہ اور اعمال جس طرف لیجاتے ہیں ادسطرف اس کو جانا پڑتا ہے اس تاریک عقیدے پر خدا کا وجود ماننے کا دعوٰی بالکل باطل اور نہایت شرمناک دعوٰی ہے کہ خدا مانتے ہیں مگر معطل اور بیکار لطف یہ کہ اوس سے التجائیں کرتے ہیں دعائیں مانگتے ہیں مرادیں طلب کرتے ہیں جس کو وہ اپنے غلط عقیدے سے بیں پرارتھنا کہتے ہیں یہ سب لغو جب اونکے نزدیک بغیر عمل کے وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تو دعا سے فائدہ بلکہ جو مجبور ہوا سے قادر مطلق کہکر تعریفیں کرنا اور پھر سائلانہ ہاتھ پھیلا کر مرادیں مانگنا اوس کو شہرمانا اور اس کا تمسخر کرنا ہے۔ ہندوں کے عقیدے کو خیال کرتے ہوئے ان کا معبود نہ کسی حمد و ثنا کا مستحق نہ اس سے کوئی درخواست و دعا جائز نہ کمالی صفات اسکے لئے ثابت بلکہ تناسخ کے عقیدے کے لحاظ سے اس کا وجود بھی ثابت نہیں ہوسکتا جب مادہ اور روح قدیم ہیں اپنے افعال میں خود مختار ہیں ان پر حکومت کیسی اور پھر ایشور کے وجود پر دلیل کیا۔ ان تمام اوہام باطلہ کو مالک یوم الدین کے ایک جملہ پاک نے باطل کر دیا اور بتا دیا کہ قادر مطلق اپنے رحم و کرم سے بے سابقہ عمل اور بے استحقاق اپنے بندوں کو ہستی اور وجود عطا فرماتا ہے اور بیشمار نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے۔ گنہگار شرمسار ہو کر اپنے جرم کی معافی چاہتا ہے تو اسے اپنے فضل و کرم سے معاف فرماتا ہے اور تمام عالم کو ان کے اعمال کے بدلے کے لئے اس نے ایک دن معین فرمایا ہے جس کا نام روز جزا ہے۔ وہ آدمی کو بندر کتے کی جونوں میں سزا نہیں دیتا اس دنیا دار العمل کے بعد دار الجزا میں انکے عملوں کی جزا دیتا ہے۔ قالب چھوڑ کر روح دوسرے قالب میں نہیں آتی یہ محض خبر عقیدہ تعلیم الٰہی نہیں ہوسکتا جس سے دل کے مجبوکی تسکین تو نہیں ہو تمام آتی ہم تفسیر یہ کہ تمام دنیا کے بعد ایک یوم الجزا ہے جس میں بندوں کو ان کے اعمال کے بدلے دیئے جائیں گے اور نیکی بدی کا حساب ہوگا اللہ اکبر کس شان کی تعلیم ہے ابھی چند جملے تعلیم فرمائے اور ایک غافل بے خبر کو کہاں سے کہاں پہنچایا۔ طالب کے دیدہ جستجو میں عرفان کا سرمہ لگایا۔ قلب سے حجابات اٹھا کر نور حقیقت کو منکشف فرمایا۔ مادیت کی تاریکی میں پڑے ہیں۔ انسان کو ظلمانیت کی اسیری سے نجات دیکر اللہ کی عظمت سے باخبر کیا بندے کے روابط نیاز کو مالک کے ساتھ مستحکم فرمایا کیا کیا نعمتیں دیں کیا کیا احسان فرمایا۔

اولا بندے کے مایۂ ناز جوہر نطق کو حمد الٰہی میں مصروف کیا اور اس کا نام پاک بتایا اوس کے صفات کمال سے اس مدرسہ معرفت کے مبتدی و تدریجی تعلیم کے ساتھ ترقی دی ذکر اور فکر جو عارف کا پہلا وظیفہ ہے اس کے قرین حال فرمایا پھر اسماء میں تامل اور اس کی نعمتوں میں نظر رب العلمین اور رحمن و رحیم کے سبقوں سے سکھائی اور اپنی عظمت شان بطریق برہان دل نشین فرمانے کے لئے مالک یوم الدین کا درس دیا۔ اب وہی بندہ جو اس سے قبل

بے خبر و نادان تھا۔ ذکر وفکر مراقبے اور استدلال بالنظر کے مراتب طے کر کے اوس مرتبہ تک پہنچ گیا کہ اسکے دل کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور نور حق نے اس کے قلب پر ظہور فرمایا۔ ابھی تک اثر سے موثر کا پتہ چلاتا تھا۔ کان سے سن کر ایمان لاتا تھا۔ اپنے پروردگار کا ذکر غائب کے صیغوں سے کرتا تھا۔ اب وہ صاحب مشاہدہ ہوا بعد سے قرب میں آیا طالب سے واصل بنا ذوق کے جذبات تیز ہوئے تو خطاب کے ساتھ مناجات کا داعیہ پیدا ہوا جو منزل قرب کا مقتضا تھا۔ اب وہ بے اختیار خطاب کر بیٹھا اس منزل میں ﴿اِیَّاكَ﴾ کی پاکیزہ عبادت خطاب کے لئے عنایت فرمائی جاتی ہے جس میں وہ اپنے محبوب کو ایسی خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرتا ہے کہ غیر کا خطرہ اور اندیشہ اور غیریت کا پردہ اور حجاب باقی نہ رہے۔ ناظر ہمہ تن منظور میں محو ہوا اور ہمہ تن گیا محویت کا یہ عالم ہو کہ ناظر اپنے کو بھی نہ دیکھے ﴿اِیَّاكَ﴾ پکارے اس منزل میں پہنچ کر اس مقام کے آداب بجالائے اور اس نعمت کی شکر گذاری کے لئے ﴿نَعۡبُدُ﴾ عرض کرے جو الفنیا دکی معراج کا منتہا ہے اور دارفتگی کا کمال یعنی وہ یہ عرض کرتا ہے کہ میں اپنی بندگی اور تیری الوہیت کا زبان ودل سے اعتقاد وعمل سے اقرار واعتراف کرتا ہوں اور ایک میری عبادت کیا اور میری نیازمندی تیری رفعت شان کے حضور کتنی اپنی ہر جہت سے اور ہر حیثیت سے تجھ پر فدا ہوں تجھی کو مالکیت ہے اور جو تیرے سوا ہے وہ تیرا بندہ ہے ایک میں نہیں ساری مخلوق ملکہ ہم سب عبادت کرتے ہیں اور تو سب کی عبادت کا مستحق ہے۔ ہماری عبادت تیرے لئے خاص کہ تیرے سوا جو دوسرا ہے اس کا منصب تیرے ہی حضور عابد بن کر حاضر ہوتا ہے۔ تو اب معبودیت تیرے سوا کسی کو نہ ہو سکی۔ **اِیَّاكَ نَعۡبُدُ** میں جہاں یہ تعلیم ہے کہ بندہ کا کمال یہ ہے کہ وہ تمام عالم سے بے نیاز ہو کر اللہ رب العزت کے حضور انتہائی عجز ونیاز کے ساتھ حاضر اور متوجہ ہو اور اس کے مراتب تعظیم بجالانے میں اپنی پوری مقدرت صرف کر دے وہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ حکمت نظریہ حکمت عملیہ پر یعنی اعتقاد عمل پر مقدم ہے اور عبادت کی صحت عقیدہ کے پاک ہونے پر موقوف۔ صیغہ جمع میں یہ بھی اشارہ ہے کہ عبادت اور عبادتوں میں اعلےٰ عبادت (نماز) اس کا علی مرتبہ ادا بجماعت ہے کہ تنہا پڑھنے والا اعبد کہے گا نعبد جب ہی ظاہر ہوگا جب جماعت میں حاضر ہو گو مومن کسی نماز میں حقیقۃً منفرد نہیں ہوتا۔ ملائکہ اس کے ساتھ ضرور شامل رہتے ہیں تنہائی میں نماز پڑھنے والا اپنی عبادت کے ساتھ ان کی عبادت کے شمول پر نظر رکھے۔

عبادت کی حقیقت

عبادت کی حقیقت یہی ہے کہ بندہ رفعت شان مولےٰ اور اسکی عظمت کے حضور فدا کارانہ حاضر ہو اور خودبینی وخودنمائی کے تمام پردے چاک کر ڈالے۔ اب یہ بات مختلف طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے شرع مطہر میں عبادت کی بہت قسمیں ہیں بعض ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض باطن سے ظاہر سے تعلق رکھنے والی یا زبان سے ادا ہوتی ہیں جیسے تلاوت تسبیح تہلیل ذکر دعا یا آنکھ سے جیسے کعبہ مقدسہ اور قرآن پاک اور انبیا کی زیارت اور اولیا کا دیکھنا اور شہدا صالحین اور قبروں کی زیارت کرنا (تفسیر عزیزی) یا کان سے جیسے قرآن پاک اور ذکر الٰہی اور ذکر رسول اور اللہ تبارک وتعالےٰ کی محبت پیدا کرنے والی باتوں اور وعظ وخطبہ کا سننا ہاتھ سے قرآن پاک لکھنا بندگان خدا کی مدد کرنا قرآن حدیث دینیات کا لکھنا وغیرہ پاؤں سے مسجد کو جانا۔ حج کے لئے سفر کرنا۔ صلحا کی زیارت کے لئے چلنا وغیرہ۔ یہ ان عبادتوں کا بیان تھا۔ جو ظاہر سے تعلق رکھتی ہیں باطن سے تعلق رکھنے والی عبادتیں قرآن پاک کی آیات میں فکر کرنا معانی کو سوچنا شریعت کے احکام کو سمجھنا یہ سب عقل کی عبادتیں ہیں نفس کی عبادت ترک مالوفات پر صبر جیسے روزہ۔ اعتکاف اور اپنی ذات پر پیش آنے والے حوادث پر ترک جزع وفزع اور محرمات ومعاصی سے طبیعت کو روکنا قلب کی عبادت محبوبان خدا کے ساتھ محبت اور اس کے مبغوضوں کے ساتھ بغض اور ثواب کی امید عذاب کا خوف روح کی عبادت مشاہدہ میں سعی اور مراقبہ میں لذت پانا **عبادت** سر معرفت الٰہی میں مستغرق رہنا **مالی عبادت** زکوٰۃ۔ صدقہ۔ خیرات دعلیٰ ہذا القیاس اب معلوم ہوا کہ درحقیقت عبادت میں بندہ اپنے تمام اعضاء ظاہری وباطنی قوی اور ہر چیز کو اللہ کی راہ اور اس کی مرضی میں بدریغ نہیں بلکہ بہ تمنا صرف کر ڈالتا ہے اور اسی مضمون کو ایاك نعبد سے ادا کرتا ہے۔ اس بادشاہ حقیقی کے حضور اس بندۂ ناچیز کی طرف سے یہی نذر ہے جو پیش کیجا سکتی ہے۔ اسی لئے وہ حضوری کا شرف پاتے ہی ایاك نعبد عرض کرتا ہے اس آیت کریمہ میں اثبات توحید ورد شرک ہے ایاک نعبد میں عبادت کو اللہ عزوجل کے ساتھ خاص کر کے یہ بتایا گیا کہ غیر خدا کے لئے عبادت ناروا اور اشراک ہے اور مشرکین کی مغفرت نہ ہوگی ان اللہ لا یغفر ان یشرك بہ۔ توحید کی اس پاکیزہ تعلیم نے شرک کی گردن قطع کر دی اور بندے کی عابدانہ روابط نیاز فقط ایک اللہ وحدہٗ لاشریک لہ سے مربوط فرما کر باطل پرستی کی تاریکی سے بچالیا لیکن اسے اور اعلےٰ مرتبہ پر ترقی عطا فرمانے کے لئے اُس احتمال کو بھی رفع فرمایا جو ایاک نعبد عرض کرتے وقت بندے کے دل میں شامت نفس یا اغوائے شیطن سے خطور کر سکتا تھا کہ میں نے معبود کا حق عبادت ادا کر دیا یا یہ کہ میں اس قابل ہوں کہ عبادت بجالاؤں اس میں نفس کو عجب وخود بینی کا موقع مل سکتا ہے کریم بندہ نواز نے بندہ کے دل پر یہ میل آنا بھی گوارا نہ فرمایا اور اسی کیساتھ تعلیم دی **اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ**۔

اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ یعنی مراتب عبادت میں وصول تیری ہی توفیق ومدد سے میسر ہے اور ہم تیری عبادت کرتے ہیں تیری اعانت ودستگیری کے محتاج طالب ہیں یہ بھی تیرا کرم ہے کہ ہمارا سر تیری درگاہ میں جھکے اور ہم غیر کی پرستش سے محفوظ رہیں۔ اب اس بندے کی عبادت کس اخلاص وراست بازی کے ساتھ ادا ہوتی ہے اور بارگاہ الٰہی میں حاضری کا کیا بہترین ادب تعلیم فرمایا ہے۔ لله الحمد استعانت طلب عون اور مدد چاہنے کو کہتے ہیں جس طرح عبادت میں بندہ کی توجہ خاص اللہ کی طرف ہے۔ استعانت میں بھی اس کا نصب العین وہی ہے جہاں عبادت دوسرے کے لئے ممنوع وباطل ہے استعانت بھی مومن کے لئے اس کیلئے متصور یہ مراتب توحید کا ایک اور بلند وبالا مرتبہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر چیز کو اور اپنے کاموں میں دخل رکھنے والے ہر وجود کو سبب اور وسیلہ دیکھے اور نظر اس کارساز پر رکھے۔ کافر سمجھ سکتا ہے کہ ان کی روشنی آفتاب کا فیض ہے اور میری بینائی اس روشنی کا صدقہ ہے۔ اسی لئے اسی خیالی کو جماتے جماتے وہ آفتاب پرست ہو جاتا ہے اور اسی طرح دنیا میں آفتاب پرستی۔ کواکب پرستی۔ مخلوق پرستی رایج ہوگئی۔ لیکن مومن آفتاب کو محض وسیلہ جانتا ہے اور اس میں قادر مطلق کے دست قدرت کو متصرف دیکھتا ہے روشنی سے فائدہ اٹھاتا ہے مگر نظر منتہا پر ہوتی ہے اور یقین سے جانتا ہے کہ یہ ضو وار اس سے انتفاع سب اسی کے کرم سے ہے۔ اسی طرح ہر چیز میں وہ کارساز حقیقی خدا کو سمجھتا ہے اور ہر شے کو اسی کی اعانت اور کرم کا مظہر جانتا ہے۔ تو مدعا یہ ہے کہ جس چیز کی طرف مومن ہاتھ بڑھائے اسے عون الٰہی کا مظہر جانکر ہاتھ بڑھائے۔ یہ عقیدہ اگر دل میں نہیں تو پھر دل تاریک ہے اب خواہ اس قسم کی استمداد واستعانت بے جان چیز دن سے ہو یا جاندار نبات وجماد سے ہو یا حیوان وانسان سے عزیز واقارب سے ہو یا اہل حکومت وسلطنت سے۔ اس سے اور بالاتر دیکھئے۔ مقربین بارگاہ سے ہو یا مقبولین ذی جاہ سے۔ اولیا سے ہو یا انبیا سے (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اس عقیدہ راسخہ سے ہو کہ یہ عون الٰہی مظہر ہیں تو یہ استعانت درحقیقت استعانت بالغیر نہیں۔ گو اسے مجازاً غیر کی طرف نسبت کیا جائے انبیا اور اولیاء اور مقربین بارگاہ سے مدد چاہنا وہ تو اسی معنی کے لحاظ کے بعد اور اسی پر موقوف ہے کہ انہیں بارگاہ حق میں قرب وقبول حاصل ہے وہ مورد رحمت اور مظہر کرم الٰہی ہیں ان کا تصور ان کی یاد یا ان کا ذکر ہر مرتبہ اس عقیدہ حقہ کو سامنے لاتا ہے کہ خدا کی رحمتیں ان میں ظاہر ہوتی ہیں اور خدا کی نعمتیں ان کے ہاتھوں ملتی ہیں۔ اس لئے اہل اللہ سے مدد مانگتے ہیں تو کوئی تردد ہی نہیں بلکہ یہ عین معرفت ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر فتح العزیز میں فرماتے ہیں کہ غیر سے اس قسم کی مدد چاہنا کہ اسی پر بھروسہ ہو اور اس کو خدا کی مدد کا مظہر نہ جانے حرام ہے اور اگر توجہ حق تعالےٰ کی طرف ہے اور اس غیر کو مدد الٰہی کا مظہر جانکر اللہ تعالےٰ کے کارخانہ و اسباب حکمت پر نظر کر کے غیر کے ساتھ استعانت ظاہری کرے تو عرفان سے دور نہ ہوگا اور شرع میں بھی جائز و روا ہے اور انبیا اور اولیاء نے غیر سے اسطرح کی مدد طلب کی ہے اور در حقیقت یہ استعانت بالغیر نہیں بلکہ حضرت حق ہی سے استعانت ہے امام حجۃ الاسلام نے فرمایا۔ من یستمد بہ فی حیاتہ یستمد بہ بعد مماتہ۔ یعنی جس سے زندگی میں مدد طلب کیجاسکتی ہے اس سے بعد وفات بھی مدد طلب کی جاسکتی ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ کی قبر قبول دعا کے لئے تجربہ کیا ہوا تریاق ہے۔

جواز استعانت میں زندہ اور مردہ میں کوئی فرق نہیں اولیا اہل ظاہر کے عرف میں مردہ کہلائے جائیں لیکن وہ قرب الٰہی میں زندہ اور معمور رحمت ہیں۔ احادیث میں اس کے مفصل تذکرے ہیں شہداء کی حیات کا قرآن پاک نے خود ذکر فرمایا خلاصہ مدعا یہ کہ اگر غیر پر بھروسہ کرے اور اس کو کارساز حقیقی جانے تو بیشک شرک اور یہ جان کر کسی سے پانی مانگنا اور یہ سمجھنا کہ وہ اپنی قدرت سے پانی دے سکتا ہے اور پانی کو یہ سمجھنا کہ وہ اپنی ذات سے پیاس کو دفع کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کو واسطہ اور سبب نہ جاننا بیشک حرام اور داخل شرک ہے اور اس قسم کے اوہام اگر پیدا ہوں تو کفار کو ہو سکتے ہیں۔ مومن ہر چیز کو مظہر قدرت الٰہی سمجھتا ہے۔ بیہودہ کہ بھی کھاوے تو دنیا کی چیزوں میں کھا سکتا ہے لیکن خود ریل اور جہاز اور بجلی اور ہوا سے دھوکہ نہ کھائے اور وہاں ان خالص دنیوی چیزوں میں جن کے نام کے ساتھ اللہ کا نام پاک ملا ہوا نہیں ہے۔ اللہ کے دست قدرت کو دیکھتا ہو محال ہے کہ وہ اہل اللہ کو معبود سمجھے اور ان سے استعانت کرنے میں اللہ کو بھول جائے کہ ان کا نام ہی بغیر خدا کے نام کے زبان پر نہیں آتا اور ان کے ذکر کے ساتھ یہ بات دل میں جاگزیں ہوتی ہے کہ یہ بارگاہ حق میں ہمارا وسیلہ ہیں اور ان کی بدولت ہم فیض ربانی سے مستفیض ہونگے۔ اس قسم کی استعانت مومن کی شان کے لایق اور اللہ کی ربوبیت کا اقرار ہے کہ وہ وسائط میں بھی نظر اسی پر رکھتا ہے اور ان عینکوں سے اسی کے جمال کو دیکھتا ہے تو مومنین پر شرک کا الزام لگانے سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ اگر ان کی ظاہر عبارت میں وسیلہ کی صراحت نہ ہو تو بھی مومن کی مراد یہی ہوتی ہے رات دن کا عرف ہے کہ غذا قوت دیتی ہے۔ یہ کہنے پر کوئی شخص مشرک نہیں ہوتا اور اس پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس نے غذا کو نافع بالذات اور موثر حقیقی جان لیا اس کا ایمان اس کی مراد صحیح کا قرینہ ہوتا ہے، خود قرآن پاک میں حضرت ذوالقرنین سے منقول ہے۔ اعینونی بقوۃ تو اس قسم کے تلفظ اور اسنادین مجازی ہیں اس حیلہ سے مسلمانوں کو مشرک کہنا اور گور پرست نام رکھنا بڑا ظلم اور نہایت گمراہی ہے نعوذ باللہ۔

ایاک نعبد وایاک نستعین کے دو کلموں میں ایک عجیب لطیفہ ہے کہ اللہ سبحانہ تبارک و تعالیٰ کو واحد کے صیغہ سے تعبیر فرمایا اور عابد و مستعین کو صیغہ جمع سے تاکہ طالب کے قلب پر نقش ہو جائے کہ معبود و مستعان خاص وہی ایک لاشریک لہٗ ہے اور عابد اور مستعین یعنی عبادت کرنے والے اور مدد چاہنے والے بیشمار ہیں لطیفہ اوپر کی آیات ایاک نعبد کے جملہ جمیلہ کے لئے ایک برہان ہے اللہ اکبر کلام کی قوت و شوکت کے سامنے عقل حیران ہے پہلے جملے پچھلے جملوں کے لئے حجت و برہان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بندہ کے لئے تین حال ہوتے ہیں۔ ماضی۔ حال۔ استقبال۔ ماضی میں تو بندہ معدوم ہے عاجز ہے جاہل ہے نہ اس کی ذات ہے نہ صفات اس حال میں اسکو مبدع اور خالق کی احتیاج ہے جو خود موجود حقیقی ہو اور اسکو وجود حیات قدرت علم عطا فرمائے اس انعام کا بیان تو الحمدللہ میں ارشاد ہوا جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا کنتم امواتًا فاحیاکم بندہ کی دوسری حالت حاضر ہے جس کو حال کہتے ہیں۔ اس وقت اس پر حوائج ضروریات کے دروازے کھلجاتے ہیں اور وہ ہمہ تن احتیاج ہوتا ہے اور اس کے گرد و پیش سب طرف ضروریات ہی ضروریات ہوتی ہیں اس وقت اسے نہایت مہربان پرورش کرنے والے کی حاجت ہوتی ہے جس کو رب و رحمٰن و رحیم کی صفات نے بیان فرمایا۔ بندہ کی تیسری حالت استقبال ہے جہاں وہ اپنے اعمال کی جزا کا امیدوار ہے جس کو مالک یوم الدین نے بیان فرمایا تو ابتدا سورۃ سے مالک یوم الدین تک جو صفات جلیلہ بیان فرمائی گئیں ان میں بندہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے تینوں حالوں میں پروردگار عالم کے رحم و کرم کا محتاج ہے اور ماضی و حال میں اس نے اس پر رحمت فرمائی ہے۔ ہستی عقل و شعور تمیز اور اک قدرت و قوت یہ سب اس نے عطا فرمائی روزی و مسکین اور حیات کی تمام آسائشیں اس نے عنایت کیں اور زمانہ مستقبل میں جزائے عمل بھی اس کے دست قدرت میں ہے تو جو بندہ اپنے تینوں حالوں میں اس کا محتاج ہے اس پر واجب ہے کہ فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو اور اس کی بارگاہ میں نیازمندی کے ساتھ جبیں سائی کرے۔

ایاک نعبد میں ایاک کی تقدیم مفید حصر ہے اور اس سے یہ مراد ہے کہ عابد تصریح کرتا ہے کہ میں خاص تیری عبادت کرتا ہوں اور عبادت سے میرا مقصود صرف تو ہے اس کی برکت سے وہ ریا کی آفت اور بہت سے شیطانی وساوس سے نجات پاتا ہے۔ نیز عارف کے لئے ایک بلند و بالا مقام تک ایصال ہے کہ عبادت کے لئے حاضر ہو تو اس کی نظر پہلے معبود کی طرف ہو اور اس کی ہستی اور عبادت تک بھی معبود تک وصول میں حجاب نہ ہو سکے۔ اب لا الٰہ الا اللہ کے معنی کس خوبی سے دلنشین فرما کر موحد کامل بنا دیا۔ نعبد و نستعین میں عبادت و استعانت کی اسناد بندہ کی طرف فرما کر یہ مسئلہ واضح فرما دیا کہ فعل بندہ کے لئے ثابت ہے اور خلق و توفیق اللہ کی طرف سے اسمیں فرقہ جبریہ کا رد ہو گیا جو بندہ سے فعل کی بالکل نفی کرتے ہیں اور معتزلہ کا بھی جو اللہ کی طرف سے توفیق کے منکر ہیں اور یہ بات عقل میں آتی ہے۔ کیوں کہ اگر فعل میں بندہ کا کوئی دخل ہی نہ ہو تو جزا کیسی اور اگر وہ اپنے فعل کا خود خالق ہو تو عبدیت کہاں۔ یہ وہ نازک مسئلہ ہے جسمیں دنیا کے بہت سے مدعیان عقل و خرد نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قرآن پاک نے اس کو ایک اشارہ میں حل فرما دیا وللہ الحمد۔

ایاک نعبد کے ساتھ ایاک نستعین فرمانے سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبادت حل مشکلات اور انجاح حاجات کا وسیلہ ہوتی ہے۔ بندہ جب مصیبت میں مبتلا ہو دشواریاں اسکو گھیر لیں پریشان ہو جائے تو اس کو چاہیئے کہ صوم و صلوٰۃ صدقہ وغیرہ عبادات کے ساتھ استعانت کرے اور پروردگار عالم سے کشائش چاہے۔ انشاء اللہ کامیاب اور فائز المرام ہوگا جیسا دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔ یا ایہا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ

اھدنا الصراط المستقیم

اللہ سبحانہ تبارک و تعالےٰ نے بندے کو اپنی ذات و صفات کی معرفت کے بعد خاص اپنی عبادت کی تعلیم دی اور اس میں اللہ تعالےٰ نے توفیق و اعانت کا طالب بنایا۔ جب بندہ عرفان ذات و صفات کے بعد مقام عبادت میں فرمانبردارانہ اخلاص کے ساتھ فائز ہوا تو اب اسکو راہ راست کی ہدایت کی دعا تلقین فرمائی اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ بندہ کو عبادت کے بعد مشغول دعا ہونا چاہیئے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا نمازوں کے بعد مشغول دعا ہونا بکثرت احادیث میں مذکور ہے طبرانی نے کبیر میں حضرت عرباض بن ساریہ سے روایت کی من صلی فریضۃ فلہ دعوۃ مستجابۃ۔ جس شخص نے فرض نماز پڑھی اس کو لئے ایک دعا مستجاب ہے۔ بیہقی نے سنن میں حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا جب تم میں سے کوئی اپنی نماز سے فارغ ہو تو چاہیئے چار چیزوں کے لئے دعا کرے عذاب جہنم و قبر۔ فتنہ محیا و ممات فتنہ دجال۔ سے بچنے کے لئے اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد خواہ وہ فرض ہوں یا غیر فرض بجماعت

ہوں یا بے جماعت جمعہ ہوں یا عیدین سب کے بعد دعا مسنون ہے۔ کسی نعمت کو پاکر پھر اس کی طلب میں رہنا محسن کے انعام کا اعتراف اور نعمت کی قدر شناسی ہے بادشاہوں کے درباروں میں باریابی پاکر درباری عرض کیا کرتے ہیں کہ الطاف خسروی جو ہمارے حال پر مبذول ہیں ہم اون کے شکر گزار ہیں۔ اور شاہی کرم وعنایت کے اُمّید وار اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلی نعمت کی انہوں نے قدر کی اور مراحم شاہی کی بقا اور مزید توجہ کے طلبگار ہیں اهدنا الصراط المستقیم عرض کرنے والا اس کے رحم وکرم کا اعتراف کر کے اس نعمت کی قدر شناسی کرتا ہے اور اس پر ثبات اور مزید فضل کا طلبگار ہوتا ہے۔ مقربان بارگاہ کا یہی دستور ہے۔ حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کیا توفنی مسلماً جادوگروں نے ایمان سے مشرف ہو کر دعا کی توفنا مسلمین صحابہ کبار نے عرض کیا توفنا مع الابرار ان سب دعاؤں میں بقائے نعمت کی طلب ہے اسی طرح جب بندہ ہدایت سے فیضیاب ہوتا ہے تو وہ اس نعمت جلیلہ کی قدر کر کے اس کی بقا کی دعا کرتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ ہمیں جو تو نے ہدایت فرمائی ہے اس پر قایم رکھ ہم راہ راست کی ہدایت کے طلبگار ہیں راہ راست پانے کے بعد جو طلب ہے یہ مزید فضل وکرم کی استدعا ہے۔ ہدایت کی بہت مراتب ہیں جو شمار میں نہیں آسکتے۔ انہیں میں سے رسول مبعوث فرما کر کتابیں نازل کر کے ہدایت کرتا ہے اس ہدایت سے اللہ تعالےٰ کے رسولوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لانے والے عام طور پر فیض یاب ہیں اس سے بلند مرتبہ ہدایت کا یہ ہے کہ قلب سے حجابات اوٹھ جائیں سرائر منکشف ہوں اشیا کماہی دکھا دی جائیں۔ وحی الہام کی روشنی سے باطن کی آنکھیں منور ہوں۔ ہدایت کا یہ مرتبہ انبیاء اور اولیا کے ساتھ خاص ہے۔ وحی انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہے اور الہام سے اولیا فیضیاب ہوتے ہیں اهدنا الصراط المستقیم جب ایک مومن پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایمان کی طرف جو تو نے ہمیں ہدایت فرمائی اُسپر قائم رکھ اور عرفان کے مراتب میں چشم بینا عطا فرما جب ایک عارف پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں سیر فی اللہ میسر کر کہ ہم سے ہمارے احوال کی تاریکیاں اور ہمارے ابدان اور مادیت کے ظلمات دور ہوں اور ہم تیرے نور قدس سے منور ہو کر تیرے دیدار سے مشرف ہوں اور ہوش میں تیری ذات اور صفات اور افعال کی تجلیاں دیکھیں۔

صراط مستقیم

سے طریق حق دین قویم ملت اسلام مُراد ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے۔ بعض کے نزدیک قرآن پاک اور حضور اقدس سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خلق کریم جس کو حضرت ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے فرمایا کان خلقہ القرآن کہ حضور انور کا خلق کریم قرآن حکیم ہے۔ علامہ شیخ اسمعیل حقی نے تفسیر روح البیان میں فرمایا الصراط المستقیم ھوالدین القویم وھوما یدل علیہ القرآن العظیم وھوخلق سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم یعنی صراط مستقیم دین قویم ہے اور دین قویم وہ ہے جس پر قرآن عظیم ولالت فرماتا ہے اور جس چیز پر قرآن عظیم ولالت فرماتا ہے وہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ ہیں تو نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ قرآن عظیم کا صحیح مدلول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاکیزہ اخلاق ہیں یہی دین قویم ہے اور اسی کو قرآن عظیم میں صراط مستقیم کے ساتھ تعبیر فرمایا۔

حضرت امام جلیل قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفا شریف میں فرمایا کہ ابوالعالیہ اور حسن بصری رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صراط مستقیم حضور انور ہیں علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضور کے اہل بیت اخیار و اصحاب اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس تفسیر کو ابوالعالی اور حسن بصری سے ابوالقاسم ماوردی نے نقل کیا اور مکی نے بھی ان دونوں بزرگوں سے ایسا ہی نقل کیا ہے اُن کا قول یہ ہے کہ صراط مستقیم حضور ہیں اور حضور کے صاحبین جلیلین ابوبکر اور عمر صلوٰۃ اللہ تعالیٰ علیہم وسلامہ ابوالیث سمرقندی نے بھی صراط الذین انعمت علیہم کی تفسیر میں ابوالعالیہ سے ایسا ہی نقل فرمایا کہ جب یہ قول حسن کے پاس پہنچا تو اُنہوں نے فرمایا کہ بخدا یہ سچ ہے اور خوب ماوردی نے عبد الرحمٰن بن زید سے بھی ایسا ہی نقل کیا۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ ایک ایک ادا اُس سرور یکتا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت ہے اور قرآن پاک نے یہ ارشاد فرمایا ما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس لادیں تم اُس کو قبول کرو اور جس امر سے وہ منع فرمائیں اس سے باز رہو۔ تو دین انہیں کے امر انہیں کی اطاعت ہے دوسری آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا۔ ماینطق عن الھوےٰ ان ھوالا وحی یوحی اس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ خواہشات سے وہ سرور کریم صلی اللہ علیہ وسلم پاک ہیں کہ زبان اقدس پر ایک کلمہ بھی اپنی خواہش سے نہیں آیا جو ادا ہوتا ہے۔ وہ سب وحی الٰہی ہے یہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی بہت بلند و بالا مرتبت کا بیان ہے اور جب صراط مستقیم حضور ہیں تو ظاہر ہے کہ بارگاہ الٰہی تک وصول اور باریابی کے لیے حضور کے سوا کوئی اور راہ نہیں۔ اب انبیا ہوں یا مرسلین سب کو اس سلطان کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع لازم ہوا اور وہ بادشاہ کونین جیسے نبی الامہ ہیں ویسے ہی نبی الانبیاء بھی۔ اسی لیے قرآن پاک میں انبیاء کے میثاق کا ذکر ہے جن سے حضرت رب العزت عزوعلا تبارک وتعالیٰ نے کتاب وحکمت سے مشرف ہونے کے بعد حضور پر ایمان لانے اور حضور کی نصرت کرنے کا عہد لیا اور اسی لیے قرآن پاک میں ارشاد ہوا من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ومن تولیٰ فما ارسلنٰک علیہم حفیظا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے فرمانبرداروں میں وہی داخل ہے جو حضور انور علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا فرمانبردار ہو۔ اب انبیا ہوں یا مرسلین ملائکہ ہوں یا جن ہر مخلوق پر حضور کی اطاعت لازم۔ اسی مضمون کو احادیث میں گوناگون عنوانوں کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے۔ کہیں ارشاد ہوا بعثت الی الخلق کافۃ میں تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔ کہیں ارشاد فرمایا بعثت الی الاسود والاحمر کہ ہر سیاہ وسرخ کی طرف میری بعثت ہوئی۔ اس سے ثابت کہ حضور تمام خلق کے نبی ہیں اور سب آپ کی امت تو یقیناً خدارسی کی راہ آپ ہیں۔ اور آپ ہی کی بدولت وصول الی اللہ کی نعمت میسر آسکتی ہے۔

ابوالعالیہ اور حسن بصری کی تفسیر کی بموجب حضور اور حضور کے اہلبیت واصحاب صراط مستقیم کا مصداق ہیں۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ حضور کی سنت اور حضور کے صحابہ اور اہل بیت اور مکی کی روایت کی بموجب حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہم کا اتباع کرے۔ اُس نے صراط مستقیم پائی اور ایسے لوگوں کو اہل سنت و جماعت کہتے ہیں تو آیہ کریمہ اھدنا الصراط المستقیم نے صاف کر دیا کہ تمام فرقوں میں جو فرقہ حق پر ہے وہ اہل سنت وجماعت ہے اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہوا علیکم بسنتی وسنت الخلفاء الراشدین المھدیین۔ (رواہ الترمذی) دوسری حدیث میں ارشاد ہوا علیکم بالجماعۃ والعامۃ (رواہ احمد) تیسری حدیث میں ارشاد فرمایا من فارق الجماعۃ شبراً فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ (رواہ احمد وابوداؤد) چوتھی حدیث میں ارشاد فرمایا ید اللہ علی الجماعۃ ومن شذ شذ فی النار (رواہ الترمذی) پانچویں حدیث میں ہے اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار۔ (رواہ ابن ماجہ) ان تمام حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ میرے اور خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم کرد اور سواد اعظم اور جماعت جمہور کا اتباع لازم سمجھو۔ جو جماعت سے جدا ہوا وہ جہنمی ہے اُس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا تو ثابت ہوا کہ صراط مستقیم طریقہ اہل سُنّت وجماعت ہے۔

حضرت امام علامہ محی السنۃ علاؤ الدین علی ابن محمد بن ابراہیم بغدادی معروف بہ خازن اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں وقیل السنۃ والجماعۃ یعنی اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ صراط مستقیم طریقۂ حقہ اہل سنت وجماعت ہے اور مآل کے اعتبار سے یہ تمام اقوال مطابق ہیں کما لایخفی علی اللبیب۔

صراط الذین انعمت علیہم

یہ صراط الذین کی تفسیر اور قرآنی تشریح ہوا۔ دوسری جگہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ومن یتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا۔ اس میں ہدایت ہے کہ راہ راست مومنین کا طریقہ ہے جو اس سے ہٹا اور جس نے اس راہ کو چھوڑا وہ صراط مستقیم سے دور ہوگیا یہی مضمون مذکورہ بالا احادیث سے بھی ثابت ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے وہ طریق مسلمین سے انحراف کرکے پیدا ہوا اور پیدا ہوتا ہے اور جو طریق مسلمین کے خلاف ہو وہ صراط مستقیم نہیں۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جو طریق مسلمانوں کا چلا آیا ہے وہی صراط مستقیم ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ گمراہی ہے۔ اس زمانہ میں جو لوگ طرح طرح کے نئے نئے مذہب نکالتے ہیں اور مسلمانوں کے طریقہ کے خلاف چلتے ہیں وہ سب صراط مستقیم سے دور ہیں۔

الذین انعمت علیہم

قال اللہ تعالیٰ ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین۔ اس آیت میں بیان فرمایا گیا کہ جن پر اللہ نے انعام فرمایا وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ الذین انعمت علیہم سے مراد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد صحابہ کرام ہیں اور بعض نے کہا کہ مومنین ہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم میں ارشاد فرمایا کہ ہم کو سیدھی راہ دکھا اور سیدھی راہ وہ ہے جس پر تیرے مقبول بندے چلے۔ یہ بندہ کی طرف سے دعا ہے کہ اے رب ہم کو ان لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم سے ظاہر ہوا کہ بندہ کا فرض ہے کہ وہ انبیاء و اولیاء کے طریقہ پر چلے اور ان کی پیروی کرے اور اللہ تعالیٰ سے اسی کی توفیق طلب کرے۔

کہ میں تجھ تک واصل ہوں اور عبدیت کی نیازمندی اور اخلاص کے ساتھ تیری معبودیت کا پرستار ہوں غیر سے علاقے قطع ہوں تجھ پر نظر ہو تو ہی مقصود ہو تو ہی مطلوب تو ہی مطلوب تو ہی مراد ہو تو ہی محبوب تیرا بندہ تیرے آستانہ پر حاضر ہو اور یمین اور یسار کی طرف نگاہ نہ ڈالے یہ بندہ کی غایت تمنا اور سعادت قصویٰ تھی مگر صراط الذین انعمت علیہم فرما کر یہ ارشاد کیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ صراط مستقیم جس پر چل کر بے دغدغہ بندہ مولا سے واصل ہو سکے بے وساطت مقربین میسر نہیں آسکتی محبوبان خدا کا اتباع اور اُن کی اطاعت ضروری ہے قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی اور یایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ میں اسی طرف ایماء ہے اسی لیے شیخ اور مرشد طلب کیا جاتا ہے اور اسی لیے بیعت مسنون ہے کہ منعم علیہم کے اتباع سے صراط مستقیم نصیب ہو۔

اتنا ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ناواقف کو بے راہبر وصول میسر نہیں آسکتا تو خدا تک پہنچنے کے لیے انبیاء اور اولیاء اور مقربین بارگاہ کے اتباع کو چھوڑ کر اپنی عقل ودانائی پر گھمنڈ کر کے خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ قرآن کی تعلیم اور عقل کے ارشاد دونوں ہی کے مخالف ہیں۔ اور اپنی عمر گراں مایہ سرمایہ ضائع کرتے ہیں۔ اللّٰہ تعالےٰ اپنے بندوں کو ہدایت فرمائے مخالفین نے تو اولیاء اللّٰہ کے اتباع کے بجائے اُن سے عناد وعداوت کو ایمان سمجھ لیا ہے اور حدیث قدسی میں حضور انور علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات نے حضرت رب العزت عزوعلا تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد پیش فرمایا من عادی لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب یعنی جو میرے اولیا کا دشمن ہو میری طرف سے اُس کو جنگ کا اعلان ہے محبوبان خدا سے دشمنی وعناد کا یہ انجام ہے نعوذ باللّٰہ۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ

اوپر اُن لوگوں کا تذکرہ تھا جن پر اللّٰہ تبارک وتعالےٰ نے انعام فرمایا اللّٰہ تبارک وتعالےٰ کی نعمتیں بہت طرح کی ہیں روحانی جسمانی وہبی کسبی دنیوی اُخروی عام خاص۔ عالم میں کوئی ایسا موجود نہیں ہے جو اُس کی نعمت سے بالکل محروم اور بے نصیب ہو مطیع یا عاصی فرمانبردار ہو یا باغی مومن ہو یا کافر وجود دنیا ہستی عطا فرمانا زندگی بخشنا عقل شعور حواس ادراک غذا مسکن صحت تندرستی سب اُسی کی نعمتیں ہیں۔ مومنوں کو بھی ملتی ہیں کافروں کو بھی تو یہاں کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ نعمت پانے والے جن کی راہ طلب کرنے کی ہدایت فرمائی اور جن کی اطاعت و فرمانبرداری سے وصول الی اللّٰہ کی دولت ملے وہ کون سے ہیں۔ نعمتیں تو خدا کی تمام جہان پر ہیں اُس کے دشمن بھی اُس کی نعمتوں سے بالکل محروم نہیں اس شبہ کے پیدا ہونے سے پہلے ازالہ فرمادیا کہ غیر المغضوب علیہم کہ نعمت والوں سے وہ مُراد ہیں اور راہ ان منعم علیہم کی وصول الی اللّٰہ کا ذریعہ ہے جن پر اس کا غضب نہیں ہوا اور جو گمراہ نہیں ہوئے کہ مغضوب وگمراہ کی راہ چل کر تو راہ چلنے والا مغضوب وگمراہ ہی ہوگا اور جہاں اُس کا مقتدا پہنچا ہے وہیں پہنچے گا واصل نہ ہو سکے گا تو منعم علیہم سے وہ مُراد نہیں ہو سکتے جنھوں نے نعمتیں پائیں اور تمرد کیا باغی ہوئے مورد غضب اور گمراہ ہوئے بلکہ وہ مُراد ہیں جن پر اللّٰہ نے انعام فرمایا اور وہ شکر گزار اور اطاعت شعار ہو کر مورد انعام ورحمت رہے راہ راست سے نہ بہکے اللّٰہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللّٰہ یہود دنیا میں بھی ذلت ورسوائی کے ساتھ خاص کر کے مورد غضب کیے گئے اس سے پہلے ہزاروں برس اُن کی سلطنت رہی مگر اس اعلان کے بعد کسی یہودی کو کہیں سلطنت نصیب نہ ہوئی وہ ذلت وخواری سے زندگی کاٹا کیے گویا یہ اللّٰہ تعالےٰ کا غضب ہوا وہ یہود ہیں اور جو دعویدار محبت بن کر گمراہ ہوئے وہ نصاریٰ ہیں کہ انھوں نے حضرت مسیح عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تصور کر لیا۔ اسطرح پردہ غلو محبت میں "ضالین" میں اُن کا شمار ہوا۔

مسئلہ طالب حق کو دشمنان خدا سے اجتناب اور ان کے رسم وراہ سے پرہیز لازم ہے ترمذی کی روایت ہے کہ مغضوب علیہم سے یہود اور ضالین سے نصاریٰ مُراد ہیں
مسئلہ ضاد اور ظاء میں مباینت ذاتی ہے۔ بعض صفات کا اشتراک انہیں متحد نہیں کر سکتا۔ لہٰذا غیر المعظوب پڑھنا اگر بقصد ہو تو تحریف قرآن وکفر ہے ورنہ ناجائز۔
مسئلہ جو شخص ضاد کی جگہ ظاء پڑھے اس کی امامت جائز نہیں (محیط برہانی)

اٰمین :۔ اس کے معنی ہیں ایسا ہی کر یا قبول فرما۔ مسئلہ یہ کلمہ قرآن نہیں۔ مسئلہ سورہ فاتحہ کے ختم پر آمین کہنا سنت ہے۔ نماز کے اندر بھی اور نماز کے باہر بھی۔ مسئلہ حضرت امام اعظم کا مذہب یہ ہے کہ نماز میں آمین اخفاء کے ساتھ یعنی آہستہ کہی جائے۔ تمام احادیث پر نظر اور تنقید سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ جہر کی روایتوں میں صرف وائل کی روایت صحیح ہے اس میں مدّ بہا لفظ ہے جس کی دلالت جہر پر قطعی نہیں جیسا جہر کا احتمال ہے ویسا ہی بلکہ اس سے قوی تر ہمزہ کا احتمال ہے اسلیے یہ روایت جہر کے لئے حجت نہیں ہو سکتی۔ دوسری روایتیں جن میں جہر ورفع کے الفاظ ہیں ان کی اسنادمیں کلام ہے علاوہ بریں وہ روایت بالمعنی ہیں اور فہم راوی حدیث نہیں لہٰذا آمین کا آہستہ پڑھنا صحیح تر ہے

آمین کی تشریح کرتے ہوئے تفسیر بیضاوی میں قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ اسم فعل ہے بمعنی استجب اور حضرت ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے حضور انور علیہ الصلوٰۃ والتحیات سے اس کے معنی دریافت کیے تو فرمایا اس کے معنی ہیں افعل یعنی استجابت کر یہ کلمہ اگر تنہا ہو تو اُس پر سکون کے ساتھ وقف کیا جائیگا اور اگر دوسرے کلمہ کے ساتھ ملے تو التقائے ساکنین کی وجہ سے اس کو متحرک کیا جائےگا اور طلبًا للخفت این وکیف کی طرح مفتوح کر دیا جائیگا۔ اس کے معنی میں بھی کئی قول ہیں۔ ایک یہ معنی کہ ایسا ہی کر۔ دوسرے یہ کہ قبول کر تیسرے ہماری اُمید نہ توڑ۔ چوتھے تیرے سوا کوئی اس پر قادر نہیں۔

اس کلمہ میں امین اور آمین مد وقصر دونوں آئے ہیں جیسا کہ مجنوں کا شعر ہے ؎

یارب لا تسلبنی حبھا ابدا ✣ ویرحم اللّٰہ عبدا قال امینا

اور قصر کی مثال جبیر بن اضبط کا یہ شعر ہے ؎

تباعد عنی فطحل اذ دعوتہ ✣ امین فزاد اللّٰہ ما بیننا بعدا

اس بات میں سب کا اتفاق ہے کسی کا اختلاف نہیں کہ یہ کلمہ قرآن نہیں ہے۔ حتی کہ علمانے اُس پر ارتداد کا حکم دیا ہے جو اس کلمہ کو قرآنی بتائے یہی وجہ ہے کہ یہ کلمہ قرآن میں نہیں لکھا جاتا۔

اس بات میں بھی سب کا اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ختم پر اس کلمہ کا پڑھنا سنت ہے حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت سے فراغ کے وقت جبریل امین علیہ السلام نے مجھے آمین کہنے کی تلقین کی حضرت علی مرتضیٰ سے مروی ہے کہ آمین رب العالمین کی مہر ہے جو اُس نے اپنے بندہ کی دُعا پر فرمائی۔

سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہنا بیرون نماز میں بھی نمازی کے لیے سنت ہے اور نماز کے اندر بھی منفرد اور امام اور مقتدی [illegible] کے لیے سنت ہے۔ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ یہ کلمہ نماز میں جہر کے ساتھ پڑھا جائے یا اخفا کے ساتھ۔ ہمارے امام عالی مقام حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذہب یہ ہے کہ اخفا کے ساتھ پڑھا جائے۔ قدرے تفصیل اس مسئلہ کی یہ ہے کہ اس مسئلہ میں جو احادیث وارد ہیں اُن میں سے بعض میں رفع بہا صوتہ بعض میں مد بہا صوتہ اور بعض میں جہر اور بعض میں قال امین حتی یسمع من فی الصف الاول۔ اور بعض میں فیرتج بہا المسجد اور بعض میں فسمعتہ یقول امین وھی فی صف النساء یہ الفاظ وارد ہیں۔ جہر کے قائلین کا تمام سرمایہ صرف یہی احادیث ہیں جن میں یہ الفاظ وارد ہیں۔ ان احادیث کا حال یہ ہے کہ یہ سب خبر واحد ہیں قطعی الثبوت نہیں، معہذا جہت روایت سے اس میں بہت گفتگو ہے اور ان تمام احادیث میں قائلین جہر کے لیے جو لسبتًہ ان میں سب سے زائد اور صحیح ہے وہ وائل کی حدیث ہے۔ وائل کی حدیث میں جو محفوظ الروایت ہے وہ حدیث ہے جس میں مد بہا صوتہ آیا جیسا کہ ترمذی نے تخریج کیا اور اُس کو سید حفاظ بخاری سے نقل کیا لیکن رفع اور جہر الفاظ جو دوسری روایتوں میں آئے ہیں وہ روایت بالمعنی ہیں اور راوی نے جیسا سمجھا ویسا اُس کو اپنے لفظوں میں تفسیر کر دیا تو یہ راوی کی تفسیر ہے نہ حدیث کے لفظ۔ علامہ قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں اس کی تصریح فرمائی۔ میرک نے کہا کہ مد بہا صوتہ کے الفاظ تو ترمذی و احمد و ابن ابی شیبہ نے روایت کیے اور رفع بہا صوتہ کو ابو داؤد نے نقل کیا اور گو یا کہ نقل بالمعنی ہیں تو خلاصہ یہ نکلا کہ راوی نے مد بہا صوتہ کے معنی آواز بلند کرنا سمجھ کر کبھی اُس کو رفع کے لفظ سے اور کبھی جہر کے لفظ سے روایت کیا۔ یہ فہم راوی ہے اور فہم راوی حجت نہیں ہوتی پھر یہ مد بہا صوتہ والی روایت بھی معلول ہے جیسا کہ ابن ہمام نے اس کی طرف اشارہ کیا اور اس کی تائید اس سے اور زیادہ ہوتی ہے کہ بخاری نے اپنی صحیح میں اس روایت کی تخریج نہیں کی باوجودیکہ اُن کو ایسے موقع پر تتبع کا خاص لحاظ ہوتا ہے اگر اُن کی نظر میں یہ حدیث حجت کے قابل ہوتی تو وہ اس کو ہرگز نہ چھوڑتے اس سے قطع نظر اگر ہم اس حدیث کو علت سے سالم بھی فرض کر لیں تو بھی یہ جہر کے لیے حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی دلالت اس معنی پر قطعی نہیں جیسا مد بہا صوتہ میں بلند آواز سے پڑھنے کا احتمال ہے ویسا ہی اُس میں ہمزہ کو کھینچنے اور ذرا دراز کر کے پڑھنے کے معنی کا بھی احتمال ہے بلکہ یہی احتمال ظاہر اور متواتر و مشہور ہے۔ اسی لیے کثیر شراح و محدثین جہر کے ساتھ اس کی تفسیر نہیں کرتے بلکہ اطالت درازی کے ساتھ جیسا کہ ابن سید الناس نے شرح ترمذی میں کہا کہ مُراد ان سے اطالت یعنی درازی ہے (آمین کے الف کو کھینچ کر پڑھنا ہے) یہ خفض یعنی آہستہ پڑھنے کے منافی نہیں اور محدث قاری نے فرمایا کہ مد بہا صوتہ کے یہ معنی ہیں کہ کلمہ کو کھینچ پڑھا۔ ایسی حالت میں مد بہا کے الفاظ سے مدعیان جہر کو کیا قوت پہنچتی ہے۔ رہیں باقی احادیث اُن کی اسناد میں کلام ہونے کے علاوہ بنظر امعان دیکھا جائے تو اُن سے بھی جہر کا مطلب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اُس میں سے ایک یہ ہے کہ مسجد گونج گئی۔ حافظ عینی نے کہا کہ حدیث ابو ہریرہ کی اسناد میں بشر بن رافع حارثی ہیں اُن کی بخاری و ترمذی و نسائی و نصر و ابن معین نے تضعیف کی ہے اور ابن قطان نے اپنی کتاب میں کہا کہ بشر بن رافع ابو الاسباط حارثی ضعیف ہے اور وہ اِس حدیث کو ابو عبد اللہ ابن عم ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں اور ابو عبد اللہ کا حال بھی معلوم نہیں اور اُن سے بشر کے سوا کسی نے روایت ہی نہیں کی اس وجہ سے حدیث صحیح نہیں تو حاکم کا شرط شیخین پر بتانا اور دار قطنی کا شیخین کہنا تو ساقط ہو گیا اس کے سوا دوسری نسبت یہ بھی تو ہے کہ مسجد نبوی عریش مسقف بالخصوص تھی اُس کا گونجنا عقل ہی میں نہیں آتا بلند بنائیں اور رفیع محل گونجا کرتے ہیں نہ کہ عریش اب صرف دو حدیثیں رہ جاتی ہیں جنمیں یہ ذکر ہے کہ میں نے حضور سے آمین سُنی یا صف اوّل والوں نے سنی ان کی اسناد میں بھی کلام ہے ممکن ہے کہ الفاقیہ بھی یہ کلمہ اسطرح ادا ہوا ہو کہ لوگوں نے سُن لیا ہو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض سورتوں کو بعض صحابہ نے ظہر و عصر کی نماز میں سنا۔ اس سے ظہر یا عصر کی نماز میں جہر کرنا تو کسی ناظف کے نزدیک بھی ثابت نہ ہوگا۔

ستیارتھ پرکاش کے قرآنِ پاک پر اعتراض اور انکے جواب

جسطرح دنیا میں ہر صاحبِ کمال کے لیے معاند و حُسّاد لازم ہیں، اور ہر یکتائے دوراں کو رشک و حسد کے سنان و سہام کا ہدف بننا ناگزیر ہے، اور جسطرح حاسدوں کے حسد اور معاندوں کی عداوت سے اہلِ کمال کی شہرت و رواج اور اُن کے کمال کا اظہار و اعلان اور زیادہ ہو جایا کرتا ہے، اسی طرح مقدس اسلام کو حاسدوں اور معاندوں سے واسطہ پڑا، اور پڑتا رہتا ہے، اور جسقدر اس کے ساتھ حسد اور عداوت کی رسمیں برتی گئیں، اور اس کو مٹانے اور نیست و نابود کرنے کے لیے اہلِ باطل کی ساری قوتیں تُل تُل کر آئیں، اور اُنہوں نے اپنی زور آزمائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، اُسی قدر اسلام کے کمالات اپنی شان و شوکت دوبالا کرتے گئے۔ دورِ حاضر میں جہاں صدہا مشینیں اور کلیں، اور طرح طرح کی عجیب و غریب چیزیں ایجاد ہو رہی ہیں، مذہب سازی کی صنعت بھی اپنے اوجِ کمال پر پہنچ گئی ہے، اور آئے دن نئے نئے مذہب ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ اُنہیں میں ایک "دیانندی" مذہب بھی ہے جو اپنے آپ کو آریہ کہلاتا ہے، جو تھوڑے زمانہ سے پیدا ہوا ہے۔ اس نے مذہبی دنیا میں عجب الچل مچا رکھی ہے، اور اپنے دل آزار طرزِ عمل سے دنیا کو جگر خراش صدمے پہنچائے ہیں۔ سخت کلامی اور بدزبانی تو گویا اُنہوں نے جزوِ مذہب قرار دے لی ہے کہ اُن کے مذہب کی مستند کتاب پنڈت دیانند کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" دریدہ دہنی اور بدزبانی، بلکہ سب و شتم کا ذخیرہ ہے۔ اس کتاب کا چودھواں باب قرآنِ پاک پر اعتراض کرنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے، اور اس میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک سُورت کی علیحدہ علیحدہ سُرخی قایم کر کے دل کے پھپولے پھوڑے ہیں، اور مسلمانوں کے دلوں کو صدمے پہنچائے ہیں۔ ان اعتراضات کی جو حقیقت ہے، اور پنڈت کے علم و لیاقت کا جو مبلغ ہے، وہ ان کے اعتراضات سے آپ کو معلوم ہوگا، اور اُسی سے اُس کی شرافت کا پتہ چل سکے گا۔ میں اُس کی عبارت بجنسہٖ نقل کر کے جواب لکھتا ہوں واللہ الموفق والمعین۔

اعتراض بر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! شروع ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے" (منزل اول سپارہ اول سورہ فاتحہ آیت اول)۔ (**محقق**) مسلمان لوگ ایسا کہتے ہیں کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے، لیکن اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی دوسرا ہے۔ کیونکہ اگر خدا کا بنایا ہوتا تو "شروع ساتھ نام اللہ کے" ایسا نہ کہتا، بلکہ "شروع واسطے ہدایت انسانوں کے" ایسا کہتا۔ (ستیارتھ پرکاش صفحہ ۵۹۱ باب ۱۴)

جواب۔ کسی چیز پر اعتراض کرنے کے لئے پہلے اُس کی واقفیت حاصل کرنا چاہیئے، لیکن معترض قرآنِ پاک سے محض نابلد ہے۔ حتّیٰ کہ اُس کو یہ بھی خبر نہیں کہ قرآنِ پاک خود اپنی نسبت کلام الٰہی ہونے کی شہادتیں دے رہا ہے اور ایسی زبردست براہین پیش فرما رہا ہے جن کے جواب سے زمانہ ہمیشہ سے عاجز ہے اور ہمیشہ عاجز رہے گا۔ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

یہ و۔ تحدی تھی، وہ معارضہ تھا، جس کی ہیبت نے ہاتھوں سے قلم چھڑا دیے، بولنے والی زبانیں ساکت، بلکہ گنگ ہوگئیں، قلم کی جگہ تلوار ہاتھ میں لینا پڑی، ا ایک آیت کا نظیر پیش کرنے کی بجائے دشمنانِ اسلام خونوں کی ندیاں بہانے کے لیے تیار ہوگئے، بلغاءِ عرب کی ہمتیں پست ہوگئیں، اور انہوں عملی طور پر اپنے عجز کا اعتراف کرلیا قرآنِ پاک نے کچھ ایک ہی جگہ نہیں جا بجا اپنے کلام الٰہی ہونے کا اعلان کیا ہے، لیکن پنڈت جی ابھی تک بے خبر ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمان لوگ ایسا کہتے ہیں، اور اس پر غرور یہ کہ اپنے آپ کو محقق لکھتے ہیں۔ اپنے منہ سے اپنی غلط تعریف کیا کسی ذی علم کام ہو سکتا ہے میں نہیں سمجھتا کہ پنڈت جی نے کون سے ایسے تحقیق کے دریا بہائے ہیں جن سے وہ "محقق" کے خطاب کے مستحق ہو سکیں، اور یہ خو ساختہ خطاب اُن کے لیے موزوں ہو سکے جس بات کا قرآنِ پاک بصراحت مدعی، اور دھوم دنیا میں مچگئی، پنڈت صاحب کو اسکی تو خبر نہیں مگر ہیں محقق عجب تحقیق ہے۔ اس کے بعد پنڈت جی نے لکھا ہے کہ "اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کا بنانیوالا کوئی دوسرا ہے" یہ ہے آپ کے محقق ہونے کی حقیقت اور قابلیت کا نمونہ جس کی سخن فہمی اس درجہ پہنچ گئی ہو وہ ضرور "محقق" کے خطاب کے شایاں ہے، آیت میں کونسا لفظ ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا کونسا حرف ہے جس کا مدلول یا مفہوم یہ ہو کہ اس کتاب کا بنانے والا خدا وندِ عالم کے سوا کوئی دوسرا ہے؟ خود پنڈت جی نے جو ترجمہ کیا ہے، اُسکے کون سے لفظ میں اشارہ ہے کہ قر کلام الٰہی نہیں؟ جو شخص کلام کے معنی سمجھنے سے اسقدر قاصر ہو اُس کا اعتراض کس وقعت کے قابل ہے۔ اللہ کے نام کے ساتھ شروع ہونا کلامِ الٰہی ہونے کا ک طرح منافی ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی دیانتدی اس کے ثابت کرنے کی ہمت رکھتا ہے؟ اگر ناممکن کسی طرح ممکن ہو، تو کوئی آریہ بھی اسکا جواب دے سکے گا، کیا بس اللہ الرحمٰن الرحیم میں اللہ کا نام آنا اس بات کی دلیل ہو سکتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں؟ ہر شخص اپنے رسالہ یا کتاب میں، اپنے خط و تحریر میں اول یا آخر اپنا نا لکھ دیتا ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ کتاب یا خط اُس شخص کا لکھا ہوا نہیں ہے؟ اگر نام مذکور ہونے سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے، تو بجز اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ اس کا دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔ خود پنڈت نے اپنی اسی ستیارتھ میں اپنا نام لکھا ہے، تو کیا اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ کتاب اُس کی تصنیف نہیں؟ جو کتاب قلوب پر عظمتِ الٰہی کے سکے بٹھانے اور جمانے کے لئے آئے کیسے ممکن ہے کہ اُس کا آغاز اللہ کے نام سے نہ ہو؟ ہر ایک مضمو کی سُرخی، اور ہر ایک بحث کے عنوان میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جن سے مضمون کی جھلک معلوم ہو، اور مدعا کا نشان ملے، تو جس کتاب کا مقصد ذات و صفاتِ حق سے باخبر کرنا ہو، اُس کی ابتدا نامِ خدا سے نہ ہونا جائے تعجب ہے، نہ کہ خدا کے نام سے شروع کرنے پر اعتراض کیا جائے۔ ہر شخص جو خدا وندِ عالم کے کارسازِ حقیقی ہونے پر یقین رکھتا ہے، اور اُس کو قادرِ مطلق سمجھتا ہے، اپنے ہر کام میں اُسی کی کارسازی اور قدرت کاملہ پر نظر رکھ اور اُسی کے نام سے شروع کرنا اس کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنے ہر کام میں اپنا عجز اور اُس کی آثارِ قدرت کا مشاہدہ کر سکے، اور کسی وقت اُس سے غافل نہ ہو، یہ قرآن پاک کا سب سے پہلا سبق ہے، جس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے کام میں رہ کر بھی اپنے رب کو فراموش نہ کرے، اور اُس کی عقیدت و نیاز کے روابط منقطع نہ ہونے پائ پنڈت جی کی نظر "وید" کی طرف گئی، اُنہوں نے جب یہ خیال کیا ہوگا کہ وید کے کلامِ الٰہی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، مگر اسکی اس کمی کا کوئی جواب نہیں کہ اُس آغاز ہی خدا کے نام سے نہیں ہے اس سخت اعتراض اور شدید الزام سے بچنے کی یہی صورت پنڈت جی کے خیال میں آئی کہ قرآن پاک کے حسن و کمال ہی عیب قرار دے دیجئے ؎

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیبیست ۔ گل ست سعدی و در چشمِ دشمناں خارست

کسی خوبی کو عیب قرار دینا، اور کمال کو موردِ الزام بنانا کسی شائستہ اور نیک مزاج آدمی کا فعل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وید کا خدا کے نام سے شرو ہونا تو درکنار، تمام وید میں کہیں کسی جگہ خدا کا نام (اسم ذات) تک نہیں[1] ہے۔ ایسی حالت میں کسی کتاب کا اللہ تعالےٰ کے نام کے ساتھ شروع ہونا ویدوں کی تعلیم عادی شخص کے لیے ضرور تعجب خیز اور حیرت انگیز ہونا چاہیئے۔ جس شخص نے عمر بھر میں کبھی خدا کا نام (اسم ذات) ہی نہیں سنا، وہ اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سنکر چمک تو کچھ بعید نہیں، لیکن جو قلوب خداشناسی کا ذوق رکھتے ہیں، اُن کے جذباتِ صادقہ کا یہی مقتضا ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے ہر کام کو نامِ خدا سے شروع کریں۔ شا فرمان میں مضمون سے قبل بادشاہ کے نام کا طغراء ہوتا ہے، تو جو کتاب، فرمانِ الٰہی ہو، اُس میں سب سے پہلے نامِ خدا ہونا چاہیے۔ پنڈت صاحب کی اُلٹی منطق یہ کہتی ہے کہ اول میں بادشاہ کا نام ہونے سے وہ فرمان شاہی فرمان ہی نہیں رہ سکتا۔ خدا کا نام ابتداء میں ہونے سے قرآن شریف کے کلامِ الٰہی ہونے میں کو تردد ہوگیا، یہ عقل و حواس ہیں جس پر "محقق" ہونے کا دعویٰ ہے۔ تعجب تو اُن عقلمندوں پر ہے، جو ایسے لچر اعتراضات پر ناز کرتے ہیں، اور معترض کے غلا بنے بیٹھے ہیں۔ برادرانِ نوع! آپ اپنے عقل و انصاف سے کام لیجئے، اور عدل کی میزان میں پنڈت کے اقوال کو تولیے، جب آپ دیکھ لیں کہ ان میں واقعیت کا شائبہ بھی نہیں ہے، تو اپنی کار آمد ہستی کھوٹے داموں فروخت نہ کیجئے۔ کسی کتاب کی عالمگیر عظمت و جلالت اور شہرۂ آفاق کمالات پر دہ ڈالنے کی غرض سے لغو اعتراضات کرنا، اُس کی خوبیوں کو عیب بتانا، روزِ روشن کو شبِ تاریک کہنا، اور جوشِ تعصب کو اس مذموم طریقہ سے ادا کرنا، درحقی دنیا کے سامنے اپنے قلب کی سیاہی نمودار کرنا ہے۔ اہلِ خرد کی نگاہ میں ایسے معترض کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ افسوس پنڈت صاحب نے قرآن پاک کے کمال کو محض تعصب کے جوش میں عیب قرار دیا، اگر نفسانیت کی پٹی اُن کی آنکھوں پر نہ بندھی ہوتی تو وہ قرآن پاک کی نعمتوں سے بہرہ مند، مسلمان اور اس کی روحانی اور الٰہی تعلیم سے فائدہ اُٹھاتے۔ اور جس قدر شہرت و رواج پنڈت جی کو حاصل ہوا، وہ بھی اُنہیں چند باتوں کا نتیجہ ہے، جو وہ قرآنی اور اس سے لے اُڑے تھے۔

[1] تنہا وید ہی میں نہیں، بلکہ سنسکرت زبان ہی خدا کے نام سے محروم ہے۔ پنڈت دیانند سرسوتی "ستیارتھ پرکاش" میں لکھتے ہیں: "سب وید وغیرہ شاستروں میں پرمیشور کا افضل اور ذاتی نام کہا گیا ہے اور سب نام صفاتی ہیں" (ستیارتھ پرکاش، باب [illegible]) اس سے معلوم ہوا کہ اوم کے سوا کوئی نام پرمیشور کا ذاتی (اسم ذات) نہیں رہا۔ اوم "وہ بھی صفاتی ہے، اسم ذات وہ بھی نہیں۔ ستیارتھ صفحہ میں پنڈت صاحب نے تصریح فرمائی ہے کہ "پرمیشور کا کوئی بھی نام بے معنی نہیں ہے (ستیارتھ [illegible]) اور اسی صفحہ میں ہے۔ "حفاظت کرنے کے باعث" اوم "بمعنی" حافظ "ہے تو اب ثابت ہوگیا کہ "اوم" صفت ہے، اسم ذات کوئی نہیں، یہ کسقدر کمی ہے کہ تمام وید میں تمام زبان میں آج تک خدا کیلیے کوئی نام نہیں اُس کا ذکر اگر کہیں آگیا ہے، تو استعاروں اور صفتوں سے بیان کیا گیا ہے۔ اُسکی ذات کیلیے ایک لفظ خرچ نہیں کیا گیا، کسقدر تنگ اور بخیل زبان ہے جس میں خدا کی ذات کے لیے ایک لفظ بھی نہیں۔ کیا یہی زبان الہام کی زبان، اور ایسی ہی کتاب خدا کی کتاب ہو سکتی ہے؟ جس میں خدا کا نام تک نہ ہو؟ جن میں کسی چیز کا رواج نہیں ہوتا، وہاں کی زبانوں میں اُس چیز کے لیے کوئی نام بھی نہیں ہوتا پھر ضرورت کے وقت استعارہ اور مجاز سے کام لیا جاتا ہے، یا صفات سے تعبیر کیا کرتے ہیں، جیسے اطباء مرکبات کو ان صفات کے ساتھ پکارتے ہیں، ہاضم، مقوی، مسہل، مصفیٔ خون وغیرہ۔ اگر ان مرکبات کے ذاتی نام ہوتے تو صفات کا ذکر اُن کے مواقع پر کیا جاتا، مگر نام لینے سے مجبوری نہ ہوتی۔ سنسکرت زبان میں زمین آسمان گائے بیل وغیرہ تمام کار آمد چیزوں کیلیے نام مدلول اُن اشیاء کی ذات ہے، مگر خدا کی ذاتِ پاک کیلیے کوئی نام نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان والوں کو خدا کی ہستی و وجود کی کچھ خبر نہ تھی، اور غافلانہ زندگی بسر کرتے تھے حتیٰ کہ اُن کی زبان میں اللہ کی ذاتِ پاک کے کوئی لفظ بھی وضع نہ ہوا تھا جب دوسری قوموں سے اختلاط ہوا۔ اور خدا کی ہستی کا کچھ پتہ چلا، تو اس کو صفات کے ساتھ تعبیر کرنے پر مجبور ہوئے۔ جو لوگ اسقدر پستی میں ہوں کہ اُن اور زبان میں خدا کا نام تک نہ ہو، وہ اگر قرآن پاک میں اول ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم دیکھ کر بھڑک اُٹھیں تو کیا بعید ہے ۱۲ منہ

اعتراض اگر انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ تم بھی ایسا کہو تو بھی درست نہیں، کیونکہ اس سے گناہ کا شروع بھی خدا کے نام سے
ہونا صادق آئے گا، اور اُس کا نام بھی بدنام ہو جائے گا۔

جواب پنڈت صاحب کو خیال آیا، یا کسی مسلمان کی زبان سے انہوں نے سُنا ہو کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" بندوں کو تعلیم ہے کہ تلاوتِ قرآ
پاک کی ابتداء اس طرح نام خدا کے ساتھ کیا کریں، کیونکہ سب سے اول جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ
اس کا پہلا لفظ قرأت کا امر ہے، یعنی پڑھیے، تو اس کے بعد جو کچھ بھی ہے وہ تعلیم ہے جس طرح کچہری میں حلف دینے والا کہتا ہے "کہو میں سچ کہوں گ
اس سے کوئی نادان بھی یہ نہیں سمجھتا کہ حلف دینے والا یہ حلف کر رہا ہے، بلکہ اُس کا کام فقط سکھانا ہے، قرآنِ پاک میں پہلا لفظ جو نازل ہوا وہ اِقْرَ
ہے، جس کے معنی تھے "پڑھیے" تو اب آئندہ جو کچھ ہے وہ تعلیماً ہے۔ پنڈت جی نے جب دیکھا کہ اب کوئی جائے اعتراض نہیں، تو اپنے دل کا غبار
اس طرح نکالا کہ "اگر انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ تم ایسا کہو، تو بھی درست نہیں، کیونکہ اس سے گناہ کا شروع بھی خدا کے نام سے صادق آئے گا"، پنڈ
کا یہ باطل دعویٰ کہ گناہ کا شروع بھی خدا کے نام سے صادق آئے گا۔ کسی دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا بطلان بدیہی ہے۔ کتاب ہدایت کا شروع نام
خدا سے کیا جاتا ہے، اس میں گناہ کا کیا ذکر، مگر پنڈت کو تو کسی نہ کسی طرح اعتراض کرنا اور الزام لگانا تھا، اس لیے ایسی بے اصل اور غلط بات کہی مسلمانو
کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ناجائز کام پر بسم اللہ پڑھنا ممنوع ہے، اسی کو مسلمانوں کے سر منڈھنا، ایک جھوٹ بات لکھ کر دنیا کو غلطی میں ڈالنے کی کوشش کرنا نہایت شرمناک حر
ہے۔ پنڈت جی کو واضح رہنا چاہیئے کہ قرآن پاک گناہ کو منع کرتا ہے، اور بندوں کو گناہ سے بچانا چاہتا ہے، تو ضرور ہے کہ جس کام کے شروع کی وہ اجازت دیگا، وہ ہرگ
گناہ نہ ہوگا، پھر نام خدا سے گناہ کا شروع کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جو کتاب گناہ مٹانے آئی ہے اُس کی یہ تعلیم کہ آغاز نام خدا سے ہو، صاف بتاتی ہے کہ اُمور خیر کا آغا
ہو۔ پنڈت جی کی نظر میں وہ کتابیں ہونگی جن میں گناہوں کی تعلیم ہو، ممکن ہے اُنہیں پر قیاس کر کے پنڈت صاحب نے یہ اعتراض جمایا ہو، لیکن قرآن پاک کی نسبت
یہ اعتراض سراپا لغو اور باطل ہے قرآن پاک کی حکمتوں سے تو پنڈت جی کو کیا مس ہے، اور ان کا دماغ وہاں تک کب پہنچتا ہے؟ لیکن اہل عقل سمجھ سکتے ہیں ک
بندوں کو ہر کام میں بسم اللہ کے ساتھ آغاز کرنے کی عادت ڈالنا گناہوں کے دروازہ کا بند کر دینا ہے، اسلیے کہ جب بندہ کسی کام کو شروع کرتے وقت
اپنے پروردگار کا نام لیگا، اور اُس کے عظمت وجلال کا پرتو اُسکے قلب میں پڑے گا۔ تو خوفِ الٰہی اُس پر غالب ہوگا، اور وہ گناہ کی جرأت نہ کرے گا۔ ایک نک
میں گناہوں کا انسداد فرما دیا۔ کتاب برحق کی اس نفیس تعلیم پر قربان ہونا چاہیئے کہ کتنے بڑے سیلاب کو، روکنے کے لیے کیسی آسان تدبیر تعلیم فرمائی، لیکن جو دا
گناہوں میں محو ہیں، وہ عظمت وجلالِ خداوندی کو بھول کر گناہ کرنے کے درپے ہو جاتا ہے۔ پنڈت صاحب نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لفظ لفظ پر اعتراض کر
کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ الرحمٰن الرحیم پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔

اعتراض اگر وہ بخشش ورحم کرنے والا ہے، تو اُس نے اپنی مخلوق میں انسانوں کے آرام کے واسطے دوسرے جانداروں کو مار، سخت ایذا دیکر، اور ذبح
کرا کر گوشت کھانے کی اجازت کیوں دی؟ کیا وے ذی رُوح بیگناہ اور خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں؟

جواب ایسے اعتراض پنڈت صاحب کی علم ولیاقت کا نمونہ ہیں، اس اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اپنے بنائے ہوئے اور ذی رُوح کو ذبح کرا
اور ایذاء دینے کی اجازت دینا رحم کے خلاف ہے۔ یہ اعتراض اس فاہمیت سے کیا گیا ہے کہ اس کی زد خود پنڈت جی پر پڑتی ہے، کیونک
اگر ایذاء دینے کی اجازت دینا رحم کے خلاف ہے، تو جانوروں سے خدمتیں لینا، اور ان کی آزادی کو اپنی آسائش کے لیے برباد کرنا، ہل جتوانا، بوجھ لاد
سواری لینا، سردی اور بارش کے وقتوں میں دق کرنا منزلوں لیے پھرنا۔ تھک جائیں تو مار مار کر لہولہان کرنا، اُن کے بچوں کا حق دودھ اُن سے چھین لینا، اُ
آنکھوں کے سامنے اُن کے بچوں کی گردنوں میں رسیاں ڈال کر اُن سے علیحدہ کرنا، اُن کی قدرتی غذا چھیننے کے لیے اُنہیں ترسانا، اِدھر بچہ چلاتا ہ
اُدھر ماں بے قرار ہوتی ہے، یہ سب کچھ دیکھنا اور ذرا پروانہ کرنا، ان سب باتوں کی اجازت اگر آپ کے پرمیشور نے دی ہے! تو بقول آپ کے وہ رح
والا نہیں، اگر نہیں دی ہے! تو آپ کے یہ سب افعال ناجائز ہیں۔ دُودھ، دہی، گھی سب آپ کے قاعدہ پر حرام، سواری، زراعت، باربرداری میں اُ
سے کام لینا سب ناجائز، لیکن کیا پنڈت جی نے یا ان کے کسی اور ہم خیال نے، کسی رشی منی نے کبھی ان ناجائز مظالم کے ترک کا عملی ثبوت دیا ہے! او
ان کو دنیا سے میست ونابود کرنے کی کوشش کی ہے؟ لیکن عمل پنڈت صاحب کی تکذیب کرتا ہے۔ آپ کا گھی، دُودھ استعمال کرنا، جانوروں س
سواری، باربرداری کی خدمتیں لینا ثابت کرتا ہے کہ آپ اپنے ایشور کو رحم والا نہیں مانتے۔

پرندوں میں شِکرہ، باز، شاہین وغیرہ کچھ تو ایسے ہیں کہ اُن کے پاس آلاتِ شکار موجود ہیں، اور کچھ کبوتر کی طرح ایسے بے بس اور کمزو
ہیں کہ وہ اپنی حفاظت کا بھی کوئی سامان اپنے پاس نہیں رکھتے۔ اور اسی طرح چوپایوں میں شیر کے پاس تو شکار کرنے کے آلات ہیں لیکن دوسرے
جانوروں کے پاس اپنی حفاظت کے لیے بھی کوئی چیز نہیں۔ یہ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں یا کسی اور کے؟ گوشت خور جانوروں کی غذا اُس
نے مقرر کی یا کسی دوسرے نے؟ آلاتِ صید اُس نے عنایت فرمائے یا کسی اور نے؟ قتل وشکار پر اُن کی غذا اور زندگی کا مدار اُس نے مقرر فرمایا یا
نہیں؟ — اب پنڈت صاحب بتائیں کہ یہ رحم کے خلاف ہے۔ اور اُن کا ایشور رحم کا دشمن ہے، یا اس کو رحم کے خلاف کہنا
ہی نادانی اور بے ادبی ہے اس اعتراض کے ضمن میں پنڈت جی کے قلم سے ایک لفظ "بے گناہ" کا بھی نکل گیا ہے، جو پنڈت صاحب شوقِ اعتراض
میں لکھ گئے ہیں، لیکن اُنہیں خبر نہیں کہ اس لفظ نے اُن کے مذہب کا ہی خاتمہ کر دیا۔ اصولِ تناسخ کی بنیاد پر تو کوئی جانور بے گناہ ہو ہی نہیں سکتا جانو
کی جُون ہی اُس کو کسی نہ کسی گناہ کی پاداش میں ملتی ہے۔ علاوہ بریں بے گناہ کو ایذاء پہونچنا، یہ بھی اصولِ تناسخ کے خلاف ہے، جو کوئی تکلیف کسی کو پہنچتی ہ
بقاعدۂ تناسخ ضرور کسی خطا، قصور کا بدلہ ہوتی ہے —— اب تو پنڈت جی کو اعتراض نہ کرنا چاہیئے، جو کوئی جانور ذبح ہوتا ہے وہ ضرور کسی نہ کسی گنا
کی پاداش میں ذبح ہوتا ہے، اور اُس کے لیے ذبح ہونا بقاعدۂ تناسخ ضروری ہے۔ البتہ اگر دنیا کی قومیں گوشت خوری چھوڑ دیں، اور ذبح کا دستور
جہان سے ناپید ہو جائے، تو پھر پنڈت جی کا ایشور اس طریقہ کی سزا کسی کو نہ دے سکے گا، جو بقاعدۂ تناسخ اُس پر لازمی اور ضروری تھی۔ ایشور کی وہ
مجبوری قابلِ رحم ہوگی، ہندوستان کے مسلمان اِس وقت گائے کا ذبیحہ ترک کرنے کی فکر میں ہیں آریوں کو بہت جلد اعلان کر دینا چاہیئے کہ مسلمان
ایسا ہرگز نہ کریں، ورنہ ایشور کو ناگفتہ بہ مصیبت کا سامنا ہوگا، اور اُس کا قانونِ سزا نکما ہو کر رہ جائے گا، جرائم پیشہ جیو کی چڑھ بنے گی، اور وید کے ایشو
کو بمجبوری معطل ہو جانا پڑیگا۔ پنڈت جی نے یہ جو لکھا ہے کہ "کیا وے خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں؟" اس سے پنڈت جی کا یہ مدعا ہے کہ اپنے بنائے
ہوئے کے ساتھ ضرور بنانیوالے کو ایسا محبت کا تعلق ہو جاتا ہے کہ وہ اُس کا ذبح ہونا گوارا نہیں کرتا، اس لیے اگر وہ ذبح کی اجازت دے، تو یہ رحم کے خلاف

میں دریافت کرتا ہوں کہ اپنے بنائے ہوئے کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے، وہ اس بات کو تو گوارا نہیں کرتی کہ اُس کے ذبح کی اجازت دیجائے، لیکن یہ گوارا کر لیتی ہے کہ اپنے آپ اُس کو فنا کر دیا جائے، جس کے لئے یہ بھی گوارا نہیں کہ دوسرا ایذا دے، اُس کی جان لینے کے لیے خود آمادہ ہو جانا تو اعلیٰ درجہ کی بے رحمی اور پرلے سرے کا ظلمِ عظیم ہوگا، تو کیا پنڈت جی کے نزدیک موت خدا کے اختیار سے باہر کوئی چیز ہے کہ بغیر اُسکے قصد و ارادے کے واقع ہو جاتی ہے؟ یا کوئی دوسرا فنا کر دیتا ہے؟ اور ایشور اپنی بنائی ہوئی مخلوق کی موت کے صدمے اُٹھایا کرتا ہے۔ ایسا مجبور اگر ہے؟ تو اُس کو پرمیشور کہنا، اور کارسازِ عالم، اور سروسکتیمان و قادرِ مطلق اعتقاد کرنا بالکل باطل و غلط ہے۔ یہ وہ اشکال ہے جس کا پنڈت صاحب کے پاس جواب نہیں۔ اعتراض کے شوق میں ایسی ایسی لغو و باطل باتیں کہنا پنڈت صاحب کی قابلیت کا نتیجہ ہے، اور اس پر آپ کو محقق ہونے کا دعویٰ بھی ہے۔ تعصب کا جوش جو پنڈت صاحب کے سینہ میں بھرا ہوا تھا اُس نے مجبور کیا کہ پنڈت صاحب قرآن شریف پر اعتراض کرنے کے لیے باطل و غلط اور لغو و رکیک باتیں لکھکر شیخی مارنے پر تل گئے، اور قرآنِ پاک کی روشن تعلیم سے فائدہ نہ اُٹھا سکے چشم بینا اور نظرِ انصاف ہو تو انسان قرآنِ پاک دیکھنے کے بعد اُس کا گرویدہ ہو جاتا ہے، اور اپنی درستی و اصلاح کے علاج اُس میں تلاش کر کے سعادتِ دارین کے منازل تک پہنچتا ہے، لیکن نظرِ عداوت خوبیوں کے دیکھنے سے مجبور ہے اُس کو ہر کمال عیب ہی معلوم ہوتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ الْبَاطِلَ بَاطِلًا۔

اعتراضات متعلق سورۂ فاتحہ

اعتراض:۔ اگر قرآن کا خدا دنیا کا پروردگار ہوتا، اور سب پر بخشش اور رحم کیا کرتا، تو دوسرے مذہب والوں اور حیوانات وغیرہ کو بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل کرانے کا حکم نہ دیتا، اگر معاف کرنے والا ہے، تو کیا گناہ گاروں پر بھی رحم کرے گا؟ اور اگر کریگا تو آگے ذکر آئیگا کہ کافروں کو قتل کرنا یعنی جو قرآن اور پیغمبر کو نہ مانیں وہ کافر ہیں، ایسا کیوں کہتا؟ اسیلیے قرآن خدا کا کلام ثابت نہیں ہوتا۔

جواب: ایسے رکیک اور لایعنی اعتراض پیش کرتے ہوئے پنڈت صاحب کو عار نہیں آتی جس سے اُن کی نہایت نافہمی اور انتہا درجہ کی نادانی کا پتہ چلتا ہے انہیں یہ بھی خبر نہیں کہ ماں باپ کا رحم دنیا میں کون نہیں جانتا، لیکن اولاد کی خطاؤں پر والدین کا سزا دینا کیا کسی نے بے رحمی سمجھا ہے؟۔ پنڈت صاحب کی فہم اتنا سمجھنے سے بھی قاصر ہے، اُن کے خیال میں گناہ گار کو سزا دینا تقاضائے رحم کیخلاف ہے اور اس سے مدت العمر کے احسانات جو ایک آن میں بیحد و پایاں شاملِ حال رہے ہیں، سب جاتے رہتے ہیں کہ قصور کی سزا دینے سے وہ رحیم نہیں رہتا۔ کیا پنڈت صاحب کے نزدیک سزا دینے والے والدین، اور مارنے والا اُستاد بچوں کا دشمن اور بے رحم ہوتا ہے؟ یہ عقل اور قرآنِ پاک پر اعتراض؟ مگر دروغ گورا حافظہ نباشد، پنڈت صاحب کو خود اپنی تحریر یاد نہیں ہے، ستیارتھ پرکاش صفحہ ۲۵۳ میں لکھتے ہیں:۔ "یہ کام اراکینِ سلطنت کا ہے کہ جو جانور یا آدمی ایذا رساں ہوں اُن کو سزا دیں، اور جان سے بھی مار ڈالیں"۔ یہ رحم کی تعلیم ہو رہی ہے یا بے رحمی کی؟ یہی پنڈت دیانند صاحب ستیارتھ صفحہ ۲۲۰ پر لکھتے ہیں:۔ "اعضائے تناسل، پیٹ، زبان، ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، کان، دولت و جان یہ دس موقع سزا کے ہیں کہ جن پر سزا دیجاتی ہے"۔ صفحہ ۲۲۲ پر لکھتے ہیں:۔ "چور جس طریق پر جس جس عضو سے انسانوں میں نامناسب (حرکات) کام کرتا ہے، اُس عضو کو سب کی عبرت کے لیے راجہ کاٹ دلوے"۔ ——— کہیے یہ رحم کی تعلیم ہے یا بے رحمی کی؟ صفحہ ۲۲۳ پر لکھتے ہیں:۔ "خواہ گرو ہو خواہ بیٹا وغیرہ اولاد ہوں، خواہ باپ وغیرہ بزرگ ہوں، خواہ برہمن، خواہ شاستر وغیرہ کا سننے والا کیوں نہ ہو جو دھرم کو چھوڑ کر ادھرم میں پھنسا ہوا دوسرے کو بلا جرم مارنے والے ہیں، اُن کو بغیر تامل کے مار ڈالنا چاہیئے۔ یعنی پہلے مار کر بعد میں سوچ کرنی چاہیئے"۔ ——— کیا عجیب فلسفہ ہے، سزا کا حکم تو پہلے دیدیا جائے، مگر مقدمہ کی تحقیقات، شہادتوں کی سماعت، اور واقعات میں غور و فکر بعد کو کیا کریں، پنڈت جی کی یہ دماغی قابلیت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ سُنا ہے کہ کسی افیونی کا لوٹا ٹوٹ گیا تھا، تو اس خیال سے کہ پانی نہ نکل جائے، وہ حاجتِ انسانی سے الفراغ کے قبل ہی آبدست لے لیا کرتا تھا۔

پنڈت جی کے فلسفہ کی رُو سے اُن کا اصول بالکل ٹھیک تھا، جہاں تجویزِ سزا کے بعد واقعات پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تعجب تو اُن عقل کے پتلوں پر ہے، جو باوصف اس دُکار و فہم کے پنڈت صاحب کے گرویدہ بنے ہوئے ہیں۔ خیر مجھے تو یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ پنڈت جی جرم کی سزا کو رحم کے خلاف بتاتے تھے، اُنہوں نے سزا قبل فیصلہ تک کا حکم دیدیا، اور کیسی کیسی سخت اور مہذب سزائیں تجویز کیں، صفحہ ۲۲۴ میں لکھتے ہیں:۔ "جو عورت اپنے حسب و نسب کے گھمنڈ سے شوہر کو چھوڑ زنا کرے اس کو بہت جی بہت عورتوں اور مردوں کے سامنے کتوں سے کٹوا کر مروا ڈالے"۔ کیا معقول سزا ہے، اور کس قدر رحم کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ذرا گریبان میں تو منہ ڈالیے۔ پھر اسی صفحہ میں لکھتے ہیں:۔ "اسی طرح اپنی عورت کو چھوڑ کر دوسرے کی عورت خواہ رنڈی سے زنا کرے، تو لوہے کے پلنگ کو آگ میں تپا کے اور سرخ کرکے اُس پر اُس گنہگار مرد کو سُلا کر بہت سے آدمیوں کے سامنے جلا دیوے"۔

کیوں پنڈت صاحب! آپ کے مذہب نے جو یہ سزائیں بتائی ہیں، آپ ان کو رحم سمجھتے ہیں یا بے رحمی؟ آپ نے کس مونہہ سے قرآنِ پاک پر اعتراض کر دیا؟ کون عقلمند ہے جو سزائے جرم کو رحم کے خلاف سمجھتا ہے؟ ذبح حیوانات کا مسئلہ تو میں آپ کو سمجھا ہی چکا ہوں، باقی رہا قتلِ کفار، اس پر آپ کیا اعتراض کر سکتے ہیں، جب زنا کا جرم آپ کے نزدیک اس بُرے طریقہ سے قتل کا مستحق ہے، تو خداوندِ عالم کی ذات و صفات، کتاب و رسل کا منکر، اور رب العالمین کی تکذیب کرنے والا کیسی شدید اور سخت ترین سزا کا مستوجب ہوگا۔ یہ تو اپنے ہی اصول سے آپ کو تسلیم کر لینا پڑیگا کہ کافر کو سخت سے سخت سزا دینا چاہیئے۔ اگر آپ خدا شناسی کی کچھ بھی قدر جانتے، تو یہ اعتراض آپ کے قلم سے نکل سکتا۔

قرآنِ پاک اور پیغمبر علیہ السلام چونکہ حق تعالیٰ کی معرفت کرا کے نفوسِ انسانیہ کو رذائل سے پاک کرنے اور علومِ یقینیہ اور معارف کی تعلیم فرماتے ہیں۔ اور بندوں کو خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں، اس لیے اُن سے اعراض و انحراف بیشک کفر اور سب سے بڑا سنگین جرم ہے۔

اب آپ اپنے اعتراض کو یاد کیجیے کہ "اگر قرآن کا خدا دنیا کا پروردگار ہوتا اور سب پر بخشش اور رحم کیا کرتا، تو دوسرے مذہب والوں اور حیوانات وغیرہ کو بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل کرانے کا حکم نہ دیتا"۔ یہ اعتراض آپ ہی پر لوٹ پڑا۔ اپنے قوانینِ سزا پر نظر ڈالیے اور اپنی پھانسی کو اپنی گردن سے نکالنے کی کوشش کیجیے۔ کیا آپ اپنے خیال میں ایشور کو پروردگار نہیں مانتے؟ اور مانتے ہیں، تو یہ قتل و خونخواری کے قوانین جو آپ کے اصول پر اُس کی پروردگاری کو نیست و نابود کیے ڈالتے ہیں، اُس سے کیسے صادر ہوئے؟ اور اگر یہ اُس کے احکام نہیں ہیں، اور آپ نے اپنی طرف سے لکھدیئے ہیں، تو کیا آپ کا مذہب آپ کی اپنی من گھڑت کا نام ہے؟ ؎

پاؤں صنم کا اُلجھا ہے زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

اعتراض خداوند دن انصاف کا، تجھ ہی کی عبادت کرتے ہیں ہم اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ہم کو دکھا ہمکو راہ سیدھا (منزل اول سپارہ اول سورۂ فاتحہ آیت ۴-۵) (**محقق**) کیا خدا ہمیشہ انصاف نہیں کرتا؟ کسی خاص دن انصاف کرتا ہے؟ یہ تو اندھیر کی بات ہے۔ اسی کی عبادت کرنا اور اس سے مدد چاہنا تو ٹھیک ہے کیا بڑی بات میں بھی مدد کا چاہنا درست ہے، اور سیدھا راستہ صرف مسلمانوں ہی کا ہے یا دوسروں کا بھی؟ سیدھے راستہ کو مسلمان کیوں نہیں قبول کرتے؟ کیا راستہ برائی کی طرف کا تو نہیں چاہتے؟ اگر اچھی باتیں سب کی یکساں ہیں تو پھر مسلمانوں کی خصوصیت کچھ نہ رہی، اور اگر دوسروں کی اچھی باتیں نہیں مانتے، تو متعصب ہیں۔

جواب پنڈت صاحب کے اعتراضات کا مادہ، افسوس ہے کہ تنہا سوءِ فکر اور خالص نافہمی نہیں، بلکہ عناد سے مرکب ہے۔ غلط فہمی رفع کی جا سکتی ہے، لیکن عناد ایک ناقابلِ علاج امراض میں سے ایک سخت بیماری ہے۔ اس ظلم کی کیا انتہا ہے کہ جس بات کا قرآنِ پاک میں نشان نہیں، رمق اور بو بھی نہیں، اسکو قرآنِ پاک کی طرف بے دھڑک منسوب کیا جاتا ہے جس معترض کا سرمایۂ اعتراض، افترا و بہتان ہو، بجز ذلت و رسوائی کے اور کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن پاک میں کہیں نہیں ہے کہ خدا ہمیشہ انصاف نہیں کرتا کسی خاص دن انصاف کرتا ہے۔ پھر اسکو قرآن شریف کی طرف منسوب کرکے اعتراض جمانا اور جھوٹ بول کر اس پاک و مقدس کتاب کو بدنام کرنیکی کوشش کرنا کس درجہ کی کمینہ حرکت ہے ایسے لچر اور لغو اعتراض جو قرآن پاک سے چھو بھی نہیں گئے اور اس پاک کتاب کے کسی ایک لفظ سے ان کا تعلق نہیں پنڈت صاحب کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ حقانیت قرآن کی ظاہر اور روشن دلیل ہے کہ دشمن معاندِ جوشِ عداوت میں اعتراض کرنے بیٹھتا ہے، اسکو قرآن پاک میں جائے حرف زدن نہیں ملتی، مجبور ہو کر افترا کرتا ہے اور اپنے دل کے پھپھولے توڑتا ہے

پنڈت صاحب کا ترجمہ بھی غلط ہے، اور اس غلط ترجمہ کی بنیاد پر بھی اعتراض صحیح نہیں، کیونکہ "انصاف کا دن" مرکب اضافی ہے جہاں اضافت تخصیص کے لئے ہوتی ہے وہاں مضاف الیہ قید ہوتا ہے، اور مضاف خاص ہوتا ہے، نہ کہ مضاف الیہ خاص ہو جائے۔ زید کا گھوڑا، اور بکر کی کتاب۔ اس میں گھوڑے اور کتاب کی تخصیص ہے، نہ کہ زید بکر کی۔ مگر پنڈت صاحب کو سخن فہمی سے کیا مطلب، اور ان کا دماغ ان باتوں سے کب آشنا ہے کہ وہ مضاف الیہ (انصاف) کی تخصیص نہیں، بلکہ انحصار کے مدعی ہیں۔ ایک چیز کا دوسری کی طرف مضاف ہونا، مضاف الیہ کی نسبت کو مضاف کے فردِ مذکور میں منحصر نہیں کرتا، ورنہ زید بکر کا بیٹا ہے، اسکے یہ معنی ہونگے کہ بکر کا بیٹا ہونا زید میں منحصر ہے، اور دیانند صاحب آریہ کے پنڈت ہیں، اسکے یہ معنی ہونگے کہ آریہ میں دوسرا پنڈت ہی نہیں، یہ ایسی باطل بات ہے جسکو ہر سلیم العقل جانتا ہے مگر شوقِ اعتراض نے پنڈت صاحب کو ایسی بدیہی اور صاف بات میں ٹھوکر کھلائی، اور انھوں نے "روزِ انصاف" کے یہ معنی سمجھے کہ انصاف اس روزِ معین میں منحصر ہے۔ اس علم و فہم پر آپ کو "محقق" ہونے کا دعوی ہے، اور قرآن پر اعتراض کرنے کی ہمت۔ غنیمت ہے کہ پنڈت صاحب نے یہ اعتراض نہ کیا کہ روزِ جزا کا مالک، اور کسی دن کا مالک نہیں، کیونکہ انکی فہم سے کچھ بعید نہ تھا، ورنہ پھر انھیں سمجھانا پڑتا کہ سلاطین کو مالکِ تاج و تخت کہتے ہیں۔ اسکے یہ معنی نہیں ہوتے کہ صرف تاج و تخت کے مالک ہیں، جاگیرات و اراضی، فوج و لشکر، کنیز و غلام، کچہری و دفتر وغیرہ کسی چیز کے مالک نہیں۔

پنڈت صاحب کی عادت ہے کہ وہ اپنے خیالات کو قرآن کی طرف منسوب کرکے اُن پر اعتراض کیا کرتے ہیں، باوجودیکہ قرآنِ پاک میں اُن کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ سوءِ فہم اور بلاغت تو پنڈت صاحب سے کچھ بعید نہیں، لیکن بے اصل بات کا الزام لگانا، اور جس بات کا قرآن پاک میں شمہ اور اشارہ بھی نہ ہو، اسکو قرآن کا مدلول یا مفہوم ٹھہرانا، غایت درجہ کی ذلیل حرکت ہے، لیکن قرآن پاک کے بے عیب ہونے کی دلیل ہے کہ معترض اُسکے کسی حرف پر اعتراض نہیں کر سکتا، بمجبوری جھوٹی اور بے اصل باتیں اپنے دل سے گھڑتا ہے، تاکہ لوگوں کو بھکائے۔

پنڈت صاحب نے لکھا ہے کہ "کیا بڑی بات میں بھی مدد چاہنا درست ہے؟" کسقدر بے اصل بات ہے، یہاں بڑی بات کا ذکر ہی کہاں ہے؟ پنڈت خود لکھ چکے ہیں کہ اسی کی عبادت کرنا اور اسی سے مدد چاہنا تو درست ہے "یہ ٹھیک ہے۔ قرآن پاک نے جو فرمایا تھا وہ بیشک ٹھیک۔ جو آپ نے دل سے نکالا وہ اپنے منھ پر مار یئے قرآن پر کیا اعتراض؟ جوابات اس میں ہے ہی نہیں، اس کا الزام قرآن پاک پر کیونکر آسکتا ہے بڑی بات کا تو قرآن پاک دروازہ بند کر رہا ہے اور دنیا کی تمام برائیوں کو نیست و نابود کئے ڈالتا ہے اُسکی نسبت یہ الزام بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ آفتاب میں سب خوبیاں ہیں، لیکن اُس کا توے کی کیطرح کالا ہونا بہت عیب کی بات ہے اسکے جواب میں جو کہا جائیگا پنڈت صاحب اسی کے مستحق ہیں، پنڈت صاحب دریافت کرتے ہیں "سیدھا رستہ کیا صرف مسلمانوں ہی کا ہے؟" یہ کوئی اعتراض تو نہیں ایک سوال ہے۔ جس کا جواب یہ ہے کہ بیشک منزلِ مقصود تک پہنچانے والا سیدھا راستہ صرف مسلمانوں ہی کا ہے إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ——— پنڈت صاحب فلسفہ سے بہت واقف ہیں۔ اسلئے انھوں نے یہ سوال کیا، ورنہ کوئی صاحب خرد ایسا سوال نہیں کر سکتا۔ ہر منزل یا مقام کے لیے کسی خاص مقام سے ایک ہی راستہ سیدھا ہو سکتا ہے، باقی اور جسقدر راستے ہونگے سب ٹیڑھے اور خمیدہ ہونگے۔ کاغذ کے صفحہ پر دو نقطے قایم کیجئے! اُن کے درمیان راستوں کے خطوط کھینچئے، ایک سیدھا ہوگا باقی سب ٹیڑھے ہونگے۔ کیا پنڈت صاحب، یا اُن کا کوئی ہوا خواہ دو نقطوں کے درمیان ایک خطِ مستقیم کے علاوہ، دوسرا خطِ مستقیم بھی بنا کر دکھا سکتا ہے؟ ——— اسی پر کہتے تھے کہ **وید** سرچشمۂ علوم ہے؟ آج تک آپ کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ سیدھا راستہ ایک ہی ہو سکتا ہے دوسرا ناممکن۔ پنڈت صاحب نے اپنی عادت کے موافق یہ بھی کہا ہے کہ "سیدھا راستہ بدی کا تو نہیں چاہتے؟" باوجودیکہ قرآن پاک میں موجود ہے صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ اس میں "صراطِ مستقیم" کو متعین کر دیا ہے کہ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے رحمت فرمائی، نہ اُن لوگوں کا جن پر تو نے غضب کیا نہ گمراہوں کا۔ اس پر بھی روزِ روشن میں آنکھیں میچ کر رات رات پکارے جانا، پنڈت صاحب کے باطن کا نمونہ ہے۔ ان حرکات سے دنیا کو جو نفرت ہونا چاہیئے محتاجِ بیان نہیں مجھے پنڈت صاحب کے معتقدین پر تعجب ہے کہ اُن کا کیسا مضبوط اعتقاد ہے، جو باوجود ایسے بطلان کے خلل پذیر نہیں ہوتا، مگر اس اعتراض کی تقریر میں پنڈت صاحب نے اپنے مذہب کا خاتمہ ہی کر ڈالا، جو یہ فرمایا کہ "اگر اچھی باتیں سب کی یکساں ہیں تو مسلمانوں کی کچھ خصوصیت نہ رہی اور اگر دوسروں کی اچھی باتیں نہیں مانتے تو متعصب ہیں

اعتراض راہ اُن لوگوں کی کہ جن پر فضل کیا تو نے، اُن کا راہ مت دکھا کہ جن کے اوپر تو نے غصہ کیا نہ گمراہوں کا راستہ دکھا۔ (منزل اول سیپارہ اول سورۂ فاتحہ آیت ۶-۷) (**محقق**) جب مسلمان تناسخ اور پہلے کیے ہوئے گناہ اور ثواب نہیں مانتے تو بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض لوگوں پر نہ کرنے سے خدا طرفدار ٹھہرتا ہے، کیونکہ گناہ و ثواب کے بغیر رنج و راحت کا دینا قطعی بے انصافی کی بات ہے، اور بلا سبب کسی پر رحم، اور کسی پر غضب کرنا یہ بات ہی نہیں بن سکتی۔

جواب پنڈت صاحب کے دماغ کی کہاں تک تعریف کیجائے، جو بات ہے بے محل، جو صدا ہے بے ہنگام۔ وہاں بندے کو دعا کی تعلیم و تلقین ہے کہ وہ خداوندِ کریم سے راہ راست پر چلنے کی توفیق طلب کرے، جسکے چلنے والوں پر انعام ہوا ہے، اور کجروی سے محفوظ رہنے کی دعا کرے جسکے اختیار کرنے والوں پر خدا کا غضب ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ یہاں اُس نعمت و غضب کا تذکرہ ہے، جو راہِ راست پر چلنے اور اُس سے انحراف کرنے کی جزا و سزا میں ہوا اس پر یہ کہدینا کہ "بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض پر رحمت نہ کرنے سے خدا طرفدار ٹھہرتا ہے، کیونکہ گناہ و ثواب کے بغیر رنج و راحت کا دینا قطعی بے انصافی کی بات ہے۔" اس کلام کا یہاں کیا محل تھا؟ یہاں بغیر عمل کے رنج و راحت کا تذکرہ ہی کس نے کیا، جو آپ تناسخ لے دوڑے۔ ع سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

لالہ صاحب کو ابھی تک فہم سخن کا تو سلیقہ ہی نہیں، اتنا شعور نہیں متکلم کے کلام کو سمجھ سکیں کہ کہہ کیا رہا ہے، مگر نام کے محقق بنکر اعتراض بازی شروع کر دی۔ اب ذرا سی آپ کے تناسخ کی بھی خبر گیری کر لیجئے جسکو آپ نے یہاں بے موقع دھنسایا ہے۔ تناسخ کی سب سے بڑی دلیل جو پنڈت صاحب کے پاس ہے وہ یہی ہے کہ رنج و راحت بے سابقہ عمل متصور نہیں۔ درحقیقت یہ خود ایک دعوی ہے جو محتاجِ دلیل کا ہے پنڈت صاحب اور اُنکے متبعین نے رنج و راحت کے جزاء و سزا میں منحصر ہونے پر آج تک کوئی دلیل نہیں پیش کی نہ آئندہ کبھی پیش کر سکیں گے، بلکہ خود اُنکی عبارتیں، اور اُنکے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ اور اُنکے وید کا طرزِ بیان اُنکے اس دعوے کی تکذیب اور بطلان کے لیے کافی شہادت ہے۔ رگوید آدی بھاشیہ بھومی کا میں پر جنم "یعنی بیان تناسخ میں سب سے منتر یہ پیش کیا ہے۔ ——— "اے پرانوں کے قایم رکھنے والے ایشور ہم اگلے جسم میں ہمیشہ سُکھ پادیں، یعنی جب ہم پچھلے جسم کو چھوڑ کر اگلا آنے والا جسم اختیار کریں، تو اُس جسم میں ہمیں پھر آنکھ اور پران ملیں، اے بھگوان ہمیں اگلے جنم میں تمام سامان

ہم تمام جنموں میں سورج کی روشنی دیکھ سکیں، اور اندر اور باہر جانے والے پران سے بہرہ یاب ہوں، اے سب کو عزیز رکھنے والے پرمیشور ہم آپ سے یہی التجا کرتے ہیں کہ آپ کی رحمت سے تمام جنموں میں سُکھ حاصل ہو۔ (رگوید اسٹک ۸ ادھیا اورگ ۲۳ منتر ۶)

وید میں اس قسم کے صدہا منتر ہیں جنمیں اس قسم کی التجائیں تعلیم کی گئیں ہیں، جو پنڈت صاحب کے دعوے کو باطل کر رہی ہیں۔ اگر تکلیف و راحت، رنج و خوشی، سُکھ اور دکھ عملوں اور کرموں پر موقوف ہے اور پرمیشور اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کر سکتا، تو دعا کی تعلیم سراسر لغو اور ابلہ فریبی ہے۔ اصول تناسخ کی بنیاد پر ایشور مجبور ہے کہ جیسے عمل ہوں ویسا بدلہ دینے پر اگلے جنم میں تمام سامان راحت دینا اُسکے اختیار میں کیا ہے جسکی دعا وید میں تعلیم کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وید کے مصنف کے نزدیک بھی تناسخ باطل ہے، اور ایشور قادر ہے کہ وہ اپنے کرم سے جس انسان کو چاہے راحت دے۔

رگوید کا ساتواں منتر ملاحظہ فرمایئے:۔

"اے بھگوان آپ کی عنایت سے ہمیں پران، اشیاءِ خوردنی اور قوت ہر جنم میں حاصل ہوں زمین، سورج، انترکش (خلا بالائے زمین) اور سرم (نباتات) ہمیں پھر اگلے جنم میں زندگی دینے والے اور جسم کی پرورش کرنے والے ہوں، اے قوت عطا کرنے والے پرمیشور ہمیں اگلے جنم میں پھر دھرم کا راستہ دکھائیو ہمیں ہر جنم میں آپ کی رحمت سے سُکھ حاصل ہو، یہی آپ سے التجا ہے"

پنڈت صاحب جب آپ کے قواعد سے نیکی کا بدلہ راحت دینے پر ایشور مجبور ہے اور بدی کا بدلہ رنج و تکلیف دینا بھی اُس پر ایسا ہی لازمی اور ضروری ہے۔ اور معاف کرنا آپ کے مذہب میں ایشور کے مقدور اور امکان سے باہر ہے تو رحمت و عنایت کے معنی کیا؟ اور سُکھ کی التجا کیسی؟ وید آپ کے مدعا کو خاک میں ملا رہا ہے، اور تناسخ کے اصول کی بیخکنی کر رہا ہے۔ اگر میں آپ کو وید کے منتر شمار کراؤں جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں، تو آپ پریشان ہو جائیں۔ یجروید ادھیائے ۴ منتر ۱۵ ملاحظہ ہو:۔ "اے جگدیشور (مالکِ جہان) مجھے اگلے جنم میں آپ کی عنایت سے علم وغیرہ نیک گنوں سے آراستہ من (دل) اور عمر نیک خیالات سے پُر اور پاک آتما آنکھ اور کان عطا ہوں، تمام دنیا کو نور یا بصارتِ چشم عطا کرنیوالا پرمیشور جو مکروغیرہ تمام عیبوں سے پاک اور جسم وغیرہ کا محافظ عین علم و راحتِ مطلق ہے جنم جنم میں ہمیں پاپ کے کاموں سے بچائیو، اور ہماری حفاظت کیجیو، تاکہ ہم پاپ سے بچکر ہر جنم میں سُکھ پاویں" ——— اب فرمایئے کہ دُعا پر دُعا سوال پر سوال ایسے ایشور سے جو اپنی طرف سے کوئی راحت و آسائش دینے کا مالک و مختار نہیں کسی تکلیف سے بچانا اُسکے اختیار میں نہیں، کیونکہ کرم کا پھل بھوگنا ضروری ہے۔ ایسے مجبور اور لاچار ایشور سے سوال اور دُعا لغو و بیحاصل نہیں، تو کیا ہے؟ اور اگر اسکا کچھ حاصل ہے، اور ایشور کو بغیر عمل کے عنایت و مرحمت کا اختیار ہے، تو تناسخ باطل، آواگون غلط، اور آپ کا اعتراض آپکی گردن پر سوار کہ بغیر سابقہ عمل کے کسطرح اُس نے رنج و راحت پہنچایا۔ اس سے اور بھی زیادہ سخت تر تکلیف اور عظیم مصیبت آپ کے لیے وہ ہے جو وید میں بایں الفاظ تحریر ہے "جنم جنم میں ہمیں پاپ کے کاموں سے بچائیو" اگر ایشور کی قدرت میں ہے کہ وہ مخلوق کو گناہوں سے بچالے، تو کسی کو بچالینا اور کسی کو نہ بچانا، بلکہ دیدہ و دانستہ گناہ میں مبتلا کرنا آریہ اصول کی بناء پر انتہا درجہ کی ستمگاری اور ظلم ہے درحقیقت آریہ ایشور کو مالک و مختار نہیں مانتے، بلکہ مجبور و بے اختیار سمجھتے ہیں۔ جب تو پنڈت دیانند نے قرآنِ پاک پر اعتراض کرتے وقت کہدیا کہ بعض لوگوں پر رحمت کرنے اور بعض پر نہ کرنے سے خدا طرفدار ٹھہرتا ہے، کیونکہ گناہ و ثواب کے بغیر رنج و راحت کا دینا قطعی بے انصافی کی بات ہے یہ اعتراض قرآنِ پاک کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوا، جیسا کہ میں گزارش کر چکا ہوں، اور مسلمانوں کا اعتقاد اس مضمون کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔

اہلِ اسلام خداوندِ عالم کی عظمت و جلالت سے باخبر، اور اُسکی قدرتِ تامّہ اور مالکیتِ حقیقیہ پر ایمان رکھتے ہیں، اُنھیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ مالک الملک، وہ قادرِ مطلق ہے جو اپنے مُلک میں اپنی ملک میں جو کچھ بھی تصرف کرے وہ حق و بجا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو، تو مالک و قدرت کے معنی ہی کیا ہیں۔ لیکن پنڈت صاحب، اللہ کے اوصافِ کمال، اُسکی عظمت و جبروت سے بالکل ناواقف اور محض ناآشنا ہیں۔ انکے نزدیک ایشور کا یہی مرتبہ ہے کہ وہ کسی کو ذرّہ بھر تکلیف یا راحت نہیں پہنچا سکتا، لیکن وید کی دُعاؤں کا سلسلہ اُن کے قدم نہیں جمنے دیتا، اور اُنکے خیال کو باطل کر دیتا ہے، اور جو اعتراض اُنھوں نے قرآنِ پاک پر جمانا چاہا تھا، قرآن شریف تک تو نہیں پہنچ سکتا، خود پنڈت جی کی گردن کے لیے پھانسی بن گیا، جس سے اُنکی رہائی کسی طرح ممکن نہیں۔

رگوید آدی بھاشیہ بھومکا مطبوعہ مفید عام پریس لاہور صفحہ ۱۳۱ میں ہے:۔ "جو پاپ کا کام کیے ہوتا ہے وہ اگلے جنم میں انسان کا جسم نہیں پاتا، بلکہ حیوان وغیرہ کا جسم پاکر دکھ بھوگتا ہے"

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کا جسم وہی لوگ پاتے ہیں جو پچھلے جنم میں بالکل بے گناہ تھے کیونکہ پاپی کو انسان کا جسم مل نہیں سکتا۔ تو اس قاعدہ سے کوئی انسان ایسا نہیں ہے، جس نے پچھلے جنم میں کوئی گناہ کیا ہو۔ پھر حمل و وضع کی تکلیفیں جو سب کو پہنچتی ہیں کس گناہ کی پاداش میں ہیں؟ اب پاپ کس کے گھر سے آئیگا؟ کسی کو امیر، دولتمند۔ کسی کو مفلس، غریب، فقیر، حاجتمند۔ کسی کو عورت، کسی کو مرد، کسی کو مخنّث، کسی کو تندرست، کسی کو بیمار کر دینا بے سبب، بے گناہ اور ظلم عظیم ہے آپ کے اصول سے ایشور اس سخت جرم کا مرتکب ہے کہ اُس نے بغیر کسی گناہ کے انسان کی پیدائش میں اسقدر فرق رکھے۔ دیکھئے آریہ اُسکے لیے کیا سزا تجویز کریں؟

علاوہ بریں آریہ نے کسی کو معصوم تو مانا نہیں، انسانوں کی عام حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ایسی چیز ہے، جس سے کوئی شخص نہیں بچتا، بڑا نہیں چھوٹا سہی، بہت نہیں تھوڑا سہی کچھ نہ کچھ گناہ بندہ سے ہو ہی جاتا ہے، اور ایشور معاف کرنے کی تو قدرت ہی نہیں رکھتا، اور پاپی انسان کی جُون نہیں پا سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی کبھی انسان کی جُون ہی نہ پائے، اور انسان صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے۔

اگر عالم کا انتظام آریوں کے اعتقاد کے موافق ہوتا، تو عالم میں کہیں انسان کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ لیکن انسانوں کی کثرت، اور مردم شماری کا روز افزوں ترقی کرنا، ویدک دھرم اور اعتقادات آریہ کے بطلان کی زبردست شہادت ہے۔ کہو پنڈت جی پھر قرآنِ پاک اعتراض کروگے؟ غیرت شرم گھبرایئے نہیں! میں آپ کی پوتھی اور کھولتا ہوں، تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کس سرمایہ پر آپ کو غرّہ ہے، اور کن اباطیل کو آپ کلام حق مان رہے ہیں، آپ کی اندرونی حالت بھی آشکار ہو جائے ؎

اپنے سایہ سے کہیں آپ ہی جائے نہ جھجک	اور پرپوش تو ادھر ناز سے اُٹھا گیا ہے
چٹکیوں ہی میں اڑا دوں ترا جوبن تو سہی	اے بتِ پردہ نشیں تو مجھے سمجھا کیا ہے

رگوید آدی بھاشیہ بھومکا صفحہ ۳۱ میں ہے:۔ "جو جیو ایشور کے کلام یعنی وید کو بخوبی جان اور سمجھ کر اُس پر عمل کرتا ہے، وہ مثل سابق پھر عالموں کا جسم پاکر سُکھ بھوگتا ہے"

وید کی اس عبارت میں صراحت ہے کہ جو وید کے پورے پورے عالم ہیں، اور اُسکو خوب اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ وید کے مطابق عمل کریں، تو اگلی جُون میں اُنکو عالموں کا جسم ملے گا اور وہ سُکھ ہی پائینگے دُکھ نہ پائینگے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ جب سے دنیا میں سلسلۂ آمدورفت (آواگون) مانا جاتا ہے، آیا کبھی کسی شخص کو بھی ایشور نے اپنے اس قانون سے نوازا، اور کبھی اس اصول پر عملدرآمد ہوا؟ میں یقین کرتا ہوں کہ سمجھدار انصاف پسند شخص، خواہ وہ آریہ ہی ہو، اسکا جواب نفی میں دیگا۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ ایشور نے کبھی کسی پر ایسی مہربانی نہیں کی۔ مثال کے طور پر آریہ مذہب کے پیشوا پنڈت دیانند کو سامنے لایئے، وہ آریہ مذہب اور ویدک دھرم کے عالم ہیں، وید کے اس قانون سے لازم آتا ہے کہ انھوں نے عالموں کا جسم پچھلے جنم کی راستبازی اور نیکوکاری اور علمِ عرفاں کی وجہ سے پایا ہو، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جب وہ پچھلے جنم میں وید کے بخوبی عالم تھے اور اُنھوں نے اُسکے مطابق عمل کیے تھے جسکی وجہ سے اُنھوں نے عالموں کا جسم پایا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ وید کے وعدہ کے مطابق اور ایشور کے قانون کے بموجب وہ پورا پورا سُکھ حاصل نہ کر سکے، اور دُکھ سے بکلی محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ دعویٰ باطل ہوگا کہ پنڈت دیانند کو اپنی حیات میں کوئی تکلیف بدنی، مالی، اعزازی پہنچی ہی نہیں، بچپن سے بڑھاپے تک کبھی وہ بیمار نہیں ہوئے، کسی عضو میں درد نہیں ہوا، آنکھ نہیں دُکھی، کھانسی اور زکام تک سے محفوظ رہے، کسی کام سے تھکن نہیں ہوئی، مناظرہ کی مجلسوں میں جانے سے پہلوتہی نہیں کی، اگر کبھی مناظرہ کا اتفاق ہوا، تو اپنے مقابل سے مجمع کے سامنے شرمندگی نہیں اُٹھائی؟ میں اُمید کرتا ہوں کہ آریوں میں سے کوئی ایسا دعویٰ کرنے کی جُرات نہ کریگا۔ تو پنڈت صاحب کے لیے دُکھ ثابت ہو گیا۔ اور اس سے بھی بڑھکر اُنکا رجسٹری شدہ دُکھ ثابت کر دیا جائے جو رگوید کے اسی صفحہ میں نرکت ادھیا ۱۳ کھنڈ ۲۹ سے منقول ہے:۔ "میں مرا ہوں اور پھر پیدا ہوا ہوں" اور پھر پیدا ہو کر پھر مرا ہوں ہزاروں قسم کی جُون میں پڑ چکا ہوں، قسم قسم کی غذائیں کھائیں، اور مختلف پستانوں کا دودھ پیا، بہت سی مائیں دیکھیں اور بہت سے باپ، اور دوستوں سے تعلق ہوا، اوندھے مونھ بڑی تکلیف میں حمل کے اندر رہا" —— اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ حمل میں بچّہ کو بہت سخت تکلیف پہنچتی ہے کیا آریہ یہ ثابت کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں کہ پنڈت دیانند صاحب حمل میں نہیں رہے؟ ایسا نہیں ہے حمل میں اُنھیں تکلیفیں پہنچیں، اور ضرور پہنچیں۔ تو وید کے ایشور کا سُکھ دینے کا وعدہ غلط ہو گیا۔ اور جب تمام انسان اسی طریقہ سے پیدا ہوتے ہیں، تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُسکا یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوا اور اس قانون کو کبھی نفاذ میسر نہیں آیا۔ آپ کے پاس سب سے مقدس اور پاک ہستیاں صرف اُن

چار رشیوں کی ہیں، جن پر آپ کے زعم میں وید کا الہام ہُوا۔ وہ بھی اگر اسی طریقہ سے پیدا ہوئے، تو اُنکا بھی یہی حال ہے، کامل سکھ سے وہ بھی محروم رہے، دُکھ اور تکلیف سے وہ بھی نہ بچ سکے، ایشور کا قانون اُنکے حق میں بھی بیکار اور نکمّا ہی رہا، اور وید کا ایشور اپنے وعدہ کو حاملانِ وید کے ساتھ وفا کرنے سے بھی مجبور رہا۔ اور اگر یہ کہئے کہ وہ توالد و تناسل کے طریقہ سے ماں اور باپ سے نہیں پیدا ہوئے، بلکہ وہ اُنہی بہت سے لوگوں میں سے تھے، جو آریہ اعتقاد کی رُو سے ابتدا کے دنیا میں بغیر ماں باپ کے جوان جوان پیدا کیے گئے تھے، تو یہ دریافت طلب ہے کہ الہام کے لیے اُن کثیر میں سے اِن چار کی کیا تخصیص؟ اور پھر یہ ثبوت دینا ہوگا کہ اُنکو مدتِ حیات میں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی؟ کم ازکم موت آئی تو اُنکے حق میں مسلّم ہوگا، وہ کیا کچھ کم دُکھ ہے؟ بہرحال یہ وعدہ کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایشور کی خدائی میں سب پاپی اور بدکار ہی بستے ہیں، آجتک نیک، راستباز ہُوا ہی نہیں، جسکو وہ اپنی مہربانی سے نوازتا اور سکھ عنایت کرتا اور دُکھ سے اُسکی نجات دیتا۔ یا یوں کہیئے کہ اُس کی ایسی عادت ہی نہیں۔ ع وہ ظالم کسی کو نہیں بخشتا ہے ؛ نیک و بد سب کو آزار پہنچانا. ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا اُسکی خُو، خصلت میں داخل ہے ـــــــ درحقیقت تناسخ ایک ایسا لچر خیال ہے، جسکے ماننے والوں کو لامحالہ بے شمار الزام کھانا، اور ندامتیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ رگوید کی عبارت میں "عالموں کا جسم پانا" بہت عجیب بات لکھی ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ اگلے جنم میں جیو کو علم دیا جاتا ہے، تو چنداں قابلِ گرفت نہ تھا، مگر عالموں کا جسم پانے سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مصنف کے خیال میں علم جسم کی صفات میں سے کوئی صفت ہے، یا جسم کے ساتھ اُسکو کسی قسم کا تعلق شدید ہے ـــ عالموں کا جسم دینے کے تو یہ معنی ہوئے کہ مختلف قسم کے جسم تیار ہیں، کوئی علم والا، کوئی جہل والا۔ جسکو علم والا جسم دیدیا عالم ہوگیا، جسکو جہل والا جسم دیدیا جاہل ہوگیا۔ اگر درحقیقت یہی مراد ہے، تو عقل و خرد پر ہزار آفریں! ایسی بدیہ البطلان بات زبان سے نکالنا آپ کا حصّہ ہے۔ اور اگر کسی اور معنی کو اِن الفاظ میں ادا کرنا چاہا ہے، اور ناقص و بے محل عبارت لائی گئی ہے، تو یہ علم و لیاقت کی خوبی ہے۔ اس قابلیت پر محقق ہونے کا دعویٰ کتنا زیبا ہے۔ ہم لفظی اغلاط کے درپے نہیں ہونا چاہتے۔

رگوید آدی بھاشیہ بھومکا میں پاپ اور پُن کا پھل بھوگنے کے دو راستے بتلائے ہیں ایک "پتری یان" دوسرا "دیویان"۔ دوسرے کی نسبت لکھا ہے، "اور دیویان وہ ہے جسمیں موکش کے درجہ کو حاصل کرکے مرنے اور پیدا ہونے کے جنجال یعنی دنیوی بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ان میں سے پہلے میں جیو اپنے کمائے ہوئے پُن کے پھل بھوگ کر پھر پیدا ہوتا ہے اور پھر مرتا ہے۔ اور دوسرے راستہ پر چلنے سے دوبارہ پیدا نہیں ہوتا" اس عبارت نے تو تناسخ کا خاتمہ ہی کر دیا۔ اس سے تو عالم کے ابدی ہونے کا خیال بھی باطل ہوتا ہے جو آریوں کے عقائد میں سے ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں تمام جیو موکش کے درجہ کو حاصل کرکے مرنے اور پیدا ہونے کے جنجال سے آزاد ہو جائیں، تو عالم حیوانات و نباتات بالکل معدوم ہو جائیگا۔ گائے، بیل بھینس، بکری، اونٹ، ہاتھی، چرند، پرند، حشرات الارض سب ناپید ہو جائینگے۔ اور اس سے آریوں کے اس قول کا بطلان ظاہر ہوتا ہے کہ سلسلہ توالد و تناسل قدیم ہے، اور ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا۔ جب ارواح نجات پاکر دوبارہ پیدا ہونے اور مرنے سے آزاد ہو جائیں گی، تو یہ سلسلہ کہاں رہا؟ نیز پنڈت دیانند کا یہ قول بھی باطل ہوتا ہے کہ ایشور کسی کو ہمیشہ کے لیے راحت نہیں دے سکتا، بلکہ نیک سے نیک شخص کو بھی ایک مدتِ معینہ کے لیے مکتی خانہ بھیجا جاتا ہے، جسطرح قیدیوں کو مدت مقررہ کر کے جیل بھیجدیا کرتے ہیں، اور جب وہ مدت ختم ہوئی، تو مکتی خانہ سے نکالدیئے گئے۔ ع

رُوئے گل سیر ندید ند و بہار آخر شد

لیکن رگوید کی یہ عبارت بتاتی ہے کہ وہ دنیوی بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اگر بالفرض اسکو پھر گرفتار کیا جائے اور کسی جُون میں لایا جائے، تو اُسکا قصور بتانا ضروری ہوگا، اور جو جُون اُسکو دی جائیگی، تو وہ کس عمل کی پاداش میں ہوگی۔ کیا آریہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرینگے؟

علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیو یعنی رُوح کا کسی نہ کسی جسم سے متعلق ہونا واجب اور ضروری نہیں، بلکہ روح مجرّد بھی رہ سکتی ہے۔ یہ بات ہے جس نے تناسخ کے دلائل کا قلع قمع کر دیا۔ اور درحقیقت آریوں نے یہ مسئلہ نہایت مضحکہ انگیز اور غیر عاقلانہ طریقہ سے مانا ہے، جیو کے ایک جسم سے دوسرے جسم تک پہنچنے کی جو صورت وید نے بتائی ہے، اُسکو دیکھکر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یجروید ادھیائے 19 منتر 47 میں ہے۔ "جب جیو پچھلے جسم کو چھوڑ کر ہَوا پانی اور نباتات میں سے گزرتا ہے، باپ یا ماں کے جسم میں داخل ہوتا اور دوبارہ جنم پاتا ہے، تب وہ جیو جسم اختیار کرتا ہے"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں کے اعتقاد میں رُوح بدن سے نکل کر ہَوا میں گھومتی پھرتی ہے پھر پانی میں غوطے لگاتی ہے، پھر نباتات یعنی ساگ وغیرہ پر بیٹھکر غذا کے ساتھ مرد یا عورت کے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اوّل تو یہ ترکیب کتنی عجیب و غریب ہے، جسے سُنتے ہی عقل کو ایک حیرت ہوتی ہے، اسکے علاوہ یہ کسقدر لغیں بات ہے کہ رُوح نباتات ہی وساطت سے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص نباتی غذائیں ترک کردے اور حیوانی غذائیں کھایا کرے گوشت، کباب، دُودھ، دہی میں اُسکی غذا منحصر ہو تو وید کے اصول سے کبھی اُسکے اولاد نہیں ہو سکتی، کیونکہ جیو اُسکے جسم میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ داخل تو جب ہی ہوتا جب وہ بھجیا کھاتا، مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ تو وید کے قاعدہ سے اُسکے اولاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن تجربہ وید کے اس قانون کو غلط ثابت کر دیگا، اور گوشت خور کی اسقدر کثیر اولاد ہوگی کہ بھجیا والے دیکھکر ترسا ہی کرینگے۔ عالمِ حیوانات میں اگر نظر ڈالیے تو آپ کو بہت کثیر ایسے حیوانات ملینگے جو نباتات سے آشنا نہیں۔ بعضے محض مٹی چاٹتے ہیں، بعضے ہَوا یا پانی کے کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں، بعضے شکاری ہیں کہ وہ پرند یا چرند کے شکار ہی پر بسر کرتے ہیں، اور ان سب کی نسلیں جاری ہیں۔ یہ تمام شہادتیں وید کی اس بعید از عقل و قیاس تعلیم کو لغو و مہمل ثابت کرتی ہیں۔ علاوہ بریں یہ کسقدر نرالی بات ہے کہ نباتات کے ذریعہ سے جیو ماں یا باپ کے جسم میں داخل ہو کر جنم پاتا ہے۔ فرض کیجیے جس بُوٹی پر جیو سوار تھا اُسکو کسی نابالغ بچے نے کھالیا، تو چاہیئے کہ اُس بچے کے اولاد ہو، یا جیو زمانۂ بلوغ تک اُسکے پیٹ میں قید رہے، تو یہ جنم لینے سے پہلے سزا ہو گئی، اور جب بغیر جنم لیے سزا ممکن ہوئی، تو سزا کے لیے جنم غیر ضروری ہوا تناسخ باطل۔ اور اگر ناگہانی طور پر کسی برہمچاری (مجرّد) نے اس بوٹی کو کھالیا، اور وہ جیو اُسکے جسم میں داخل ہُوا، تو فرمایئے کہ مدت العمر قید ہی رہیگا، یا اُس برہمچاری مرد کے بچہ پیدا ہوگا؟ کیا ابتک وید کی اس تعلیم کا کوئی نشان پایا گیا ہے؟ اور کسی برہمچاری بچہ جنا ہے؟۔ اگر وہ بوٹی عنین (نامرد) یا خصی مجبوب مقطوع الآلۃ کی غذا بنی، اور جیو انکے جسم میں داخل ہُوا، تو وہ کس راہ سے جنا جائیگا، کان سے ناک سے؟ اور اگر کسی ناکتخدا کنواری لڑکی، یا برہمچریہ کرنیوالی عورت نے وہ بوٹی کھالی، تو بغیر شوہر ہی کے اُسکے اولاد ہو جائے گی، آیا آریہ ایسا مانتے ہیں؟۔ اگر رُوح غذا کے ذریعہ سے ابتداءً ماں کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے، تو اولاد ہونے کے لیے مرد کیوں درکار ہے؟ ایسا عاقلانہ اور ہوشمندانہ خیال تعجب ہے کہ عقل و ہوش رکھنے والوں کا عقیدہ ہو سکے۔

پنڈت دیانند اسی تناسخ کے معتقد ہیں، اور قرآنِ مجید کی آیات میں اسی کو ڈھونڈھنا چاہتے ہیں۔ یقیناً کتابِ الٰہی ایسی لغویات سے پاک ہوتی ہے، بلکہ کسی عقلمند آدمی کی زبان و قلم سے ایسی باتیں نہیں نکل سکتیں، جو بچّوں کی نگاہوں میں بھی قابلِ مضحکہ ہیں۔

اب میں آریہ صاحبان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا وہ دار العمل اور دار الجزاء میں کوئی فرق و امتیاز کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اس لحاظ سے اُنکے نزدیک جُونیں دو قسم پر منقسم ہیں یا نہیں یعنی ایک تو ایسی جُونیں جن میں جیو کو عمل کرنے کے لیے آزاد چھوڑا گیا ہو، اور اُس جُون میں کسی قسم کی جزاء یا سزا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دوسری وہ جُونیں جن میں جیو کے پاپ اور پُن کے لحاظ سے جزاء یا سزا دیجائے اگر آریہ دھرم نے کہیں ایسی تقسیم کی ہے، تو اُسکا پتہ دیجیے؟ مگر میں جانتا ہوں کہ آریہ کے اصول اُن کو اس تقسیم کی طرف نہ جانے دینگے، اسلیے ہر دُکھ یا سکھ کو ہر رنج یا راحت کو وہ جزاء و سزا میں منحصر مانتے ہیں، اور کوئی جُون اس سے خالی نہیں ملتی، تو ہر جُون دار الجزاء ہے، اور جزاء کیلیے تقدم عمل ضروری۔ اور جب کوئی جُون جزاء سے خالی نہیں، تو لامحالہ عمل بھی ان تمام جُونوں میں تسلیم کرنا پڑیگا، تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہر جُون دار العمل بھی ہے اور دار الجزاء بھی۔

میں پوچھتا ہوں کہ ایک جیو جس نے رَنڈی کے گھر میں جنم لیا، اور ایک جیو جس نے راجہ کے گھر میں جنم لیا، اور ایک جیو جس نے کسی وید کے عالم پنڈت کے گھر میں جنم لیا، کیا ان سب کے عمل اپنی پچھلی زندگی میں یکساں تھے؟ اگر ایسا ہو تو اُنکے ساتھ مختلف قسم کا سلوک ظلم ہوگا کہ ایک کو ایسے گھر میں پیدا کیا، جس میں پیدا ہونا اُسکے لیے انتہا درجہ کی ذلت ہے اور باوجود اسکے اُسکو اس گھر میں ایسی تعلیم ملتی ہے، ایسی تربیت و صحبت ملتی ہے، جس سے اُسکے لیے بدکاری طبیعتِ ثانیہ ہو جائے۔ کیا یہ ذلّت اور ایسی خراب صحبت اور ایسی غلط تعلیم، یہ کل اسباب جیو نے خود مہیا کیے ہیں؟ ایسا تو نہیں ہے۔ ایشور ہی نے اُسکو اِس گھر میں پیدا کیا، اُسی نے یہ صحبت و تربیت اُسکو بہم پہنچائی۔ تو ضرور ہے کہ کسی عمل کی پاداش میں اُسکے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہوگا۔ دوسرا جیو، جس نے راجہ کے گھر میں جنم لیا ہے، اس گھر میں پیدا ہونا اُسکے لیے غایت درجہ کی عزت ہے، اور اُسکو اچھی صحبت اور اچھی تربیت اِس جُون میں خود بخود میسر ہے۔ اسکے ساتھ یہ سلوک بھی آریہ اصول کی بناء پر ضرور کسی نہ کسی نیک عمل کی جزاء میں ہے، اور جسقدر سامانِ عیش، اور اختیار اس گھر میں اُسکو حاصل ہوئے، وہ سب کسی نہ کسی نیکی کا بدلہ ہیں۔ تیسرا بچّہ جو کسی وید کے عالم عامل رشی کے گھر میں پیدا ہُوا، اُسکو وید کی تعلیم حاصل کرنے، اُس پر عمل پیرا ہونے کے لیے پہلے دونوں بچّوں سے زیادہ سہولت حاصل ہے۔ اسکو ایسے گھر میں پیدا کرنا، اور تعلیم وید کی ایسی عمدہ بہم پہنچانا یہ بھی ضرور کسی عمل کا بدلہ ہے۔ جب اِن تینوں بچّوں کی حالتیں اسقدر مختلف و متفاوت ہیں، تو اُنکے سابقہ اعمال کا یکساں ہونا، وید

ماننے والوں کے اصول پر ایک ناممکن بات ہے۔ بالجملہ ہر ایک اپنے کردار کے موافق اسباب پارہا ہے وہ جیو جسکی سزا یہی تھی کہ رنڈی کے گھر پیدا ہو، رنڈی کی صحبت میں رہے، رنڈی کی تربیت پائے اور پھر رنڈی بنکر دنیا میں ذلت کے ساتھ دیکھا جائے، رسوائی و بے عزتی کا عذاب اختیار کرے، کیا پھر اس جرم میں پکڑا جائیگا؛ کہ اُس نے بدکاری کیوں کی، بُری صحبت میں کیوں رہا؟ یا نہ پکڑا جائیگا؟ اگر پکڑا جائیگا، تو کیا ایسے عمل کرنے والے کو آئندہ کے لیے کسی عمدہ جون پانے، اور راحتیں حاصل کرنیکا اُمیدوار رہنا چاہیئے؟ اور اگر پکڑا جائے گا، تو کیا جو مصیبت کہ اُس پر سزا کی ڈالی گئی تھی، پھر موجبِ سزا ہو جائے گی؟ جس شخص کو کسی جرم کی پاداش میں جرمانہ کی کوئی سزا دی گئی ہو، کیا پھر اُس جرمانہ کو اُسکی خطا قرار دیکر اُسکو دوبارہ سزا دیجا سکتی ہے؟ یا جس اہلکار کو کسی قصور پر ایک ماہ کے لیے معطل کر دیا گیا ہو، اُسکو اسی ایک ماہ کام نہ کرنے کے بدلہ میں پھر سزا دیجا سکتی ہے؟

جب ایک جیو کو ایشور نے کسی گناہ ہی کی سزا میں رنڈی بنایا ہے، تو اب اُسکے افعال کسطرح قابلِ مواخذہ ہو سکتے ہیں۔ دیکھیئے تناسخ کا اعتقاد کرنے سے کیسے بُرے نتائج پیش آتے ہیں۔ رنڈی بنکر بدکاری کرنا قابلِ سزا، اور لائقِ گرفت نہ رہا۔ یہ تو ایک طرف، دوسری جون میں ایشور رنج دیگا یا رحت، اسکا فیصلہ آپ کو متعذر ہے، کیونکہ اس جون کے جسقدر عمل تھے، وہ تو سب سزائیں تھیں، نئی جون کے لیے کون سے عمل ہیں؛ جن پر رنج و راحت دی جائے گی۔

اسی طرح ایک جیو جس نے بھنگی کے گھر میں جنم لیا، اور ہوش سنبھالتے ہی ضرورتِ معاش نے اُسکو اپنے کسبِ موروثی کی پابندیوں پر مجبور کیا۔ بچپن ہی کی عمر میں بغل میں ٹوکری اور ہاتھ میں جھاڑو لیے ہوئے سڑکیں صاف کرتا، اور نجاستیں دُور کرتا پھرتا ہے، شام کو تھک کر پڑ رہتا ہے۔ یہ نادانی اور طلبِ علم کی عمر اس ذلت و خواری اور تکلیف کے ساتھ کاٹتا ہے، اور پھر عمر بھر کے لیے یہی گندہ خدمت اُس کا طریقِ زندگانی اور طرزِ معاش ہوتی ہے، اور وہ اپنی عمر کے طویل عرصہ میں علم حاصل کرنے کے لیے فراغ نہیں پاتا۔ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وید کے مطابق عمل کر سکے۔ اب ویدک دھرم کے خلاف ہونے کی وجہ سے اگلی جون میں اُسکو کوئی سزا دیجائیگی؟ اگر ایشور سزا نہ دے، تو آریہ دھرم کی بنیاد پر وہ ظالم ٹھہرتا ہے کہ خطاکار کو سزا نہ دینا اور عفو کرنا بھی اس مذہب میں ظلم ہے۔ نیز اس تقدیر پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان کی نجات کے لیے وید پر عمل کوئی ضروری چیز نہیں ہے، بلکہ بُری سے بُری پُر جرائم زندگانی بسر کرنے پر بھی نجات مل سکتی ہے، اور اس سے تناسخ کے تار مکڑی کے جالوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں کہ بغیر عملوں کے بلکہ باوجود بُرے عملوں کے نجات مل گئی، تو عمل پر جزا کا مدار نہ رہا۔ اور اگر ایشور اُس بھنگی پر عذاب کرے، اور اُسکو کسی بُری جون میں گرفتار کرکے سختی و مصیبت میں مبتلا کرے، تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر مجھے پنڈت کے گھر میں پیدا کیا ہوتا، اور وید کی تعلیم میرے کان میں پڑی ہوتی، اور پھر میں نے اطاعت نہ کی ہوتی، تو میں مجرم ہو سکتا تھا۔ جب مجھے ایسی جگہ پیدا کیا جہاں وید کی صدا سے کان آشنا ہو ہی نہیں سکتے تھے، اور ایسی صحبتیں تھیں جہاں ان باتوں کا کبھی تذکرہ بھی نہ تھا، تو پھر وید پر عمل کرنا میرے امکان میں کہاں تھا، اور کسی ناممکن بات کے نہ کرنے پر کوئی شخص کیسے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس اعتراض کا ایشور کے پاس کیا جواب ہے؟ ظاہر ہے کہ کچھ جواب نہیں۔ پھر بھی اگر اُسکو سزا دے، تو یہ سزا بے سابقہ جرم ظلم ہو گی۔

اسی طرح اُن ممالک کے رہنے والے جہاں زبان تو کیا، وید کے نام اور وید کے ماننے والوں سے بھی لوگ واقف و آشنا نہیں ہیں، اور اُن کو خبر نہیں ہے کہ وید کوئی چیز بھی ہے یا نہیں۔ کیا انھیں بھی وید پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے گرفتار کیا جائیگا یا نہیں؟ اور سزا دی جائے گی یا نہیں؟ اگر دی جائے گی، تو سزا بے جرم ہے، نہ دی جائے گی تو عمل بارہے سزا نہیں۔

کہیئے تناسخ کتنا عاقلانہ اعتقاد ہے؟ اسکا اُسی زمانہ میں چلن ہو سکتا تھا، اور یہ سکہ جبھی رواج پا سکتا تھا، جب انسان وحوش کی طرح زندگانی بسر کرتے تھے، اور علم و خرد سے اُنکو سروکار نہ تھا آج جب دنیا کے ہاتھ میں علم کی نورانی مشعلیں ہیں، تو اُن کو تاریک گڑھے میں گرا لینے کی توقع عبث ہے خلاصہ یہ ہے کہ حیوانات کی جونیں دار العمل اور دار الجزاء دونوں تو ہو نہیں سکتیں، اسکا بطلان تو ظاہر ہو چکا۔ اب صرف تین صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام جونیں دار العمل ہوں، تو پوچھا جائیگا کہ جزا کہاں دیجائیگی، اور زندگی میں جو تکلیفیں یا راحتیں پہنچیں، وہ کیوں پہنچیں؟ کیونکہ آریہ کے نزدیک رنج و راحت جزا یا سزا میں منحصر نہیں ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوا کہ آریہ اصول کی بنا پر یہ جونیں تنہا دار العمل بھی نہیں ہو سکتیں۔ تو دوسری صورت یہ ہے کہ تمام جونیں دار الجزاء ہوں۔ اس صورت میں دار العمل کا پتہ دینا ہوگا کہ وہ کونسی ولایت ہے جہاں کے عملوں کی پاداش ان جونوں میں دیجاتی ہے یہ بتانا بھی آریوں کو محال سے کم نہیں۔ اب تیسری صورت صرف یہ باقی رہتی ہے کہ بعض جونیں دار العمل ہوں، اور بعض دار الجزاء۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جو جونیں دار الجزاء قرار دی جائیں اُنمیں جیو صرف پچھلے کرم یعنی اعمالِ سابقہ کا پھل بھوگیں اور بدلہ پائینگے، اور اُن پر تکلیفی احکام، فرائض اور منہیات کچھ نہ ہونگے۔ اگر ایسا ہے، تو اِس جون کے بعد پھر دوسری جون انسانی خواہ حیوانی کوئی بھی ہو، اُنھیں کس استحقاق میں ملے گی؟ اگر بے استحقاق ملی، تو راحت و رنج اور داد و دہش کیلیے تقدمِ عمل ضروری نہیں رہتا، اور تناسخ کی بنیاد برباد ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس جون میں کچھ اُن پر تکلیفی احکام بھی ہوں، جن پر عمل کرنے سے وہ آئندہ اچھا جنم اور سُکھ پانے کے مستحق، اور خلاف کرنے پر سزا اور عذاب کے مستوجب ٹھہریں، تو یہ جون تنہا دار الجزاء نہ رہی۔ اور باوجود اس کے یہ سوال ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل کے لیے انسانوں کی طرح دوسرے جانداروں کے پاس بھی کوئی دستور العمل، کوئی وید کی تعلیم دینے والا پنڈت پہنچتا ہے، جو ایشور کی مرضی اور نامرضی یعنی نیک و بد افعال کے امتیاز بتائے، اور وید کی وہ تعلیم اُن تک پہنچائے جو آریہ اعتقاد میں نجات کیلیے ضروری ہے۔ اگر اُنکے لیے کوئی وید و پنڈت ہے، تو کہاں، کس صورت میں، کسطرح تعلیم دیتا ہے؟ ثبوت دیجیئے، اور نہیں تو انسان کو ہر جنم میں باوصف کمالِ ادراک ایک دستور العمل اور وید دیا جائے اور اُسکی رہنمائی کیجائے، اور کمزور حیوانات کو جو عقل و خرد میں انسان سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتے اُن احکام کی خبر تک نہ دیجائے جن پر عمل کرنا اُنکی نجات کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔ پھر انھیں ماخوذ کرنا، اور سزا دینا عقلاً کب درست ہے۔ خود پنڈت دیانند صاحب نے اسی سورۂ فاتحہ شریفہ پر زبان کھولتے ہوئے لکھا ہے:-

"جس کتاب میں طرفداری کی باتیں پائی جاویں وہ کتاب خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً عربی میں نازل کرنے سے عرب والوں کو اسکا پڑھنا سہل اور دوسری زبان والوں کو مشکل ہو جاتا ہے، اس سے خدا طرفدار ٹھہرتا ہے، اور جسطرح خدا نے کل دنیا کے رہنے والے آدمیوں پر نظرِ انصاف سے سب ملکوں کی زبان سے نرالی سنسکرت زبان میں جو سب ملک والوں کے لیے یکساں محنت سے حاصل ہوتی ہے، ویدوں کو نازل کیا ہے، ایسی ہی زبان میں اگر قرآن کو نازل کرتا تو یہ نقص عائد نہ ہوتا۔" (ستیارتھ پرکاش ملخصاً)

خود اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ماننا پڑیگا کہ انسانوں کو وید دینے اور حیوانوں کو محروم رکھنے سے ایشور پر طرفداری اور ظلم کا الزام آتا ہے، جبکہ وہ بھی انسانوں کی طرح مکلّف ہیں، اور اُنھیں بھی نیک و بد اعمال کی سزا ملتی ہے۔ ———— اسکے ساتھ ہی یہ بھی بتانا ہوگا کہ وہ جانور جنکی غذا گوشت پر منحصر ہے، اور اُنکی زندگانی کا دار و مدار شکار پر ہے، جو کبھی گھاس اور دانہ کی طرف التفات نہیں کرتے اور یہ اُنکی نوع کا خاصہ ہے، جو اُنکے تمام افراد میں پایا جاتا ہے اور کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں ملتا۔ کیا اُنکی یہ خوراک گناہ یا جرم ہے؟ ایسا تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ شکار اور گوشت خوری اُنکا طبعی مقتضاء ہے، اُنکے بنانے والے نے، اُنکے پیدا کرنیوالے نے اُنکی فطرت میں یہ اقتضاء رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو اُنکا کوئی فرد تو ترکِ گوشت کرتا، یا سب نے ملکر اتفاق کر لیا ہے کہ ایشور کے قانون کو توڑنا چاہیئے، وہ بھی نان کو اپر یشر ہو گئے ہیں، یہ بھی بداہۃً باطل، تو لامحالہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ گوشت اُنکی جائز غذا، اور مباح خوراک ہے۔ اور گوشتوں میں بھی یہانتک وسعت کہ ہندوؤں کی گئو ماتا تک سے اُنھیں درگزر نہیں۔ آیا گوشت کی اباحت اور شکار کا جواز اُنھیں وید کا عطا کردہ انعام ہے؟ ———— اِس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ جو وید اُنکے لیے گوشت کو جائز کرتا ہے دوسرے حیوانات کیلیے کیوں ناجائز کرتا ہے؟ ——— دیکھا آپ نے تناسخ کا ثمرہ اور آواگون کا تماشا!

پنڈت دیانند صاحب سے پوچھو کیا ہوئیں اُنکی تعلّیاں۔ اسی مُنہ سے قرآنِ پاک پر اعتراض کرتے تھے۔ مگسِ فضلہ خوار را الشہباز سے آہنگ ہمسری۔

مگر یہ دعوی جانچنے کے قابل ہے کہ وید تمام بنی نوع انسان سے نسبت برابر رکھتا ہے۔ اول تو ایسی زبان میں ہونا جو کسی ملک میں نہ بولی جاتی ہو، کسی قوم کی زبان نہ ہو، اک مسخرگی انسانوں کی تعلیم کیلیے جو کتاب ہوگی ضرور ہے کہ انسانوں کی زبان میں ہوگی۔ اس سے بھی قطعِ نظر کیجئے، تو میں پوچھتا ہوں کہ رشی جنکو آریہ کے خیال میں وید کا الہام ہوا، وید کی زبان کو سمجھتے تھے یا نہیں؟ اگر سمجھتے تھے تو کسطرح۔ آیا وہ اُنکی مادری زبان تھی؟ یہ تسلیم کیجیئے تو وہ زبان تمام انسانوں کیلیے یکساں دشوار نہیں رہی۔ اگر سنسکرت رشیوں کی مادری زبان نہ تھی، اور اُنکے لیے بھی اتنی ہی مشکل تھی، جتنی آج یورپ و امریکہ والوں کیلیے ہے، تو سوال یہ ہے کہ اُنھوں نے وید کو کیسے سمجھا؟ اور جو ذریعہ وید کی تفہیم کا ایشور نے اُنھیں دیا تھا، اور اسبابوں سے وید کا سمجھنا اُنھیں آسان کیا تھا، وہی اسباب دوسروں کو کیوں نہ دیئے؟ اس سے تو ایشور طرفدار ٹھہرتا ہے، اور اُسکا انصاف پنڈت جی کے قانون سے رفوچکر ہوا جاتا ہے۔

اب پنڈت جی بتائیں کہ رشیوں کیلیے ذریعۂ علم کیا ہے؟ اور جو اُنکے لیے ہے دوسروں کیلیے کیوں نہیں؟ اس طرفداری کا پنڈت جی کے پاس جواب کیا ہے؟ یا یہی الزام وہ وید کو بھی لگاتے ہیں۔ اور قرینِ انصاف تو ہے کہ جو اعتراض انھوں نے دوسری کتابوں کی نسبت کیا جب وہ خود اُنکی کتاب پر عائد ہوتا ہو، تو وہ اُسکو تسلیم کر لیں۔ وہ تسلیم کریں خواہ نہ کریں مگر عقلاً جانتے ہیں کہ پنڈت صاحب اپنے اعتراض کی زد میں خود ہی آ گئے، اور اُنکے لیے اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ رہی۔

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را ❊ چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

سُورۂ بقرہ

سُورۃ قرآنِ پاک کے اُس حصّہ کو کہتے ہیں جسکے لیے اوّل و آخر معیّن ہو، اور شریعت نے اُسکو کسی خاص نام کے ساتھ موسوم فرمایا ہو۔ اسی لیے سُورتوں کے اَسماء توقیفی ہیں، یعنی حضورِ اقدس نبیِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے منقول ہونے پر موقوف ہیں۔ ایک سُورۃ کے لیے کبھی ایک ہی نام ہوتا ہے، اور کبھی زیادہ نام ہوتے ہیں۔ اس سُورۃ مبارکہ میں بقرہ کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، جس سے بیشمار حکم و حِکَم مستفاد ہوتے ہیں۔ اس مناسبت سے اس سورۃِ مبارکہ کا نام "سورۂ بقرہ" ہے۔

سُورتوں کے نام زمانۂ صحابہ میں مصاحف میں ثبت نہیں کیے جاتے تھے، یہ دستور حجاج نے نکالا۔

قرآنِ پاک کے حق میں اللہ سبحانہٗ نے فرمایا اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْن، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس کتابِ پاک کے ہم خود محافظ ہیں، یہ وعدہ دوسری کتابوں کے حق میں نہیں فرمایا اسی لیے اُن میں تحریفیں ہوئیں تبدیلیں ہوئیں، مگر قرآنِ پاک حفظِ الٰہی میں ہے اسکے کسی حرف میں فرق نہیں آسکتا۔ تغیراتِ عالم کے لمبے لمبے ہاتھ اسکے دامن تک پہنچنے سے کوتاہ ہیں۔ زمانے پلٹ گئے، دنیا بدل گئی، آبادیاں ویران ہوئیں، ویرانے آباد ہوئے، خشک صحراء اور بیابانوں میں نہریں اور چشمے موجیں مارتے نظر آنے لگے، بڑے بڑے دریا خشک ہو گئے۔ صفحاتِ کائنات میں محو و اثبات سے عجیب و غریب تبدل و تغیر ہوئے، مگر قرآنِ پاک کے کسی حرف میں فرق نہ آیا، زمانہ اُسکے بدلنے سے عاجز رہا حفظِ الٰہی کا اثر ہے کہ قرآنِ پاک سینوں کے خزانوں میں محفوظ ہے جہاں بدنیت خائنوں کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے۔ یہ کتابِ پاک عجیب شان سے محفوظ ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب بھی اس شان سے محفوظ نہیں کی گئی۔ سُورتیں معدود، رکوع محدود، آیات، کلمات، حروف، حرکات، سکنات، ایک ایک گنے ہوئے۔ آیات کا وقتِ نزول، شانِ نزول، مقامِ نزول بتایا گیا پھر حروف کی شمار بھی کئی طرح ہے، یوں بھی کہ کُل حروف قرآنِ پاک میں کتنے ہیں، اور یوں بھی کہ الف کتنی جگہ آیا، اور (ب) کتنی جگہ، اور اسکے علاوہ بہت طریقوں سے محفوظ کیا گیا۔ اس شان کے ساتھ دُنیا میں کسی کتاب کی حفاظت نہ ہوئی۔

جسطرح سُورتوں کے نام توقیفی ہیں اُسی طرح آیات اور سُوَر کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔ جب کوئی سُورۃ تمام ہوئی، یا کوئی آیت نازل ہوئی، تو حضرتِ جبریل علیہ السلام حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کرتے کہ اِس سُورۃ یا آیت کی جگہ فلاں سُورۃ، یا آیت کے قبل، اور فلاں سُورۃ یا آیت کے بعد ہے۔

اس سُورۃِ مبارکہ میں دو سو چھیاسی یا ستاسی آیتیں ہیں۔ یہ اختلاف اسوجہ سے ہے کہ مثلاً مصحفِ کوفی میں ایک جگہ آیت مانی گئی، اور دوسرے میں نہ مانی گئی۔ یعنی ایک مصحف میں جسکو ایک آیت قرار دیا گیا ہے، دوسرے میں اُس کو دو آیتیں مانا گیا ہے۔

اس سُورۃ میں رکوع چالیس، اور چھ ہزار ایک سو اکیس کلمے، پچیس ہزار پانچسو حرف ہیں۔ ابنِ عربی رحمۃ اللہ کا قول ہے کہ سُورۃ بقرہ میں ہزار امر ہزار نہی ہزار حکم ہزار خبریں ہیں۔

سُورۂ بقرہ کی خصوصیات

یہ پہلی سُورۃ ہے جو مدینۂ طیبہ میں نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیۃ وَاتَّقُوا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ حجِ وداع میں بمقام مکّہ مکرمہ نازل ہوئی، باقی کُل سُورۃ کا نزول مدینۂ طیبہ میں ہُوا۔

مکّی اور مدنی آیات کی تعریف میں مفسرین کے چند اقوال ہیں، اُن میں سب سے راجح قول یہ ہے کہ مکّی وہ آیت ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی، خواہ مکّہ مکرمہ میں یا کسی اور مقام میں۔ گویا آیت کے مکّی ہونے کا مدار حضور پُرنور سیدِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اقامتِ مکّہ مکرمہ پر ہے کہ جب تک وہ سَرورِ ذیجاہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات مکّہ مکرمہ میں متوطن رہے، اُسوقت تک جو کچھ نازل ہوا مکّی ہے، اور بعد ہجرت جب اُس محبوبِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مدینۂ طیبہ کو اپنی اقامت سے سرفراز فرمایا، اور مدینۂ طیبہ کو وطنِ محبوب ہونے کا شرف حاصل ہُوا، اُس زمانہ میں جو آیت نازل ہوئی، وہ مدنی ہے، خواہ کسی مقام پر نازل ہو حتیٰ کہ مکّہ مکرمہ یا عرفہ میں بعد ہجرت جو آیت نازل ہو، وہ بھی مدنی ہے۔ اس تقدیر پر کُل سُورۃ کو بلا استثناء مدنی کہنا صحیح ہے۔

(۲) :- یہ سُورۃِ مبارکہ قرآنِ پاک کی سُورتوں میں سب سے بڑی سُورۃ ہے۔

(۳) :- اس سُورۃ میں احکام امثالِ حج تمام سورتوں سے زیادہ ہیں۔ اسی لیے اُس کو فسطاط القرآن کہا گیا ہے۔

(۴) :- جو سُورتیں حروفِ مقطعہ کے ساتھ شروع کی گئیں، یہ اُن میں پہلی سُورۃ ہے۔

سورۃ فاتحہ کو حروفِ مقطعہ کے ساتھ شروع نہ کیا گیا۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ سُورۃِ فاتحہ کتابِ مجید کا خطبہ ہے، اور خطبہ میں حمدِ الٰہی ضرور، اور حمدِ الٰہی کے لیے ایسے کلمات مناسب، جن میں رمز و ابہام نہ ہو۔ ہر شخص اُن سے قدرِ استطاعت و استعداد مستفیض و مستفید ہو سکے۔

علاوہ بریں حروفِ مقطعہ معارضہ و تحدی پر مشتمل، اور حمد اُس پر مقدم۔ مع ہٰذا اس میں اشارہ ہے کہ علمِ ظاہر کو علمِ اسرار پر تقدم ہے، پہلے متعلم اسکی تحصیل کرے تب اُس پر اسرار منکشف ہوں۔

سُورۂ بقرہ کے فضائل

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآنِ پاک کی تلاوت کرو کہ وہ روزِ قیامت اپنے اصحاب کا شفیع ہو کر آئیگا۔ دو روشن سورتوں (بقرہ و آلِ عمران) کو پڑھو کہ وہ روزِ قیامت ابر کی طرح سایہ گستر ہونگی، یا پرندوں کی صف بستہ جماعت کی طرح آکر اپنے پڑھنے والے کی طرف سے اظہارِ حجت کرینگی۔ سورۃِ بقرہ کو پڑھو، اُسکو لینے میں برکت، چھوڑنے میں حسرت ہے، اور باطل کار (جادوگر) اسکی استطاعت نہیں رکھتے۔ دوسری حدیث حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، اُس میں حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ شیطان اُس گھر سے بھاگ جاتا ہے، جس میں سُورۃِ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ دونوں حدیثیں امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیں۔

بزرگوں کا طریقہ ہے کہ جب کوئی بیمار ہو، اور مرض طول پکڑ جائے، علاج نفع نہ دے، تو اُس مکان میں سورۃ بقرہ پڑھوایا کرتے ہیں، کیونکہ اکثر اَمراض کی نسبت حدیث شریف میں ارشاد ہُوا کہ وہ شیطان علیہ اللعن کی خلش سے ہوتے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت اسید ابنِ حضیر انصاری جو افاضلِ صحابہ اور نقباءِ انصار سے ہیں، اُنھوں نے فرمایا کہ وہ شب میں سورۃ بقرہ کی تلاوت فرما رہے تھے، اور اُنکے قریب اُن کا گھوڑا بندھا ہوا تھا، یکایک اُن کا گھوڑا شوخی کرنے لگا، تو آپ خاموش ہوگئے، آپ کے خاموش ہوتے ہی گھوڑے کو بھی سکون ہو گیا۔ پھر آپ نے پڑھنا شروع کیا، پھر اُسی طرح گھوڑے نے شوخی شروع کی، پھر آپ خاموش ہوئے، پھر دوبارہ بھی گھوڑے کو سکون ہو گیا۔ پھر آپ نے پڑھا، پھر اُس نے شوخی کی۔ تین بار ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور پڑھنا آپ نے ختم کر دیا۔ آپ کے فرزند یحییٰ گھوڑے کے قریب تھے، آپ کو خوف ہوا کہ گھوڑے کے بدکنے سے اُن کو کوئی آزار نہ پہنچے، تو آپ نے صاحبزادہ کو اُٹھا کر گھوڑے سے دور کر دیا، اور آسمان کی طرف جو نظر اُٹھائی، تو دیکھا کہ روشن چراغوں کا ایک سائبان ہے۔ صبح کو یہ واقعہ حضورِ اقدس علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی خدمت میں عرض کیا، حضور نے فرمایا کہ اے ابنِ حضیر پڑھو۔ اور یہ کلمہ مکرر فرمایا، جس سے مُراد قرأت پر مداومت ہے۔ اسکے جواب میں اسید ابنِ حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معذرۃً عرض کیا کہ یا رسول اللہ، میں ڈر گیا کہ کہیں گھوڑے کے بدکنے سے یحییٰ کچل نہ جائیں، جو اُسکے قریب ہی تھے، اسی وجہ سے میں یحییٰ کے قریب چلا گیا، اور میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھایا، تو میں نے ایک سائبان سا دیکھا جس میں چراغوں

کی طرح بہت سی روشنیاں ہیں، پس میں باہر نکلا جب تک کہ وہ نظر آتی رہیں۔ حضور نے فرمایا کہ تم جانتے ہو وہ کیا تھا؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا وہ ملائکہ تھے، جو تمہاری تلاوت کی آواز سے قریب ہو گئے تھے، اور اگر تم پڑھتے رہتے، تو وہ فرشتے صبح تک اُسی حال میں رہتے اور آدمی اُنھیں دیکھ لیتے اور وہ اُن سے نہ چھپتے۔

مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اپنے مکانوں کو قبرستان نہ بناؤ، یعنی ذکر و تلاوت و عبادت سے خالی نہ رکھو۔ شیطان اُس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۃ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔ مسلم شریف ہی میں نواس بن سمعان صحابی سے مروی ہے، اُنھوں نے کہا میں نے سُنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ روزِ قیامت قرآن اور اہلِ قرآن، یعنی وہ لوگ جو اُسکے احکام پر عمل کرتے ہیں؛ لائے جائینگے اور سورۂ بقرہ اور آلِ عمران قرآن کی پیشوائی کرینگی۔ گویا کہ یہ دونوں سورتیں ابر ہیں یا سائبانِ سیاہ ہیں، اور ان دونوں کے درمیان فصل و تمیز کے لیے فرق ہے، یا وہ دونوں پرندوں کی صف بستہ جماعتوں کی طرح ہیں، جو اپنے پڑھنے والے کی طرف سے حجت پیش کریں گی۔

سُنن ترمذی شریف میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہر شے کے لیے ایک بلندی ہے، اور قرآن کی بلندی سورۃ بقرہ ہے اور سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے کہ وہ آیاتِ قرآنیہ کی سردار ہے، وہ آیۃ الکرسی ہے۔

مسلم شریف میں بروایت حضرت اُبَی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا، اے ابا منذر کیا تم جانتے ہو کہ کتاب الٰہی کی کونسی آیت تمہارے ساتھ ہے، جو بزرگ ہو؟ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا، اللہ اور اُسکا رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام داناتر ہیں۔ پھر حضور نے یہی دریافت فرمایا کہ کونسی آیت بزرگ ہے؟ میں نے جواب دیا اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم یعنی آیۃ الکرسی۔ اُبَی ابنِ کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نے اپنا دستِ مبارک میرے سینہ میں مارکر فرمایا کہ تجھے علم مبارک ہو اے ابو منذر۔ پہلی مرتبہ حضرتِ اُبَی ابنِ کعب سوال کا جواب عرض نہ کرسکے تھے، دوسری مرتبہ بے تکلف جواب عرض کردیا۔ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تصرفِ القائی تھا کہ ایک توجہ سے حضرتِ اُبَی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینۂ میں علم کا افاضہ فرمایا، اور جواب صحیح عرض کرنے پر علم کی بقاء و رسوخ کی دُعا فرمائی۔

حضرت ابو عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ طیبہ کے مشائخ سفید ریش سے روایت کی کہ ایک روز صبح کے وقت انصار کے محلہ کے لوگ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوئے اور اُنھوں نے عرض کیا، یارسول اللہ آج رات ہمارے محلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ ثابت بن قیس بن شماس کا تمام مکان بہت تیز روشنی والے چراغوں سے بھرا ہوا تھا اسکا سبب سمجھ میں نہیں آیا؟ ارشاد فرمایا کہ ثابت نے اپنے مکان میں سورۂ بقرہ پڑھی ہوگی، اُن سے دریافت کرو۔ لوگوں نے حضرتِ ثابت سے دریافت کیا، رات آپ نے تہجد میں کیا پڑھا تھا؟ فرمایا سورۂ بقرہ۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرتِ ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۂ بقرہ کو اُس کے حقائق و دقائق کے ساتھ بارہ سال کے عرصہ میں تمام فرمایا، اور ختم کے روز ایک اُونٹ ذبح فرماکر بہت کھانا پکاکر اصحاب کی دعوت کی۔

سورۃ البقرۃ مدنیۃ وھی مائتان وست وثمانون اٰیۃ واربعون رکوعا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ بقرہ مدنی ہے اس میں دو سو چھیاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں — اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۚۖۛ فِیْهِ ۚۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ

وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں اور نماز قائم

الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ

رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں اور وہ کہ ایمان لائیں اُس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اُترا

وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ؕ اُولٰٓىٕكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اور آخرت پر یقین رکھیں وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مراد کو پہنچنے والے

الٓمّٓ سُورۂ بقرہ اُن انتیس [۲۹] سورتوں میں سے ہے جن کی ابتداء حروفِ مقطعہ کے ساتھ فرمائی گئی۔ یہ الفاظ جنکے ساتھ ہجا کی جاتی ہے، اُن حروف کے اسماء ہیں جن سے کلمات مرکب کیے جاتے ہیں، مثلاً قاف قال کے حرفِ اوّل کا اور الف اسکے حرف اوسط کا اور لام اُسکے آخر کا اسم ہے۔ اسی وجہ سے اسم کی تعریف (استقلال بالمفہومیت) ان پر صادق آتی ہے، اور اسم کے احکام و خواص امالہ، تفخیم، تعریف، جمع، تنکیر، تصغیر، وصف اضافت وغیرہ ان پر جاری ہوتے ہیں، خلیل اور ابو علی کا یہی قول ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں وارد ہوا کہ جس شخص نے قرآنِ پاک کا ایک حرف پڑھا اُسکو ایک نیکی ملے گی اور نیکی کا بدلہ دس گونا ہوگا لا اقول الٓمّٓ حرف بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمّٓ کل ملکر ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف۔ اس حدیث میں الف اور لام اور میم کو حرف بتایا گیا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ حدیث میں لفظ حرف اپنے معنیِ اصطلاحی میں نہیں ہے، بلکہ اسکے معنی لغوی (کلمہ یا طرف) مراد ہیں۔ سورتوں کا افتتاح ان حروف کے ساتھ کیا گیا، اس میں تنبیہ ہے کہ قرآنِ پاک کی نظم اُن ہی حروف سے ہے جن سے سب لوگ اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں، تو اگر یہ کتاب حضرت قادرِ بے مثال کی طرف سے نہ ہوتی، تو تمام دُنیا، اور بڑے بڑے فصحاء اور زبان آور اسکی کسی ایک سُورۃ کا مثل بنانے سے عاجز نہ ہوتے، باوجودیکہ کلام کی ترکیب کا مادّہ اُنکے پاس موجود تھا لیکن مثل بنانا تو بہت دُور رہا۔ قرآنِ پاک کے بہت غیرت دلانے، تحدی فرمانے سے عرب کے فصحاء و بلغاء میں جوشِ مقابلہ پیدا ہوا، اور قرآنِ پاک کے یہ فرمادینے سے کہ تم اس کتاب مقدس کی ایک سُورۃ کی مثل تو بنا لاؤ، اپنے معبودوں سے بھی مدد لو۔ اور اسکے ساتھ یہ بھی اعلان کہ یہ تم سے نہ ہو سکے گا، اس کتاب کا مثل بنانا تمہارے مقدور سے باہر ہے۔ یہ سُنکر عربوں کی رگوں میں جوش کا سمندر طوفانی موجیں مارنے لگا، مقابلہ کی آگ اُن کے دلوں میں بھڑک اُٹھی، اور زبان دانی کے ماہر، فصاحت و بلاغت کے عارف باہمہ گر ملکر قرآنِ پاک کے مقابلہ میں کوئی چھوٹی سی عبارت بنانے پر تل گئے، بہت عرق ریزیاں کیں، بہت کوششیں کیں، رات دن اسی دُھن میں گزارے، مدتیں محنتوں میں بسر کیں، لیکن وہ تمام محنتیں رائیگاں گئیں، اور کوئی عبارت ایسی بھی نہ بن سکی جو قرآنِ کریم کی فصاحت سے کچھ نسبت ہی رکھتی۔ اپنی عبارتوں کو اپنے ہی ہاتھوں چاک کیا، اور اپنے علم و دماغ کو صرف کرکے، اپنے اعوان و انصار اور شہرۂ آفاق فصحاء سے مددیں لیکر جو کچھ بنایا، اُسکو اُنھوں نے خود قرآنِ پاک کے مقابل پیش کرنے کے قابل نہ سمجھا، تو ثابت ہو گیا کہ یہ کلام اگر بشر کا ہوتا، تو کیا وجہ تھی کہ فصاحت و بلاغت کے ماہر، علم و ہنر کے اُستاد سب کے سب اس کی مثل کوئی چھوٹی سی عبارت بنانے سے بھی عاجز رہتے۔

سُورتوں کے اوّل میں اسماءِ حروف لاکر تنبیہ فرمائی کہ اس کلام معجز کا عنصر بھی حروف ہیں، جنکے موجود ہوتے ہوئے بشری قدرت اس کلام پاک کا مثل نہیں بنا سکتی۔ یہ اتم دلیل اور قوی بُرہان ہے کہ یہ کتابِ مقدس خدا کی کتاب ہے۔

دوم اُمّی بات چیت تو کر لیتے ہیں، لیکن وہ حروف کے نام نہیں جانتے، تو یہ ایک اور معجزہ کا اظہار ہے کہ ایک اُمّی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، جنہوں نے نہ دنیا میں کسی سے پڑھنا لکھنا سیکھا، نہ لکھنے پڑھنے والوں کے ساتھ انکو مخالطت رہی، وہ اسماءِ حروف کے سا نطق فرمائیں۔ یہ بالکل خارق عادت، اور اُمّی سے مستغرب مستبعد ہے، تو یہ وجہ ایک اور معجزہ ہے۔ اور جب ان حروف کے ایراد کی خصوصیت پر نظر کیجاتی ہے، تو یہ معجزہ اور ظاہر تر ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ اسماء قرآن پاک کی سورتوں میں اسطرح وارد کیے گئے ہیں کہ ادیب اریب، فائقِ فن ان رعایتوں کے ساتھ اتنے حروف کے وارد کرنے سے عاجز ہے، اور اگر یہ پابندیاں اُس پر لازم کی جائیں، تو وہ اتنے حروف کا اسطرح ذکر کر دینا ناممکن سمجھے گا۔

کُل حروف کی تعداد اُن لوگوں کے نزدیک اٹھائیس ۲۸ ہے جو الف کو حرفِ مستقل شمار نہیں کرتے، اور جو الف کو حرفِ مستقل شمار کرتے ہیں، اُنکے نزدیک انتیس ۲۹ ہے۔ مذہب ثانی پر جتنی کُل حروف کی تعداد ہے، اُتنی سورتوں میں حروفِ مقطعہ وارد کیے گئے۔ کُل حروف جو فواتح سُوَر میں لائے گئے ہیں، مکررات ساقط کر کے چودہ ۱۴ ہیں، جو مذہب اول پر کُل حروف کی تعداد کے نصف ہیں۔ تو اب یہ سمجھئے کہ کل حروف کے نصف حروف اُتنی سورتوں میں لائے گئے، جتنی کُل حروف کی تعداد ہے، مگر یہ کونسے نصف لائے گئے، اور کونسے نصف چھوڑے گئے۔ اس میں جن دقائق اور جن نکات کی رعایت رکھی گئی ہے، وہ عقل کو حیرانی میں ڈالدیتے ہیں اُن میں سے ایک بات یہ ہے کہ ہر ایک حرف کے لیے کچھ صفات ہیں، اُنتیس ۲۹ سورتوں میں نصف حروف اسطرح لائے گئے کہ ہر صفت کے حروف کا نصف اُن میں آگیا۔ اور پھر جو نصف لائے گئے اور جو کچھ چھوڑے گئے اُنکے ترک واستیصال میں بہت لطیف ودقیق وجوہِ ترجیح موجود ہیں۔ پھر کہیں ایک حرف لایا گیا، کہیں دو ۲ لائے گئے، کہیں تین ۳ لائے گئے، کہیں چار ۴ لائے گئے، کہیں پانچ ۵ لائے گئے، ان سب کی بہت بارک اور قوی وجوہ ہیں، جنکو تفسیر بیضاوی میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس ترتیب کو دیکھ کر ایک عالم متبحر، اور علم و ادب کا ماہر حیرت میں پڑ جاتا ہے، اور وہ جزم ولقین کے ساتھ حکم کرتا ہے کہ جو بات طبقۂ بشر میں کوئی بڑے سے بڑا ماہر بھی نہیں کر سکتا، وہ عالم اُمّی کی زبان سے ادا ہونا یقیناً ایک بڑا معجزہ ہے۔

اب یہاں ایک بحث تو یہ ہے کہ یہ حروفِ مقطعہ کسی معنی پر دلالت بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ قطع نظر اس سے کہ وہ دلالت تمام عوام وخواص کے لیے ظاہر ہو، یا مخصوصین کے سواء اور اُس تک رسائی نہ کر سکیں علماءِ متکلمین نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ یہ حروف مفہمہ یعنی معنی پر دلالت رکھنے والے ہیں، اور انھوں نے بہت آیات واحادیث سے اس مدعا پر دلائل قائم کیے ہیں کہ کتاب الٰہی میں کوئی چیز بے معنی نہیں ہے، اور ادلۂ عقلیہ سے بھی اس کی تائید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کلام کا مقصود ہی افہام ہے، اگر کلام مفہوم نہ ہو، اور اُس سے کوئی معنی نہ سمجھے جائیں، تو مخاطبت عبث اور بیکار ہوگی، اور شانِ حکیم اس سے ارفع واعلیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن حکیم کے ساتھ تحدی کی گئی، اور نامعلوم چیز کیساتھ تحدی کسطرح ہو سکتی ہے۔ بہر تقدیر ان کا علم سرِّ محجوب وراز مستور ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہر کتاب میں ایک راز ہوتا ہے، اور قرآن پاک کا راز اوائلِ سُوَر ہیں۔ بعض عارفین نے فرمایا، عالم بمنزلۂ سمندر اور بحر ناپیدا کنار کے ہے، اُس سے جو کھاڑیاں نکلیں انھوں نے جنگل کے جنگل بھر دیئے۔ پھر اُن سے دریا نکلے، پھر اُن سے چھوٹے چشمے نکلے، پھر اُن سے جدولیں نکلیں، پھر اُن سے اور چھوٹی شاخیں نکلیں، تو اگر جدول میں کھاڑی بہہ نکلے، تو جدول غرق ہو جائے بگڑ جائے، اُسکا نام ونشان باقی نہ رہے اور اگر سمندر کھاڑی جگہ آئے تو اُسکا بھی یہی حال ہو۔ بحورِ علم اللہ کے پاس ہیں، اُن میں سے رسولوں کو اودیہ (کھاڑیاں یعنی سمندر سے نکلنے والے بہت بڑے بڑے دریا) عطا فرمائے۔ رسولوں نے اپنے علوم کے اودیہ سے علماء کو نہریں عنایت کیں، پھر علماء نے عامہ کو جداول بحسب اُن کی قدرت واستطاعت کے ملیں۔ پھر اُن جداول سے چھوٹی چھوٹی شاخیں اُنکے اہالی کو بقدر اُنکی طاقت کے پہنچیں۔ یعنی عقولِ ضعیفہ اسرارِ قویہ کا تحمل نہیں کر سکتیں، جسطرح خفاش (چمگادڑ) کی آنکھ آفتاب کے نور کی برداشت سے عاجز ہے۔ جب تربیتِ انبیاء علماء کی عقول میں نورانیت کا اضافہ کر کے مزید استطاعت پیدا کرتی ہے، تب وہ اَسرارِ نبوت کے برداشت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اسی طرح علماء کی تعلیم جب عوام کی عقول کو صاف کر کے قوت بخشتی ہے، تب وہ اَسرارِ علماء کے برداشت کے قابل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی علماءِ باطن، جنکو دین میں حکماء کہتے ہیں، جب فیضِ نبوت سے اُن کی عقلیں زیادہ متنور اور خوب روشن ہو جاتی ہیں، تو وہ اُن اَسرار کا تحمل کر سکتے ہیں، جن سے علماءِ ظاہر عاجز ہیں۔ شعبیؒ سے ان حروف کی نسبت دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ خدا کا راز ہیں اُن کے درپے نہ ہو۔

ابوظبیان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی، اُنھوں نے فرمایا کہ علماء ان حروف کے ادراک سے عاجز ہیں اور حسین ابن فُضیل نے کہا کہ یہ متشابہات میں سے ہیں۔ تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ یہ ہو سکتا ہے کہ الٓمّٓ اور تمام حروفِ مقطعہ من قبیلِ رموز ومعمیات ہوں، جو دو محبّوں کے درمیان معیّن ہوں اُنکے سواء کوئی اُن پر مطلع نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اِن رموز کو اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اسطرح معیّن فرمایا ہو کہ جس میں مَلَکِ مقرب اور نبی مرسل کی وسعت نہ ہو سکے اور جبریل کی وساطت سے جو کلام کیا جائے، اور جن اَسرار وحقائق کے ساتھ خطاب فرمایا جائے، اُس پر نہ جبریل مطلع ہوں نہ کوئی دوسرا۔ اِس پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام کٓھٰیٰعٓصٓ لیکر نازل ہوئے، تو جسوقت اُنھوں کاف پڑھا، حضور نے فرمایا عَلِمۡتُ دانستم۔ جب اُنھوں نے ہا پڑھا فرمایا عَلِمۡتُ جب پڑھا یا فرمایا عَلِمۡتُ جب پڑھا عین فرمایا عَلِمۡتُ جب پڑھا صاد فرمایا عَلِمۡتُ۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا، حضور نے کیسے جان لیا جسکو میں نے نہ جانا۔

شیخ عبد الرحمٰن بسطامی قدس سرہ السامی نے "بحر الوقوف" میں فرمایا کہ بعض انبیاء اَسرارِ حروف کو وحی ربانی والقاءِ صمدانی سے جانتے ہیں، اور بعض اولیاء کشفِ نورانی و فیضِ روحانی سے، اور بعض علماء نقلِ صحیح وعقلِ رجیح سے، اور یہ حضرات کبھی اپنے اصحاب کو اُسکے بعض اَسرار پر مطلع فرماتے ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسرارِ حروف کا علم اکثر اُمت سے مخفی رکھا ہے کہ اس میں حِکَمِ الٰہیہ اور مصالحِ ربانیہ ہیں۔

تاویلات حروفِ مقطعات کے معلوم المراد ہونے میں علماء کے کلام کا بالاختصار ذکر کیا جا چکا، طریق اسلم یہی ہے کہ اسکو اللہ ورسول کے درمیان راز سمجھکر تعینِ مُراد کے درپے نہ ہوں، اور انکے علم کو اللہ ورسول کی طرف تفویض کریں، اور جو اس کی مُراد ہے اُس پر سچی فرمانبرداری کے ساتھ ایمان لائیں۔ مؤمن کی شان یہی ہے اور خدا شناسی کا یہی مقتضاء ہے کہ بندہ اپنے مالک ومولیٰ کے علم وحکمت پر یقین کامل رکھے، اور اُسکے دقائقِ حکمت تک جہاں بندہ کی عقلِ ناقص رسائی نہ کر سکے وہاں تردد وانکار کو راہ نہ دے کہ یہ شیوۂ متمردین ہے، اور شانِ بندگی سے دُور۔

ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کو ان فواتح کی مُراد پر مطلع فرمایا ہو۔ اسی لیے اہلِ علم کا ایک طبقہ انکو معلوم المراد کہتا ہے، اور انکی مراد میں اُنھوں نے بہت سے وجوہ ذکر کیے ہیں۔ یہ ذکر صرف اپنی عقل اور تخیلِ محض پر نہیں ہے، بلکہ روایات پر نظر کر کے، اور دلائل میں فکر کر کے وہ جن نتائج تک پہنچے، اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے جو علم اُن پر منکشف ہُوا، اپنی حدِ معلومات تک اُنھوں نے بیان کیا۔ ضروری نہیں ہے کہ مُراد انھیں وجوہ میں منحصر ہو، اور یہ بھی کہ یہ اقوال باہم متخالف ومتضاد ہوں، بلکہ ایک شے تک جنکو جسقدر رسائی حاصل ہوئی، اور جس عنوان سے وہ جتنی معرفت پا سکے اُسقدر اُنھوں نے ذکر کیا۔ اب ہم یہاں اُن حضرات کے چند اقوال نقل کرتے ہیں:۔

(۱) ۔ یہ حروف اُن سورتوں کے نام ہیں جن میں یہ واقع ہیں، یہ قول اکثر متکلمین کا ہے، خلیل وسیبویہ نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ قفال نے کہا کہ عرب حروف کے ساتھ اشیاء کے

نام رکھتے ہیں، جیسا کہ حارثہ بن لام طائی کے والد کا نام لام ہے۔ اور جسطرح نقد کو عین، ابر کو غین، اور ایک خاص پہاڑ کو قاف، اور مچھلی کو نون کہتے ہیں۔ ان حروف کیساتھ سورتوں کا نام اسلیے رکھا گیا تاکہ اس تسمیہ میں اشعار ہو کہ یہی حروف عنصر کلام ہیں، تو اگر نظم قرآن وحیِ الٰہی نہ ہوتی، تو ان حروف سے ایسے کلام کا مرکب کرنا مقدرتِ بشر سے باہر نہ ہوتا۔

(۲)۔ یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔ حضرت مولیٰ علیِ مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ وہ فرماتے تھے یَا کٰہٰیٰعٓصٓ یا حٰمٓعٓسٓقٓ (رواہ ابن ماجہ) اسطرح ندا کرنا دلالت کرتا ہے کہ یہ اسماءِ الٰہی ہیں۔

(۳)۔ یہ حروف اسماءِ باری کا جزو ہیں۔ اگر لوگوں کو ان کا طریق تالیف معلوم ہو جائے تو وہ اللہ کے اسمِ اعظم پر مطلع ہو جائیں۔ حضرت سعید ابنِ جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا الٓر۔ حٰمٓ۔ نٓ، ان کا مجموعہ اسم الرحمٰن ہے، لیکن باقی اسماء کی کیفیتِ ترکیب پر ہم قادر نہیں۔

(۴)۔ ان حروف میں سے ہر ایک حرف اسماءِ الٰہی میں سے ایک اسم کا مفتاح ہے۔ الف اسمِ اللہ کا، لام اسمِ لطیف کا، میم اسمِ مجید کا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا الٓمٓ میں الف اشارہ ہے اسطرف کہ اللہ احد اول آخر ازلی ابدی ہے، اور لام اشارہ ہے اسطرف کہ وہ لطیف ہے، اور میم اشارہ ہے اسطرف کہ وہ ملک مجید منان ہے۔ اور کٰہٰیٰعٓصٓ میں فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ثناء ہے، جو اُس نے اپنے نفس پر فرمائی۔ اس میں کاف کافی پر، ھا ہادی پر، عین عالم پر، صاد صادق پر دلالت کرتے ہیں

(۵)۔ یہ حروف قرآن کے اسماء ہیں، یہ قول کلبی سدی اور قتادہ کا ہے۔ اسی لیے کتاب و قرآن اس کی خبر واقع ہوتے ہیں، جیسے کہ الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ اور الٓمٓصٓ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اور الٓرٰ الْكِتٰبُ الْحَكِیْمُ وغیرہ میں۔

(۶)۔ الف سے آلاء اللہ، اور لام سے لطفُ اللہ، اور میم سے ملکُ اللہ مراد ہے۔ عرب کا طریقہ ہے کہ وہ کلمہ کا ایک حرف ذکر کر کے کُل مراد لیا کرتے ہیں، جیسا راجز نے کہا قلت لہا قفی فقالت لی قاف۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی مخاطبہ سے کہا قفی ٹھہر جا، تو اُس نے مجھ سے کہا قاف یعنی وقفت میں ٹھہر گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب ایک حرف کو لیکر ایک کلمہ مُراد لے لیا کرتے ہیں۔ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، آپ نے فرمایا الالف آلاء اللہ واللام لطفہ والمیم ملکہ

(۷)۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا یہ قسمیں ہیں۔ اخفش کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف کے شرف و فضل کی وجہ سے، اور اسلیے کہ یہ اُس کی کُتبِ منزلہ اور اسماءِ حسنیٰ اور صفاتِ علیہ کے مبانی اور کلامِ اُمم کے اصول ہیں انکے ساتھ قسمیں یاد فرمائیں۔

(۸)۔ ابو العالیہ کا قول ہے کہ اِن حرفوں میں اقوام کی مدتوں کی طرف اشارہ ہے کہ انکے اعداد سے سمجھا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس یہود آئے، آپ نے الٓمٓ پڑھا، اُنھوں نے حساب لگا کر کہا ہم ایسے دین میں کسطرح داخل ہوں جس کی مدت اکہتر سال ہے۔ حضور نے تبسّم فرمایا تو کہنے لگے کیا اُس کے علاوہ اور بھی ہے؟ حضور نے فرمایا الٓمٓصٓ۔ الٓرٰ۔ الٓمّٓرٰ، تو اُنھوں نے کہا کہ ہم حیرت میں پڑ گئے کہ انمیں سے کسکے ساتھ حساب لگائیں۔ (رواہ البخاری فی تاریخہ)

(۹)۔ الف اقصاءِ حلق سے ادا ہوتا ہے، جو اوّلِ مخارج ہے، اور لام کنارۂ زبان سے جو وسطِ مخارج ہے، اور میم لبوں سے جو آخرِ مخارج ہے۔ انکے جمع کرنے میں اشارہ ہے کہ بندہ کو سزاوار ہے کہ اُس کلام کا اول و اوسط و آخر ذکرِ اللہ ہو۔

(۱۰)۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ الٓمٓ کے معنیٰ انا اللہ اعلم ہیں۔

یہ چند قول یہاں ذکر کیے گئے، اگرچہ مفسرین نے اور بھی بہت سے اقوال ذکر فرمائے ہیں، مگر وہ سب اُن ہی کے قریب قریب ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ج اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے اُن پر ایک ایسی کتاب نازل فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا جس کو پانی نہ مٹا سکے، اور کتنی بھی پڑھی جائے پرانی نہ ہو۔ قرآنِ پاک نازل فرما کر ارشاد فرماتا ہے، یہ وہی کتاب ہے جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اور فی الواقع قرآنِ پاک میں یہ صفت ہے کہ وہ پانی سے دھو کر محو نہیں کیجا سکتی، قلوب میں محفوظ ہے، جہاں تک کسی محو کرنے والے کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا، اور روزانہ اس کی تلاوت کیجاتی ہے، ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے، حفاظ دَور کرتے ہیں، رمضانِ مبارک میں تراویح میں ہر سال سُنائی جاتی ہے، پھر ایک ایک رمضان میں صدہا بلکہ بے شمار ختم ہوتے ہیں، اس پر بھی اس کی لذّت ہر آن ہر دم تازہ ہے، اور اس کی طرف شوق ہر لمحہ بڑھتا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ قرآنِ پاک ختم کرنے کے قاری کو دوسری مرتبہ پڑھنے کا ذوق پہلی مرتبہ سے زیادہ جوش کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی ہزارہا تفسیریں لکھی گئیں، اسکے علوم کا بحر مواج اُسی طرح موجیں مار رہا ہے، معانی کے غواص اُسی شوق کے ساتھ آرزومند غواصی ہیں۔ کہنگی کو اسکے دامنِ خوبی تک رسائی نہیں۔ یہی حال اس کے برکات کا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ایک کتاب نازل فرمائیگا، اور حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمائیگا۔ جب حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی، اور وہاں یہود بکثرت تھے، تب یہ آیت نازل فرمائی الٓمٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کا میں نے زبانِ موسیٰ پر وعدہ فرمایا تھا۔

ایک معنی مفسرین نے یہ بھی بیان فرمائے ہیں کہ ذٰلِكَ ھُوَ الْكِتٰبُ یعنی کتاب یہی ہے۔ مطلب یہ کہ وصفِ کمال میں یہ کتاب اپنا عدیل و مثال نہیں رکھتی، تو جہاں یہ کتاب ہو، وہاں اسکے مقابلہ میں دوسری کتب پر کیا نظر پڑے۔ جسطرح کہتے ہیں روشن تو آفتاب ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ چاند اور ستارے اور شمع اور چراغ سب بے نور محض ہیں، بلکہ یہ مطلب ہے کہ روشنی کا کمال آفتاب میں ہے، اُسکے مقابل اِس وصف میں دوسرا کوئی قابلِ ذکر و التفات نہیں۔ اسی طرح یہاں ارشاد فرمایا کہ دنیا کی تمام کتابیں اس کتابِ مقدس کے اور اسکی جامعیت و کمال کے حضور شمار کرنے کے قابل نہیں، جہاں یہ ہو اُسی کو کتاب کہا جائیگا، اور کتاب کہلائے جانے کی یہی مستحق ہوگی، کیونکہ کامل کے سامنے غیر کامل ذکر نہیں کیا جاتا۔ اس کتاب کو بامعانِ نظر دیکھیے اور اسکے اوصاف و کمالات تک رسائی حاصل کیجیے، تو یہ بات قلب میں خود بخود راسخ ہو جاتی ہے کہ بے شبہ کتاب وہی ہے جو بندوں کو خدا کی راہ بتائے، اُسکی عزت و جلال سے باخبر کرے، اُسکی ذات و صفات کے علوم پیش کرے، بندوں کو سعادت و نجات کی راہیں بتائے، معاش و معاد کے تمام علوم پر مشتمل ہو، بلکہ سارے علوم اُس میں جمع ہوں، نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ اُس کی شان ہو، اُسکے عجائب تمام نہ ہو سکیں، اُسکا مثل بنانا قدرتِ بشری سے باہر ہو، اُسکے محو و فنا کرنے سے غارتگر کے ہاتھ عاجز ہوں، عالم کے تغیرات جو ویرانوں کو آباد، اور آبادیوں کو ویران کر ڈالتے ہیں صدہا اور ہزار سال میں بھی اسکے کسی ایک حرف کو نہ بدل سکیں، تو یقیناً کتاب کہلانے کی وہ ہی مستحق ہے۔

کتابِ مقدس کی ابتداء میں اس مسئلہ کا زیرِ بحث لانا کہ یہ کیا کتاب ہے، کس شان و صفت کی کتاب ہے، اسکا مقصود اور کام کیا ہے، اس نے کیا کیا علوم پہنچائے، اسکا کیا مرتبہ اور کیا منزلت ہے؟ عجیب حکمت ہے کہ کتاب کا ہاتھ میں لینے والا ابتداء ہی میں، اول نظر ہی سے واقف اور باخبر ہو جاتا ہے، اور اُسے پتہ چل جاتا ہے کہ اُس کے ہاتھ میں کیا کتاب ہے، اور اس کتاب سے اُسکو کیسے کیسے فوائد و منافع پہنچنے والے ہیں، کن کن ضرورتوں میں وہ اُسکے کام آئیگی، اُسکے علوم کس اعلیٰ درجۂ یقین پر ہیں، شک و تردد کی گرد و کدورت سے اُسکے درسِ ہدایت کے دامن پاک ہیں۔ یہ معلوم کر کے طالب مطمئن ہو جاتا ہے، اور ناظرِ منصف یقین کر لیتا ہے کہ بیشک ایسی کتاب اُسکی ہدایت و نجات کی متکفل ہونے کی سزاوار ہے۔ کتاب کی عظمت و شان اس کے کتابِ الٰہی ہونے کی خبر دیتی ہے۔

غیر مسلم لوگ جن کتابوں کے گرویدۂ عقیدت ہو رہے ہیں اور جن کی نسبت انہیں دعوے ہے کہ یہ کتب الٰہیہ ہیں اُن کتابوں کو کھولے اور اُن کے آغاز پر نظر ڈالے تو آپ بے تامل یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونگے کہ قرآن پاک کے سامنے اُن کتابوں کی وہ حیثیت بھی نہیں جو آفتاب عالمتاب کے اشراق کے حضور ٹمٹماتے چراغ کی ہو سکتی ہو۔ یہ مقابلہ ہی بتا دے گا کہ وہ تمام کتابیں پریشان حال انسانوں کی پراگندہ خیالی کا مرقع ہیں۔ اور ان کو کتاب الٰہی وہی کہہ سکتا ہے جس نے کبھی حق طلب آنکھ سے کتاب الٰہی کا مطالعہ نہ کیا ہو۔

سورۂ مبارکہ میں حروف مقطعہ کے بعد پہلا کلمہ ذٰلِکَ ہے زبان عربی میں یہ اسم اشارہ ہے جو مشار الیہ بعید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اصل میں اس کی وضع ہی بعید کے لیے ہے اور بنانیوالے نے اس کو بعید ہی پر دلالت کرنے کے لیے بنایا کیونکہ زبان عرب کے کلمات میں ایک ایسا قانون حکمت مرعی ہوتا ہے جو دوسری زبانوں کو میسر نہیں ہے۔ الفاظ کی وضع اور کونسا لفظ کس معنی کے لیے موضوع ہوا۔ اس میں نہایت لطیف وجوہ کی رعایت ہوتی ہے۔ جب ہم اُس قانون حکمت کو اس کلمہ میں تلاش کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذٰلِکَ اور ھٰذا یہ دونوں کلمے اشارہ کے لئے ہیں اور ان دونوں کی اصل ذا ہے ایک میں ہا بڑھایا گیا ہے اور ایک میں لام کاف زبان عرب میں ذا تنہا بھی مستعمل ہے۔ قرآن پاک ہی میں ارشاد ہوا من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں اسم اشارہ ذا ہے ھا تنبیہ کا اس پر زیادہ کیا جاتا ہے تو اُس وقت اُس کے معنی ہوتے ہیں کہ اے مخاطب اُس چیز کیلئے متنبہ اور ہوشیار ہو جس کی طرف میں اشارہ کرتا ہوں۔ یہ کلام اُس وقت مناسب ہوتا ہے جبکہ وہ شے حاضر اور پیش نظر ہوا سیلیے ہٰذا کو قریب کیلیے استعمال کرتے ہیں۔

کبھی ذا کے ساتھ کاف خطاب ولام تاکید کو ملحق کیا جاتا ہے اس طرح ذٰلِکَ بنتا ہے اس میں لام تاکید دلالت کرتا ہے کہ متکلم تنبیہ میں مبالغہ کرنا چاہتا ہے اور یہ اُسی وقت مناسب ہے جبکہ مشار الیہ بالکل قریب نہو بلکہ متاخر اور بعید ہو اس لئے ذٰلِکَ کو مشار الیہ بعید کے لیے استعمال کرتے ہیں اس بیان سے یہ ثابت ہوگیا کہ اصل وضع میں بعد ماخوذ نہیں بلکہ عرف میں بعید کی طرف اشارہ کلمہ ذٰلِکَ کے ساتھ قرینہ مذکورہ کے سبب سے رائج ہوگیا۔

اب یہاں دو وجہ ہیں ایک وضع لغوی کا اعتبار دوسرا وضع عرفی کا۔ وضع لغوی پر تو ذٰلِکَ بعد کا مفید ہی نہیں اور اسی لیے فصحا کے کلام میں ہٰذا اور ذٰلِکَ میں سے ہر ایک دوسرے کا قائم مقام ہو جاتا ہے وضع عرفی کے لحاظ سے ذٰلِکَ بعد پر دلالت کرتا ہے اور اس کا مشار الیہ اگرچہ حاضر ہو مگر وہ اپنے مرتبہ اور عظمت کے لحاظ سے انتہائی بعد رکھتا ہے وہ ایسے حکم عظیمہ اور علوم کثیرہ پر مشتمل ہے جن پر اطلاع و وقوف بشری قوای کے لیے نہایت دشوار اور قرآن پاک اگرچہ صورۃً حاضر ہے لیکن اُس کے اسرار و حقائق بہت بلند و بالا اس لیے اس کے علو شان اور بلندی مرتبہ کی طرف ذٰلِکَ سے اشارہ فرمایا

اصول دین جن سے دین کے احکام ثابت ہوتے ہیں چار ہیں کتاب سنت اجماع قیاس کیونکہ دین کے بعض احکام کتاب (قرآن شریف) سے ثابت ہیں بعض سنت سے بعض اجماع امت سے اور بعض قیاس مجتہدین سے۔ مجتہدین کا قیاس اُن کی اپنی ذاتی رائے کا نام نہیں ہے بلکہ دلائل شرعیہ میں نظر کر کے وہ اپنے عمیق و وسیع علم سے ایک نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اور اصول ثلثہ ہیں سے کوئی اصل انکا مستند ہوتی ہے جس سے وہ حکم مستنبط کرتے ہیں اس لیے حقیقۃً وہ انہیں تین اصول کی طرف راجع ہے۔ اسی طرح اجماع وہ بھی کتاب و سنت کی طرف مستند ہوتا ہے اس کا مرجع بھی دو ہیں اور سنت خود راجع ہے کتاب کی طرف تو اس تمام اصول کی کتاب (قرآن شریف ہے) اس پر اتفاق ہے کہ یہاں کتاب سے قرآن پاک مراد ہے اور کتاب قرآن پاک کا نام ہے جیسا کہ خود قرآن حکیم میں ارشاد ہوا۔

کتاب انزلناہ الیک۔ خوبی اس تسمیہ میں یہ ہے کہ کتاب کتب سے ماخوذ ہے جس کے معنی جمع کے ہیں اس لیے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں کہ اُس میں اجتماع پایا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے قرآن پاک کا نام کتاب رکھا گیا کہ وہ شبہات و اوہام کے لیے ایک لشکر ظفر پیکر ہے یا اس لیے کہ وہ تمام علوم کا جامع ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیء۔

قرآن پاک کے اسمار بہت ہیں اُن میں سے چند ذکر کیے جاتے ہیں اور اُن کے مقابل وہ آیات بھی لکھی جاتی ہیں جس میں قرآن پاک کو اُس اسما کے ساتھ موسوم فرمایا گیا ہے ساتھ ہی اس تسمیہ کی مناسبت کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

جدول اسامی قرآن پاک

نمبر شمار	اسامی قرآن	وہ آیات جن میں قرآن پاک اُن اسماسے موسوم فرماتا ہے	بیان مناسب بطریق اختصار
۱	کتاب	کتاب انزلناہ الیک	اس کی مناسبت ذکر ہو چکی۔
۲	قرآن	انا جعلناہ قرآنا عربیا وان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم	حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول پر قرآن اور قرأت لفظ خسران و خسارت کی طرح ایک ہی ہیں اس کے معنی تلاوت کے ہیں اور اُن کی دلیل یہ آیت ہے۔ اذا قرأناہ فاتبع قرآنہ۔ قتادہ کے نزدیک قرآن جمع کے معنی میں مصدر ہے جیسا عرب بولتے ہیں قرأت الماء فی الحوض میں نے حوض میں پانی جمع کیا اب لفظ قرآن خواہ بمعنی جمع لیا جائے یا بمعنی تلاوت اس کتاب حکیم کی تسمیہ کے لیے نہایت مناسب ہے کہ یہ کتاب تلاوت کی جاتی ہے اس لیے اُس کو قرآن بمعنی تلاوت کہا جائے اور اُس میں سورتیں آیتیں جمع ہیں۔ اور اولین و آخرین کے علوم جمع ہیں اس معنی سے اُس کو قرآن بمعنی جمع نام رکھنا نہایت مناسب ہے سفیان ابن عیینہ کا یہی قول ہے۔
۳	فرقان	تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ بینات من الھدی والفرقان	مناسبت اس تسمیہ کی یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول متفرق طور پر بیئس سے زائد سال میں ہوا اس لیے اُس کا نام فرقان رکھا گیا اور اس کے علاوہ باقی تمام کتب جملۃً یکبارگی نازل

نمبر شمار	اسمائے قرآن	وہ آیات جن میں قرآن پاک ان اسماء سے موسوم فرمایا ہے	بیان مناسب بطریق اختصار
			نازل ہوئیں اور یہ بھی مناسبت ہے کہ یہ حق و باطل حلال و حرام مجمل و مبین محکم و ماول میں فارق ہے ۔
۴	ذکر	ھذا ذکر مبارك انزلناہ انا نحن نزلنا الذکر انہ لذکر لك و لقومك	ظاہر ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذکر ہے جس سے اُس نے اپنے بندوں کو اپنے اوامر و احکام کی معرفت کرائی نیز ذکر کے معنی فخر و شرف کے بھی ہیں اور قرآن پاک فخر و شرف ہے اُن لوگوں کے لیے جو اُس پر ایمان لائے ۔
۵	تذکرہ	انہ لتذکرۃ للمتقین	تذکرہ یاد دلانے کو کہتے ہیں چونکہ قرآن پاک احکام الٰہی یاد دلاتا ہے اس لیے اسکا نام تذکرہ ہے
۶	ذکریٰ	فان الذکریٰ تنفع المومنین	؎
۷	تنزیل	وانہ لتنزیل من رب العلمین	چونکہ یہ کتاب اللہ تبارک و تعالیٰ نے نازل فرمائی اس لیے اسکا نام تنزیل ہے ۔
۸	احسن الحدیث	اللہ نزل احسن الحدیث	قرآن شریف تمام کلاموں سے بہتر ہے اسلیے اس کا نام احسن حدیث ہے ۔
۹	موعظت	یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم	موعظۃ نصیحت کو کہتے ہیں اور قرآن پاک سراسر پند و نصیحت ہے ۔
۱۰	حکم	کذلك انزلناہ حکما عربیا	یہ ظاہر ہے کہ قرآن پاک اللہ تبارک و تعالیٰ کا حکم ہے اس لیے اسکا نام حکم نہایت مناسب ہے
۱۱	حکمۃ	حکمۃ بالغۃ، واذکرن ما یتلی فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ	حکمۃ اُس علم نافع کو کہتے ہیں جس سے حسن عمل میسر ہو اور سفاہت سے امن دے ۔ چونکہ قرآن حکیم ایسا علم عطا فرماتا ہے اس لیے اسکا نام حکمۃ ہے ۔
۱۲	حکیم	یس والقرآن الحکیم	حکمت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حکیم نام ہوا ۔
۱۳	شفا	وننزل من القرآن ما هو شفاءٌ	چونکہ مومنین کے لیے قرآن جسمانی و روحانی امراض سے شفا دیتا ہے اس لیے اس کا نام شفا ہے ۔
۱۴	ہدیٰ ہادی	ھدی للمتقین ان القرآن یھدی للتی ھی اقوم	راہ راست بتانے کی وجہ سے قرآن پاک کا نام ہدیٰ اور ہادی ہے ۔
۱۵	صراط مستقیم	ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ	قرآن ہی وہ سیدھی شاہراہ ہے جس کی بدولت رضائے الٰہی کو منزل مقصود تک رسائی ہو سکتی ہے اس لیے اسکا نام صراط مستقیم ہے ۔
۱۶	حبل اللہ	واعتصموا بحبل اللہ جمیعا	دینی امور میں قرآن پاک ہی مضبوط تھام لینے سے عذاب آخرت و وبال دُنیا سے نجات ملتی ہے لہٰذا اُس کا نام حبل اللہ ہے ۔
۱۷	رحمۃ	ننزل من القرآن ما هو شفاءٌ ورحمۃ للمومنین	درحقیقت قرآن پاک وہ رحمت ہے جس کی بدولت جہالات و ضلالات سے رہائی ملتی ہے اور راحت ابدی میسر آتے ہیں اس لیے اس کا نام رحمت ہے ۔
۱۸	روح	کذلك اوحینا الیك روحا من امرنا ننزل الملئکۃ بالروح من امرہ	قرآن پاک ارواح کی حیات کا سبب ہے اس لیے اُس کا نام روح ہے ۔
۱۹	احسن القصص	نحن نقص علیك احسن القصص	متقدمین کے سچے قصے جن سے عبرت حاصل ہوتی ہے اور انسان نیک نتیجے پر پہنچتا ہے ۔ ان پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اس کا نام احسن القصص ہے ۔
۲۰	بیان	ھذا بیان للناس	کیونکہ قرآن پاک میں دلائل قدرت اور اسرار معرفت اور جملہ علوم کمال فصاحت کے ساتھ مذکور ہیں اس لیے بیان تبیان مبین اس کتاب کے نام ہوئے ۔

نمبر شمار	اسمائے قرآن	وہ آیات جنہیں قرآن پاک کو ان اسماء سے موسوم فرمایا ہے	بیان مناسبت بطریق اختصار
۲۱	تبیان	نزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شی	چونکہ قرآن کریم تمام علوم پر حاوی اور تمام علوم کو ظاہر کرتا ہے اسلیے اس کا نام تبیان رکھا گیا۔
۲۲ ۲۳	مبین البصائر	تلک ایات الکتاب المبین ھذا بصائر من ربکم	یہ کتاب قدرت الٰہی کو ظاہر کرتی ہے اسلیئے مبین کہا گیا۔ قرآن پاک دلیلوں سے حق نظر آتا ہے اس لیے اس کا نام بصائر ہے۔
۲۴	فصل	انہ لقول فصل وما ھو بالھزل	قرآن شریف لوگوں کے درمیان سچا فیصلہ کرتا ہے اس لیے اُس کا نام فصل ہے۔
۲۵	النجوم	فلا اقسم بمواقع النجوم	نجما نجما نازل ہونے کی وجہ سے نجوم نام ہوا۔
۲۶	مثانی	مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم	قرآن پاک کے بعض مضامین بہترین پیرایہ میں دوبارہ لائے گئے اس لیے اس کا نام مثانی ہے۔
۲۷	نعمت	اما بنعمۃ ربک فحدث	قرآن پاک سے دارین کی کامیابی حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ اعلیٰ نعمت ہے۔
۲۸	بُرہان	قد جاءکم برھان من ربکم	قرآن پاک ایسی زبردست برہان ہے جس نے تمام دنیا کو اپنی ایک چھوٹی سی سورت کا مثل بنانے سے عاجز کر دیا۔
۲۹	بشیر نذیر	بشیرا ونذیرا فاعرض اکثرھم	قرآن پاک فرمانبرداروں کو جنت کی بشارت دیتا ہے اور نافرمانوں کو عذاب دوزخ سے بچاتا اس لیے اس کا نام بشیر و نذیر ہے۔
۳۰	مہیمن	ومھیمنا علیہ	چونکہ قرآن پاک کیساتھ تمسک کرنیوالا دنیوی واخروی نقصانوں سے امن میں رہتا ہے اسلیے اسکا نام مہیمن ہے۔
۳۱	ہادی	ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم	چونکہ قرآن پاک رہنمائی کرتا ہے اس لیے اُس کا نام ہادی ہے۔
۳۲	نور	واتبع النور الذی انزل معہ	قرآن پاک سے دلکی تاریکی دور ہوتی ہے اس لیے اُس کا نام نور ہے۔
۳۳	الحق	انہ لحق یقین	باطل کا ازالہ کرنے اور حقیقۃ امر کو ہوبہو ظاہر فرمانیکی وجہ سے حق نام رکھا گیا۔
۳۴	عزیز	انہ لکتاب عزیز	عزیز کے معنی غالب کے بھی آتے ہیں اور بے مثل کے بھی اور قرآن پاک کے لیے دونوں معنی مناسبت نام رکھتے ہیں کیونکہ قرآن پاک نے اعداکو معارضہ سے عاجز کر دیا اور اُس کا غلبہ تمام دُنیا کو تسلیم ہی کرنا پڑا اسی طرح تمام عالم اُسکا مثل لانے سے عاجز رہا وہ غالب بھی ہے اور بے مثل بھی اس لیے اس کا نام عزیز ہے۔
۳۵	الکریم	انہ لقرآن کریم	قرآن پاک کا نام کریم اس لیے ہے کہ جو علوم وحِکَم قرآن کریم سے حاصل ہوتے ہیں وہ کسی دوسری کتاب سے حاصل نہیں ہوتے
۳۶	عظیم	لقد اتینٰک سبعا من المثانی والقرآن العظیم	قرآن پاک کا کتاب الٰہی ہونا اُس کے عظیم ہونے کی کافی وجہ ہے مع ہذا اعظم ترین مقاصد وصول الی اللہ پر اشتمال اُس کی عظمت پر دال ہے۔
۳۷	مبارک	ھذا ذکر مبارک	قرآن پاک برکات بے نہایت ہیں اس لیے اس کا نام مبارک ہے۔

لاریب فیہ

ریب نفس کے قلق و اضطراب کو کہتے ہیں کیونکہ شک کی حالت میں نفس کو کسی ایک طرف اطمینان و سکون نہیں ہوتا اور وہ ہے یا نہیں کے اضطراب میں گرفتار ہوتا ہے اس لیے اس حالت کو ریب کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت شک کرنے والا حالت اضطراب میں ہوتا ہے۔ یہاں شک کی نفی فرمائی گئی ارشاد ہوا کہ یہ کتاب محل شک نہیں مقصود یہ ہے کہ کسی طرح کا شک و اشتباہ اس کتاب حق کے پاس نہیں پہنچ سکتا نہ اس کی صحت میں شبہ کی گنجائش نہ اس کے من عند اللہ ہونے میں نہ معجز ہونے میں کیونکہ یہ کتاب اپنی برہان کے سطوع اور روشنی سے وضوح کے اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گئی ہے کہ کوئی عاقل نظر صحیح کے بعد اُس کے وحی الٰہی اور معجز ہونے میں کوئی شک نہیں کر سکتا جس طرح ٹھیک دوپہر کے وقت آفتاب اپنے نور ضیا

سے ایسا واضح وظاہر ہوتا ہے کہ آنکھ والے کو اُس میں شک وشبہہ باقی نہیں رہتا۔ ایسے ہی یہ کتاب اپنے ساتھ ایسے روشن انوار رکھتی ہے جو شک وشبہہ کی ظلمت وتاریکی کو نیست ونابود کر ڈالتے ہیں البتہ جس طرح ایک نابینا آفتاب نصف النہار کی ضیاء میں شک کر سکتا ہے اسی طرح کوئی بصیرت کا اندھا اِس کتاب میں شک کر سکتا ہے لیکن یہ اُس کی بینائی کا قصور ہے اور بے ادراکی کا فتور ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ۔ چشمہ آفتاب را چہ گناہ

اور جس طرح علاج سے کوئی نابینا صحت پاکر اُس شک کی غلطی سے نجات پا سکتا ہے اور وجود شمس کے یقین سے اطمینان حاصل کر سکتا ہے اسی طرح باطل کا اندھا بھی نظر فی الدلائل کے علاج سے صحت پاکر اس کتاب مقدس کے صدق و حقانیت کا اطمینان حاصل کر سکتا ہے اور ریب شک کے قلق واضطراب سے خلاص پا سکتا ہے اس لیے دوسری آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یعنی جس کتاب کو اپنے بندہ خاص محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اگر تم اُس کی طرف سے شک میں ہو تو اس کی مثل ایک سورۃ بنا لاؤ۔ اِس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم اُس میں شک پاؤ کیونکہ وہ کتاب تو شک کا محل ہی نہیں اُس کے دلائل ظاہرہ باہرہ اور اُس کے براہین واضحہ ولائحہ کسی طرح قابل تردد نہیں ہاں اگر تم اپنی کور باطنی سے اپنے قصور نظر یا ضعف البصر سے شک میں ہو اور تمہاری بیماری تمہیں اِس کتاب حق کے انوار کے مشاہدہ سے مانع ہو تو اپنے ضعف بصر کا اس طرح علاج کرو کہ اُس کی مثل ایک سورت بنا کر لاؤ۔

اپنے معین و مددگار ظہیر و انصار سب کو جمع کر لو۔ عمر بھر کوششیں کرو اور تمام قوتیں اس کتاب پاک کا مثل بنانے سے عاجز رہیں اور تم اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو اُس وقت تمہاری آنکھوں سے پردہ اُٹھ جائے گا اور اس کتاب کے من عند اللہ ہونے کی طرف سے جس شک میں تم گرفتار تھے وہ شک دور ہو جائے گا اور اس کتاب کے کلام الٰہی ہونے کا اور وحی ربانی ہونے کا یقین واطمینان حاصل ہوگا۔ پھر اگر تم نے عناد سے کام نہ لیا تو دل کے ساتھ تمہاری زبان بھی اس کتاب کی تصدیق کرے گی۔ خلاصہ یہ کہ یہ کتاب پاک حق محض وصدق خالص ہے اور ریب شک کی ظلمت سے پاک۔

ناظر منصف بعد نظر اس کی حقیقت کا معترف ہوتا ہے اور اُس کو کوئی شک واشتباہ اُس میں باقی نہیں رہتا ریب کی نفی ابتدائے کتاب میں نہایت ہی مناسب اور بہت ہی برمحل ہے۔ طالب حق ایک پیاسے کی طرح ہوتا ہے اُس کے سامنے اگر شراب آئے تو وہ اُس کو پانی سمجھ کر خوش ہوتا ہے اور اس خیال سے کہ وہ پانی ہے پانی کی تلاش میں جدوجہد نہیں کرتا لیکن جب اُس تک پہنچتا ہے اور عین ضرورت کے وقت اس کو ریگ خشک پاتا ہے تو اس کے رنج ومایوسی کی کوئی نہایت نہیں رہتی اس لیے طالب حق کو ضروری ہے کہ وہ بے ریب وشک اپنے مطلوب کی راہ پائے اور سراب دیکھنے والے پیاسے کی طرح ایسی چیز کا مفتوں نہو جائے جس سے انجام کار بجز حسرت وندامت کے کچھ حاصل نہو اور اخروی زندگی تباہ ہو جائے اس لیے وہ کتاب جو دُنیا کی ہدایت کے لیے آئی ہو اور طالبان حق کو اپنی طرف دعوت دینی ہو بہت مناسب ہے کہ وہ ابتدا ہی میں اُن کو مطلع کر دے کہ اُس کے تمام علوم یقینی ہیں فلسفہ کی طرح نہیں کہ عمر بھر کی جانکاہیوں کے بعد ایک انسان جب اُس میں مہارت تام حاصل کر لیتا ہے اور اُس کو حقائق عالم کے ماہر ہونے کا زعم باطل اور ادعائے غلط پیدا ہو جاتا ہے اور انجام کار فلسفہ کے اغلاط اُس پر کھلتے ہیں اس وقت وہ گذری ہوئی زندگی کے ضائع ہونے پر کف افسوس ملتا ہے۔ اسکا یہی باعث ہے کہ فلسفہ میں غلو کرتے وقت اس نے یہ اطمینان نہیں کر لیا تھا کہ اس فن کا مدار قطعیات ولقینیات پر ہے اور اس کے معلومات شک وتردد کی دست برد سے محفوظ ہیں۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ کتاب شک وتردد سے پاک ہے اور اُس کے تمام علوم قطعی ویقینی ہیں طالب کو یہ جستجو ہوتی ہے کہ اِس کتاب کا مقصد کیا ہے اور میری کس کس ضرورت میں کس حد تک کار آمد ہے کیا علم دیتی ہے کیا فائدہ پہنچاتی ہے جب تک یہ بات معلوم نہو رغبت پیدا نہیں ہوتی اس لیے کتاب مقدس میں ابتدا ہی میں کتاب کے مقصد فائدے اور مضامین سے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرما کر مطلع اور باخبر کر دیا کہ انسان کے لیے راہ راست کا دریافت کرنا جو منزل مقصود تک پہنچائے اس کے حوائج میں سب سے اہم واعلیٰ ہے اس کتاب سے وہ راہ ملتی ہے اور اس کتاب کا متبع اس سے سرفراز ہوتا ہے۔ ہدایت بھی وہ ہدایت جس سے تقوے کے رفیع مقامات تک رسائی حاصل ہو تو معلوم ہوا کہ انسان کے اہم ترین حوائج میں کتاب دستگیری کرتی ہے اور وہ علوم اس کے مضامین ہیں جن سے بندہ تقوے کے اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکتا ہے اخروی زندگی کی کامیابی اور ابدی سعادت جو اِس ہدایت کے نتائج ہیں وہ اِس کتاب کے فوائد ہیں۔ اس میں مضمون سابق کی تاکید بھی ہے کہ چونکہ یہ کتاب حق ویقین کے اعلیٰ مرتبہ پر ہے اس لیے اِس قابل ہے کہ طلبگاران ہدایت اِس سے تمسک کریں اور یقینا وہی کتاب ہدایت ہو سکتی ہے جس کے علوم تردد واحتمال اور غلطی کے اندیشہ سے برتر ہوں اِسی طرح یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اس کتاب کی حقیقت اس سے اور ظاہر تر ہو جاتی ہے کہ وہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے یعنی حق ویقین کے ایسے اعلیٰ مرتبہ پر ہے کہ انسانوں کا بہترین طبقہ اُس کو اپنے لیے شمع راہ بناتا ہے اور جس کو بہترین طبقہ اپنا دستور العمل بنائے اور اُس سے انتفاع کے لئے اس سے دریوزہ گری کرے اُس کے حق ویقین ہونے میں کسی عامی کو شبہ کرنا محض کور باطنی اور سیاہ دلی ہے یہ قرآن کریم کی فصاحت وخوش بیانی ایک عجیب منظر ہے لَا رَيْبَ فِيْهِ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ دو جملے ہیں پر لطف جملے کیسی عجیب نظم کہ ہر ایک ان میں دوسرے کے لیے بینہ اور برہان ہے پہلا جملہ دوسرے کو قوت پہنچاتا ہے اور دوسرا پہلے کو ثابت کرتا ہے۔

متقیوں کے لیے ہدایت ہونا۔

کسی چیز کے اعلےٰ وصفوں کو بیان کر دینا اُس سے فروتر باتوں کو خود ثابت کر دیتا ہے۔ کسی عالم کی صفت میں یہ بیان کر دینا کہ علما اس کے درس سے منتفع ہوتے ہیں بلکہ حیثیت طالبعلموں کو درس دینے کی صفت سے غنی کر دیتا ہے جو کتاب متقیوں کے لیے ہدایت ہو پھر اُن سے فروتر لوگوں کے لیے کس طرح ہدایت نہو گی اِسی لیے قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہوا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ اب یہاں قرآن پاک کا ہدایت ہونا ہر انسان کے لیے بیان فرمایا گیا ہے خواہ وہ مومن ہو یا کافر اسکی مثال اس کے قریب قریب ہے جیسے کوئی شخص ایک شاہنشاہ کی مدح میں کہے کہ اس کے جود ونوال بذل وکرم سے بادشاہ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور تاج ودیہیم کے مالک اس کے دست سخا سے دولتیں حاصل کرتے ہیں دوسری مرتبہ اُسی شاہنشاہ کی تعریف میں کہا جائے کہ اُس کا فیض عام ہر امیر وغریب کو پہنچتا ہے تو اگرچہ پہلی عبارت میں صرف سلاطین کے فائدے پانیکا ذکر ہے صاحب عقل وخرد فوراً سمجھ لیتا ہے کہ جس کے جود وسخا کی یہ وسعت

کہ وہ امراء و سلاطین کو بھی فیضیاب کرتا ہے تو ان سے کم درجہ کے لوگ اُس کے اس فیض سے کیوں محروم رہیں گے دونوں عبارتوں کا ایک ہی نتیجہ ہے مگر تبدیل اسلوب میں عجیب حکمت ہے۔ یہ ابتداء کتاب ہے اور طالب اس کتاب کی جلالت و رفعت منزلت معلوم کرنا چاہتا ہے تو مناسب یہی ہے کہ یہاں بتایا جائے کہ یہ وہ کتاب ہے جس سے انسانوں کا اعلیٰ ترین طبقہ نفع پاتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ رہنمائی بھی طرح طرح کی ہوتی ہے حق و صواب کی طرف بھی ہو مگر اُن امور میں نہ ہو جن سے انسانی سعادت کا قوی تعلق ہے تو طالب کو اس کی طرف رغبت نہیں پیدا ہوتی مثلاً یہ کہ کل ہمیشہ جزء سے بڑا ہوتا ہے اور زوج متساویین پر تقسیم ہو سکتا ہے۔ آسمان بلند ہے ستارے روشن ہیں یہ سب باتیں بھی حق ہیں مگر ان پر انسانی سعادت کا مدار نہیں تو ان کی طرف ہدایت کرنا انسان کے دل کو اپنی طرف نہیں کھینچتا اس لیے فقط اتنی بات کہہ دینا کہ امور واقعیہ حقہ کی طرف یہ کتاب ہدایت ہے کتاب کے ساتھ گرویدگی اور محبت کا سبب نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ بھی نہ بتایا جائے کہ اس ہدایت سے ہمیں کیا فائدہ دے گا۔ اس فائدہ کو طویل عبارتوں سے ایسا ذہن نشین نہیں کیا جا سکتا تھا جیسا ایک للمتقین نے خاطر گزین کر دیا کہ یہ کتاب ایسے امور حقہ کو بتاتی ہے جن سے انسان مرتبہ تقوےٰ پر فائض ہوتا ہے۔ فصحا کا یہ بھی دستور ہے کہ شئے کو مایئول الیہ کے اعتبار سے تعبیر کرتے ہیں جیسے ایک شاعر کہتا ہے ع

بسوئے دلبر رعنا نگاہے کردہ ام پیدا

تو دلبر کی طرف نگاہ پیدا کرنے کے کیا معنے۔ دلبر تو وہ جب ہوگا جب اس کی طرف آنکھ لگائی جائے گی مگر چونکہ اس کا انجام کار یہی ہے اس لیے اُسے پہلے ہی سے دلبر کہا۔ رات دن کے محاورات میں یہ طریقہ رائج ہے اس لیے جو لوگ مآل کار متقی ہیں اور انکا انجام کار تقوےٰ ہے اُن کی متقی سے تعبیر فرما دینا کمال فصاحت ہے کیونکہ کسی شخص یا قوم کو اس کے بہترین حالات کے اعتبار سے تعبیر کرنا اصحاب ادب کے نزدیک محمود و ستودہ امر ہے۔ علاوہ بریں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن میں حق کی طلب صادق ہو خواہ ہنوز حق تک رسائی حاصل نہ کر سکے ہوں۔ ایسے لوگ تو کسی رہنما کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں دوسرے وہ معاندین جو دیدہ و دانستہ بھی حق کا انکار کرتے ہیں۔ تمرد و سرکشی ضد و عناد اُنکی سیرت ہے کسی شخص کے جھٹلانے کے لیے روز روشن میں آفتاب کے نور و ضیا اور گرمی و حرارت کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد بھی انکار پر جسے رہنا اپنی وضعداری سمجھتے ہیں وہ رہنما کی رہنمائی سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے اس لیے یہ کہہ دینا بہت ہی صحیح اور بالکل حق ہے کہ اس ہدایت کا نفع اُن ہی لوگوں کے لیے ہے جو دلمیں خدا کا خوف رکھتے ہیں اور حق جوئی کی صفت کو اُنہوں نے عناد کے ہاتھوں برباد نہیں کرا دیا ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہدایت کس کی حق میں نافع ہوتی ہے اور کون اُس سے بے نصیب رہتا ہے۔ رہنمائی تو سب کو کیجاتی ہے۔ راستہ تو سارے عالم کو دکھا دیا جاتا ہے مگر عناد کی سیاہی نے جس کی بصیرت کو باطل نہیں کر دیا ہے وہی ارائت حق سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے ؎

ابر گر آب زندگی بارد — ہرگز از شاخ بید برنخوری

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ

وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں

ایمان کے معنی

جن چیزوں کی نسبت بہ یقین معلوم ہے کہ اُن کو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے پاس سے لائے اور عوام و خواص اُن چیزوں کا دین مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم میں سے ہونا بے احتیاج نظر و استدلال جانتے ہوں اُن کو ضروریات دین کہتے ہیں جیسے اللہ کی وحدت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و خاتمیت تمام انبیا و مرسلین کی نبوت و رسالت نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کی فرضیت شراب خنزیر۔ زنا۔ سرقہ۔ قمار کی حرمت وغیرہ شرح فقہ اکبر للملا علی قاری میں ہے ثم المراد من المعلوم ضرورۃً کونہ من الدین بحیث یعلمہ العامۃ من غیر افتقار الی النظر والاستدلال کوحدۃ الصانع ووجوب الصلوٰۃ وحرمۃ الخمر ونحوھا اور رد المحتار جلد اول باب الوتر والنوافل میں ہے ما کان من ضروریات الدین وھو ما یعرفہ الخواص والعوام ان من الدین کوجوب اعتقاد التوحید والرسالۃ والصلوات الخمس واخواتھا یکفر منکرہ ضروریات دین کے معنی تو معلوم ہو گئے اب ان تمام ضروریات دین کی تصدیق کرنا اور ان کو دل سے ماننا ایمان ہے۔ شرح فقہ اکبر میں ہے۔ الایمان ھو تصدیق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالقلب فی جمیع ما علم بالضرورۃ مجیئہ بہ من عند اللہ اجمالاً او تفصیلاً کذا فی شرح العقائد

ایمان کے رکن و شرط

ضرورت دین کی دل سے تصدیق کرنا اور ماننا باجماع و اتفاق ایمان کا رکن اصلی ہے اور کسی حال میں یہ عاقل بالغ سے ساقط نہیں ہوتا ہمیشہ ہر حال میں لازم رہتا ہے۔

اقرار باللسان ان تمام ضروریات دین کا زبان سے اقرار کرنا۔ بعض کے نزدیک ایمان کا رکن لغیرہ ہے۔ شمس الائمہ سرخسی وحلوائی و فخر الاسلام اسی طرف گئے ہیں اور صاحب عمدہ امام ابو البرکات عبد اللہ بن احمد ابن محمود نسفی رضی اللہ عنہ نے تصریح فرمائی کہ اقرار دنیا میں اجراء احکام کے لیے شرط ہے۔ یہی مذہب مختار اشاعرہ کا ہے اور اسی پر امام ابو منصور ماتریدی ہیں اور اسی طرف جمہور محققین گئے ہیں۔

اسی لیے حالت اکراہ میں ساقط ہو جاتا ہے یعنی جب جان جانے کا اندیشہ ہو اُس وقت تصدیق کو دل میں محفوظ رکھنا اور زبان کو اقرار سے روک لینا جان بچانے کی ضرورت سے جائز کیا گیا ہے۔ قال اللہ تعالےٰ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان اس کا سبب یہ ہے کہ زبان دل کی ترجمان ہے تو اقرار تصدیق کی دلیل ہوگا۔ اور انکار و عدم اقرار عدم تصدیق کی تو اگر باوجود قدرت اقرار نکرے تو کافر ہوگا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دلمیں تصدیق نہیں ہے ورنہ بغیر کسی مجبوری کے اقرار و اظہار میں اُس کو کیوں عذر ہوتا۔ لیکن جس حالت میں کہ وہ مجبور کیا جائے اور اظہار کی قدرت باقی نرہے تو عدم اقرار سے کافر نہوگا اسلئے کہ جان کا اندیشہ تصدیق کی دل میں باقی رہنے کی دلیل ظاہر ہے اور تبدیل اقرار کے لیے حفاظت جان اور دفع مہلکہ عذر معتبر ہے قدرت و عدم مجبوری کیوقت میں یہ عذر موجود نہیں۔ مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ عند المحققین ایمان کا رکن اصلی تصدیق ہے اور اقرار شرط ہے اور قلبی تصدیق ایک باطنی امر ہے جس تک ظاہر بینوں کی نگاہیں نہیں پہنچتیں اُس پر مطلع ہونے کے لیے کوئی علامت ضروری ہے۔ اس لیے شرح مقاصد میں فرمایا کہ اقرار کا علی وجہ الاعلان ہونا ضروری ہے اگرچہ قلبی تصدیق سے آدمی عند اللہ مومن ہو جائے لیکن دنیا میں مسلمانوں کے احکام اُس پر جاری نہونگے جب تک کہ وہ ظاہر اقرار نہ کرے احکام شرع کی پابندی اور شرعیات کا

التزام بھی اقرار بالاعلان کا قایم مقام ہے تو جس شخص کی زبان سے اقرار نہ سُنا گیا لیکن اعمال میں اس کو پابند شرع دیکھا گیا اُس کے اسلام کا حکم کیا جائیگا جب تک کہ کوئی دلیل اس کے خلاف قایم نہو گونگا ہونا عذر معتبر ہے اور اسی وجہ سے اگر کوئی شخص اقرار کا اظہار نہ کر سکے تو اُسکو کافر نکہا جائے گا شرح فقہ اکبر میں ہے التصدیق رکن حسن لعینہ لا یحتمل السقوط فی حال من الاحوال بخلاف الاقرار فانہ شرط او شطر رکن لغیرہ وھذا یسقط فی حال الاکراہ وحصول الاعذار وھذا لان اللسان ترجمان الجنان فیکون دلیل التصدیق وجودا وعدما فاذا بدلہ بغیرہ فی وقت یکون متمکنا من اظہارہ کان کافرا واما اذا زال تمکنہ من الاظہار بالاکراہ لم یصر کافرا لان سبب الخوف علی نفسہ دلیل ظاہر علی بقاء التصدیق فی قلبہ وان الحامل لہ علی ھذا التبدیل خاصۃ الی دفع المہلکۃ عن نفسہ لا تبدیل الاعتقاد فی حقہ (الی ان قال) فکان رکن الایمان وجودا وعدما کما قال شمس الائمۃ السرخسی رحمہ اللہ الا ان صاحب العمدۃ وھو ابو البرکات عبد اللہ ابن احمد بن محمود النسفی رضی اللہ عنہ صرح ان الاقرار شرط اجراء الاحکام وھو مختار الاشاعرۃ وعلیہ ابو منصور الماتریدی (وفیہ ایضًا) ثم اعتبار الاقرار فی مفہوم الایمان مذھب بعض العلماء وھو اختیار الامام شمس الائمۃ الحلوانی وفخر الاسلام من ان الاقرار رکن الا انہ قد یحتمل السقوط کما فی حالۃ الاکراہ وذھب جمہور المحققین الی ان الایمان ھو التصدیق بالقلب وانما الاقرار شرط لاجراء الاحکام فی الدنیا لما ان تصدیق القلب امر باطنی لا بد لہ من علامۃ (وفیہ ایضًا) قال فی شرح المقاصد الاقرار اذا جعل شرط اجراء الاحکام لا بد ان یکون علی وجہ الاعلان علی الامام وغیرہ من اہل الاسلام بخلاف ما اذا جعل رکنا لہ فانہ یکفی لہ مجرد التکلم مرۃ وان لم یظہر لغیرہ والظاہر ان التزام الشرعیات یقوم مقام ذلک الاعلان کما لا یخفی علی الاعیان ثم الاجماع منعقد علی ایمان من صدق بقلبہ وقصد الاقرار بلسانہ ومنع منہ من خرس ونحوہ۔

اسلام اور ایمان میں فرق

اسلام کے لغوی معنی ہیں "سر باطاعت نہادن" یعنی فرمانبرداری کے ساتھ سر کو جُھکا دینا اور اطاعت کرنا۔ اور اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ دینی احکام کو اپنے اعضاء وجوارح پر جاری کرنا۔ گویا اسلام ظاہری اعمال کا نام، اور ایمان پوشیدہ اور مخفی عقائد کا۔ اس تعریف سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ ایسا شخص جو اسلام پر ظاہری عمل کرتا ہو، مگر باطنی طریقہ پر وہ بدعقیدہ ہو، اور کفریات پنہاں رکھتا ہو، تو اُس شخص کو مسلم تو کہہ سکتے ہیں مگر مومن نہیں کہہ سکتے، جیسے کہ منافقین وغیرہ۔ اسی طرح وہ شخص جو اخیر وقت میں ایمان تو لے آیا مگر اُسے اتنا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے ایمان کا اظہار کر سکتا، تو اُسے مومن کہہ سکتے ہیں مگر مسلم نہیں۔ اور وہ شخص جسکے عقائد بھی درست ہوں، اور باطنی حالت بھی صحیح ہو، اور زبان سے اقرار بھی کرتا ہو، لیکن اعضاء وجوارح پر دینی احکام کو جاری نہیں کرتا، تو وہ مومن ومسلم تو ہے، مگر فاسق ہے چونکہ اُسکے اعمال غیر صالح ہیں۔ لیکن وہ شخص جسکے اعمال بھی صالح وپاکیزہ ہوں، تو وہ متقی ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو اخیر وقت میں معاذ اللہ بدعقیدہ ہو گیا، تو وہ بے ایمان ہے خواہ عمر بھر وہ کیسے ہی نیک عمل کرتا رہا ہو، سب اکارت اور رائیگاں ہے۔

اسی طرح معرفت وایمان میں فرق ہے۔ معرفت یعنی کسی کو جاننا پہچاننا اور ہے، اور ایمان یعنی ماننا اور اُس پر یقین رکھنا اور ہے۔ حضورِ اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو محض جاننے پہچاننے کا نام ایمان نہیں ہے، بلکہ صدقِ دل سے ماننے اور یقین رکھنے کا نام ایمان ہے۔ حضور کو تو کفار ومشرکین بھی جانتے پہچانتے تھے، مگر اُن کی یہ معرفت اُن کو مومن ومسلم نہ بنا سکی، بلکہ وہ کافر ہی رہے، کیونکہ وہ مانتے نہ تھے۔ پھر اس ماننے کی بھی تین کیفیتیں ہیں، ایک یہ کہ کسی ڈر اور خوف سے مانا جائے، دوسری یہ کہ کسی طمع ولالچ سے مانا جائے، تیسری یہ کہ دلی محبت سے مانا جائے۔ پہلے دونوں ماننے میں بھی ایمان نہیں ہے، کیونکہ منافق بھی ڈر اور خوف یا طمع ولالچ سے مانتے تھے۔

درحقیقت وہی ماننا قابلِ قبول اور لائقِ ایمان ہے، جو دلی محبت سے مانا جائے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَھُمۡ الآیہ

مطلب یہ کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں یہ بھی وارد ہوا کہ ایک فریق اُن میں سے حق کو چھپاتا ہے باوجودیکہ وہ جانتے ہیں اور یہ بھی قرآن پاک میں آیا وان الذین اوتوا الکتب الایۃ جن لوگوں کو کتاب دی گئی یعنی اہلِ کتاب خوب جانتے ہیں کہ وہ حق ہے ان کے رب کی جانب سے اور جان بوجھ کر مکرے اور دلوں میں یقین تھا۔ اس کے علاوہ اور آیات ہیں ان سب سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام کے صدق کا سمجھنا اور جاننا اتنا ہی مومن ہونے کے لیے کافی نہیں بلکہ اُس کا یقین کرنا اور اُس کو ان لینا اور نفس کا اُس سے سکون پانا اور دل کا اُس کے ساتھ اطمینان کر لینا اور جحود وعناد ترک کر کے قبول کرنا مومن ہونے کے لیے ضروری ہے مولوی اشرف علی کی تعریف کے بموجب اگر کوئی ایمان لائے تو وہ بے ایمان ہی رہیگا اور لاکھوں یہودی نصرانی جن کو قرآن پاک کافر فرماتا ہے ان مولوی صاحب کے قول سے مومن ٹھہرتے ہیں۔ یہ تفسیر ہوئی یا قرآن پاک کی تبدیل وتغیر مسلمان ایسے ترجمہ اور حاشیہ کے دیکھنے سے پرہیز کریں جو ایسی گمراہیوں پر مشتمل ہے۔ ایمان کے معنی میں مولوی اشرف علی صاحب نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ وہ لکھتے ہیں۔ پس جتنی کتابیں اللہ تعالےٰ نے پہلے انبیا علیہم السلام پر نازل کیں سب کو سچا سمجھنا فرض اور شرطِ ایمان ہے۔ جب سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہوا تو ایمان کیا چیز رہی حدیث شریف میں تو ایمان کی حقیقت یہ ارشاد ہوئی ان تومن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ تمام علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ تصدیق رکن ہے۔ شرح فقہ اکبر سے نقل کیا جا چکا التصدیق رکن حسن لعینہ لا تحمل السقوط فی حال من الاحوال لیکن مولوی صاحب کو ابھی تک ایمان کے رکن وشرط کا ہی پتہ نہیں تفسیر لکھنے بیٹھ گئے اور رکن کو شرط بتا رہے ہیں تو آپ کے نزدیک تصدیق ایمان سے ایک خارج چیز ہے جس کو شرط کا مرتبہ حاصل ہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کوئی پوچھے کہ جب تصدیق خارج رہی تو ایمان اور کس چیز کا نام یہ تمام کلام تو اُس تقدیر پر تھا کہ تصدیق کو فرض اور شرط بتایا ہوتا مگر معاملہ اس سے بھی بدتر ہے۔ تصدیق کی جگہ سچا سمجھنا لکھتے ہیں۔ تو گویا تصدیق تو نہ ان مولوی صاحب کے نزدیک رکن نہ شرط صرف سچا سمجھنا شرط ہے رکن ایمان وہ بھی نہیں۔ ان مولوی صاحب کے ساتھ اگر حسن ظن کیا جائے تو اُن کے کلام کی ایک یہی توجیہہ ہو سکتی ہے کہ اُنہوں نے یہ معنی خاص وہابیوں کے ایمان کے بیان کیے ہیں اور تقویۃ الایمان سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ خدا کو مان اور اس کے سوا کسی کو مت مان۔ تو وہاں ماننا قبول کرنا تسلیم کرنا گرویدہ ہونا تو ممنوع ہے۔ بس سمجھنا ہی کافی ہے جیسا کفار یہود سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ تو اور کوئی توجیہہ مولوی اشرف علی کے کلام کی نظر نہیں آتی جو شخص ایمان کے معنی تک نہ بیان کر سکا اور اُس میں اتنی خطرناک غلطیاں کیں۔ وہ اور حقایق ودقائق معانی قرآن کیا بیان کریگا اور اس سے اُس میں کیا کچھ غلطیاں نہ ہوں گی۔

غیب کے معنی

غیب یا تو مصدر ہے جو اسم فاعل کے قائم مقام کیا گیا جیسے صوم بمعنی صایم یا بروزن فعیل ہے جس کو تخفیف کیا گیا مثل قیل ہین میت لیکن ان سب میں اصل بھی مستعمل ہے اور غیب میں اصل مستعمل نہیں بہر تقدیر غیب سے مراد وہ پوشیدہ امر ہے۔ جو

حواس و عقل سے غائب ہو۔ اور ان میں سے کسی سے بھی ابتداءً لطریق بداہت مدرک نہو تو اگر کوئی چیز وسائط کے ذریعہ سے مکشوف ہو خواہ وہ وسائط امور معلومہ کی ترتیب ہو جسے نظر و فکر کہتے ہیں عقل ان کے ذریعہ سے نظریات تک پہنچتی ہے یا آلات ہوں جن کے ذریعہ سے حواس اس چیز تک رسائی حاصل کر سکیں جہاں تک وہ ابتداءً بغیر وساطت نہیں پہنچ سکتے تھے جیسے آلات رصدیہ کی مدد سے فلکیات کے احوال کا معائنہ یا گردہ کی پتھری کو بدن کے اندر بجلی سے روشنی کر کے آئینہ کے ذریعہ سے دیکھ لینا تو یہ اس کے غیب ہونے میں قادح نہیں کیونکہ غیب کی تعریف میں ابتداءً منکشف نہونا معتبر ہے۔ غیب کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جس پر کسی طرح کی کوئی دلیل نہو جاننے والا اس کو بغیر احتیاج کسی دلیل کے خود بخود جانے اس قسم کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ علم ذاتی کسی مخلوق کے لیے متصور نہیں۔ قرآن کریم کی جن آیات میں غیر خدا سے غیب کی نفی کی گئی ہے ان میں اسی قسم کا غیب مراد ہے جیسے آیہ عندہٗ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو وغیرہ آیات میں۔ غیب کی دوسری قسم وہ ہے جس پر دلیل ہو اس قسم کا علم اللہ تعالیٰ نے جن بندوں کو عطا فرمایا اُن کے لیے ثابت ہے۔ صانع اور اُس کے صفات نبوت اور اُن کے متعلقات احکام و شرائع روز آخر اور اُس کے احوال بعث و نشور حساب و جزا۔ یہ سب وہی چیزیں ہیں جو غیب ہیں اور دلائل کے ذریعہ سے بفضل الٰہی اللہ کے پیارے بندوں کو اُن کا علم حاصل ہے۔ قرآن کریم کی آیات میں اور احادیث کریمہ میں جہاں کہیں غیب کا علم مقبولان بارگاہ کے لیے ثابت کیا گیا ہے اُس سے اسی قسم کا علم مراد ہے نفی و اثبات کی نصوص میں کوئی تعارض نہیں غیب کی یہ تقسیم لحوظ رہنا چاہیے غیب یہاں مفعول بہ کے موقع میں واقع ہے اور چونکہ ایمان اعتراف کے معنی کا متضمن ہے اس لیے با صلہ میں لائی گئی اور یومنون بالغیب فرمایا گیا اس صورت میں یہ معنی ہونگے کہ وہ غیب یعنی صانع اور اُس کی صفات اور نبوات شرائع واحکام روز آخر و بعث نشور حساب جزا کو مانتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بالغیب الطریق میں فاعل سے حال واقع ہو اُس وقت میں معنی یہ ہونگے کہ یومنون متلبسین بالغیبۃ یعنی وہ ایمان لاتے ہیں غیب کے ساتھ متلبس ہو کر مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ مومن معترف ہوتے ہیں اور اس غیبت سے اُن کے ایمان و یقین میں کوئی فرق نہیں آتا اور یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ وہ مومنین سے غائب ہونے کی حالت میں بھی مومن ہوتے ہیں وہ مخلص ہیں منافقین کی طرح نہیں کہ وہ ایمانداروں سے ملیں تو اُن کے سامنے مومن ہونے کا اقرار کریں اور جب غائب ہوں تو اپنے رفقاء سے اپنے دل کی بات کہدیں کہ وہ اُن کے ساتھ ہیں۔

ایک قول یہ بھی ہے کیونکہ وہ ایک چھپی چیز ہے اس تقدیر پر آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے دلوں سے ایمان لاتے ہیں اُن لوگوں کی طرح نہیں جو منہ سے تو کہتے ہوں مگر اُن کے دلوں میں ایمان نہو۔ اس تقدیر پر ما آلہ کے لیے ہوگی اور پہلی تقدیر پر تعدیہ کے لیے اور دوسری تقدیر پر مصاحبت کیلیئے

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ

اور نماز قائم رکھیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اُٹھائیں محاورات عرب پر وسیع نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامت جس سے کلمہ و یقیمون ماخوذ ہے چند معانی میں مستعمل ہے یہاں محاورات کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں تاکہ یہ بات ذہن نشین ہو سکے کہ محاورہ عرب کے اعتبار سے یہ کلمہ کن کن معانی پر دلالت کرتا ہے (۱) عرب میں ایک یہ محاورہ معروف ہے اقام العود جب لکڑی بنانیوالا اُسے ہموار کر کے کجی دور کرتا ہے اور لکڑی کو سیدھا کر دیتا ہے تو اُس وقت عرب یہ محاورہ بولتے ہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے لکڑی کو سیدھا کر دیا اور اُس میں کہیں کجی باقی نہ رہی جب کسی چیز کی نسبت یہ محاورہ بولا جاتا ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اُس شے کو نہایت استوار اور درست حالت میں کر دیا اور اس میں کسی قسم کا خلل و نقصان باقی نہ رہا۔ اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ وہ نماز کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ اُس کی ارکان میں کسی طرح کا خلل و نقصان راہ نپائے اُس کے فرائض سنن مستحبات سب بے نقصان ادا ہوں۔

(۲) ایک محاورہ ہے قامت السوق واقامھا یہ محاورہ اُس وقت بولا جاتا ہے جبکہ کوئی چیز رائج کی جاتی ہے اسی معنی میں شاعر کہتا ہے

اقامت غزالۃ سوق الضراب ÷ لاھل العراقین حولاً قمیطا

واقعہ یہ تھا کہ شبیب خارجی کو حجاج نے قتل کیا اس کی عورت غزالہ اپنے شوہر کا بدلہ لینے کے لیے اس پر لشکر لیکر چڑھی اور جنگ و جدل کی گرم بازاری ہوئی اس کو شاعر نے اس شعر میں ادا کیا ہے وہ کہتا ہے کہ غزالہ نے اہل عراقین یعنی کوفہ و بصرہ والوں کے لیے ایک سال کامل جنگ کا بازار رائج رکھا۔ اس شعر اور اس محاورہ سے معلوم ہوا کہ زبان عرب میں لفظ اقامۃ۔ مواظبت و رواج کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اس تقدیر پر آیت کے معنی یہ ہونگے کہ وہ نماز پر مواظبت و مداومت کرتے اور اس کو بہ پابندی و رغبت ادا کرتے ہیں۔

(۳) اقامت عرب میں مستعدی و کوشش کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے محاورہ ہے قام بالامر واقامہ یہ محاورہ اُسوقت بولا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کام کو نہایت چستی و مستعدی سے انجام دیتا ہے اور اُس میں سستی و کاہلی پاس نہیں آنے دیتا اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہونگے کہ وہ نماز کو نہایت مستعدی و کوشش سے بغیر کسی سستی و کاہلی کے ادا کرتے ہیں۔

(۴) اقامت بمعنی ادا بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اس میں آیت کے معنی ہونگے کہ وہ نماز کو ادا کرتے ہیں چونکہ نماز قیام پر مشتمل ہے اس لیے اُس کے ادا اقامت کے ساتھ تعبیر کی گئی جس طرح رکوع و سجود و تسبیح کے ساتھ تعبیر کی جاتی ہے۔ ایسے محاورات قریب قریب ہر زبان میں رائج ہیں جنگ کرنے کو کہتے ہیں کہ تلوار ہاتھ میں لی کیونکہ جنگ تلوار اُٹھانے پر مشتمل ہے۔

یہ تمام معنی محاورات پر نظر کرنے سے راست معلوم ہوتے ہیں اور مقام سے بھی مناسبت رکھتے ہیں فصحاء کے لطائف میں سے ہے کہ وہ ایسی عبارات لائیں جن کی وجوہ دلالات فوائد کثیرہ کے مثمر ہوں۔ ان تمام معانی میں معنی اوّل یعنی **تعدیل ارکان** سب سے راجح تر ہیں۔ اس رجحان کی چند وجوہ ہیں پہلی وجہ تو یہ کہ یہ معنی رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ یہ معنی مشہور ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ مقام مدح سے اس معنی کو مناسبت زیادہ ہے۔ چوتھی وجہ یہ کہ یہ معنی مُراد لینے پر ادامت و مواظبت خود بخود لازم آتی ہے لفظاً بھی اور معنیً بھی۔ لفظاً تو اس لیے کہ صیغۂ مضارع استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے اور معنیً اس لیے کہ جن کی صفت یہ ہے کہ وہ نماز کے فرائض و واجبات سنن و مستحبات خشوع و خضوع کی محافظت کرتے ہیں اور کسی ایک مستحب کو ترک نہیں ہونے دیتے وہ کس طرح گوارہ کر سکیں گے کہ نماز ہی پوری کی پوری ترک کر دیں ان وجوہ

سے یہ معنی راجح معلوم ہوتے ہیں لیکن بعض مفسرین معنی ثانی یعنی ادامت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی دوسری آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں جیسے ارشاد فرمایا۔

والذین ھم دائمون

صلوٰۃ:۔ افعال مخصوصہ کا نام ہے جو تحریم سے شروع ہوکر تحلیل پر ختم ہو جاتے ہیں اور جن کی صحت ادا کے لیے شرائط لعینہ ہیں وہ افعال فرائض واجبات وآداب پر مشتمل ہیں مقصود انکا اللہ تبارک وتعالےٰ کی عبادت اور اُس کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنا ہے۔ یہ تو صلوٰۃ کے شرعی معنے ہیں اور بحمد اللہ ہر مسلمان اس کو جانتا ہے۔ ہندوستان میں اور فارس وغیرہ بعض ممالک میں یہ نماز کے نام سے مشہور ہے۔ نماز مثل درود فرشتہ بہشت دوزخ وغیرہ الفاظ کے مصطلحات شرعیہ میں سے نہیں ہے بلکہ یہ عجمی زبان کا لفظ ہے جو ایک عبادت کے معنی میں مستعمل ہو گیا لیکن اُس کا استعمال ایسا عام ہوا کہ یہی معنی اُس پر غالب آگئے کہ اس سے پہلے اُس کے گیا معنی تھے یہ نسیا منسیا ہوکر رہ گئے حتی کہ اس لفظ کو سن کر کسی کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ اس لفظ کے کچھ اور معنی بھی ہیں۔

صلوٰۃ نماز کے سوا اور بھی چند معانی کے لیے مستعمل ہے مثلاً دعا جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا صل علیھم دوسرے معنی درود وثنا کقولہ تعالےٰ ان اللہ وملائکتہ یصلون تیسرے معنی قرآت کما قال اللہ تعالےٰ ولا تجھر بصلاتک چوتھے معنی رحمۃ کما فی القرآن اولٰئک علیھم صلوات من ربھم نماز کو ان تمام معانی سے مناسبت ہے اس لیے اسکا نام صلوٰۃ بہت ہی درست اور نہایت ہی مناسب ہے زمخشری کا یہ قول باطل ومردود ہے کہ صلوٰۃ تحریک الصلوین سے ماخوذ ہے نہ اسکی کوئی نقل معتمد ملتی ہے اور عدم شہرت کا خود زمخشری کو بھی اقرار ہے۔ اب صلوٰۃ مطلق نماز کو کہتے ہیں خواہ فرض ہو یا واجب یا نفل۔ مفسرین اس سے نماز

تفسیر

چونکہ اس جگہ متقین کا تذکرہ ہے، اور متقی وہ ہیں جنکے ایمان واعمال صحیح و درست ہوں۔ پہلے ایمان کا ذکر ہو چکا، اب اعمال کا ذکر شروع کیا جاتا ہے۔ اب اعمال کی بھی چونکہ بہت انواع ہیں، مگر ان میں سب سے بہتر وافضل نماز ہے، اسلیے نماز کو ان سب پر مقدم رکھا گیا۔ کئی وجوہ سے ایمان اعمال پر مقدم ہے:۔

اوّل یہ کہ ایمان چونکہ اعمال کی اصل ہے، کہ اگر ایمان درست نہیں، تو اعمال اُسکے لیے کوئی مفید نہیں، اگرچہ وہ کتنے ہی اچھے عمل کرے کہ بغیر صحیح اعتقاد اور درست ایمان کے ناقابل قبول ہیں۔ دوم یہ کہ ایمان اعتقاد قلبی کا نام ہے، اور اعمال جسم سے متعلق ہیں، اور قلب (دل) بادشاہ ہے، اور جسم اُسکی رعایا۔ لہٰذا جو چیزیں دل سے متعلق ہیں وہ جسم سے افضل ہیں۔ سوم یہ کہ سب سے پہلے اسلام میں ایمان لانا فرض ہوا، اسکے بعد نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ فرض ہوئے۔ چہارم یہ کہ ایمان لانا سب پر فرض ہے، مگر اعمال سب پر فرض نہیں۔ چنانچہ کافر کو ایمان لانا فرض ہے، اور بچے، دیوانے اپنے ماں باپ کے تابع ہیں، اور یہ کہ ہر مسلمان پر ہر حالت میں ایمان فرض، لیکن کافروں کے بچوں اور مسلمانوں کے بچوں اور دیوانوں پر نماز روزہ وغیرہ فرض نہیں۔ اسی طرح وہ عورت جو حیض ولفاس میں ہو، اُسے بھی ایمان رکھنا تو فرض ہے، مگر نماز روزہ فرض نہیں۔ اسی طرح غریب پر زکوٰۃ و حج فرض نہیں۔ ان وجوہات پر ایمان کو مقدم بیان کیا گیا۔

نماز کو مقدم بیان کرنیکی حکمت

اعمال میں سب سے افضل نماز ہے، اسکی حکمت یہ ہے کہ اللہ رب العزت جلّ مجدہٗ نے بوقتِ معراج عرش پر بلاکر اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نماز عطا فرمائی اور روزہ وزکوٰۃ وحج وغیرہ زمین پر ہی فرض فرمائے۔ (۲) اور اسلیے بھی نماز افضل ہے کہ نماز ہر روز پانچ دفعہ فرض ہے، اور زکوٰۃ وروزہ سال میں ایک مرتبہ اور حج عمر میں ایک بار فرض ہے۔ (۳) اور اسلیے بھی کہ نماز ہر غریب وامیر، مقیم ومسافر مسلمان پر فرض ہے مگر زکوٰۃ غریب پر فرض نہیں، اور روزہ مسافر اور حیض ولفاس والی عورت پر فرض نہیں، کیونکہ وہ قضا کر سکتے ہیں۔ (۴) اور اسلیے بھی کہ نماز حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک تقریباً ہر نبی ورسول نے کسی قدر فرق کے ساتھ پڑھی، لیکن زکوٰۃ وروزہ وغیرہ کا یہ حال نہیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے نمازِ فجر پڑھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمازِ ظہر پڑھی، حضرت یونس علیہ السلام نے نمازِ عصر پڑھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نمازِ مغرب پڑھی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نمازِ عشاء پڑھی۔ (تفسیر روح البیان) ان سب کی نمازوں کو اُمتِ مُسلمہ پر فرض کر دیا گیا۔

نماز کی فرضیت از کتاب وسُنّت

ایمان وتصحیح عقائد مطابق مذہب اہلِ سنّت وجماعت کے بعد نماز تمام فرائض میں نہایت اہم واعظم ہے۔ قرآن مجید واحادیثِ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اس کی اہمیت سے مالا مال ہیں، جابجا اسکی تاکید آئی، اور اسکے تارکین پر وعید فرمائی۔ چند آیتیں اور حدیثیں ذکر کیجاتی ہیں کہ مسلمان اپنے رب عزوجل اور پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات سنیں اور اُس کی توفیق سے اُن پر عمل کریں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ یہ کتاب پرہیزگاروں کو ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قایم رکھتے اور ہمنے جو دیا اُس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور فرماتا ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۝ نماز قایم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو، یعنی مسلمانوں کیسا کہ رکوع ہماری ہی شریعت میں ہے یا باجماعت ادا کرو۔ اور فرماتا ہے حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ۝ تمام نمازوں خصوصاً بیچ والی نماز (عصر) کی محافظت رکھو اور اللہ کے حضور ادب سے کھڑے ہو۔ اور فرماتا ہے وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ۝ نماز شاق ہے مگر خشوع کرنے والوں پر۔ نماز کا مطلقاً ترک تو سخت ہولناک چیز ہے، اُسے قضا کرکے پڑھنے والوں کو فرماتا ہے فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ ۝ خرابی اُن نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں وقت گزار کر پڑھنے اُٹھتے ہیں۔ جہنم میں ایک وادی ہے جس کی سختی سے جہنم بھی پناہ مانگتا ہے، اُسکا نام وَیل ہے قصداً نماز قضا کرنے والے اُسکے مستحق ہیں۔ اور فرماتا ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا ۝ اُنکے بعد کچھ ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نمازیں ضائع کر دیں اور نفسانی خواہشوں کا اتباع کیا عنقریب اُنھیں سخت عذاب طویل وشدید سے ملنا ہوگا۔ غیّ جہنم میں ایک وادی ہے، جس کی گرمی اور گہرائی سب سے زیادہ ہے، اُس میں ایک کنواں ہے جس کا نام ہبہب ہے جب جہنم کی آگ بجھنے پر آتی ہے اللہ عزوجل اُس کنوئیں کو کھول دیتا ہے جس سے وہ بدستور بھڑکنے لگتی ہے، قال اللہ تعالیٰ کُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰھُمْ سَعِیْرًا ۝ جب بجھنے پر آئیگی ہم اُنھیں اور بھڑک زیادہ کرینگے۔ یہ کنواں بے نمازیوں اور زانیوں اور شرابیوں اور سود خواروں اور ماں باپ کو ایذا دینے والوں کے لیے ہے۔ حدیث (۱) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اُس امر کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اُسکے خاص بندے اور رسول ہیں، اور نماز قایم کرنا، اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا، اور ماہِ رمضان کے روزے رکھنا رواہ البخاری ومسلم عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حدیث (۲) حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا، وہ عمل ارشاد ہو کہ مجھے جنت میں لیجائے اور جہنم سے بچائے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی عبادت کر اور اُسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور نماز قایم رکھ اور زکوٰۃ دے اور رمضان کا روزہ رکھ اور بیت اللہ کا حج کر۔ اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اسلام کا ستون نماز ہے رواہ احمد والترمذی وابن ماجۃ۔ حدیث (۳) فرمایا۔ پانچوں نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک اور رمضان سے رمضان تک اُن تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو انکے درمیان ہوں جبکہ کبائر سے بچا جائے رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴) ارشاد فرمایا بتاؤ تو کسی کے دروازہ پر نہر ہو، وہ اُس میں ہر روز پانچ بار غسل کرے، کیا اُسکے بدن پر میل رہ جائیگا؟ عرض کی نہ۔ فرمایا یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے سبب خطاؤں کو محو فرما دیتا ہے۔ رواہ البخاری ومسلم عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حدیث (۵)۔ ایک صاحب سے ایک گناہ صادر ہُوا، حاضر ہو کر عرض کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكۡرٰی لِلذّٰكِرِیۡنَ ۝ نماز قایم کر دن کے دونوں کناروں اور رات کے کچھ حصّہ میں، بیشک نیکیاں گناہوں کو دُور کرتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لیے۔ انھوں نے عرض کی، یارسول اللہ کیا یہ خاص میرے لیے ہے؟ فرمایا میری سب اُمت کے لیے۔ رواہ الشیخان عن ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۶) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے سوال کیا، اعمال میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کیا ہے؟ فرمایا وقت کے اندر نماز۔ میں نے عرض کی پھر کیا؟ فرمایا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ میں نے عرض کی پھر کیا؟ فرمایا راہِ خدا میں جہاد۔ رواہ الشیخان۔ حدیث (۷) ایک صاحب نے عرض کی یارسول اللہ اسلام میں سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب کیا چیز ہے؟ فرمایا وقت میں نماز پڑھنا، اور جس نے نماز چھوڑی اُسکا کوئی دین نہیں نماز دین کا ستون ہے۔ رواہ البیھقی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۸) فرمایا جب تمہارے بچّے سات برس کے ہوں، تو اُنھیں نماز کا حکم دو، اور جب دسؔ کے ہو جائیں، تو مار کر پڑھاؤ۔ رواہ ابوداؤد عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ حدیث (۹) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جاڑوں میں باہر تشریف لے گئے، پت جھڑ کا زمانہ تھا، دوٗ ٹہنیاں پکڑ لیں پتّے گرنے لگے، فرمایا اے ابوذر! میں عرض کی لبّیک یارسول اللہ۔ فرمایا مسلمان بندہ اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہے، تو اُسکے گناہ ایسے گرتے ہیں جیسے اس درخت سے یہ پتّے رواہ الامام احمد۔ حدیث (۱۰) فرمایا جو شخص اپنے گھر میں طہارت (وضو وغسل) کر کے فرض ادا کرنے کے لیے مسجد کو جاتا ہے، تو ایک قدم پر ایک گناہ محو ہوتا ہے دوسرے پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۱۱) فرمایا جو دوٗ رکعت نماز پڑھے اور اُن میں سہو نہ کرے، تو جو کچھ پیشتر اُسکے گناہ ہُوئے ہیں اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے یعنی صغائر رواہ الامام احمد عن زید بن خالد الجھنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۱۲) فرمایا بندہ جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اُسکے لیے جنتوں کے دروازے کھولدیئے جاتے ہیں، اور اُسکے پروردگار کے درمیان حجاب ہٹا دیئے جاتے ہیں، اور حورِ عین اُس کا استقبال کرتی ہیں جبتک نہ ناک سنکے نہ کھکارے رواہ طبرانی عن ابی امامۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۱۳) فرمایا سب سے پہلے قیامت کے دن بندہ سے نماز کا حساب لیا جائیگا، اگر یہ درست ہوئی، تو باقی اعمال بھی ٹھیک رہینگے، اور یہ بگڑی تو سبھی بگڑے، اور ایک روایت میں ہے کہ وہ خائب و خاسر ہُوا رواہ الطبرانی فی الاوسط والضیاء عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۱۴) ایک روایت میں یوں ہے، اگر نماز پوری کی ہے تو پوری لکھی جائیگی، اور پوری نہیں کی (یعنی اُس میں نقصان ہے) تو ملائکہ سے فرمائیگا، دیکھو میرے بندہ کے نوافل ہوں، تو اُن سے فرض پورے کر دو۔ پھر زکوٰۃ کا اسی طرح حساب ہوگا، پھر یوں ہی باقی اعمال کا رواہ الائمۃ احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ عن تمیم الداری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۱۵) فرمایا (جو مسلمان جہنم میں جائیگا والعیاذ باللہ تعالیٰ) اُسکے پورے بدن کو آگ کھائے گی سواء اعضاءِ سجود کے، اللہ تعالےٰ نے اُن کا کھانا آگ پر حرام کر دیا ہے رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ عن ابوھریرۃ رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔ حدیث (۱۶) فرمایا اللہ تعالےٰ کے نزدیک بندہ کی یہ حالت سب سے زیادہ پسند ہے کہ اُسے سجدہ کرتے دیکھے کہ اپنا مونھ خاک پر رگڑ رہا ہے رواہ الطبرانی فی الاوسط۔ حدیث (۱۷) فرمایا کوئی صبح وشام نہیں، مگر زمین کا ایک ٹکڑا دوسرے کو پکارتا ہے، آج تجھ پر کوئی نیک بندہ گزرا جس نے تجھ پر نماز پڑھی یا ذکرِ الٰہی کیا؟ اگر وہ ہاں کہے، تو اُسکے لیے اس سبب سے اپنے اوپر بزرگی تصور کرتا ہے رواہ الطبرانی فی الاوسط عن انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔ حدیث (۱۸) فرمایا جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہارت رواہ مسلم عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۱۹) فرمایا جو طہارت کر کے فرض نماز کے لیے اپنے گھر سے نکلا، اُس کا اجر ایسا ہے جیسا حج کرنے والے مُحرِم کا، اور جو چاشت کے لیے نکلا اُسکا اجر عُمرہ کرنے والے کی مثل ہے، اور ایک نماز دوسری نماز تک کہ دونوں کے درمیان میں کوئی لغو بات نہ ہو علیین میں لکھی ہوئی ہے، یعنی درجۂ قبول کو پہنچتی ہے رواہ ابوداؤد عن ابی اُمامۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۲۰ و ۲۱) فرمایا جس نے وضو کیا جیسا حکم ہے اور نماز پڑھی جیسی نماز کا حکم ہے، تو جو کچھ پہلے کیا ہے معاف ہو گیا رواہ الائمۃ احمد والنسائی وابن ماجۃ عن ابی ایوب الانصاری وعقبۃ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حدیث (۲۲) فرمایا جو اللہ کے لیے ایک سجدہ کرتا ہے اُسکے لیے ایک نیکی لکھتا ہے اور ایک گناہ معاف کرتا ہے اور ایک درجہ بلند کرتا ہے رواہ الامام احمد عن ابی ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۲۳) فرمایا جو تنہائی میں دوٗ رکعت نماز پڑھے کہ اللہ اور فرشتوں کے سوا کوئی نہ دیکھے، اُسکے لیے جہنم سے براءت لکھ دی جاتی ہے رواہ فی کنز العمال۔ حدیث (۲۴) ارشاد فرمایا ہر شے کے لیے ایک علامت ہوتی ہے، ایمان کی علامت نماز ہے کما فی المنیۃ۔ حدیث (۲۵) فرمایا نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قایم رکھا، دین کو قایم رکھا، اور جس نے اسے چھوڑ دیا دین کو ڈھا دیا کما فی المنیۃ۔ حدیث (۲۶) فرمایا پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا، اور وقت میں پڑھیں اور رکوع وخشوع کو پورا کیا، تو اُسکے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمۂ کرم پر عہد کر لیا ہے کہ اُسے بخشدے، اور جس نے نہ کیا اُسکے لیے عہد نہیں، چاہے بخشدے چاہے عذاب کرے رواہ احمد وابوداؤد عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۲۷) فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے اگر وقت میں نماز قایم رکھے، تو میرے بندہ کا میرے ذمۂ کرم پر عہد ہے کہ اُسے عذاب نہ دوں، اور بے حساب جنت میں داخل کروں رواہ الحاکم فی تاریخہ عن اُم المؤمنین الصدیقۃ رضی اللہ تعالےٰ عنہا۔ حدیث (۲۸) فرمایا اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز فرض نہ کی، جو توحید ونماز سے بہتر ہو۔ اگر اس سے کوئی چیز ہوتی، تو وہ ضرور ملائکہ پر فرض کرتا، اُن میں کوئی رکوع میں ہے، کوئی سجدہ میں رواہ دیلمی عن ابی سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۲۹) فرمایا جو بندہ نماز پڑھ کر اُس جگہ جب تک بیٹھا رہتا ہے فرشتے اُسکے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں، اُسوقت تک کہ بے وضو ہو جائے یا اُٹھ کھڑا ہو رواہ الطیالسی عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ملائکہ کا استغفار اُسکے لیے یہ ہے اَللّٰھُمَّ اغۡفِرۡ لَهٗ اَللّٰھُمَّ ارۡحَمۡهُ اَللّٰھُمَّ تُبۡ عَلَیۡهِ۔ اور متعدد حدیثوں میں آیا ہے کہ جبتک نماز کے انتظار میں ہے اُسوقت تک وہ نماز ہی میں ہے، یہ فضائل مطلق نماز کے ہیں، اور خاص خاص نمازوں کے متعلق جو احادیث وارد ہوئیں اُن میں بعض یہ ہیں:۔ حدیث (۳۰) ارشاد فرماتے ہیں، جو صبح کی نماز پڑھتا ہے، وہ شام تک اللہ کے ذمہ میں ہے دوسری روایت میں ہے، تو اللہ کا ذمہ نہ توڑو، جو اللہ کا ذمہ توڑے گا، اللہ تعالےٰ اُسے اوندھا کر کے دوزخ میں ڈالدیگا رواہ الطبرانی عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حدیث (۳۱) فرمایا جو صبح نماز کو گیا ایمان کے جھنڈے کے ساتھ گیا، اور جو صبح بازار کو گیا ابلیس کے جھنڈے کے ساتھ گیا رواہ ابن ماجۃ عن سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۳۲) جو نمازِ صبح کے لیے طالبِ ثواب ہو کر حاضر ہُوا، گویا اُس نے تمام رات قیام کیا (عبادت کی) اور جو نمازِ عشاء کے لیے حاضر ہُوا، گویا اُس نے نصف شب قیام کیا رواہ البیھقی فی شعب الایمان عن عثمان موقوفًا۔ حدیث (۳۳) فرمایا جس نے چالیس دن نمازِ فجر وعشاء باجماعت پڑھی، اُسکو اللہ تعالیٰ دوٗ براءتیں عطا فرمائیگا، ایک نار سے دوسری نفاق سے رواہ الخطیب عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۳۴) فرماتے ہیں رات اور دن کے ملائکہ نمازِ فجر وعصر میں جمع ہوتے ہیں، جب وہ جاتے ہیں تو اللہ عزوجل اُن سے فرماتا ہے کہاں سے آئے؟ حالانکہ وہ جانتا ہے۔ عرض کرتے ہیں تیرے بندوں کے پاس سے، جب ہم اُنکے پاس گئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور نماز پڑھتا چھوڑ کر تیرے پاس حاضر ہوئے رواہ احمد عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۳۵) فرماتے ہیں جو مسجدِ جماعت میں چالیس راتیں نمازِ عشاء پڑھے کہ رکعتِ اولیٰ فوت نہ ہو، اللہ تعالیٰ اُسکے لیے دوزخ سے آزادی لکھ دیتا ہے رواہ ابن ماجۃ عن ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ حدیث (۳۶) فرماتے ہیں سب نمازوں میں زیادہ گراں منافقین پر نمازِ عشاء وفجر ہے، اور جو ان میں فضیلت ہے اگر جانتے ضرور حاضر ہوتے، اگرچہ سُرین کے بل گھسٹتے ہوئے، یعنی جیسے بھی ممکن ہوتا رواہ الطبرانی عن ابنِ مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔ حدیث (۳۷) فرماتے ہیں جو نمازِ عشاء سے پہلے سوئے، اللہ اُسکی آنکھ کو نہ سُلائے رواہ البزار عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ نماز نہ پڑھنے پر جو وعیدیں آئیں اُن میں سے بعض یہ ہیں:۔ حدیث (۳۸) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں جسکی نماز فوت ہوئی گویا اُسکے اہل ومال جاتے رہے رواہ الشیخان عن نوفل بن معاویۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۳۹) فرمایا جس نے قصداً نماز چھوڑی جہنم کے دروازہ پر اُسکا نام لکھ دیا جاتا ہے

رواہ ابونعیم عن ابی سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴۰) فرمایا قصداً نماز ترک نہ کرو کہ جو قصداً نماز ترک کردیتا ہے اللہ و رسول اُس سے بری الذمّہ ہے رواہ الامام احمد عن اُم ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴۱) فرماتے ہیں جس دین میں نماز نہیں اُس میں کوئی خیر نہیں رواہ الشیخان عن عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴۲) فرماتے ہیں جس نے نماز چھوڑدی اُسکا کوئی دین نہیں، نماز دین کا ستون ہے رواہ البیھقی عن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴۳) فرماتے ہیں اسلام میں اُسکا کوئی حصہ نہیں جس کیلیے نماز نہ ہو رواہ البزار عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴۴) فرمایا جس نے نماز پر محافظت (مداومت) کی قیامت کے دن وہ نماز اُسکے لیے نور و بُرہان و نجات ہوگی، اور جس نے محافظت نہ کی اُسکے لیے نہ نور ہے نہ بُرہان نہ نجات، اور قیامت کے دن قارون و فرعون و ہامان و اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا رواہ احمد والدارمی والبیھقی فی شعب الایمان۔ حدیث (۴۵) حضرت امیر المومنین فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے صوبوں کے پاس فرمان بھیجا کہ تمہارے سب کاموں سے اہم میرے نزدیک نماز ہے، جس نے اُسکا حفظ کیا اور اُس پر محافظت کی، اُس نے اپنا دین محفوظ رکھا، اور جس نے اسے ضائع کیا، وہ اوروں کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کریگا رواہ الشیخان و مالک عن نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حدیث (۴۶) صحابۂ کرام کسی عمل کے ترک کو کفر نہیں جانتے سوا نماز کے رواہ الترمذی عن عبد اللہ بن شقیق۔

بہت سی ایسی حدیثیں آئیں جن کا ظاہر یہ ہے کہ قصداً نماز کا ترک کفر ہے، اور بعض صحابۂ کرام مثلاً حضرت امیر المومنین فاروقِ اعظم و عبد الرحمٰن بن عوف و عبد اللہ بن مسعود و عبد اللہ بن عباس و جابر بن عبد اللہ و معاذ بن جبل و ابوہریرہ و ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی مذہب تھا۔ اور بعض ائمہ مثلاً امام احمد بن حنبل و اسحٰق بن راہویہ و عبد اللہ بن مبارک و امام نخعی کا بھی یہی مذہب تھا، اگرچہ ہمارے امام اعظم و دیگر ائمہ، نیز بہت سے صحابۂ کرام اُسکی تکفیر نہیں کرتے۔ پھر بھی یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ اُن جلیل القدر حضرات کے نزدیک ایسا شخص کافر ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اُٹھائیں۔

چونکہ گزشتہ کلمات میں متقین کی صفات کا سلسلہ وار بیان ہورہا ہے، اور ان صفات میں ایمان کو مقدم کیا، کیونکہ یہ سب میں اصل ہے۔ اسکے بعد نماز کو کہ یہ تمام عبادات میں افضل ہے۔ گویا ایمان میں مومن کی قلبی حالت کا بیان تھا، اور نماز میں اُسکی بدنی عبادت کا ذکر تھا۔ اب مالی عبادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، تاکہ تقوے کے تمام اعلیٰ منازل بیان کردیے جائیں۔ اسکے سوا یہ بھی حکمت ہے (۲) ایمان میں عزّت و حکومت ہے، اور نماز میں قربت و منزلت، اور انفاق میں مزید اضافہ۔ (۳) اور یہ کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے، تو اولاً چونکہ وہ دینِ فطرت پر تولد ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ وَيُمَجِّسَانِهٖ (کہ ہر بچّہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسکے بعد اسکو اُسکے والدین یہودی، نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں) تو لازم ہے کہ پہلے ایمان کا اظہار کرے، اسکے بعد اپنے جسم کو طاعتِ الٰہی میں مشغول کرے۔ پھر جب اُسے اللہ تبارک و تعالیٰ نعمتِ مال سے سرفراز فرمائے، تو اُسکو اُسکی راہ میں خرچ کرے۔ (۴) اور یہ کہ ایمان توحید و رسالت کے بعد پہلے نماز فرض ہوئی، پھر زکوٰۃ۔ (۵) اور یہ کہ ایمان میں نجات ہے، اور نماز میں مناجات، اور انفاق درجات۔ (۶) اور یہ کہ ایمان میں بشارت ہے، اور نماز میں کفارہ ہے اور انفاق میں طہارت و تزکیہ ہے۔ (۷) اور یہ کہ اس آیت میں چار چیزوں کا ذکر ہے، تقوٰی، ایمان بالغیب، اقامتِ صلوٰۃ، اور انفاق۔ اور یہ چاروں اوصاف بالعموم صحابۂ کرام میں اور خصوصیت کے ساتھ خلفاءِ اربعہ یعنی سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر فاروق، سیدنا عثمان ذوالنورین اور سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں موجود ہیں۔ چنانچہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ متقین کے سردار، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مومنین کے پیشوا، سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نمازیوں کے مقتداء اور سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم خرچ کرنیوالوں کے رہنما و امام ہیں۔ (روح البیان)

اور کیوں نہ ہو کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے مجموعۂ کمالات ہوگئے تھے، اُنکی ہستیاں خصائلِ رضیہ و فضائلِ مرضیہ کے مجسّمے تھے، اُن میں سے ہر ایک کمالات کا پُتلہ تھا، شمائلِ جمیلہ و اوصافِ حمیدہ کے اصناف کے لیے اُنکی ذاتیں سرچشمہ اور منبعِ فیض تھیں، اُن کے جُود و نوال کے مقابلہ میں سلاطینِ عالم ناقابلِ ذکر چیز ہیں۔ حاتم طائی اس وصف میں اُن درباروں کے دریوزہ گر کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام صحابہ میں سب سے زیادہ صاحبِ جُود و سخا ہیں اور آپ کے مرتبہ کی بلندی یہانتک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں فرمایا

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (پ ۳۰ سورۃ اللیل)	اور بہت اُس سے دُور رکھا جائیگا، سب سے بڑا پرہیزگار جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو، اور کسی کا اُس پر احسان نہیں جسکا بدلہ دیا جائے، صرف اپنے رب کی رضا چاہتا ہے جو سب سے بلند ہے اور بیشک قریب ہے کہ وہ راضی ہوگا

ابنِ جوزی نے کہا کہ اس پر اجماع ہوگیا ہے کہ یہ آیت حضرتِ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ جُود و سخا کا اس سے بڑھکر اور کیا مرتبہ ہوسکتا ہے کہ قرآنِ پاک کی آیتیں اُسکے حق میں نازل ہوں۔

آپ کے انفاقِ مال میں سب سے اعلیٰ موقع جو آپ کو حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کا مال بارگاہِ نبوّت میں قبول ہُوا، اور حضور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم نے اُس کی قدر فرمائی۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ مروی ہیں

مَا نَفَعَنِيْ مَالُ اَحَدٍ مَا نَفَعَنِيْ مَالُ اَبِيْ بَكْرٍ، فَبَكٰى اَبُوْ بَكْرٍ وَقَالَ هَلْ اَنَا وَمَالِيْ اِلَّا لَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (رواہ احمد عن ابی ھریرۃ)	مجھے ہرگز کسی کے مال نے وہ نفع نہ دیا جو ابوبکر کے مال نے دیا، حضرتِ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سُنکر رو دیئے اور عرض کرنے لگے کہ نہیں ہوں میں اور میرا مال مگر خاص آپ کیلیے اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرتِ صدیق کی نیازمندی و اخلاص کا یہ اثر تھا کہ سلطانِ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اُنکے مال کو اپنے مال کی طرح بے تکلف خرچ فرماتے۔ جس روز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شرفِ اسلام سے مشرف ہوئے، اُس روز وہ چالیس ہزار دینار کے مالک تھے، وہ کُل اُنھوں نے حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کے قدموں پر نثار کردیا۔ آپ نے اپنا تمام مال اسلام کی اعانت اور اُن اسیروں کے آزاد کرانے میں صرف کردیا، جو کفّار کے ہاتھوں میں مملوک تھے، اور حضور سرورِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فراق میں تڑپ رہے تھے، اور اس جذبِ محبت کی وجہ سے اُنکو سخت سے سخت تکلیفیں دیجاتی تھیں۔

ابوداؤد و ترمذی نے حضرتِ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ ہمیں حضور نے صدقہ کرنے کے لیے فرمایا، اُسوقت میرے پاس مال تھا، میں نے کہا کہ اگر حضرتِ ابوبکر پر سبقت لیجانا ممکن ہو، تو آج وہ دن ہے کہ میں اُن پر سبقت لیجاؤں، چنانچہ میں اپنا نصف مال لیکر حاضر ہوا۔ حضور نے فرمایا تم نے کتنا باقی رکھا؟ میں نے عرض کیا، اتنا ہی۔ اور حضرتِ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا کُل مال حاضر کردیا۔ جب اُن سے سوال ہوا کہ تم نے کیا چھوڑا؟ تو اُنھوں عرض کیا کہ اللہ و رسول۔ میں نے کہا کہ میں ان سے کبھی کسی بات میں سبقت نہ لیجاسکونگا۔ حدیث:۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ روایت کیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم پر کسی کا احسان نہیں ہم سب کا بدلہ کرچکے بجز ابوبکر کے، اللہ تعالیٰ اُن کو روزِ قیامت اُسکی جزاء عنایت فرمائے، اور مجھ کو کسی کے مال نے وہ نفع نہ دیا، جو ابوبکر کے مال نے دیا۔

حدیث:۔ ابنِ عساکر نے ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھ پر احسان کرنے میں کوئی ابوبکر کا ہم پلہ نہیں اُنھوں نے میری غمخواری میں اپنی جان و مال اور اولاد سے دریغ نہ کیا۔

تفسیر راہِ خدا میں خرچ کرنے سے یا زکوٰۃ مُراد ہے، جیسا دوسری جگہ فرمایا یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ یا مطلق اِنفاق، خواہ فرض و واجب ہو جیسے زکوٰۃ نذر، اپنا اور اپنے اہل کا نفقہ وغیرہ، خواہ مستحب جیسے صدقاتِ نافلہ، اموات کا ایصالِ ثواب وغیرہ۔ **مسئلہ** گیارھویں، فاتحہ، تیجہ، چالیسواں، برسی عُرس وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں کہ وہ سب صدقات ہیں، اور قرآن پاک و کلمہ شریف کا پڑھنا نیکی کے ساتھ اور نیکی ملا کر اجر و ثواب بڑھاتا ہے۔
مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ ہے، جو اسطرف اشارہ کرتا ہے کہ اِنفاق میں اِسراف ممنوع ہے، یعنی اِنفاق خواہ اپنے نفس پر ہو، یا اپنے اہل پر، یا کسی اور پر اعتدال کے ساتھ ہو، اسراف نہ ہونے پائے۔ البتہ اگر کوئی اللہ کا مخلص بندہ سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح متوکل ہو، اور اُسکے تمام اہل و عیال بھی سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر والوں کی طرح متوکل ہوں، اور پھر وہ اپنا سارا گھر بار حضور سید عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قدمِ مبارک پر نثار کر دے، اور گھر میں اللہ و رسول کا نام رکھے، تو یہ دوسری بات ہے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو پروانۂ شمعِ مصطفائی تھے۔ اِن سوختہ جانوں کے احکام بھی دوسرے ہیں۔
دوسرے اسطرف بھی اشارہ ہے کہ مال دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ کہ جو کسبِ حلال سے حاصل کیا گیا ہو، دوسرا وہ کہ جو کسبِ حرام سے حاصل کیا گیا ہو۔ تو راہِ خدا میں وہ مال خرچ کرنا چاہیئے جو نہایت طیب و حلال ہو، کیونکہ مالِ حرام اُس کی راہ میں نامقبول ہے۔ نیز یہ کہ بعض مال رَدّی ہوتے ہیں، اور بعض جید و عمدہ۔ تو اللہ کی راہ میں جو مال خرچ کیا جائے وہ جید و عمدہ ہونا چاہیئے۔ اسکے علاوہ اور بھی حکمتیں ہیں، اسلیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مِنْ ارشاد فرمایا۔
رَزَقْنٰھُمْ۔ رِزْقٌ سے ماخوذ ہے، جسکے لغوی دو معنی ہیں، ایک بمعنی عطا، یعنی دی ہوئی چیز، حصہ۔ ارشادِ باری ہے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ اَنَّکُمْ تُکَذِّبُوْنَ ۝ اس آیت میں رزق کے معنی "حصہ" ہیں ـــ رزق کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ ہر وہ شے رزق ہے جس سے کوئی جاندار نفع حاصل کرے۔ مثلاً ہوا، پانی، لباس، غذا، زمین اور اولاد وغیرہ۔ غرضکہ دنیا کی ہر نعمت رزق ہے، اور ہر نعمت در رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ حضرتِ قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ مال جو تمہارے پاس ہے، وہ خدا کی عطا کردہ ایسی امانت ہے، جو بہت جلد تم سے جُدا ہونے والا ہے۔ لہٰذا اپنی زندگی میں اسے خدا کی راہ میں خرچ کرو۔
شریعت میں سات طرح پر مال خرچ کرنا عبادت ہے (۱) زکوٰۃ۔ اس کی بہت قسمیں ہیں، اور اسکے بیشمار مسائل ہیں جو کُتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ (۲) صدقۂ فطر، (۳) صدقاتِ نافلہ۔ اسکی بھی بہت قسمیں ہیں، مہمانوں کی دعوت، کمزوروں کی مدد، یتیموں کی پرورش، قرضداروں کے قرضہ کی ادائیگی، گیارھویں شریف، محفلِ میلاد شریف تیجہ، دسواں، چالیسواں، برسی، عرس، اور تمام ایصالِ ثواب وغیرہ سب کو شامل ہے۔ (۴) "وقف"۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں، مثلاً مسجد بنانا، کنوئیں تعمیر کرانا، دینی مدارس کھولنا، پُل، سرائے وغیرہ بنانا۔ (۵) مصارفِ حج۔ (۶) جہاد۔ (۷) اہلِ قرابت پر خرچ کرنا، صلہ رحمی کرنا وغیرہ۔
یُنْفِقُوْنَ۔ اِنفاق نَفَقٌ سے ماخوذ ہے، جسکے لغوی معنی بکھیرنے یا الگ الگ ہونے کے ہیں، اسی لیے جس کا دل اور زبان ایک نہ ہو، اُسے "منافق" کہتے ہیں کہ اس کا دل اور زبان الگ الگ ہے۔ لومڑی کے سُوراخ کو "نافقہ" بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ اُسکے دروازے کئی ہوتے ہیں ایک ظاہر اور ایک پوشیدہ۔ اور رائج سکّہ کو بھی "نافقہ" کہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک جگہ مشکل سے جمع ہوتا ہے۔ خرچ کو بھی "نفقہ" اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں گویا مال بکھیر دیا جاتا ہے۔
خرچ کرنے کی کئی صورتیں ہیں۔ جس میں کچھ حرام ہیں جیسے شراب نوشی جوا وغیرہ اور کچھ جائز جیسے دنیوی ضروریات میں پیسہ خرچ کرنا اور کچھ مستحب جیسے ایصالِ ثواب وغیرہ اور کچھ سنت اور کچھ فرض۔ اس جگہ وہ خرچ مراد ہے جو رضائے الٰہی کے لیے ہو خواہ فرض ہو یا نفل وغیرہ
اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود اور دیگر بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا ہے یہ زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے حضرت ضحاک کا قول ہے کہ زکوٰۃ کی سات آیتیں جو سورۂ برأت میں ہیں ان کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ اپنی استطاعت و طاقت کے مطابق تھوڑا بہت جو میسر ہو خدا کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔ حضرت ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے زکوٰۃ کو بھی اور اہل و عیال پہ خرچ کرنے پر اور جن لوگوں کو دینا ضروری ہے ان سب کے دینے کو بھی شامل ہے۔ اسی لیے کہ اللہ رب العزت جل مجدہ نے ایک عام وصف بیان فرمایا اور عام تعریف کی ہے تو ہر طرح کے خرچ کو شامل ہے۔
رزقنٰھم کی تقدیم اور رزق کو اپنی طرف نسبت فرما کر ظاہر فرمایا گیا کہ مال تمہارا پیدا کیا ہوا نہیں ہمارا عطا فرمایا ہوا ہے اس کو ہمارے حکم سے ہماری راہ میں خرچ نہ کرو تو تم نہایت ہی بخیل ہو اور یہ بخل نہایت قبیح۔
اس مقام پر تفسیر روح البیان میں ہے کہ کسی نبی پر وحی فرمائی گئی کہ فلاں شخص کی آدھی عمر غناء میں اور آدھی عمر فقیری اور محتاجی میں گزرنے والی ہے اس سے پوچھو کہ پہلے کونسی چیز چاہتا ہے آیا پہلے مال و دولت حاصل کر کے غنا چاہتا ہے یا افلاس و فقیری۔ چنانچہ اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے اپنے گھر آ کر اپنی بیوی سے مشورہ طلب کیا۔ اُس نے رائے دی کہ پہلے نصف عمر کی ثروت طلب کرو اس شوہر نے کہا کہ تنگدستی دولتمندی کے بعد بہت سخت اور شاق ہوتی ہے اور دولتمندی تنگ حالی کے بعد بہت لذیذ اور پیاری ہوتی ہے اور آخر عمر کے ضعف اور بیچارگی کی دقتیں تنگدستی اور مصیبت پر مصیبت ہوگی مگر بی بی نے اس رائے کو منظور نکیا اور شوہر سے کہا کہ یہی کرنا ہوگا چنانچہ اُس نے اللہ کی بارگاہ الٰہی میں بھی عرض کر دیا اور اُس کا حال روز بروز بہتر ہونے لگا دولت و ثروت بڑھنے لگی غنا کے دروازے کھُل گئے تو اُسکی پاک بی بی نے اپنے شوہر سے کہا کہ اگر تو چاہتا ہے کہ یہ نعمت باقی رہے اور فقر و فاقہ کی مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑے تو سخی بن اور اس مال کو راہِ خدا میں خرچ کرنا شروع کر۔ اس مشورہ پر اُس نے یہاں تک عمل کیا کہ اپنے لیے کپڑا جب بناتا جب پہلے ویسا ہی فقیر کے لیے بنا لیتا اور اپنے آپ جب کھاتا جب اہلِ حاجت کو اُس سے بہتر کھلا لیتا یہاں تک کہ اسکی عمر کا نصف حصہ اور دولت و ثروت کے لیے مقرر کیا ہوا زمانہ گذر چکا نبی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس اللہ تبارک و تعالیٰ کیطرف سے وحی آئی کہ میرے بندے نے جو زمانہ اپنی دولت کیلئے مقرر کیا تھا گذر گیا اور اب تنگدستی کا زمانہ آیا لیکن بیں کے اُس کو زمانہ نعمت میں اپنے احسان کا شکر گذار پایا اور وہ اپنی آسائش کیوقت میرے غریب بندوں کی دستگیری سے غافل نہ رہا اُسے بشارت دیدو کہ میرا کرم اُس کی باقی عمر کو اور مزید نعمت کیساتھ نوازتا ہے اور اب اُس پر فقر و فاقہ مسلط نہ کیا جائیگا۔

جلوۂ طوبیٰ و ما قامت یار؛ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

حضرات صوفیائے کرام نے اس آیت کے معنی اپنے درجات و مقامات کے لائق سمجھے الفاظ کے قالب میں اُن معانی کی ادا اتنی ہی دشوار ہے جتنا کوزہ میں سمندر کو بھر دینا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت رس نگاہیں ہی حقیقت تک پہنچتی ہیں ایک ضعیف البصر اگر کسی تیز نظر سے ہمسری کا دعویٰ کرے تو جنون ہے وہ حضرات فرماتے ہیں کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ کے معنی ہیں کہ جو ہم نے اُنہیں عطا فرمایا تو اب اس عطا کی وسعت کو دیکھیے مال و مسکن بھی عطا عزت و جاہ بھی عطا اہل و اولاد بھی عطا لباس و خوراک بھی عطا صحت و عافیت بھی عطا عقل و خرد بھی عطا۔ فضل و کمال بھی عطا اور خود ہمارا وجود اور اس پر مرتب ہونے والے جملہ صفات یہ بھی عطا تو ابتداءِ عطا کی کہاں سے ہوتی ہے یہیں سے تو کہ ہم کچھ نہ تھے ہمیں وجود عطا فرمایا هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا تو اگر انفاق یہاں سے شروع ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ متقین جن کا تذکرہ کیا جا رہا ہے ایسے خالص بندے ہیں جو اپنے وجود و اوصافِ وجود کو راہِ خدا میں صرف کرتے ہیں جب یہ بذل و جہد اپنے کمال کو پہنچتا ہے اور اس انفاق کی نہایت ہوتی ہے تو عنایتِ ازلی اپنے نفحاتِ الطاف سے دستگیری فرماتی ہے اور درجاتِ قرب عنایت کرتی ہے جس طرح کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جذبۂ حق نے خطاب اُدْنُ کی صورت میں نوازا اسی طرح مومن مخلص کو

خطابِ اُسْجُدْ وَاقْتَرِبْ کی شکل میں سرفراز فرماتا ہے۔ سجدہ کے بعد تشہد میں انانیت کے حجابات سے خلاص اور جذبات ربانیہ کیساتھ جمالِ حق کے شہود تک وصول کیطرف اشارہ ہے۔ پھر تحیات کیساتھ عند الرجوع رسم عبدیت کیطرف اشارہ ہے کہ بارگاہ ملوک سے واپسی کے وقت باریابانِ دربار ثنا و شکر کے کلمات جاری کرتے ہیں اور دائیں بائیں سلام کرنے میں اشارہ ہے کہ سرمستان صہبائے محبت اور بادہ کشان مجالس قربت اپنے مقامات مناجات واجابات اور درجات قربات میں لذت و شہوت اور کونین و دارین کے لذات سے مستغنی ہیں وہ بحر کرامات میں غرق اور قید جذبات میں مقید ہیں ؎

خلاص حافظ ازان زلف تابدار مباد ÷ کہ بستگان کمند تو رستگار انند

اہل ظاہر تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہکر اقامت صلوٰۃ سے باہر آتے ہیں اور اہل حقیقت اسی سلام کے ساتھ ادامت صلوٰۃ میں داخل ہوتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ایک قوم ہے جو نماز کو قایم کرتی ہے اور نماز اُن کی حفاظت کرتی ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ان ہی کی شان ہے اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ آج جو نعمت و دولت اُن کے پاس ہے قریب کی ہو یا بعید کی اُس کو وہ راہِ خدا میں بیدریغ صرف کرتے ہیں اور اُن کے لیے بارگاہِ حق میں وہ نعمتیں ہیں جن کی نسبت حدیث شریف میں ارشاد ہوا اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی دل میں مخطور ہوئیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کے اور ان نعمتوں کے درمیان اُن کے اپنے وجود کے سوا اور کوئی حجاب نہیں ہے تو وہ ایک ایسی آگ کی طرف دوڑتے ہیں جو حجابات وجود کو جلادے اور اس دوری کو مٹادے یہ آگ اُنہیں نماز کی وادی ایمن میں ملتی ہے اور اُس سے یہ حجابات دوری جلاڈالتے ہیں اور جو اوصاف وجود انہیں ملے ہیں اُس کو اس نار کا ایندھن بناکر انفاق کرتے ہیں یہ اہل حقیقت کا انفاق ہے

رزقنا اللہ تعالیٰ ابناعھم وادخلنا فی زمرتھم آمین

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ

اور وہ کہ ایمان لائیں اُس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اوترا اور جو تم سے پہلے اوترا اور عاقبت پر یقین رکھیں

زمانہ اقدس میں ایمان لانے والے دو طرح کے تھے ایک اہل کتاب دوسرے اُن کے ماسوا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ سے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ تک جو آیتیں ہیں وہ اگرچہ عام ہیں اور ہر اس شخص کو شامل ہیں جو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لایا خواہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بھی ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ لیکن مراد ان آیات میں عام عرب ہیں اور والذین یومنون بما انزل الیک الآیہ سے خاص اہل کتاب مراد ہیں مثل عبد اللہ ابن سلام اور اُن کے امثال کے اور یہ تخصیص بعد تعمیم اُن کے مزید تشریف کے لیے ہے کہ وہ متقین کے عموم میں بھی داخل تھے اور اس آیتہ میں بھی مخصوص طور پر ذکر کیے گئے یہ اُس تقدیر پر ہے جبکہ الذین یومنون بما انزل الیک کو الذین یومنون بالغیب پر معطوف قرار دیا جائے تو دونوں آیتیں متقین کی تفصیل ہونگی یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الذین یومنون بما انزل الیک الآیۃ المتقین پر معطوف ہو تو اس وقت معنی یہ ہونگے کہ یہ قرآن کریم اُن لوگوں کے لیے بھی ہدایت ہے جو شرک سے بچتے ہیں اور اہل کتاب میں سے جو ایمان لائے اُن کے لیے بھی ہدایت۔ اس صورت میں اس آیت سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں اور پہلی آیت سے وہ لوگ جو مشرکین میں سے ایمان لائے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الذین یومنون بما انزل الیک اور الذین یومنون بالغیب دونوں کا مصداق واحد ہو اور بعینہ وہی لوگ جو پہلی آیت میں مراد تھے دوسری آیت میں بھی وہی لوگ مراد ہوں۔ اس صورت میں اتنی بات دریافت طلب رہیگی کہ معطوفین میں باوجود اتحاد ذات صحت عطف کی کیا توجیہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صحت عطف کے لیے مفہومی تغایر کافی ہے جس طرح ابن زیابہ کے اس شعر میں ؎ یالہف زیابۃ للحارث الصابح فالغانم فالعائب۔

ایسی شکل میں آیتہ کے معنی یہ ہونگے کہ وہ لوگ جامع ہیں دونوں طرح کے ایمان کے جن چیزوں کا عقل ادراک کرتی ہے اُن سب کے ساتھ بھی ایمان لاتے ہیں اور عبادات بدنیہ و مالیہ جو اس ایمان کی مصداق ہیں ان کو بھی ادا کرتے ہیں اور جو علوم انبیا سے حاصل ہوتے ہیں اور سوائے اس کے اُن کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے اُس پر بھی ایمان لاتے ہیں مگر خفاجی نے اس اخیر احتمال کو غیر ماثور بتایا ہے۔ ما انزل الیک سے مراد تمام قرآن اور پوری شریعت ہے اور انزال کو ماضی کے ساتھ تعبیر فرمانا بالخصوص ایسے حال میں کہ ابھی بعض نازل ہوا ہو اور بعض کا انتظار ہو بقاعدہ تغلیب محقق علی المقدر ہے یا اس لیے کہ خبر جو یقینا واقع ہونے والی ہے اُس کو واقع قرار دیدینا داب فصحا ہے کلام عرب میں اور خود قرآن حکیم میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں جیساکہ آیتہ انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ میں تعبیر لفظ ماضی سے واضح ہوئی باوجودیکہ جیات تے پوری کتاب سنی نہ اُس وقت تک کامل نازل ہوئی تھی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن شئی واحد ہے اُس کے بعض کا انکار کل کا انکار ہے اور بعض پر ایمان لانا کل ہی پر ایمان لانا ہے انزل الیک سے وحی متلو (قرآن شریف) اور وحی غیر متلو جس کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیان فرمایا ہو جیسے اعداد رکعات نصاب زکوٰۃ اور حدود و جنایات وغیرہ یہ سب مراد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى اس سے معلوم ہوا کہ تمام شریعت محمدیہ پر اور تمام کتب سابقہ پر جو پہلے انبیا علیہم السلام پر نازل ہوئیں اُن سب پر ایمان لانا ضروری و فرض ہے فرق اتنا ہے کہ کتب سابقہ پر تو بالاجمال ایمان کافی ہے اور اپنی شریعت پر بالتفصیل فرض کفایہ ہے کیونکہ ہم اپنی شریعت کے تفاصیل کے مطیع ہیں اور وہی ہمارا طریق زندگانی ہے۔ فرض کفایہ اسلیے ہے کہ اگر بعض تحصیل علم میں مشغول ہوں اور وہ ان تفاصیل کے عالم و عارف ہوجائیں تو باقی لوگوں کو اُن کے ذریعہ سے احکام پہنچ جاتے ہیں اور ہر ہر شخص کے لیے ضروری نہیں رہتا کہ وہ پورا عالم بنجائے اس لیے دین پاک میں براہ سہولت و آسانی اس کو فرض کفایہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اہل حاجت کو اپنی ضروریات معاش وغیرہ میں دشواری پیش نہ آئے اور کام میں بھی کوئی خلل نہو۔ اِنْزَال کے معنی اُتارنا یعنی کسی شے کو اعلیٰ سے اسفل کی طرف نقل کرنا ہیں یہ معنی ذوات و اجسام میں تو بے تردد سمجھ میں آجاتے ہیں اور معانی ہیں ذوات عاملہ کا نزول معنی محمولہ کا نزول ہے کتب الہیہ کے نزول میں بھی یہ معنی سمجھے جاسکتے ہیں کہ فرشتہ اُن کو بارگاہ قرب الٰہی سے یا لوح محفوظ سے اخذ کرے اور رسول کے پاس پہنچادے تو حامل کا نزول محمول کا نزول ہے۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ جو حکم کسی بلند مرتبت کی جانب سے اُس کے محکوم ول پہنچایا جاتا ہے اُس کو بلحاظ صاحب حکم رفعت مرتبت کے نزول و ورود سے تعبیر کرتے ہیں کہا جاتا ہے کہ حکم نامہ سلطانی نازل ہوا۔ شاہی فرمان نے ورود فرمایا۔ اس میں اس کی بلندی مرتبہ کا اظہار ہے اور فصاحت کا یہ ایک پاکیزہ اور لطیف اسلوب ہے کہ لفظ نزول کے ساتھ تعبیر کرنے سے سامع کا ذہن فوراً صاحب کلام کی رفعت مرتبت تک پہنچ جائے۔

آخرت سے دار آخرت مراد ہے چونکہ یہ عالم عالم دنیا سے متاخر اور اُس کے بعد ہے اس لیے اس کا نام آخرت رکھا گیا۔

یقین نظر و استدلال سے شک وشبہ دفع ہو کر علم راسخ ہو جائے تو اُس کو یقین کہتے ہیں اسلیئے علم باری تبارک و تعالیٰ کو اور علوم ضروریہ کو یقین نہیں کہا جاتا کیونکہ اول میں نہ تقدیم شک وشبہ ہے نہ حاجت نظر و استدلال اور ثانی میں توقف برنظر مفقود مرادیہ ہے کہ وہ آخرت کا ایسا علم قطعی رکھتے ہیں جسمیں کوئی شک وشبہ نہیں اور اہل کتاب کو جو اس میں شکوک و اوہام تھے وہ سب ان حضرات کے علم الیقین سے دور ہو گئے ۔ اُنہیں اوہام یہ) سے یہ وہم باطل تھا کہ جنت میں یہود و نصرانی کے سوا کوئی داخل نہ ہو گا غرضکہ یہ اور اسکے علاوہ جو شکوک اوہام تھے وہ دور ہو کر آخرت کا علم راسخ حاصل ہوا اور اسی کو یقین کہتے ہیں اور یوقنون سے پہلے ھم ضمیر تعریض کا فائدہ دیتی ہے کہ اہل کتاب کے سوا دوسرا لوگوں کا اعتقاد امور آخرت میں صحت سے منزلوں دور ہے چہ جائیکہ مرتبہ یقین تک پہنچے ۔ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یقین تین طرح کا ہوتا ہے ایک یقین عیاں دوسرا یقین خبر تیسرا یقین دلالت ۔ یقین عیاں تو یہ ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر اُسکی نسبت جو شک تھا رفع ہو جائے یقین دلالت کی مثال یہ ہے کہ آدمی کسی جگہ سے دھواں اُٹھتا دیکھ کر یقینی جان لیتا ہے کہ وہاں آگ ہے اگرچہ اُس نے آگ کو آنکھ سے نہ دیکھا ہو لیکن اُسکو آگ کے ہونے کا یقین دھویں کے دلالت سے حاصل ہو جاتا ہے اور اسمیں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا ۔ یقینی خبر یہ ہے کہ کسی خبر معتبر کے ذریعہ سے قلب کو ایسا اطمینان تام حاصل ہو جس سے شکوک وشبہات قطع ہو جائیں مثلاً ایک آدمی یقین کرتا ہے کہ دنیا میں ایک شہر ہے جس کا نام بغداد ہے اگرچہ وہ بغداد تک نہ پہنچا ہو اور اس نے اپنی آنکھ سے اُسکو نہ دیکھا اور کوئی دلیل بغداد کے وجود پر دلالت نکرتی ہو مگر خبر متواتر اس کو ایسا یقین دلاتی ہے جس سے بغداد کے وجود میں اُسکو کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا آخرت کے حق ہونے میں مسلمانوں کو خبر و دلالت دو طرح کا یقین حاصل ہے ۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مُراد کو پہنچنے والے

متقین کے جو اوصاف ایمان بالغیب اقامت صلوٰۃ انفاق فی سبیل اللہ ایمان بالقرآن ایمان بالکتب السابقہ ایقان بالآخرۃ ذکر فرمائے گئے اُنکا نتیجہ اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا کہ اُن کے مذکورۂ بالا اوصاف کا ثمرہ یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی مُراد پانے والے ھدًی للمتقین میں ہدایت کی تخصیص متقین کے ساتھ فرمائی گئی تھی یہاں اُس کی حکمت ارشاد فرمائی کہ ان اوصاف نے ان کو ہدایت کا اہل بنایا اور اس وجہ سے وہ ہدایت و فلاح کے ساتھ مخصوص ہوئے اس میں اہل کتاب پر ایک لطیف تعریض بھی ہے کیونکہ جب یہ بتا دیا کہ ہدایت و فلاح ان متقین کے ساتھ مخصوص ہے جن میں اوصاف مذکورہ پائے جاتے ہوں تو صاف نتیجہ نکل آیا کہ اہل کتاب جو حضور اقدس سید انبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہیں لائے وہ ہدایت و فلاح کی نعمتوں سے محروم ہیں اور اُنکا یہ خیال کہ وہ ہدایت پر ہیں اور اُنہیں بارگاہ حق میں فلاح میسر آئے گی طمع باطل ہے کہ یہ ہدایت و فلاح جن اوصاف کا ثمرہ تھا جب وہی حاصل نہیں تو ثمرہ کس طرح مرتب ہوگا بندہ کے لیے یہ بشارت بڑی عظیم بشارت ہے کہ جو راہ وہ چل رہا ہے وہ منزل تک پہنچانے والی ہے اور جس رستہ کو اس نے اختیار کیا ہے وہ مقام مقصود کا سیدھا رستہ ہے لیکن آیت کریمہ میں اُولٰٓئکَ عَلٰی هُدًی پر ہی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اُس کے ساتھ من ربھم ارشاد فرما کر تسکین خاطر فرما دی کہ جو رستہ یہ لوگ چل رہے ہیں اور جو ہدایت بتوفیق الٰہی انہیں میسر ہے وہ کدورات نفسانیہ و اوہام شیطانیہ کے خطرہ سے پاک ہے کیونکہ وہ اُن کے رب کی طرف سے ہے اور اس ہدایت پر ان کو استفراغ فکر اور جہد منصوصہ میں ادامت نظر اور عمل میں محاسبت نفس پر مواظبت سے تمکن و استقرار حاصل ہے یعنی وہ اپنے اذہان کو خیالات ردیہ و افکار فاسدہ سے خالی کر کے آیات الٰہیہ اور دلائل قدرت میں ہمیشہ نظر کرتے رہتے ہیں اور عمل میں نفس کی ہمیشہ جانچ رکھتے ہیں کہ شائبہ ہوا سے اخلاص میں کوئی خلل نہ آنے پائے اس سے اُن کو ہدایت پر تمکن و استقرار حاصل ہوتا ہے یہ دُنیا میں اُن کی پاک بازانہ زندگی کا ایک نقشہ ہے جس پر موت سے قبل فلاح کی بشارت میسر آتی ہے اور کامیابی کی خوشخبری رفیق حال رہتی ہے ۔ فلاح کے معنی مراد پانا ہے اور مفلح وہ شخص ہے جو اپنے مطلوب و مُراد پر ظفر یاب ہو اور اس کے ابواب اُس پر مفتوح ہو جائیں مقاصد و مطالب پر اُس کو دست رس حاصل ہو اور مُراد کا دروازہ کبھی اُس کے لئے بند نہ کیا جائے خطرہ اور اندیشہ سے اُس کو امن ہو اور کوئی ناگوار ناپسند حال پیش نہ آئے ۔ اس تمام کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ناجی ہیں فائز بالمقصود ہیں عذاب نار سے اُن کو نجات ملی اور نعیم جنت و خلود عیش کی بشارت سے وہ شاد کام و فائز المرام ہوئے اور یہ نعمت اُن کے لیئے دائم ہے اور دُنیا و آخرت کی بہبود یقینی یہ کمال فلاح ہے جس کو اُن متقین کے ساتھ خاص کیا گیا جن کے اوصاف مذکور ہوئے اس سے یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ اس درجہ کے نہوں اگرچہ مومن ہوں مگر اعمال میں اُن سے فروگذاشتیں ہوتی ہوں اُن کو فلاح ہی نہ ملے بلکہ مُراد یہ ہے کہ فلاح کامل تو انہیں متقین کے ساتھ مخصوص ہے اور جو مومن فاسد العمل ہو فاسق ہو وہ اس مرتبہ کی فلاح و پائیگا مگر جس درجہ پر پہنچ گیا ہے کرم الٰہی سے اُس کی جزا ضرور ملے گی من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ایمان میسر ہوتے ہوئے گر شامت نفس سے تقویٰ و پرہیزگاری اور صلاح عمل میسر نہ ہو تو ایمان کا اور جس قدر بھی عمل نیک ساتھ ہوں انکا ثمرہ تو انشاء اللہ العزیز یقیناً ملیگا ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین اور جس کو معاذ اللہ ایمان میسر نہو آخرت میں اُن کے اعمال سب رائیگاں ہیں حبطت اعمالھم جس نے خدا کو نہ مانا رسالت کو تسلیم نہ کیا ایمانیات سے منکر ہو کر اپنے پروردگار سے باغی ہو گیا وہ اگر کسی بھوکے کو کھانا کھلائے یا ایسا ہی کوئی اور عمل کرے تو وہ سب ہیچ ہے لا خلاق لھم فی الاٰخرۃ اس میں معتزلہ کا رد ہو گیا جو فاسق کو مخلد فی النار اور معذب بعذاب دائم کہتے ہیں اللہ تعالےٰ اپنے کرم سے ہمیں لباس تقویٰ عطا فرمائے اور اپنے اُن پاک بندوں کے زمرہ میں شامل کرے جنکا اس صورت پاک کے صدر میں ذکر فرمایا ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انھیں برابر ہے ۔ چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں

اوپر کی آیات میں اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص بندوں اور خالص اولیاء کا اور اُن کی ایسی صفات کا ذکر فرمایا تھا جنہوں نے اُن کو ہدیٰ و فلاح کا اہل بنایا اور قرآن کریم کی شان ہدایت کا اظہار تھا کہ یہ کتاب مقدس ایسی ہے جس کی تعلیم و ارشاد سے طالبان حق راہ یاب ہوئے اور بہترین صفات سے متصف ہو کر فلاح کو پہنچے اور فائز المرام ہوئے اِن مقبولین کے ذکر کے بعد جنہوں نے طاعت و فرمانبرداری نہایت اخلاص سے کی اور عقیدے و عمل سے ظاہراً و باطناً مطیع رہے اُن لوگوں کا ذکر فرمایا جو اُن کے اضداد ہیں سرکشی و تمرد اُنکا شیوہ ہے نہ وہ ہدایت سے منتفع ہوں نہ آیات و نذر سے پند پذیر کفر کے معنی لغت میں چھپانے کے ہیں اور اصطلاح شرع میں کفر ہر اُس چیز کا انکار کرنا ہے جس کا دین رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہونا بالیقین معلوم ہے اور جس کو عوام و خواص جانتے ہیں کہ یہ دین مصطفےٰ سے ہے صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے شعار کا استعمال بغیر کسی مجبوری کے کفر ہے مثلاً زنار پہننا قشقہ کھینچنا کفار کی مخصوص ٹوپی اوڑھنا اسلیے

کہ ان چیزوں کا استعمال تکذیب و انکار کی دلیل ہے کیونکہ جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہو اس کو شعار کفر اختیار کرنے پر جرأت ہی نہیں ہو سکتی بعضے مفسرین نے کفر کی چار قسموں پر تقسیم کی ہے ایک کفر انکار وہ یہ ہے کہ کافر اللہ تعالےٰ کو جانتے ہی نہیں جیسے کہ فرعون کا کفر جو کہتا تھا ما علمت لکم من الٰہ غیری یعنی میرے علم میں میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، دوسری قسم کفر جحود وہ یہ ہے کہ دل سے اللہ کو پہچانے اور زبان سے اقرار نہ کرے جیسے کہ ابلیس کا کفر۔ تیسری قسم کفر عناد ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کو دل سے پہچانتے زبان سے اقرار کرے لیکن اس کے دین کو نہ قبول کرے جیسا کہ امیہ بن خلف اور ابوطالب کا کفر چنانچہ ابوطالب نے کہا

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِیْنَ مُحَمَّدٍ مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّۃِ دِیْنًا
لَوْلَا الْمَلَامَۃُ اَوْحِذَارُ مَسَبَّۃٍ لَوَجَدْتَنِیْ سَمْحًا بِذَاکَ مُبِیْنًا

یعنی میں جانتا ہوں کہ (حضور پر نور) محمد مصطفےٰ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا دین تمام زمانہ کے کل ادیان سے بہتر ہے اگر ملامت و بدگوئی کا اندیشہ نہ ہوتا تو تم دیکھ لیتے کہ میں بڑی جوانمردی کیساتھ اس دین کو قبول کرتا۔ ان اشعار سے ظاہر ہے کہ وہ دل سے بھی دین کی حقانیت کو پہچانتے ہیں زبان سے اقرار بھی کرتے ہیں مگر دین نہیں قبول کیا اس لئے دولت ایمان سے محروم رہے، چوتھی قسم کفر نفاق۔ وہ یہ ہے کہ زبان سے تو اقرار کرے مگر دل سے معتقد نہو یہ تمام قسمیں کفر ہیں جس نے اللہ تعالےٰ کا یا اس کی وحدانیت کا یا اس کی کتاب کا یا اس کے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی اور نبی کی نبوت کا انکار کیا وہ کافر ہے اور اگر ایسی حالت پر مرجائے تو مخلد فی النار ابدی جہنمی اللہ تعالےٰ کی مغفرت سے محروم۔ ایسے راسخ فی الکفر کافروں کے لئے ارشاد فرمایا کہ ان کے حق میں انذار و عدم انذار برابر یعنی وہ ہدایت سے کسی طرح منتفع نہیں ہوتے۔ ہدایت کے طریقوں میں سے بشارت دنیا اور ڈرانا بھی موثر طریقے ہیں کسی امر نیک کے فوائد و منافع اور اس کے خوش گوار دل پسند نتائج دکھا کر ترغیب دلانے سے بھی انسان امر نیک کی طرف راغب و مائل ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ بااثر تخویف و انذار ہے کہ اگر منافع کی طرف راغب ہو اتو اس امر خیر کے ترک میں جو مضرتیں اور خطرے ہیں وہ اسکے سامنے کیے جائیں تاکہ وہ اپنے آپ کو مہالک سے بچائے اور ضرر سے محفوظ رہنے کے لیئے امر خیر پر عامل ہو۔ اس آیہ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جن کفار میں کفر راسخ ہو جاتا ہے اُن کی حالت اسقدر ردی و ابتر ہو جاتی ہے کہ انہیں پیش آنیوالی مصیبتوں کا خوف بھی راہ راست پر نہیں لا سکتا اور انذار و عدم انذار یعنی تخویف کے ساتھ رہنمائی کرنا اُن کے حق میں نہ کرنے کے برابر ہو جاتا ہے اور انہیں ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ آیۃ کریمہ میں یہ ارشاد ہوا کہ انذار و عدم انذار انکے حق میں یکساں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہادی کے حق میں ایسے لوگوں کو بھی رہنمائی کرنا اور اُن کی ہدایت کے درپے رہنا بے فائدہ نہیں۔ اس ہدایت کا فائدہ ایک تو رسالت و ارشاد کا عموم ہے کہ ہادی نے اپنی سعی سے کسی کو بھی محروم نہیں چھوڑا اور اپنے منصبی فرض کو پورے طریقہ پر ادا فرما دیا دوسرے ان متمردین پر حجت الٰہیہ قائم کر دی اور عذر قطع کر دیا اب وہ نہ کہہ سکیں گے کہ ہمیں ہدایت کیجاتی یا عذاب الٰہی کا خوف دلایا جاتا تو ہم راہ راست قبول کر لیتے۔ تیسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس ہدایت پر اجر و ثواب مرتب ہوتا ہے تو اُن کے حق میں انذار و عدم انذار ایکساں نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے ابولہب ابوجہل وغیرہ خاص معین لوگ مراد ہیں اُن کی نسبت یہ خبر دی گئی کہ انہیں انذار سے کچھ نفع نہوگا وہ ایمان نہ لائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس میں غیب کی خبر ہے

مومنین متقین و مخلصین فائزین کے ذکر کے بعد کفار کا تذکرہ قرآن کریم کی شان ہدایت و ارشاد کا خوب اظہار کرتا ہے کہ جسطرح آفتاب کی روشنی میں آنے والے اسکے نور سے مستفید ہوتے ہیں اور اس سے دور بھاگنے والے تاریکی و ظلمت میں گرفتار رہتے ہیں ایسے ہی اس آفتاب ہدایت قرآن پاک سے کسب ضیا کرنے والے اپنے قلوب کو منور اور اعمال کو آراستہ کر کے مرتبہ تقویٰ و پرہیز گاری پر فائز ہو کر فلاح کو پہنچتے اور کامیاب ہوتے ہیں اور اس تجلی سے بھاگنے اور دور رہنے والے اس کی صدا پر کان نہ رکھنے والے بدنصیب ان تمام دولتوں سے محروم اور کفر کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں اور آخرت کے دائمی عذاب میں گرفتار ہوگئے ہیں تو نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی سعادت و شقاوت اس کتاب پاک کے ماننے نہ ماننے پر موقوف ہے۔

اس آیت کریمہ میں کفار کا بیان ہے اور ایسے کفار کا جو شقی ازلی ہیں جنکا ایمان میں حصہ ہی نہیں مگر اس میں بھی عظمت و شان سید انبیا صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ اس میں حبیب انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاطر مبارک کی تسلی و تسکین مد نظر ہے اور یہ منظور ہے کہ قلب مبارک پر یہ خطرہ اور اندیشہ نہ آئے اور قلب نازنین کو اس تصور سے ملال نہ پہنچے کہ ہم کو ہادی عالم اور رحمۃ اللعٰلمین بنایا گیا اور دنیا کے بگڑے ہوؤں کی اصلاح درستی کے لیئے مبعوث فرمایا اور ہمارے زمانہ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو کفر پر مر رہے ہیں اور دم آخر تک انہیں ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ کفر پر انکا خاتمہ ہو جاتا ہے کہیں ہماری سعی و کوشش میں ہماری جد و جہد میں۔ کوئی کمی و کوتاہی نہ ہو۔ بہت ممکن تھا کہ یہ خطرہ قلب پر گزرے اور اس محبوب کے نازک دل کو اندیشہ و فکر ہو اس لیئے تسلی فرما دی کہ آپ کے لیے کوئی فکر کی بات نہیں آپ کی تبلیغ و ہدایت اور آپ کے اجر و ثواب میں کوئی نقصان نہیں آپ نے منصبی فیض بخوبی ادا فرما دیا آیات و نذر پیش کر دئے دلائل واضحہ قائم فرما دیے خلق خدا ان سے منتفع ہو کر مرتبہ تقویٰ و فلاح کو پہنچی جن بدنصیبوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھایا یہ ازلی شقی ہیں انھوں نے اپنی استعداد کو ایسا برباد کیا ہے کہ ان کے لئے انذار برابر ہے اور ایمان کی راہ مسدود یقینی و قطعی دلائل سے بھی وہ فائدہ نہیں ہوتا اس کی مزید توضیح اگلی آیت میں ارشاد ہوتی ہے

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۶ ع

اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ (پردہ) ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ ہدایت کی راہیں ان کے لیئے اول ہی سے بند نہ تھیں کہ جائے عذر ہوتی بلکہ ان کے کفر و عناد اور سرکشی و بے دینی اور مخالفت حق و عداوت انبیاء علیہم السلام کا یہ انجام ہے جیسے کوئی شخص طبیب کی مخالفت کرے اور زہر قاتل کھالے اور اسکے لیے دوا سے انتفاع کی صورت نہ رہے تو خود ہی مستحق ملامت ہے۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ کفار ضلالت و گمراہی میں ایسے ڈوبے ہوئے ہیں کہ حق کے دیکھنے سننے سمجھنے سے اس طرح محروم ہوگئے جیسے کسی کے دل اور کانوں پر مہر لگی ہو اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہو۔ مسئلہ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندوں کے افعال بھی تحت قدرت الٰہی ہیں۔

تفسیری اقوال

حضرت سدی فرماتے ہیں ختم سے مُراد طبع ہے، یعنی مُہر کر دینا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں، یعنی ان پر شیطان غالب آگیا وہ اُسی کی ماتحتی میں لگ گئے، یہانتک کہ مُہر خداوندی اُنکے دلوں پر اور اُنکے کانوں پر لگ گئی اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہدایت کو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ گناہ لوگوں کے دلوں پر چڑھتے جاتے اور اُسے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں، بس یہی طبع اور ختم، یعنی مُہر ہے۔ دل اور کان کے لیے محاورہ میں مُہر آتی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قرآن میں رَان کا لفظ ہے طَبَعَ کا لفظ ہے اور اَقْفَال کا لفظ ہے۔ ران، طبع سے کم ہے اور طبع، اقفال سے کم ہے، اقفال سب سے زیادہ ہے۔ حضرت مجاہد نے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے اور بندہ کے گناہ کی وجہ سے وہ سمٹ جاتا ہے اور بند ہو جاتا ہے، اسطرح کہ ایک گناہ کیا تو گویا چھنگلیا بند ہو گئی، پھر دوسرا گناہ کیا تو دوسری اُنگلی بند ہو گئی، یہانتک کہ تمام اُنگلیاں بند ہو گئیں، اور اب مُٹھی بالکل بند ہو گئی جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح گناہوں سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں مُہر لگ جاتی ہے پھر اس حق اثر نہیں کرتا اسے رین بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اُن کا تکبر، اُن کا حق سے مُونھ پھیر لینا بیان ہو رہا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس بات کے سُننے سے بہرا بن گیا، مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکبر اور بے پروائی کر کے اُس نے اس بات کی طرف کان لگایا۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں، لیکن یہ مطلب ٹھیک نہیں ہو سکتا، اسلیے کہ یہاں تو خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس نے انکے دلوں پر مُہر کر دی۔ زمخشری نے اس رَد کا بہت کچھ رَد کیا ہے اور پانچ تاویلیں کی ہیں، لیکن سب کی سب بالکل بودی اور واہی ہیں، اور صرف اپنے معتزلی ہونے کی وجہ سے اُسے یہ تکلفات کرنے پڑے ہیں، کیونکہ اُس کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ کسی کے دل پر خداوند قدوس مُہر کر دے، لیکن افسوس اُس نے دوسری صاف اور صریح آیات پر غور نہیں کیا۔ ایک جگہ ارشاد ہے فَلَمَّا زَاغُوا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ یعنی جب ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے اُنکے دل ٹیڑھے کر دیئے۔ اور فرمایا نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ الآیہ ہم اُنکے دلوں کو اور اُنکی نگاہوں کو اُلٹ دیتے ہیں، گویا وہ سرے سے ایمان ہی نہ لائے تھے، اور ہم انھیں اُنکی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں، جو صاف بتلاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُنکے دلوں پر مُہر کر دی ہے، اور ہدایت کو اُن سے دُور کر دیا ہے، انکے حق کو ترک کرنے اور باطل پر جم رہنے کی وجہ سے۔ اور یہ سراسر عدل اور انصاف ہے اور عدل اچھی چیز ہے نہ کہ بُری اگر زمخشری بھی بغور اِن آیات پر نظر ڈالتے، تو تاویل نہ کرتے۔ واللہ اعلم۔ قرطبی فرماتے ہیں، اُمت کا اجماع ہے کہ اللہ سُبحانہٗ وتعالےٰ نے اپنی ایک صفت مُہر کرنا بھی بیان کی ہے، جو کفار کے کفر کے بدلے ہے۔ فرماتا ہے بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ بلکہ اُنکے کفر کی وجہ سے خدا نے اُن پر مُہر لگا دی۔ حدیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالےٰ دلوں کو اُلٹ پلٹ کرتا ہے۔ دعا میں ہے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِكَ یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قایم رکھ۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، دلوں پر فتنے اسطرح پیش ہوتے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے بوریے کا ایک تنکا، جو دل انھیں قبول کر لیتا ہے، اُس میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے، اور جس دل میں یہ فتنے اثر نہیں کرتے اُس میں ایک سفید نکتہ ہو جاتا ہے، جس کی سفیدی بڑھتے بڑھتے بالکل صاف سفید ہو کر سارے دل کو منور کر دیتی ہے، پھر اُسے کبھی کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور اس دوسرے دل کی سیاہی بھی پھیلتی جاتی ہے، یہانتک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے، اب وہ اُلٹے توے کی طرح ہو جاتا ہے، نہ اچھی بات اُسے اچھی لگتی ہے، نہ بُرائی بُری معلوم ہوتی ہے الخ۔ امام ابن جریر کا فیصلہ یہ ہے کہ حدیث میں آچکا ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے، اُسکے دل میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے، اگر وہ باز آگیا، توبہ کر لی اور رُک گیا، تو وہ نکتہ ہٹ جاتا ہے اور اُسکا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ گناہ میں پڑ گیا، تو وہ سیاہی بھی پھیلتی جاتی ہے یہانتک کہ سارے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہی وہ رَان ہے جسکا ذکر اس آیت میں ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ یعنی یقیناً اُن کے دل پر رَان ہے اُنکی بداعمالیوں کی وجہ سے (ترمذی۔ نسائی۔ ابن جریر) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ گناہوں کی زیادتی دلوں پر غلاف ڈال دیتی ہے اور اسکے بعد مُہر خداوندی ہو جاتی ہے، جسے ختم اور طبع کہا جاتا ہے۔ اب اس دل میں ایمان کے جانے اور کفر کے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ اسی کے مُہر ہونے کا ذکر اس آیت خَتَمَ اللّٰهُ الآیہ میں ہے۔ یہ نظیر ہے ہماری آنکھوں دیکھی چیزوں کی کہ جب کسی چیز کا مُونھ بند کر کے اُس پر مُہر لگا دیں جب تک وہ مُہر نہ ٹوٹے گی، نہ اُس میں کچھ جا سکتا ہے، نہ اُس میں سے کوئی چیز نکل سکتی ہے۔ اسی طرح جن کفار کے دلوں اور کانوں پر مُہر خداوندی لگ چکی ہے، اُن میں بھی بغیر اسکے ہٹنے اور ٹوٹے نہ ہدایت جائے، نہ کفر آئے ــــــ سَمْعِهِمْ پر پورا وقف ہے، اور عَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ الگ پورا جملہ ہے۔ ختم اور طبع دلوں اور کانوں پر ہوتی ہے، اور غشاوت یعنی پردہ آنکھوں پر پڑتا ہے، جیسے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔ قرآن میں ہے فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ اور جگہ ہے وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشَاوَةً اِن آیتوں میں دل اور کان پر ختم کا ذکر ہے اور آنکھ پر پردہ کا۔ بعضوں نے یہاں غِشَاوَةً زبر کے ساتھ بھی پڑھا ہے، تو ممکن ہے انکے نزدیک فعل جَعَلَ مقدر ہو، اور ممکن ہے نصب محل کی سے ہو جیسے وَحُوْرٌ عِیْنٌ میں۔

قلب

قلب (دل)، ایک گوشت کے لوتھڑے کا نام ہے، جو صنوبری شکل میں بائیں جانب پسلیوں کے قریب لٹکا ہوا ہے، لیکن کبھی اسکا اطلاق عقل اور معرفت پر بھی ہوا کرتا ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید کے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔

اللہ رب العزت ہر چیز کا خالق ہے، خواہ وہ اعراض ہوں یا جواہر۔ اور اسباب سب کے سب اسباب عادیہ ہیں جنکے لیے اللہ تعالیٰ مسببات پیدا فرماتا ہے۔ تو جب آدمی اپنے حواس یعنی کان، آنکھ وغیرہ سے کام لیتا ہے اور انھیں استعمال میں لاتا ہے، تو انکے بعد اللہ تعالیٰ علم بالمحسوسات پیدا فرماتا ہے، اور جب اُسے علم بالمحسوسات حاصل ہو جاتا ہے، اور وہ اپنے ذہن کو دو مقدموں کی ترتیب میں صرف کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ علم بالنتیجہ پیدا فرما دیتا ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو کوئی چیز بھی پیدا نہ فرمائے، اور حواس کو معطل و بیکار اور ذہن کو پراگندہ و پریشان کر دے، اور اگر وہ چاہے تو علم بالمحسوسات حاصل کرا دے۔ لیکن یہ علم قلب میں کچھ بھی مؤثر و مفید نہ ہو۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ كُلَّهَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ یُصَرِّفُهٗ كَیْفَ یَشَاءُ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِكَ (رواہ مسلم عن عبد اللہ بن عمرو) یعنی تمام بنی آدم کے دل اللہ تعالیٰ کی دو اُنگلیوں میں اسطرح واقع ہیں جیسے ایک دل۔ تو وہ انھیں جسطرف چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ پھر فرمایا اے خدا دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کو کفار کے دلوں کا پاک کرنا منظور نہ تھا، اسلیے اُنکو آیات الٰہیہ میں غور و فکر کرنے، اور قدرت کی نشانیوں پر نظر کرنے سے روک دیا۔ اگرچہ اُنھوں نے آیات و معجزات بھی دیکھے، مگر اسکے بعد بھی انکے دلوں میں ایمان و یقین کے اثر کو قبول کرنے کا ملکہ پیدا نہیں فرمایا۔ اسی عدم تاثر اور تصریف قلوب کو کہیں "طبع" سے، کہیں "اقفال" سے، کہیں "اکنان" سے، کہیں "غشاوہ" سے مجازاً تعبیر فرمایا۔ یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس گوشت کے لوتھڑے پر جسے ہم دل کہتے ہیں کوئی پتھر یا سیسے کی واقعۃً مُہر لگا دی ہے بلکہ مُہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے انکے دلوں میں یہ صلاحیت و قابلیت ہی پیدا نہیں کی کہ وہ ایمان و یقین کے اثر کو قبول کر سکیں۔ یا یوں کہیئے کہ خدا نے اُنکے دلوں اور حواس کو اُن چیزوں سے تمثیل دی ہے جن پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ ختم سے وہ سیاہی مُراد ہے، جو گناہوں کے مرتکب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گنہگاروں کے دلوں پر پیدا فرما دیتا ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کی حدیث ابھی گزری۔

مقام غور و فکر ہے کہ جب مومن کے گناہ آلودہ ہونے کا یہ وبال ہے کہ ایک گناہ کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے، تو کافر کی کیا کیفیت ہوگی؟ (مظہری)

سمع سَمْعٌ اگرچہ لفظاً مفرد ہے، لیکن معنیٰ میں جمع کے ہے، یعنی وَعَلٰی اَسْمَاعِہِمْ۔ چونکہ التباس کا فوت نہ تھا، نیز اعتبارِ اصل بھی متصور اور مدِّ نظر تھا کہ سَمْعٌ اصل میں مصدر ہے، اور مصادر جمع کی صورت میں نہیں لائے جاتے، بدیں وجہ لفظ سَمْعٌ مفرد لایا گیا۔ اسکا عطف عَلٰی قُلُوْبِھِمْ پر ہے، جیساکہ قرآنِ مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے وَخَتَمَ عَلٰی قَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشَاوَۃً۔ چونکہ دل اور کان کا ہر جانب واطراف سے ادراک ممکن تھا، اور ان میں تمام جہات مساوی ویکساں تھیں، توان دونوں کی روک اور مانع کے لیے ایک ہی شے یعنی ختم (مُہر) قرار دی گئی، بخلاف آنکھ کے کہ وہ صرف مقابلہ کے ساتھ مخصوص ہے، اسلیے اس کا مانع غشاوہ (پردہ) ٹھہرایا گیا، جو مقابلہ کے ساتھ مختص ہے۔

ابصار البصار، بصر کی جمع ہے۔ معنی یہ کہ آنکھ کے ذریعہ کسی شے کا ادراک کرنا۔ لیکن اسکا اطلاق مجازاً کبھی قوّتِ باصرہ پر بھی ہوا کرتا ہے، اور کبھی نفسِ آنکھ کو بھی بصر کہدیتے ہیں علیٰ ہٰذا القیاس لفظ کا بھی یہی حال ہے۔

عذاب عذاب، اَعْذَبَ الشَّیْءَ سے ماخوذ ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز کا منع کرنے اور روکدینے والا ہوتا ہے، تواہلِ محاورہ ایسے موقع پر اَعْذَبَ الشَّیْءَ بولا کرتے ہیں۔ چونکہ سزا بھی مجرم کو دوبارہ جرم پر دلیر ہونے سے باز رکھتی اور منع کرتی ہے، اسلیے اُسے "عذاب" کہا جانے لگا۔ پھر اسکے معنی میں اتنی وسعت ہوگئی کہ ہر دُکھ اور درد کو عذاب کہنے لگے، اگرچہ وہ نہ سزا ہو، اور نہ مانع۔ یا یہ کہ عذاب، تعذیب سے مشتق ہے، جسکے معنی عذب یعنی شیرینی کے زائل اور دُور کرنے کے ہیں۔

شروعِ سورۃ کی چار آیتوں میں مومنین کے اوصاف بیان ہوئے، پھر ان دو آیتوں میں کفّار کا حال بیان ہوا، اب منافقوں کا ذکر ہوتا ہے، جو بظاہر ایماندار بنتے ہیں لیکن حقیقت میں کفّار ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی چالاکیاں عموماً پوشیدہ رہ جایا کرتی ہیں، اسلیے ان کا بیان ذرا تفصیل سے ہوا، اور بہت کچھ انکی نشانیاں بیان کی گئیں انہی کے بارے میں سورۂ براءۃ آتری، اور انہی کا ذکر سورۂ نور وغیرہ میں کیا گیا، تاکہ ان سے پورا بچاؤ ہو، اور ان مذموم خصلتوں سے مسلمان دُور رہیں۔ پس فرمایا:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ ⑧ يُخٰدِعُوْنَ

اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں فریب دیا چاہتے ہیں

اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۞ ⑨

اللہ اور ایمان والوں کو اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ۔ یہاں سے اُن منافقوں کی حالت وکیفیت بیان کیجاتی ہے، جو ظاہر میں تو مسلمان بنتے تھے، مگر باطن میں کفر پنہاں تھا، یہ سلسلہ تیرہ آیتوں تک جاری ہے۔ چنانچہ یہ آیت عبداللہ بن اُبَی ابن سلول، اور معتب بن قشیر، اور جد بن قیس اور انکے رفقاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن میں اکثر تو یہودی تھے۔

نَاسٌ، دراصل اُنَاسٌ تھا، ہمزہ کو حذف کر کے اسکے عوض حرفِ تعریف یعنی الف لام لے آئے۔ چونکہ ہمزہ اور حرفِ تعریف ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے تھے، اسلیے عوض اور معوض کا اجتماع ناجائز ہے۔ اَلنَّاسُ انسان کی جمع ہے، اور بعض کے نزدیک اسمِ جمع ہے۔ کیونکہ جمع کے اوزان میں فُعَالٌ نہیں آیا۔ پھر یا تو یہ اُنْسٌ سے مشتق ہے، کیونکہ آدمی باہم ایک دوسرے سے مانوس ومالوف ہوتے ہیں، یا یہ اَلنَّسْیُ سے مشتق ہے، جسکے معنی ظَھَرَ کے ہیں، جیساکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے فَلَمَّا اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ؕ اور چونکہ آدمی آپس میں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتے اور دکھائی دیتے ہیں، اسلیے انھیں ناس کہا گیا، جسطرح جنوں کو انکے مخفی اور پوشیدہ ہونے کے سبب "جن" کہا جاتا ہے۔ النَّاس میں الف لام جنس کا ہے، اور مِنْ موصوفہ ہے، اسلیے کہ یہاں کوئی معہود نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عہد کا ہے، اور معہود "اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا" ہے۔ یا یہ کہ مِنْ کو موصولہ کہیے، اور اس سے ابن اُبَی وغیرہ منافقین کو مُراد لیجیے۔ کیونکہ وہ اُن کفّار میں داخل ہیں، جنکے دلوں پر مُہر لگادی گئی ہے، بلکہ یہ اُن سے بڑھ کر ایک اور خصوصیت بھی رکھتے ہیں کہ وہ "خدع" یعنی مکر وفریب بھی کرتے ہیں۔

مِنَ النَّاسِ فرمانے میں ایک لطیف رمز یہ ہے کہ یہ گروہ بہتر صفات وانسانی کمالات سے ایسا عاری ہے کہ اسکا ذکر کسی وصف وخوبی کے ساتھ نہیں کیا جاتا، یوں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی آدمی ہے۔ **مسئلہ** اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو بشر کہنے میں اُسکے فضائل وکمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے۔ اسلیے قرآن پاک میں جابجا انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بشر کہنے والوں کو کافر فرمایا گیا۔ اور درحقیقت انبیاءِ کرام علیہم السلام کی شانِ رفیع میں ایسا لفظ ادب سے دُور اور کفّار کا دستور ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا مِنَ النَّاسِ سامعین کو تعجب دلانے کے لیے فرمایا گیا کہ ایسے فریبی، مکار اور ایسے احمق بھی آدمیوں میں ہیں۔ (خزائن العرفان)

مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن (قیامت) پر ایمان لائے)۔ اس جگہ صرف اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لانے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمانا اسواسطے ہے کہ سلسلۂ ایمان کی فہرست میں یہی دو باتیں مقصودِ اعظم اور مہتم بالشان ہیں۔ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (اور وہ ایمان والے نہیں) یہ منافقین کے باطل دعوے کی تردید ہے۔ اگرچہ سیاقِ کلام کا اقتضا تھا کہ اسکی جگہ وَمَا اٰمَنُوْا کہا جاتا تاکہ اُنکے قول کے بالکل مطابق ہوجاتا، کیونکہ اس میں فاعل کی تصریح نہیں بلکہ فعل کی تصریح ہے، مگر اس کے برعکس وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ فرمانے میں اصل حکمت یہ ہے کہ انکے دعوئے باطل کی مبالغہ کے ساتھ تکذیب کردیجائے جو وَمَا اٰمَنُوْا سے نہیں ہوسکتی، کیونکہ منافقین کو ایماندار لوگوں کی جماعت سے نکال دینا اس سے زیادہ ابلغ ہے کہ زمانۂ گزشتہ میں اُنکے ایمان کی نفی کردی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نفی کی تاکید حرف "با" کے ساتھ کی گئی۔ "وہ ایمان والے نہیں" یعنی کلمہ پڑھنا، اسلام کا مدعی ہونا، نماز روزہ ادا کرنا، مومن ہونے کے لیے کافی نہیں، جبتک دل میں تصدیق نہ ہو **مسئلہ** اس سے معلوم ہوا کہ جتنے فرقے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور کفر کا اعتقاد رکھتے ہیں، سب کا یہی حکم ہے کہ وہ کافر خارج از اسلام ہیں۔ شرع میں ایسوں کو منافق کہتے ہیں، ان کا ضرر کھلے کافروں سے زیادہ ہے۔ (خزائن العرفان)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو —— خَدْعٌ اسے کہتے ہیں کہ تم کسی شخص کو اُس مکروہ اور ناپسند بات کے برخلاف دھوکہ میں ڈالو جسے تم چھپانا چاہتے ہو۔ اور یہ عرب کے قول خَدَعَ الضَّبُّ سے ماخوذ ہے، یعنی جب گوہ اپنے بل میں چھپکر شکاری کو ظاہر ہونے اور نکلنے کا دھوکہ دیتی ہے، تو اس کیفیت کو اہلِ زبان خَدَعَ الضَّبُّ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسکے لغوی معنی پوشیدہ کرنے کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اُسکو کوئی دھوکہ دے سکے، وہ اسرار ومخفیات کا جاننے والا علیم وخبیر ہے۔ مُراد یہ ہے کہ منافق اپنے گمان میں خدا کو فریب دیا چاہتے ہیں۔ یا یہ کہ خدا کو فریب دینا یہی ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دھوکہ دینا چاہیں، کیونکہ وہ اسکے خلیفہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو اسرار کا علم عطا فرمایا، وہ ان منافقین کے چھپے کفر پر مطلع ہیں، اور مسلمان اُنکے اطلاع دینے سے باخبر۔ تو ان بدینوں کا فریب نہ خدا پر چلے، نہ رسول پر، نہ مومنین پر۔ بلکہ درحقیقت وہ اپنی جانوں کو فریب دے رہے ہیں۔ **مسئلہ** اس آیت سے معلوم ہوا کہ تقیہ بڑا عیب ہے، جس مذہب کی بناء تقیہ پر ہو، وہ باطل ہے۔ تقیہ والے کا حال قابلِ اعتماد نہیں ہے

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ⑩

ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ تو اللہ نے انکی بیماری اور بڑھائی اور اُن کے لیئے دردناک عذاب ہے بدلا اُن کے جھوٹ کا۔

مَرَض دو طرح کا ہوتا ہے، جسمانی و رُوحانی۔ مرضِ جسمانی وہ ہے، جو بدن کو اُسکے اعتدالِ خاص سے خارج کرے، اور اُسکے افعال میں خلل کا موجب ہو، اور مرضِ نفسانی یا رُوحانی وہ ہے، جو نفس کے کمال میں مخل ہو، جیسے جہل، بدعقیدگی، حسد، بغض، حُبِّ معاصی۔

جسطرح اَمراضِ جسمانی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض وہ جن سے بدن کے افعال میں خلل آئے مگر وہ ہلاکت تک مُؤدی نہ ہوں۔ دوسرے وہ جن کا نتیجہ ہلاکت ہو اسی طرح اَمراضِ رُوحانی بھی دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو نفس کو تحصیلِ فضائل سے مانع ہوں۔ دوسرے وہ جو حیاتِ حقیقیہ ابدیہ کے زوال کے موجب ہوں۔ حیاتِ حقیقیہ ابدیہ سے سعادتِ مخلدہ مُراد ہے، اور خلودِ عذاب یا جہنم کی مخل حیات، حیاتِ حقیقیہ کہلانے کے لائق نہیں۔ آیت اِن دونوں قسم کے امراضِ روحانی کی محتمل ہے منافقین کے دلوں کی بیماری، ایک تو اُنکا وہ رنج والم اور وہ سوزش وکاوش تھی، جو اُنکے دلوں میں اپنی ریاست وسرداری فوت ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ثباتِ امر، اور روز بروز علوِ شان دیکھکر جو حسد اُنکے دل میں پیدا ہوتا تھا اور غم زیادہ ہُوا کرتا تھا، وہ اُنکے دلوں کے لیے ایک تکلیف وہ مرض تھا، دوسری بیماری سُوءِ اعتقاد، اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت، اور مثل اسکے اور کفریات، یہ اُنکے اصل مرض ہیں۔ اب جسقدر وحی نازل ہوتی ہے، احکام اُترتے ہیں، حضور کو دشمنانِ دین پر فتح دیجاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتبہ بلند کرتا ہے، اُتنی ہی انکی آتشِ حسد وعناد بھڑکتی ہے اور عناد میں ترقی ہوتی ہے۔ اسلیے فرمایا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ حضور کا علوِ مرتبت دشمنانِ حق سے دیکھا نہیں جاتا، اور یہ اُن کے دلوں کے لیے روحانی مہلک بیماری ہے۔ منافقین کا تردد ونفاق اُن کی بیماری تھا، زمانِ نزولِ قرآن میں اللہ تعالیٰ جتنی آیتیں اور نازل فرماتا ہے، انھیں اُنکے متعلق بھی شک ہوتا جاتا ہے، اور دمبدم جتنا قرآنِ پاک نازل ہوتا جاتا ہے، اُتنا ہی اُن پر مرض بڑھتا جاتا ہے۔

منافق شک کی بیماری میں مبتلا اور تردد میں گرفتار رہتا ہے، یکسوئی اور اطمینان اُسکو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ حدیث شریف میں ہے مثل المنافق کمثل الشاۃ العائرۃ بین الغنمین۔ منافق اُس بکری کی مثل ہے جو دو گلّو کے درمیان متحیر ومتردد ہو، کبھی اِدھر جائے اور کبھی اُدھر، کسی طرف اسکو اطمینان وقرار حاصل نہ ہو۔

کذب، جو خبر کسی شان پر ہو اُسکے برخلاف خبر دینا "کذب" ہے، اور یہ بدترین عیب اور حرام ہے۔ کیونکہ اس آیت میں استحقاقِ عذاب کذب ہی پر مرتب فرمایا گیا ہے۔ ایک قرأت میں یکذبون بھی آیا ہے، جسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنے دلوں میں یا تنہائیوں میں رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تکذیب کرتے اور جھٹلاتے ہیں۔ بہر تقدیر آیت سے یہ ظاہر ہے کہ مرض کا زیادہ کرنا اور بڑھا دینا سزا ہے، وبال ہے۔ اور اسکا باعث اُن کا جھوٹ بولنا، دھوکہ دینے کے لیے آمنّا کہنا، یا رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تکذیب کرنا اسکا باعث ہے۔ اُنکی سُوءِ عقیدت، اور فریب کاری اُنکے مزید خسران وخزلان کی موجب ہوئی۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو رحمتِ مجسم اور اپنی اُمت پر والدین سے زیادہ اشفق وارحم ہیں، اُنکے ساتھ عداوت وعناد اُنکی اور زیادہ تباہی اور بربادی کا موجب ہُوا۔ ہادی سے دشمنی کرنے والا اپنے لیے رہنمائی کے راستے بند کرلیتا ہے۔ محرومی اُنھی کے کردار کا نتیجہ ہے۔

تفسیری اقوال

نفاق۔ دراصل نفاق کہتے ہیں بھلائی کے ظاہر کرنے اور بُرائی کے پوشیدہ رکھنے کو۔ نفاق کی دو قسمیں ہیں، اعتقادی اور عملی۔ پہلی قسم کے منافق تو ابدی جہنمی ہیں، اور دوسری قسم کے بدترین مجرم ہیں۔ اس کا بیان تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ کسی مناسب جگہ ہوگا۔ امام ابن جریج رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ منافق کا قول اُسکے فعل کے خلاف، اُسکی پوشیدگی ظاہر کے خلاف، اُسکا آنا جانے کے خلاف، اُسکی موجودگی عدم موجودگی کے خلاف، ہُوا کرتی ہے۔ نفاق مکہ مکرمہ میں تو تھا ہی نہیں، بلکہ اسکے خلاف تھا۔ بعض لوگ ایسے تھے جو زبردستی سے بظاہر کافروں کا ساتھ دیتے تھے مگر دل میں مسلمان ہوتے تھے، بلکہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینۂ طیبہ میں تشریف لائے، اور یہاں پر اوس اور خزرج کے قبائل نے انصار بنکر آپ کا ساتھ دیا، اور جاہلیت کے زمانہ کی مشرکانہ بت پرستی ترک کی اور دونوں قبیلوں میں سے خوش نصیب لوگ مشرف بہ اسلام ہوگئے، لیکن یہودی ابتک خداوند تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم تھے، ان میں سے صرف عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سچے دین کو قبول کیا تھا، تب تک بھی منافقوں کا خبیث گروہ قایم نہ ہُوا تھا، اور حضور نے ان یہودیوں سے، اور عرب کے بعض اور قبائل سے صلح کرلی تھی۔ اس جماعت کے قیام کی ابتدا یوں ہوئی کہ مدینۂ طیبہ کے یہودیوں تین قبیلے تھے، بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع تو خزرج کے حلیف اور بھائی بند بنے ہوئے تھے، اور باقی دو قبیلوں کا بھائی چارہ اوس سے تھا۔ جب جنگِ بدر ہوئی اور اس میں پروردگار نے اپنے دین والوں کو غالب کیا اور شوکت وشانِ اسلام ظاہر ہوئی، اور مسلمانوں کا سکہ جم گیا، اور کفر کا دھڑ ٹوٹ گیا، تب یہ ناپاک گروہ قایم ہُوا۔ عبد اللہ ابن اُبَی ابن سلول تھا تو خزرج کے قبیلہ میں سے، لیکن اوس اور خزرج دونوں اسے اپنا بڑا مانتے تھے، بلکہ اس کی باقاعدہ سرداری اور بادشاہت کے اعلان کا پختہ ارادہ ہو چلا تھا کہ ان دونوں قبیلوں کا رُخ اسلام کی طرف پھر جاتا ہے، اور اسکی سرداری یونہی رہ جاتی ہے۔ یہ خار تو اس کے دل میں تھا ہی، اِدھر اسلام کی روز افزوں ترقی، اُدھر لڑائی کی کامیابی نے اسے مخبوط الحواس کردیا۔ اب اس نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلنے کا، جھٹ سے بظاہر اسلام قبول کرلینے اور بباطن کافر رہنے کی ٹھان لی، اور جسقدر جماعت اسکے زیرِ اثر تھی سب کو یہی ہدایت کی، اور اسطرح منافقین کی ایک جمعیت مدینۂ طیبہ میں اور مدینۂ طیبہ کے آس پاس قایم ہوگئی ان منافقین میں بحمد اللہ مکی مہاجر ایک بھی نہ تھا، بلکہ یہ بزرگ تو اپنے اہل وعیال، مال ومتاع کو نام خدا پر قربان کرکے خدا کے رسُول کا ساتھ دیکر آئے تھے رضی اللہ عنہم اجمعین

حضرتِ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں، یہ منافق اوس اور خزرج کے قبیلوں میں سے تھے اور یہودی بھی جو اُنکے طریقہ پر تھے۔ قبیلۂ اوس اور خزرج کے نفاق کا ان آیتوں میں بیان ہے۔ ابو العالیہ، حضرتِ حسن، قتادہ، سدی نے یہی بیان کیا ہے۔ پروردگارِ عالم نے منافقوں کی بہت سی بدخصلتوں کا یہاں ذکر فرمایا، تاکہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آجائیں، اور انھیں مسلمان خیال کرکے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں، جس کی وجہ سے کوئی بڑا فساد پھیل جائے۔ یہ یاد رہے کہ بدکاروں کو نیک سمجھنا بھی بجائے خود بہت بد، اور نہایت خوفناک امر ہے۔ جسطرح اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ زبانی اقرار تو ضرور کرتے ہیں مگر دل میں انکے ایمان نہیں، اسی طرح سورۂ منافقون میں بھی کہا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ الآیہ یعنی منافق تمہارے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اُسکے رسول ہو۔ لیکن چونکہ حقیقت میں منافقوں کا قول انکے عقیدہ کے مطابق نہ تھا، اسلیے باوجود ان لوگوں کے شاندار اور تاکیدی الفاظ کے خداوند تعالیٰ نے انھیں جھٹلا دیا، اور سورۂ منافقون میں فرمایا وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بالیقین منافق جھوٹے ہیں۔ اور یہاں بھی فرمایا وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ۔ یعنی دراصل وہ ایماندار نہیں، وہ اپنے ایمان کو ظاہر کرکے اور اپنے کفر کو چھپا کر اپنی جہالت سے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں، اور اسے نفع دینے والی اور خدا کے یہاں چل جانے والی کارگری خیال کرتے ہیں، جیسے کہ بعض مومنوں پر انکا یہ مکر چل جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اور جگہ ہے یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَهٗ الآیہ یعنی قیامت والے دن جبکہ اللہ تعالیٰ ان سب کو کھڑا کریگا، تو جسطرح وہ یہاں ایمان والوں کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی قسمیں کھائینگے، اور سمجھتے ہیں کہ وہ بھی کچھ ہیں۔ خبردار! یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔

یہاں بھی انکے اس غلط عقیدہ کے مقابلہ میں فرمایا کہ دراصل وہ اپنے اس کام کی بُرائی کو جانتے ہی نہیں یہ دھوکہ خود اپنی جانوں کو دے رہے ہیں جیسے کہ اور جگہ ارشاد ہُوا اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ یعنی منافق خدا دھوکہ دیتے اور وہ اُنھیں دے رہا ہے۔ بعض قاریوں نے یَخْدَعُوْنَ پڑھا ہے اور بعض نے یُخَادِعُوْنَ اور دونوں قراءتوں کے معنی کا مطلب ایک ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کو، اور مومنوں کو منافق دھوکہ کیسے دینگے؟ وہ جو اپنے دل کے خلاف ظاہر کرتے ہیں وہ تو صرف بچاؤ کے لیے ہوتا ہے + تو جواباً کہا جائیگا کہ اسطرح کی بات کرنیوالے کو بھی جو کسی خوف سے بچنا چاہتا ہے عربی زبان میں مُخَادِعْ کہا جاتا ہے، چونکہ منافق بھی قتل و قید اور دُنیاوی عذابوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ چال چلتے تھے، اور باطن کے ظاہری الفاظ کہتے تھے، اسلیے انھیں دھوکہ باز کہا گیا۔ ان کا یہ فعل گو کسی کو دنیا میں کچھ دھوکہ دے بھی دے، لیکن درحقیقت وہ خود اپنے تئیں دھوکہ دے رہے ہیں، اسلیے کہ وہ اس [illegible]لائی اورکامیابی جانتے ہیں۔ اور دراصل یہ سبب ہوگا انکی بُرائی، عذاب اور غضب خداوندی کا، جسکے سہنے کی ان میں طاقت نہیں۔ پس یہ دھوکہ حقیقتاً خود اُن پر وبال ہوگا، وہ جس کام کو انجام کار اچھا جانتے ہیں، وہ انکے حق میں بُرا اور بہت بُرا ہوگا۔ انکے کفر، شک اور تکذیب کی وجہ سے ان کا رب ان پر ناراض ہوگا۔ لیکن افسوس انھیں اسکا شعور ہی نہیں، اور یہ اپنے اندھے پن ہی میں مست ہیں۔ ابن جریج اسکی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کا اظہار کرکے وہ اپنی جان و مال کا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں، یہ کلمہ اُنکے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتا۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں، منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ دل میں کچھ، عمل کچھ عقیدہ کچھ، صبح کچھ شام کچھ، کشتی کی طرح جو ہَوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی اُدھر۔

بیماری سے مراد یہاں شک و شبہ ہے، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور چند صحابہ سے یہی مروی ہے۔ حضرت مجاہد، عکرمہ، حسن بصری، ابوالعالیہ، ربیع بن انس اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عکرمہ اور طاؤس نے اسکی تفسیر کی ہے ریا سے۔ اور ابن عباس سے اسکی تفسیر "نفاق" بھی مروی ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں یہاں دینی بیماری مراد ہے، نہ کہ جسمانی، انھیں اسلام میں شک کی بیماری تھی، اور انکی ناپاکی میں خدا نے اور اضافہ کر دیا، جیسا کہ قرآن میں اور جگہ ہے فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْھُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِھِمْ۔ یعنی ایمان والوں کے ایمان میں زیادتی کرتی ہے اور وہ خوشیاں مناتے ہیں لیکن بیماری والوں کی ناپاکی اور پلیدی کو اور زیادہ کر دیتی ہے، یعنی انکی بدی اور گمراہی بڑھ جاتی ہے، یہ بدلہ بالکل اُنکے عمل کے مشابہ ہے۔ یہ تفسیر اچھی ہے۔ ٹھیک اسی کے مثل یہ فرمان بھی ہے وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی وَّاٰتٰھُمْ تَقْوٰھُمْ۔ یعنی ہدایت والوں کو ہدایت میں بڑھا دیتا ہے اور اُنکو تقویٰ عطا فرماتا ہے۔

یَکْذِبُوْنَ ۝ کو یُکَذِّبُوْنَ ۝ بھی قاریوں نے پڑھا ہے۔ یہ دونوں بد خصلتیں اُن میں تھیں، جھٹلاتے بھی تھے، اور جھوٹے بھی تھے۔

حضور رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے باوجود منافقوں کو اچھی طرح جاننے کے پھر بھی قتل نہ کرنے کی وجہ وہ ہے جو بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں یہ چرچے ہوں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ آس پاس کے رہنے والے جو اعرابی ہیں، اُنھیں یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ ان منافقوں کے پوشیدہ کفر کی بنا پر انھیں قتل کیا گیا ہے، اُنکی نظر میں تو صرف ظاہرداری پر ہوگی جب ان میں یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ حضور اپنے ساتھیوں کو قتل کروا ڈالتے ہیں، تو خوف ہے کہ کہیں وہ اسلام کے قبول کرنے سے رُک نہ جائیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ ٹھیک اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مؤلفۃ القلوب کو جنکے دل اسلام کی جانب پرچائے جاتے تھے مال عطا فرمایا کرتے تھے باوجودیکہ جانتے تھے کہ انکے اعتقاد بد ہیں۔ حضرت امام مالک بھی منافقوں کو قتل نہ کرنے کی یہی وجہ بیان فرماتے ہیں، جیسے محمد بن جہم، قاضی اسمٰعیل اور ابہری نے نقل کیا ہے۔ حضرت سے بقول ابن ماجشون ایک وجہ یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ یہ اسلیے تھا کہ آپ کی اُمت کو معلوم ہو جائے کہ حاکم اپنے علم پر فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ علماء میں گو اور تمام مسائل کے اندر اختلاف ہو، لیکن اس مسئلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ قاضی صرف اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا منافقین کے قتل سے رُک رہنے کا سبب اُن کا اپنے ایمان کو اپنی زبان سے ظاہر کرنا تھا، گو اسکا علم تھا کہ انکے دل اسکے خلاف ہیں، لیکن ظاہری کلمہ اس پہلی بات کو ہٹا دیتا تھا۔ اسکی تائید میں بخاری و مسلم وغیرہما کی یہ حدیث بھی پیش کیجا سکتی ہے، جسمیں ہے کہ مجھے حکم کیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں، جب وہ اسے کہہ دیں تو انھوں نے مجھ سے اپنی جانیں اور مال بچالیا، اور انکا حساب اللہ عزوجل پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ شریف کے کہتے ہی ظاہری احکام اسلام اُن پر جاری ہو جائینگے۔ اب اگر ان کا عقیدہ بھی اسکے مطابق ہے، تو آخرت والے دن نجات کا سبب ہوگا، ورنہ وہاں کچھ بھی نفع نہ ہوگا، لیکن دنیا میں تو مسلمانوں کے احکام اُن پر جاری رہینگے۔ گو یہ لوگ یہاں مسلمانوں کی صفوں میں اور انکی فہرست میں نظر آئیں، لیکن آخرت میں عین پل صراط پر اُن سے دُور کر دیئے جائینگے اور اندھیروں میں حیران و پریشان ہوتے ہوئے باآواز بلند مسلمانوں کو پُکار کر کہینگے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ لیکن وہاں سے جواب ملے گا کہ تھے تو سہی مگر تم فتنوں میں پڑگئے اور انتظار میں ہی رہ گئے، اور اپنی من مانی خواہشوں کے پھیر میں پڑ گئے، یہاں تک کہ امر خداوندی آپہنچا۔

غرض دار آخرت میں بھی مسلمانوں کے پیچھے لگے لپٹے رہینگے، لیکن بالآخر اُن سے الگ کر دیئے جائینگے، اور انکی اُمیدوں پر پانی پھر جائیگا، وہ چاہینگے کہ مسلمانوں کے ساتھ سجدہ میں گر پڑیں، لیکن سجدہ نہیں کر سکیں گے، جیسا کہ احادیث میں مفصل بیان آچکا ہے۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ قتل نہ کیے جانے کی یہ وجہ تھی کہ خدا کے رسول کی موجودگی میں ان کی شرارتیں نہیں چل سکتی تھیں۔ مسلمانوں کو جناب باری تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ انکی بُرائیوں سے محفوظ رکھ لیتا تھا۔ لیکن حضور کے بعد اگر خدانخواستہ اگر ایسے لوگ ہوں کہ اُنکا نفاق کھل جائے اور مسلمان بخوبی معلوم کرلیں تو قتل کر دیئے جائینگے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ نفاق حضور کے زمانہ میں تو تھا، لیکن آجکل تو وہ بیدینی اور زندیقیت ہے یہ بھی یاد رہے کہ زندیق کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ جب وہ کفر ظاہر کرے تو اسکے قتل سے پہلے اُس پر توبہ پیش کیجائے یا نہیں؟ اور وہ زندیق جو لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو اور وہ زندیق جو معلم نہ ہو، ان دونوں میں فرق کیا جائے یا نہیں؟ اور یہ ارتداد کئی کئی مرتبہ ہُوا ہو تب یہ حکم ہے، یا صرف ایک مرتبہ پر بھی؟ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہ اسلام لانا اور یہ رجوع کرنا خود اسکی اپنی طرف سے ہو، یا اُس پر غلبہ پالینے کے بعد بھی یہی حکم ہے؟ غرض ان سب باتوں میں اختلاف ہے، لیکن اسکے بیان کی جگہ احکام کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیریں۔ منافقوں کے نفاق کا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اچھی طرح علم تھا، جن میں چودہ تو وہ بدباطن لوگ تھے جنھوں نے غزوۂ تبوک میں مشورہ کرکے یہ امر طے کر لیا تھا کہ حضور کے ساتھ دغابازی کریں۔ آپ کے قتل کی پوری سازش کر چکے تھے کہ رات کے اندھیرے میں جب حضور فلاں گھاٹی کے قریب پہنچیں، تو آپ کی اُونٹنی کو بدکا دیں، وہ بھڑک کر بھاگے گی اور حضور گھاٹی میں گر پڑینگے۔ اللہ تعالیٰ [illegible] نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف اُسی وقت وحی بھیجکر انکی اس ناپاک غداری کی اطلاع دی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر اس واقعہ کی خبر دی، اور اُن غداروں کے نام بھی بتا دیئے۔ پھر بھی آپ نے انکے قتل کے احکام صادر نہ فرمائے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ

اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو۔ تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں۔ سنتا ہے وہی فسادی

الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

ہیں مگر انہیں شعور نہیں

یہ آیتِ کریمہ بھی منافقین کے خبثِ باطنی کے اظہار و بیان میں نازل ہوئی۔ مطلب یہ کہ ان منافقین کی دلی بیماری اسقدر غالب آگئی کہ بُرے بھلے کی تمیز نہ رہی، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ چغلخوری اور غیبت، فرمانِ الٰہی کے ساتھ نافرمانی، اور گناہوں سے زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بھلائی کرتے ہیں۔ گویا یہ منافقین اِن بُرائیوں کو بھلائی سمجھ بیٹھے ہیں۔

وَاِذَا قِیْلَ :- قیل، قول سے ماخوذ ہے، جسکے معنی بات، بولنا یا کہنا، دل کے خیالات، رائے اور مذہب ہے۔ اس جگہ یا تو کہنا مراد ہے، یا رائے دینا۔ اب رہا یہ کہنے والے کہ "زمین میں فساد برپا نہ کرو" کون ہیں؟ اس سے یا تو ربّ تبارک وتعالیٰ ہے کہ اُس نے اپنے نبی کریم رؤف ورحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ذریعہ اُن سے یہ فرمایا، یا یہ کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا یہ کہ عام مومنین ہیں، یا یہ کہ وہ مسلمان جن سے منافقین فتنہ وفساد کی باتیں کرتے تھے۔

لَا تُفْسِدُوْا :- فساد سے ماخوذ ہے۔ فساد کے معنی بگڑنا اور اعتدال سے تجاوز کرنا ہے۔ "صلاح" اسکی ضد ہے۔ صلاح کے معنی درستگی، سنورنا اور اعتدال پر رہنا ہے۔ مطلب یہ کہ فساد کا لفظ ہر طرح کی مضرت اور تکلیف دینے والی چیزوں کو شامل ہے، اور اسی طرح صلاح کا لفظ ہر قسم کی مفید اور نفع بخش چیزوں کو۔

منافقوں کا ملک میں فساد پھیلانا کیا تھا؟ یہ کہ مسلمانوں کو دھوکہ دیکر جنگ وجدال کی آگ کو پھیلانا اور بھڑکانا، اور مسلمانوں کے بھیدوں کو طشت از بام کرکے کافروں کو ان پر پل پڑنے کی ترغیب دینا تھا، اور یہ کہ لوگوں کو حضور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور قرآنِ عظیم پر ایمان لانے سے روکنا تھا۔

تفسیری اقوال حضرتِ عبد اللہ ابنِ عباس اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ ان کا فساد کفر اور معصیت تھی۔ مطلب یہ کہ زمین میں خدا کی نافرمانی کرنا، یا نافرمانی کرنے کا حکم دینا زمین میں فساد کرنا ہے۔ اور زمین وآسمان کی اصلاح اطاعت و فرمانبرداری میں ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ انھیں جب نافرمانی سے روکا جاتا تھا، تو وہ کہتے تھے کہ ہم تو ہدایت وصلاح پر ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس خصلت کے لوگ ابتک نہیں آئے۔ مطلب یہ کہ حضور کے زمانۂ اقدس میں ایسے بدخصلت اور بدطینت لوگ تو موجود ہی تھے، لیکن آئندہ جو آئینگے وہ ان سے بھی بدتر ہونگے۔

ابنِ جریر کا قول ہے کہ منافقین احکامِ الٰہی کی نافرمانی کرتے، اور فرائض کی ادائیگی میں جان چراتے، اور اللہ تعالیٰ کے سچے دین میں شک وشبہ کرتے اور اسکی حقانیت و صداقت پر یقینِ کامل نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ مومنوں کے پاس آکر اپنی ایمانداری کی ڈینگیں مارتے تھے، حالانکہ انکے دل شکوک ووساوس سے بھرے ہوئے ہوتے تھے، اور موقع پاتے ہی اعداءِ اسلام کی اعانت وامداد کرتے رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے مخلص اور فرمانبردار بندوں کے مقابلہ میں اُنکی طرفداری کرتے تھے، اور باوجود اس مکاری اور مفسدانہ چالوں کے وہ خود کو مصلح اور صلحِ کلی جانتے تھے، حالانکہ قرآنِ کریم نے کفار سے موالات اور دوستی رکھنے کو بھی زمین میں فساد برپا کرنے سے تعبیر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِیْرٌ ۝ یعنی کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اگر تم ایسا کروگے، اور ان کفار سے دوستی رکھوگے، تو یہ زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔ تو اس آیت نے مسلمان اور کفار کے دوستانہ تعلقات کو یکدم منقطع کردیا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا "اے ایمان والو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ"۔ ایک جگہ پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا کہ "یہ منافقین تو جہنم کے نچلے طبقہ میں ہونگے، اور تم ہرگز انکے لیے کوئی مددگار نہ پاؤگے"۔ چونکہ منافقوں کا ظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے، بنابریں مسلمانوں پر حقیقت مخفی رہجاتی ہے، اور وہ ایمانداروں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دیدیتے ہیں، اور انکی کفار سے پوشیدہ دوستیوں سے مسلمانوں کو خطرناک مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔

اب یہ حقیقت واشگاف ہوکر سامنے آگئی کہ دراصل بانیِ فساد یہی منافقین ہیں، کیونکہ اگر یہ اپنے سابقہ کفر پر ہی رہتے، اور اسلام کا ظاہری لبادہ نہ اوڑھتے، تو انکی خطرناک سازشوں اور گہری چالوں سے مسلمانوں کو ہرگز اتنا نقصان نہ پہنچتا۔ اور اگر یہ سچے پکے مخلص مسلمان ہوجاتے، اور ان کا ظاہر وباطن یکساں ہوجاتے، تو دنیا کے امن وامان خیر وصلاح کے ساتھ آخرت کی نجات وفلاح میں بھی کامران بنجاتے۔ اور جب انھیں صلاح وخیر کی ترغیب وتلقین اور نصحت کیجاتی ہے، اور یکسو ہونے کو کہا جاتا ہے، تو جھٹ بول اُٹھتے ہیں کہ ہم تو صلحِ کلی ہیں، ہم کسی سے لگاڑ نہیں چاہتے۔ ہم سب کے ساتھ اتفاق واتحاد چاہتے ہیں۔

حضرتِ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے ہم مومنین اور اہلِ کتاب کے مابین صلح کرانے والے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اُن کی نری جہالت ہے، جسے یہ صلح جانتے ہیں، وہ تو عین فساد ہے لیکن انھیں شعور نہیں۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ

اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں

اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

سنتا ہے وہی احمق ہیں مگر جانتے نہیں

یہاں النّاس سے یا تو صحابۂ کرام مراد ہیں یا مومنین، کیونکہ خداشناسی، فرمانبرداری اور عاقبت اندیشی کی بدولت وہی انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔ (خزائن العرفان) یعنی جسطرح مہاجرین وانصار اسلام میں سچے دل سے داخل ہوگئے ہیں، تم بھی ویسے ہی صاف دل سے داخل ہوجاؤ۔ یا یہ کہ جسطرح اہلِ کتاب میں سے حضرت عبد اللہ بن سلام (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) وغیرہ ایمان لے آئے ہیں، تم بھی اُسی طرح ایمان لے آؤ۔ یہ جملہ انھیں مسلمان نصیحت کرنے والوں کا مقولہ ہے، جو منافقوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے اور منع کرتے تھے، اس میں نصیحت کی تکمیل ہے، اسلیے کہ فساد سے اعراض کرنا اور شرائعِ اسلام کو بجالانا یہی انسان کا کمال ہے۔

سَفَه - سفہ کہتے ہیں خفتِ عقل کو۔ اور اس کی ضد علم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جو شخص عمداً اور قصداً جھوٹ بولتا ہے اُسے "سفیہ" کہتے ہیں۔ منافقوں نے مسلمانوں کو یا تو اس وجہ سے سفیہ واحمق اور بیوقوف کہا کہ وہ انکے فسادِ رائے کے معتقد نہ تھے، یا تحقیرِ شان کی وجہ سے۔ مطلب یہ کہ جب ان منافقوں کو صحابۂ کرام کی طرح اللہ تعالیٰ پر، اُسکے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے کو، موت کے بعد زندہ اٹھنے، اور جنّت ودوزخ کی حقانیت کے تسلیم کرنے و، خدا ورسول کی فرمانبرداری کرکے نیک اعمال بجالانے، اور بُرائیوں سے رُکے رہنے کو کہا جاتا ہے، تو یہ ملعون فرقہ ایسے ایمان کو بیوقوفوں کا ایمان بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انکی جہالت وحماقت پر خبردار فرماتا ہے کہ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝ خبردار یہی لوگ احمق ہیں، کیونکہ دن رات معجزات دیکھتے ہیں، تورات سے نبیِ آخر الزماں کی معرفت حاصل کرتے ہیں، اور باوجود اسکے ایمان نہیں لاتے، تو جو شخص آسمانی کتاب کی شہادت اور معجزات کے ثبوت کے بعد بھی خدا کے کلامِ مقدس پر ایمان نہ لائے، اُسکے نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا انکار کرے اُس سے بڑھکر اور کون احمق ہوسکتا ہے۔ اس جملہ میں ویسا ہی رَد اور مبالغہ ہے، جیسا کہ سابق کے جملہ میں تھا۔

مسئلہ :- اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ سے ثابت ہُوا کہ صالحین کا اتباع محمود ومطلوب ہے۔ **مسئلہ** :- یہ بھی ثابت ہُوا کہ مذہبِ اہلِ سُنّت حق ہے، کیونکہ اسمیں صالحین کا

اتباع ہے۔ **مسئلہ** تمام فرقے صالحین سے منحرف ہیں، لہٰذا گمراہ ہیں۔ **مسئلہ** بعض علماء نے اس آیت کو زندیق کی توبہ مقبول ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ (بیضاوی)
زندیق وہ ہے جو نبوت کا مُقر ہو، شعائر اسلام کا اظہار کرے، اور باطن میں ایسے عقیدے رکھے جو بالاتفاق کفر ہوں، یہ بھی منافقوں میں داخل ہے۔ (خزائن العرفان)
مسئلہ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ کَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (تو کہیں کہ کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں) سے معلوم ہوا کہ صالحین کو برا کہنا اہلِ باطل کا قدیم طریقہ ہے۔ آجکل کے باطل فرقے بھی پچھلے بزرگوں کو برا کہتے ہیں۔ روافض، خلفاءِ راشدین اور بہت سے صحابہ کو۔ خوارج حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم اور اُنکے رفقاء کو۔ غیر مقلد ائمۂ مجتہدین بالخصوص امام اعظم علیہ الرحمہ کو۔ وہابیہ بکثرت اولیاء و مقبولانِ بارگاہ کو۔ مرزائی، انبیاء سابقین تک کو۔ قرآنی (چکڑالوی) صحابہ و محدثین کو۔ نیچری، تمام اکابرِ دین کو بُرا کہتے ہیں، اور زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ سب گمراہی میں ہیں۔ اس میں دیندار عالموں کے لیے تسلی ہے کہ وہ گمراہوں کی بدزبانیوں سے بہت رنجیدہ نہ ہوں، سمجھ لیں کہ یہ اہلِ باطل کا قدیم دستور ہے۔ (مدارک و خزائن العرفان)
منافقین کی یہ بدزبانی مسلمانوں کے سامنے نہ تھی، اُن سے تو وہ یہی کہتے تھے کہ ہم باخلاص مومن ہیں، جیساکہ اگلی آیت میں ہے وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ الآیہ، یہ تبرّے بازیاں اپنی خاص مجلسوں میں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کا پردہ فاش کردیا (خازن)۔ اسی طرح آجکل کے گمراہ فرقے مسلمانوں سے اپنے خیالاتِ فاسدہ کو چھپاتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اُنکی کتابوں اور تحریروں سے اُنکے راز فاش کردیتا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ بددینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہیں، دھوکہ نہ کھائیں۔ (خزائن)

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے۔ اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝

ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے تھے۔ اللہ ان سے استہزا فرماتا ہے (جیساکہ اُسکی شان کے لائق ہے) اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں

اس آیت میں منافقین کے معاملہ و طریقِ عمل کا بیان ہے، جو اُنھوں نے ایمانداروں اور کافروں کے ساتھ اختیار کیا کہ مومنین سے جب ملے تو خوب چاپلوسی کی، ایمان کا ادّعا کیا، اپنے آپ کو مومنِ خالص ظاہر کیا، اور جب کفار کے ساتھ خلوت و تنہائی ہوئی اور اُنکی خاص مجلسوں میں اُن سے ملے، تو اُن پر اپنے باطن کا اظہار کردیا، اور بتاکید کہدیا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ جو طریقِ عمل رکھتے ہیں، اور اُنکے سامنے جو اظہارِ ایمان کرتے ہیں، یہ تمسخر و استہزاء ہے۔ یہ اُنھوں نے کفار سے اس لیے کہدیا تاکہ اُنھیں مومنین کے ساتھ میل جول رکھنے کی حقیقت معلوم ہوجائے، اور وہ سمجھ لیں کہ یہ اخبثِ کفار ہیں۔ ان کا مومنین سے ملنا اُنھیں دھوکہ دینے اور نقصان پہنچانے کیلیے ہے
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اللہ تعالیٰ اُنھیں جزاءِ استہزاء دیگا، اور اس فریب کاری کا وبال اُن پر پڑیگا، ذلت و رسوائی میں جو استہزاء کو لازم ہے وہ گرفتار ہونگے۔
اِستہزاء جیسا تمسخر، استحقار اور کسی کا مضحکہ بنانے کو کہتے ہیں۔ ایسی ہی اُسکی سزا کو بھی کہتے ہیں، اور اکثر جزائیں اُنھی افعال کے ساتھ نامزد کیجاتی ہیں جن کا وہ بدلہ ہیں۔ ہمارے محاورات میں رائج ہے "جو بدی کریگا بدی پائیگا" باوجودیکہ بدی کے عوض میں جو تکلیف دیجائے گی، وہ بدی نہ ہوگی۔ بات یہ ہے کہ بدی کی جزاء کی تھی اسلیے بدی کے نام سے نامزد کی گئی۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "جو ستائیگا ستایا جائیگا" حقیقۃً ستانا ظلم ہے، اور ستانے والے کو سزا دینا انصاف و عدل۔ یہاں اِس سزا کو "ستانا" کہا گیا۔ اور اسی طرح عرب میں بھی کسی شے کی سزا کو اُسکے نام سے نامزد کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اسکی بہت مثالیں ملتی ہیں، جیسے فرمایا جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اور فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ اسی اصول پر یہاں جزاءِ استہزاء کو استہزاء فرمایا گیا۔
واقعہ یہ ہے کہ تمسخر وہی ہوتا ہے جو ابتداءً کسی کی ہنسی اور مضحکہ بنانے کے لیے کیا جائے، وہی عیب ہے، اسی کو قرآنِ پاک میں فعلِ جُہال بتایا ہے۔ اسی کی نسبت حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا یہ قول قرآنِ کریم میں منقول ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ۔ اور جزاءِ استہزاء کو اگرچہ مجازاً استہزاء کہا جاتا ہے، مگر حقیقۃً وہ استہزاء نہیں عین حکمت و کمال انصاف ہے۔
دوسری وجہ استہزاء اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے کی یہ بھی ہے کہ اُس نے کفار کے استہزاء کا ضرر اُنھی کی طرف راجع کردیا۔ تیسری وجہ یہ بھی کہ استہزاء کا نتیجہ اور مقصود ذلت و حقارت ہے، وہ کفار کو اُنکے عمل کے بدلے اللہ کی طرف سے پہنچی۔ اور افعال کو اُنکے نتائج کے ساتھ تعبیر کرنا آئینِ فصاحت سے ہے۔ چوتھی وجہ یہ کہ کفار کے استہزاء کا مدار اس پر تھا کہ اُنکے آپس میں جو راز ہیں اُن کا افشاء نہ ہو، اور مسلمانوں کو اُنکی مکاری کی اطلاع نہ ملے، مگر اللہ تعالیٰ نے اُنکے راز فاش کردیئے، اور اُنکے مکائد پر مسلمانوں کو مطلع فرمادیا تو اہلِ ایمان کے ساتھ کفار کا استہزاء کرنا خود اُنکی اپنی ہنسی ہوگیا۔
اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے مومنین کے ساتھ استہزاء کیا، اُسکی سزا اللہ تعالیٰ نے اُنھیں دی، اور مومنین کو اُنکے جواب سے بے نیاز کردیا۔ اس سے یہ مسئلہ صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبولانِ بارگاہِ حق کی جناب میں ادب ضروری ہے۔ بے ادبی اور گستاخی باعثِ وبال و موجبِ عقاب ہے۔ جب مومنین کے ساتھ استہزاء و ترکِ ادب حضرتِ حق تبارک و تعالیٰ کو اسقدر ناپسند ہے، تو مخصوصانِ بارگاہ و مقربانِ درگاہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاءِ عظام کی جناب میں بے ادبی، گستاخی، بیباکی کیسا سخت جرم اور کسقدر باعثِ غضبِ الٰہی ہوگی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی۔ تو ان کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے نہ تھے۔

منافقین وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے عوض خریدا، اور اُنکی تجارت نے فائدہ نہ دیا، اور وہ اس میں راہ پانے والے نہ تھے۔ مُراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے اوصاف اُوپر ذکر کیے گئے اُن لوگوں نے ضلالت کو اختیار کیا اور ہدایت کو چھوڑا، اور اُنکے اس فعل کو شراء و تجارت کے ساتھ استعارہ فرمایا۔ شراء خریدنے کو کہتے ہیں، جس میں مقصود حصولِ مبیع (مال) ہوتا ہے، اور اسی کے لیے خریدار ثمن (قیمت) دینے پر راضی ہوتا ہے۔ یہی خرید و فروخت میں فرق ہے کہ بائع اور فروشندہ کی رغبت ثمن (قیمت) کی طرف ہوتی ہے، اور وہ اُسکے حاصل کرنے کیلیے مبیع (مال) دے ڈالتا ہے۔ اور خریدار کی رغبت مال کی طرف ہوتی ہے، اور وہ قیمت کو اُسکی طرف دفع کردیتا ہے۔ اس آیت میں اُن لوگوں کے حال کا اظہار ہے کہ اُنکی تباہ کاری اسدرجہ پہنچ گئی کہ اُنھوں نے ضلالت جیسی برباد کرنے والی چیز کو رغبت سے لیا، اور ہدایت جیسی قابلِ قدر نعمت کو ناقدری کیساتھ ہاتھ سے دیدیا۔ ہدایت سے مُراد یہاں دین میں راہِ صواب پر استقامت، اور ضلالت سے مُراد اُس سے عدول ہے۔ اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ منافق پہلے سے گمراہ تھے، تو گمراہی خریدنے اور ہدایت چھوڑنے کے کیا معنی ہیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ منافقین میں وہ لوگ بھی تھے جو پہلے ایمان لائے پھر کافر ہوئے، تو اُنکی نسبت یہ فرمانا بالکل درست ہوا کہ اُنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی، کیونکہ ایمان جو اُنکے

شانِ نزول :- یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے یا یہود کے حق میں ہے جو پہلے سے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے تھے مگر جب حضور کی تشریف آوری ہوئی تو منکر ہو گئے یا تمام کفار کے حق میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیمہ عطا فرمائی حق کے دلائل واضح کیے۔ ہدایت کی راہیں کھولیں لیکن انہوں نے عقل و انصاف سے کام نہ لیا اور گمراہی اختیار کی۔ (خزائن)

ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی بجائے ایمان کے کفر اختیار کر کے نہایت خسارہ اور ٹوٹے میں رہے۔ تو ان کی یہ تجارت سراسر خسران و نقصان کا باعث بنی کیونکہ اگر تجارت کا طریقہ جانتے تو تو اصل پونجی جو ہدایت ہے اسے نہ کھو بیٹھتے **مسئلہ** اس آیت سے بیع تعاطی کا جواز ثابت ہوا یعنی خرید و فروخت کے الفاظ کہے بغیر محض رضا مندی سے ایک چیز کے بدلے دوسری چیز لینا جائز ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ

ان کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی توجب اس سے آس پاس سب جگمگا اٹھا اللہ ان کا نور

بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝

لے گیا اور انہیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں

یہ ان کی مثال ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ ہدایت دی یا اس پر قدرت بخشی پھر انہوں نے اس کو ضائع کر دیا اور ابدی دولت کو حاصل نہ کیا اُن کا مآل حسرت و افسوس اور حیرت و خوف ہے۔ اس میں وہ منافق بھی داخل ہیں جنہوں نے اظہارِ ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا اور وہ بھی جو مومن ہونے کے بعد مرتد ہو گئے اور وہ بھی جنہیں فطرتِ سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق کو واضح کیا مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی اور جب حق سننے ماننے کہنے راہِ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان زبان آنکھ سب بیکار ہیں۔

خلاصہ یہ کہ منافقین کی حقیقتِ حال بیان کرنے کے بعد مزید کشف و توضیح کے لئے مثال بیان فرمائی جاتی ہے اور حقیقۃً باریک معانی کے ذہن نشین کرنے میں مثال بڑی تاثیر رکھتی ہے کتب سماویہ میں بکثرت مثالیں وارد ہیں انجیل کی صورتوں میں سے ایک صورت کا نام سورہ مثال بھی ہے اس آیت میں منافقین کے حال عجیب کو اس کے حال سے تشبیہہ دی جس نے آگ کو روشن کیا تاکہ تاریکی میں اس سے فائدہ اٹھائے پھر جب اُس سے تمام آس پاس روشن ہو گیا اللہ نے اُنکا نور لے لیا اور انہیں اندھیریوں میں متحیر چھوڑ دیا ایسے ہی منافقین نے کلمہ ایمان کا اظہار کر کے غنیمت وغیرہ دنیوی منافع حاصل کیے لیکن نفاق سے اُس کو ضائع کر کے ابدی نعمتوں سے محروم رہے اور بعد موت ظلمت و خوف میں گرفتار ہوئے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ نور لے لینے سے یہ مراد ہے کہ انکا چھپا ہوا عقیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے مومنین پر ظاہر ہو گیا اور کلمہ اسلام کے اجرا سے جو فوائد انہیں حاصل ہوئے تھے ہاتھ سے جاتے رہے۔

ظلمۃ :- جن ظلمتوں میں منافقین گرفتار ہوئے وہ کئی طرح کی ہیں ایک ظلمت نفاق کی۔ دوسری ظلمت روزِ قیامت کہ کفار نور سے محروم رہیں گے تیسری ظلمت ناراضی خداوند۔ چوتھی ظلمت عذاب ابدی۔ پانچویں ایمان پر مرتب ہونے والی نعمتوں کے فوت ہونے سے حسرت و افسوس کی ظلمت۔

تمثیل کی حکمتیں :- اس تمثیل میں چند حکمتیں ہیں پہلی یہ کہ آگ سے روشنی حاصل کرنے والا ذاتی نور نہیں رکھتا بلکہ خارجی اور غیر کے نور سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جب وہ دوسرا نور جاتا رہے تو یہ تاریکی میں متحیر رہ جاتا ہے۔ یہی حال کفار کا ہے جنہوں نے ایمان کا اقرار کیا اور دل اعتقاد سے خالی تھے ذاتی روشنی نہ تھی۔ ایک مستعار چیز کی طرح ایمانی کلمات ان کی زبان پر آجایا کرتے تھے پردہ فاش ہونے پر حقیقتِ حال ظاہر ہو گئی۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ آگ بغیر مادہ کے باقی نہیں رہتی اس کے لئے کوئی ایندھن درکار ہے۔ اسی طرح ایمان کی بقا بغیر اعتقاد کے متصور نہیں تو ان کا محض دعویٰ کچھ مفید نہ ہوگا۔ تیسری حکمت یہ ہے کہ جو تاریکی کے بعد روشنی کے پیش آئے وہ زیادہ سخت ہوتی ہے ایمان کی چمک اور اس کے منافع دیکھ لینے کے بعد پھر اُس سے محروم ہونا ابتدائی محرومی سے زیادہ سخت ہے۔ اس کے بعد فرمایا صم بکم کہ وہ بہرے گونگے اندھے ہیں۔ ہر چند کہ اُن کے حواس سلیم ہوں لیکن جب انہوں نے حق کے سننے، حق کے بولنے حق کے دیکھنے میں ان سے کام نہ لیا تو وہ مسلوب الحواس لوگوں کی طرح ان کے فائدے سے محروم رہے اس کے بعد اُن کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ وہ ہدایت کی طرف واپس نہ ہونگے اس نتیجہ کو فا کے ساتھ لانا دلالت کرتا ہے کہ ان کی حیرت و محرومی کا سبب اُن کا اندھا بہرہ بننا اور ہدایت کی طرف سے اعراض کرنا ہے۔

شانِ نزول :- سدی کا قول ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ رونق افروز ہونیکے وقت بعض لوگ داخلِ اسلام ہوئے پھر وہ منافق ہو گئے اس صورت میں تشبیہہ کی مراد یہ ہوگی کہ انہوں نے پہلے ایمان لا کر نور حاصل کیا پھر منافق ہو کر اُس کو ضائع کر دیا اور حیرت میں گرفتار ہو گئے۔

سعید بن جبیر کا قول ہے کہ یہ آیت یہود کے حق میں نازل ہوئی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور آپ کی برکت سے مشرکین عرب پر فتح کی دعائیں کرتے تھے جب حضور جلوہ افروز ہوئے تو یہ بدنصیب کافر ہو گئے ان کا انتظار آگ روشن کرنے سے اور اس کے بعد حضور کا انکار کرنا زوالِ نور سے تشبیہہ دیا گیا۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي

یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس

آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝

رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے

یہ منافقین کے حال کی دوسری تمثیل ہے اس میں دینِ اسلام کو بارش سے تشبیہہ دی گئی کیونکہ وہ قلوب کی حیات کا ذریعہ ہے جیسے کہ بارش زمین کی حیات کا اور کفار کے شبہات کو ظلمات سے اور وعدہ و وعید کو گرج اور چمک سے اور مسلمانوں کی طرف سے جو اندیشے ہیں اُن کو کڑک سے تشبیہہ دی گئی یعنی کفار کے نزدیک ایمان لانا اور اپنے دین کو ترک کرنا موت کی مثل ہے اس لیئے وہ احکامِ اسلام و قرآن کو جو بارش کی طرح قلوب کی زندگی کا باعث ہیں اور اس میں کفر کا ذکر اور شبہات کفار کا بیان ہے جو ظلمات سے تشبیہہ دیا گیا اور اُس پر وعید جو بجلی کی گرج سے مشابہت رکھتی ہے اور حجج بینہ جو برق کے ساتھ تشبیہہ دیئے گئے ہیں

ان سے اپنے کان بند کر لیتے ہیں کہ کہیں ایسا نہو کہ یہ باتیں کان میں پڑیں تو دل ایمان کی طرف مائل ہو جائے اور آبائی دین چھوٹ جائے۔

شانِ نزول منافقوں میں سے دو آدمی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سے مشرکین کیطرف بھاگے راہ میں یہی بارش آئی جس کا آیت میں ذکر ہے اس میں شدت کی گرج، کڑک اور چمک تھی جب گرج ہوتی تو یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں یہ کانوں کو پھاڑ کر مار نہ ڈالے جب چمک ہوتی چلنے لگتے جب اندھیری ہوتی اندھے رہجاتے آپس میں کہنے لگے خدا خیر سے صبح کرے تو حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ہاتھ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس میں دیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام پر ثابت قدم رہے ان کے حال کو اللہ تعالیٰ نے منافقین کے لیے مثل (کہاوت) بنایا جو مجلس شریف میں حاضر ہوتے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں حضور کا کلام ان میں اثر نہ کر جائے جس سے مر ہی جائیں اور جب ان کے مال واولاد زیادہ ہوتے اور فتوح غنیمت ملتی تو بجلی کی چمک والوں کی طرح چلتے اور کہتے کہ اب دین محمدی سچا ہے۔ اور جب مال واولاد ہلاک ہوتے اور کوئی بلا آتی تو بارش کی اندھیریوں میں ٹھٹک کر رہنے والوں کیطرح کہتے کہ یہ مصیبتیں اسی دین کی وجہ سے ہیں اور اسلام سے پلٹ جاتے (لباب النقول للسیوطی وخزائن)

مطلب یہ کہ جس طرح اندھیری رات میں کالی گھٹا چھائی ہو اور بجلی کی گرج چمک جنگل میں مسافر کو حیران کرتی ہو اور وہ کڑک کی دہشتناک آواز سے باندیشہ ہلاک کانوں میں انگلیاں ٹھونستا ہو ایسے ہی کفار قرآن پاک کے سننے سے کان بند کرتے ہیں۔ اور انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کے دلنشیں مضامین اسلام وایمان کی طرف مائل کر کے باپ دادا کا کفری دین ترک نہ کرا دیں جو ان کے نزدیک موت کی برابر ہے۔ لہذا یہ گریز انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتی کیونکہ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر قہر الٰہی سے خلاصی نہیں پا سکتے۔ (خزائن)

صیب۔ کے معنی مینہ اور بارش کے ہیں بعض نے بادل کے معنی بھی بیان کیے ہیں لیکن زیادہ مشہور معنی بارش ہی کے ہیں جو اندھیرے میں برسے۔

ظلمات۔ سے مراد شک اور کفر ونفاق ہے اور رَعد کے معنی گرج اور کڑک کے ہیں جو اپنی خوفناک آواز سے دل ہلا دیتی ہے۔ یہی حال منافق کا ہے کہ اسے ہر وقت ڈر خوف گھبراہٹ اور پریشانی ہی رہتی ہے دوسری جگہ ارشاد ہے۔ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ یعنی ہر آواز کو اپنے اوپر ہی گمان کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ یہ منافقین خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں لیکن دراصل وہ ڈر پوک ہیں اگر وہ کوئی جائے پناہ رکھتے یا فرار کا راستہ پاتے تو یقیناً وہ اسمیں سمٹ کر گھس جاتے۔

برق۔ کے معنی ہیں بجلی اور روشنی۔ اس سے مراد وہ نور ایمان ہے جو ان کے دلوں میں کبھی کبھی چمک اٹھتا ہے۔ تو وہ اسوقت اپنی انگلیاں موت کے خوف سے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ لیکن یہ انہیں کوئی نفع نہ دے گا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے ارادوں کے ماتحت ہیں بچ نہیں سکتے (ابن کثیر)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لیجائیگی۔ جب کچھ چمک ہوئی اس میں چلنے لگے۔ اور جب اندھیر ہوا کھڑے

قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۰)

رہ گئے اور اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا۔ بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

یہ تمثیل ہے کہ قرآنی حجج اور اسلامی دلائل دلوں پر اثر کرتے ہیں۔ اور کفار جب وہ احکام سنتے ہیں جن میں ان کو فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ تو تصدیق کرتے ہیں۔ اور جو ان پر گراں گذرتے ہیں ان کو سن کر ٹھہر جاتے ہیں مطلب یہ کہ جیسے بجلی کی چمک سے معلوم ہوتا ہے کہ بینائی زائل کر دے گی ایسے ہی دلائل باہرہ کے انوار ان کی بصر بصیرت کو خیرہ کرتے ہیں۔ اور جب چمک ہوتی ہے تو اسمیں چلنے لگتے ہیں جسطرح اندھیری رات اور ابر وبارش کی تاریکیوں میں مسافر متحیر ہوتا ہے جب بجلی چمکتی ہے تو کچھ چل لیتا ہے جب اندھیرا ہوتا ہے کھڑا رہ جاتا ہے اس طرح اسلام کے غلبہ اور معجزات کی روشنی اور آرام کے وقت منافق اسلام کی طرف راغب ہوتے ہیں اور جب کوئی مشقت پیش آتی ہے تو کفر کی تاریکی میں کھڑے رہجاتے ہیں اور اسلام سے ہٹنے لگتے ہیں اسی مضمون کو دوسری آیت میں اسطرح ارشاد ہوا۔ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ۔ (خزائن)

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ الآیہ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لیجاتا یعنی اگرچہ منافقین کا طرز عمل اس کا مقتضی تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے سمع وبصر کو باطل نہ کیا۔ **مسئلہ** اس سے معلوم ہوا کہ اسباب کی تاثیر مشیت الٰہیہ کیساتھ مشروط ہے بغیر مشیت تنہا اسباب کچھ نہیں کر سکتے۔

مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مشیت اسباب کی محتاج نہیں وہ بے سبب جو چاہے کر سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ شیئی اس کو کہتے ہیں "جسے اللہ چاہے اور جو تحت مشیت آسکے" تمام ممکنات شئی میں داخل ہیں اس لئے وہ تحت قدرت ہیں۔ اور جو ممکن نہیں وہ واجب یا ممتنع ہیں اس سے قدرت وارادہ متعلق نہیں ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات واجب ہیں اس لیے مقدور نہیں۔ (خزائن)

مسئلہ شئی موجود کے ساتھ خاص ہے چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا معدوم کو شئے نہیں کہتے۔ وما المعدوم مرئیا وشیئا **مسئلہ** ذات الٰہی پر بھی شئے کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ لیکن عالم کی کوئی شے اس کی مثل نہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ **مسئلہ** قدرت کا تعلق صرف ممکنات کے ساتھ ہوتا ہے واجبات ومحالات تحت قدرت نہیں آتے اس لئے ذات الٰہی اس عام میں سے خاص کی گئی تو مراد شئے سے ہر موجود ممکن ہے اور اسی پر قدرت ثابت ہے محالات یا واجبات پر قدرت کا ثابت کرنا گمراہی اور مآلاً قدرت کا انکار ہے۔ **مسئلہ** کذب جہل وغیرہ قبائح وعیوب حضرت حق تقدست ذاتہ کے لئے محال ہے اس لیے تحت قدرت نہیں آتے **مسئلہ** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عام کی تخصیص عقل سے جائز ہے نیز یہ بھی کہ تخصیص عقلی سے قطعیت زائل نہیں ہوتی۔

تنبیہ۔ بعض نافہم لوگوں نے شئی کے معنی چیز لیکر کہا کہ جھوٹ بھی شیئی ہے اور رب تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے اور اس پر علامہ بیضاوی کے اس قول اِنَّ مَقْدُوْرَ الْعَبْدِ مَقْدُوْرُ اللّٰهِ جو بندے کا مقدور ہے خدا کا مقدور ہے دلیل لاتے ہیں۔ بلاشبہ قدرت دی ہوئی اسی کی ہے مگر بندے کے ہر فعل کو بعینہٖ خدا کی طرف منسوب نہ کیا جائے گا۔ رب تبارک وتعالیٰ ہر عیب ونقصان سے پاک ہے۔ اسی طرح وہ جھوٹ، بدکاری، چوری سب سے بری ہے۔

... قول اللہ ... اللہ سے زیادہ سچ بولنے والا کون ہے اور جھوٹ اور سچ ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے۔ خدا جب سچا ہے تو جھوٹا ہو ہی نہیں سکتا ان اللہ علی کل شیئی قدیر یعنی اللہ ہر شئ پر قادر ہے (بیضاوی)

توحید و نبوت و معاد کا بیان

احکام شرعیہ کے بیان میں چھ سو کے قریب آیتیں ہیں۔ باقی آیات توحید، نبوت میں، اور بت پرستی اور اس کے اقسام کا رد ہے نفس سے حکمت و قدرت الٰہی کی معرفت مقصود ہے۔ اس آیت میں بھی وجود صانع اور اس کی توحید کا بیان ہے اور اس پر یہاں پانچ دلیلیں ذکر فرمائی ہیں (۱) مکلفین کو پیدا فرمانا (۲) ان سے پہلوں کو پیدا فرمانا۔ (۳) آسمان کو پیدا فرمانا۔ (۴) زمین کو پیدا فرمانا (۵) آسمانی پانی جو زمین پر برستا ہے اس سے پھل و ثمر پیدا فرمانا۔ ان دلائل کے بعد شرک کی ممانعت فرمائی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے

تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ لاعب الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ص وَّاَنْزَلَ مِنَ

ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔ وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی

السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ج فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ

اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لیئے جان بوجھ کر

اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

برابر والے نہ ٹھہراؤ

اول سورۃ میں بتایا گیا تھا کہ یہ کتاب متقین کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی پھر متقین کے اوصاف کا ذکر فرمایا اس کے بعد اس سے منحرف ہونے والے فرقوں کا اور ان کے احوال کا ذکر فرمایا کہ سعادت مند انسان ہدایت و تقویٰ کی طرف راغب ہو اور نافرمانی و بغاوت سے بچے۔

مطلب یہ کہ مکلفین کے گروہ اور ان کے خواص بیان فرمانے کے بعد ان کی طرف خطاب فرمایا، اور عبادت کا حکم دیا باوجودیکہ اب تک کلام غائب کے صیغوں سے تھا اس سے عبادت کی اہمیت اور اس کی شان معلوم ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ عبادت ذریعہ قرب حق ہے کہ اس کا حکم اسلوب بدل کر فرمایا اور جنکا ذکر اب تک غائب کے ساتھ ہو رہا تھا انہیں قرب خطاب کے ساتھ نوازا عابد کو ایک لذت روحانی تو محبوب کے خطاب ہی سے حاصل ہو جاتی ہے اور ذوق و شوق پیدا ہوتا اور بڑھتا ہے۔ کہ حکم عبادت میں جب قرب توجہ سے نوازا تو ادائے عبادت پر کیا کیا حکم ہونگے۔

یا ایھا الناس کا خطاب اکثر اہل مکہ کو اور یا ایھا الذین اٰمنوا کا اہل مدینہ کو ہوتا ہے مگر یہاں یہ خطاب مومن و کافر سب کو عام ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ انسانی شرافت اسی میں ہے کہ آدمی تقویٰ حاصل کرے اور مصروف عبادت رہے۔

غرضکہ یہ خطاب تمام مکلفین کے لیئے عام ہے خواہ وہ لوگ ہوں جو وقت نزول قرآن پاک موجود تھے یا وہ جو ان کے بعد قیامت تک پیدا ہوں کیونکہ دین پاک مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم میں احکام اور مقتضیات خطاب جس طرح اس زمانے کے لوگوں کے لئے ثابت ہیں اسی طرح ان کو بھی شامل ہیں جو ان کے بعد قیامت تک آئیں۔ اس سے صرف وہی لوگ مخصوص ہو سکتے ہیں جنکو دلیل شرعی نے خاص کیا ہو جیسے کہ جنبی و مجنون مکلفین میں کفار بھی ہیں امر عبادت ان کو بھی شامل ہے جسطرح جنبی یا بے وضو شخص کی طرف نماز کا حکم متوجہ ہوتا ہے اور نماز کا وجوب لازم کرتا ہے کہ وہ حدث جنابت کو رفع کر کے طاہر ہو اور نماز ادا کرے۔ اسی طرح کافر کو عبادت کا حکم دینے کے یہ معنے ہیں کہ وہ نجاست کفر سے پاک ہو کر ادا عبادت میں مشغول ہو۔

ہر کام جو شرائط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے اس کو حکم دینے کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ اس کو اس کے شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے۔

عبادت:۔ عبادت وہ غایت تعظیم ہے جو بندہ اپنی عبدیت اور معبود کی الوہیت کے اعتقاد و اعتراف کے ساتھ بجالائے یہاں عبادت بھی عام ہے جو اپنے تمام انواع و اقسام و اصول و فروع کو شامل ہے۔ مسئلہ کفار عبادت کے مامور ہیں جس طرح بے وضو ہونا نماز کے فرض ہونے کا مانع نہیں۔ اسی طرح کافر ہونا وجوب عبادت کو منع نہیں کرتا اور جیسے بے وضو شخص پر نماز کی فرضیت رفع حدث لازم کرتی ہے ایسے ہی کافر پر وجوب عبادت سے ترک کفر لازم آتا ہے (خزائن) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس عبادت کی توحید سے تفسیر فرماتے ہیں۔

توحید کے معنی ہیں الٰہ واجب الوجود کو واحد ماننا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو واجب والٰہ اعتقاد نہ کرنا اسی طرح اس کے جملہ صفات کمالیہ میں اس کو واحد و منفرد جاننا اور اسکے کسی کمال کو بالاصالت و الاستقلال کسی دوسرے کی طرف نسبت نہ کرنا ایسے ہی عبادت کا مستحق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو نہ جاننا اور اسکے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرنا کہ یہ بھی اعتقاد الوہیت کی خبر دیتا ہے اس میں داخل ہے مشرکین کے ان افعال سے احتراز و اجتناب جو ان کے شرک و مخلوق پرستی کے دلائل و علامات شعار کفر و شرک ہے۔

ربکم ۔ فرمانا وجوب عبادت کی دلیل اور الوہیت و استحقاق عبادت کا بیان ہے کہ مستحق عبادت وہی ہے جس نے تمہاری پرورش کی اور تمہیں اور پہلوں کو پیدا کیا۔ اس میں بت پرستی کا ابطال ہے۔

لعلکم تتقون ۔ میں اس عبادت کے نتیجے و ثمرہ کا بیان ہے کہ اس سے تم زمرہ متقین میں داخل ہو گے۔ جن کا ھدےً و فلاح تک فائز ہونا بیان ہو چکا ہے (مسئلہ) لعلکم تتقون میں اس بات کی طرف تنبیہ ہے کہ تقویٰ سالکین کا منتہائے درجات ہے کیونکہ عبادت سے اس تک وصول میسر آتا ہے غایت مراتب تقویٰ یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو ماسوی اللہ سے فارغ و خالی کرے اور بکلی جناب حق کی طرف متوجہ ہو جائے (مسئلہ) لعلکم میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عابد کو اپنی عبادت پر مغرور و نازاں نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کو جلال حق کا خوف اور کرم الٰہی کا امیدوار رہنا چاہیئے۔ یہی مومن کی شان ہے اور ایمان بین الخوف والرجاء، قرآن حکیم میں اسی مسئلے کا دوسری جگہ اسطرح ذکر فرمایا۔ ید عون ربھم خوفا وطمعا اسی کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا یرجون رحمتہٗ ویخافون عذابہٗ۔

مسئلہ لعلکم تتقون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ملتا ہے اللہ تعالےٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو عبادت یا اور کسی چیز سے نفع حاصل ہو۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ لعلکم کا اعبدو سے تعلق نہیں ہے بلکہ یہ خلقکم کی تعلیل ہے اس تقدیر پر معنی یہ ہیں کہ تمہارے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم متقی و پرہیز گار ہو۔ مگر اس قول کو ضعیف بتایا گیا ہے۔ **مسئلہ** آیت میں اللہ تعالےٰ کی خالقیت و ربوبیت کو نعمتوں پر وجوب عبادت کا سبب بتایا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بندوں کا عبادات ادا کرنا ان پر مخلوق و مربوب اور مورد احسان و کرم ہونے کی جہت سے واجب ہے اور کوئی شخص ادائے واجب سے مستحق جزا نہیں ہوتا ایک قرضدار قرض ادا کر کے کسی انعام کا مستحق نہیں ہوتا تو بندے بھی عبادت سے کسی ثواب اور جزا کے حقدار نہیں بن جاتے لہٰذا عبادت پر جزا و ثواب مرتب فرمانا یہ اللہ تعالیٰ کا محض کرم ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی الوہیت و ربوبیت کا بیان ہے جسمیں تعلیم ہے کہ صرف ذات لائق پرستش قابل عبادت ہے اسکے سوا کوئی پوجنے اور عبادت کے لائق نہیں۔ کیونکہ وہی اپنے بندوں کو عدم سے وجود میں لایا اس نے ہر طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا فرمائیں اس نے زمین کا فرش بنایا اور اس میں مضبوط پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور آسمان کو چھت بنایا دوسری آیت میں ارشاد ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا یعنی آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔ باوجود ان کھلی نشانیوں کے پھر بھی انسان روگردانی کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک و سہیم بنائے کس قدر تعجب خیز ہے۔

الذی جعل لکم الآیہ۔ اس میں حق تعالیٰ کی ربوبیت کا بیان ہے کہ انسان کے تمام حوائج و ضروریات اور سامان راحت و آسائش کو اس نے علی وجہ الکمال بہم پہنچایا۔ آسمان و زمین کا وسیع مکان رہنے کو دیا کواکب سے اس کو روشن کیا ابر و باران سے نباتات و اشجار و اثمار پیدا فرما کر روزی عطا فرمائی اس کا شکر انسان پر لازم ہے۔ بجائے اس کے ناشکری کرنا اسکی عبادت بجا نہ لانا دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانا نہایت شنیع و شدید جرم ہے۔ نیز اس آیت میں ایک تنبیہ یہ بھی ہے کہ انسان اس عالم میں اشرف و اعلیٰ بنایا گیا اور آسمان و زمین اور ان کی کائنات اس کی خدمت کے لیے مقرر کی گئی ان خدام کو اپنا معبود اور خداوند کریم کا شریک ٹھہرانا انتہا درجے کا کمینہ پن اور انسانیت کا خون ہے مشرکین خواہ کواکب پرست ہوں یا بت پرست یا اور کوئی سب اسی جرم کے مرتکب ہیں۔

وانزل من السماء ماءً آسمان سے پانی نازل کرتا ہے اور خاص ایسے احتیاج و ضرورت کے وقت جبکہ لوگ اس کے لیے بیتاب و بےچین ہوں۔ پھر اس پانی سے طرح طرح کے پھل پھول پیدا فرماتا جس سے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں اور ان کے جانور بھی۔ قرآن پاک میں اس مضمون کو جابجا بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ اللہ الذی جعل لکم الارض قرارًا الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہیں پیاری پیاری صورتیں عطا فرمائیں اور بھلی بھلی روزیاں پہنچائیں وہی اللہ ہے جو برکتوں والا اور تمام عالم کا پالنے والا (رب) ہے۔ پس سب کا مالک، سب کا خالق، سب کا رازق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اسی وجہ سے وہی ہر قسم کی عبادتوں کا مستحق اور کسی کو شریک نہ کیے جانے کا سزاوار ہے۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ دریافت کرتے ہیں کہ حضور سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو سب کا خالق ہے شریک ٹھیرانا۔ حضرت معاذ والی حدیث میں ہے کہ فرمایا کیا جانتے ہو کہ خدا کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ ٹھیرائیں۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ انداداً کے معنی شریک اور برابر کے ہیں۔

مجاہد فرماتے ہیں تم توریت و انجیل پڑھتے ہو اور جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک اور لاشریک ہے پھر یہ جانتے ہوئے کیوں اللہ تعالیٰ کا شریک کرتے ہو؟ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو۔ اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو قریب تھا کہ وہ اس میں ڈھیل کرتے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگار عالم کا حکم تھا کہ ان پانچ چیزوں پہ خود کاربند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو اب یا تو خود آپ کہہ دیجئے یا میں پہنچا دوں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت کر گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ کیا جائے یا زمین میں دھنسا نہ دیا جائے چنانچہ یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا۔ جب مسجد پُر ہو گئی تو بلند جگہ پر بیٹھ گئے حمد و ثنا کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم کیا ہے خود عمل کر کے تم سے بھی ان پر عمل کراؤں۔ پہلا حکم یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے غلام کام کاج کرے اور جو کچھ پائے اسے کسی اور کو دے دے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا تمہیں روزی دینے والا تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی سزاوار ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ دوسرا حکم یہ کہ نمازیں ادا کرو اللہ تعالیٰ کا رخ انور بندے کے چہرے کی طرف ہوتا ہے جب تک وہ نماز میں ادھر ادھر التفات نہ کرے جب تم نماز میں ہو تو خبردار ادھر ادھر التفات نہ کرنا تیسرا حکم یہ ہے کہ روزے رکھا کرو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کسی شخص کے پاس مشک کی تھیلی بھری ہوئی ہو جس سے اس کے تمام ساتھیوں کے دماغ معطر رہیں یاد رکھو روزے دار کے منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔ چوتھا حکم اس کا یہ ہے کہ صدقہ دیتے رہا کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمنوں نے قید کر لیا اور گردن کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھ دیے اور گردن مارنے کے لیے لے چلے تو وہ کہنے لگا کہ تم مجھ سے فدیہ لے لو اور مجھے چھوڑ دو چنانچہ جو کچھ تھا کم زیادہ دے دلا کر اپنی جان چھڑالی پانچواں حکم اس کا یہ ہے کہ کثرت سے اس کے نام کا ذکر کیا کرو۔ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کے پیچھے تیزی کے ساتھ دشمن دوڑا آتا ہے اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں گھس جاتا ہے اور وہاں امن و امان پا لیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت بندہ شیطان کے چنگل سے محفوظ رہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرما کر ارشاد فرمایا اب میں بھی تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے رہنا (اللہ اور اس کے رسول) اور مسلمان حاکم وقت کے احکام سننا اور ماننا چوتھے ہجرت کرنا پانچویں جہاد کرنا جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر نکل گیا اس نے اسلام کے پٹے کو اپنے گلے سے اتار پھینکا ہاں یہ اور بات ہے کہ رجوع کرے جو شخص جاہلیت کی پکار پکارے وہ جہنم کا کوڑا کرکٹ ہے لوگوں نے کہا حضور اگرچہ وہ روزے دار اور نمازی ہو فرمایا اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو۔ اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ مسلمان کو ان کے ان ناموں کے ساتھ پکارتے رہو جو خود خداوند تبارک و تعالیٰ نے رکھے ہیں جیسے مسلمین مومنین عباداللہ اولیاء اللہ وغیرہ یہ حدیث حسن ہے۔

امام رازی وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور فی الواقع یہ آیت بہت بڑی دلیل ہے اللہ تعالیٰ کے وجود پر زمین اور آسمان کی مختلف شکل و صورت، مختلف رنگ، مختلف مزاج اور موجودات کے مختلف منافع ان میں سے ہر ایک کا نفع والا ہونا اور خاص حکمت سے ہونا ثبوت ہے اُن کے خالق کے وجود کا اور اس کی عظیم الشان قدرت اور حکمت اور زبردست سطوت اور سلطنت کا۔

کسی بدوی سے پوچھا گیا۔ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا۔ یَا سُبْحَانَ اللّٰہِ اِنَّ الْبَعْرَ لَیَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ۝ وَاِنَّ اٰثَرَ الْاَقْدَامِ
لَتَدُلُّ عَلَی الْمَسِیْرِ۝ فَسَمَآءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ۝ وَاَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ۝ وَبِحَارٌ ذَاتُ اَمْوَاجٍ۝ اَلَا یَدُلُّ ذٰلِکَ عَلٰی وُجُوْدِ اللَّطِیْفِ الْخَبِیْرِ۝
یعنی اے اللہ تیری ہی پاکی ہے یقیناً مینگنی سے اور پاؤں کے نشان کو زمین پر دیکھنے سے معلوم ہو جائے کہ کوئی آدمی گیا ہے تو کیا یہ برجوں والا آسمان
پیرا ستوں والی زمین یہ موجیں مارنے والے سمندر اللہ لطیف و خبیر کے وجود پر دلیل نہیں بن سکتے؟
حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ہارون رشید نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے آپ نے فرمایا زبانوں کا مختلف ہونا آوازوں کا جدا گانہ
ہونا نغموں کا الگ الگ ہونا ثابت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ہے۔
امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی جب یہی سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ چھوڑو میں ابھی کسی اور فکر میں ہوں لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ ایک بہت بڑی
کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں نہ کوئی اس کا نگہبان ہے نہ چلانے والا ہے باوجود اس کے وہ برابر آ جا رہی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی
گذر جاتی ہے ٹھیرنے کی جگہ ٹھہر جاتی ہے چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے اور نہ کوئی ملاح ہے نہ منتظم سوال کرنے والے دہریوں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے کوئی عاقل
ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی نظام کے ساتھ تلاطم والے سمندر میں آئے جائے اور کوئی اسکا چلانے والا نہ ہو؟۔ آپ نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر ایک
کشتی تو بغیر چلانے والے کے نہ چل سکے لیکن یہ ساری دنیا آسمان و زمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں۔ اور ان کا کوئی مالک حاکم خالق نہ ہو؟۔
یہ جواب سن کر وہ لوگ ہکے بکے ہو گئے اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے۔
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا توت کے پتے ایک ہی ہیں ایک ہی ذائقہ کے ہیں لیکن کیڑے اور شہد کی مکھی اور گائیں
بکریاں ہرن وغیرہ سب اس کو چرتے کھاتے چگتے اور چوستے ہیں اسی پتے کو کھا کر کیڑے میں سے ریشم نکلتا ہے مکھی شہد دیتی ہے ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے۔ اور
گائیں بکریاں مینگنیاں دیتی ہیں کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟۔ اور اسی کو ہم اللہ تبارک و تعالیٰ مانتے ہیں
وہی موجد اور صانع ہے۔
حضرت امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک مرتبہ وجود باری تعالیٰ پر دلیل طلب کی گئی تو آپ نے فرمایا سنو یہاں ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے
جس میں کوئی دروازہ نہیں نہ کوئی راستہ ہے بلکہ سوراخ تک نہیں باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور اندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے اور اوپر نیچے دائیں بائیں
چوطرف سے بالکل بند ہے ہوا تک اس میں نہیں جا سکتی اچانک اسی کی ایک دیوار گرتی ہے اور ایک جاندار آنکھوں کانوں والا بولتا چالتا خوب صورت شکل پیاری
بولی والا چلتا پھرتا نکل آتا ہے کہو اس بند اور محفوظ مکان میں اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں اور وہ ہستی انسانی ہستیوں سے بالاتر اس کی قدرت غیر محدود
ہے یا نہیں؟۔ مطلب آپ کا یہ تھا۔ کہ انڈے کو دیکھو چوطرف سے بند ہے پھر اس نے پروردگار عالم خالق یکتا جاندار بچہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی دلیل ہے خدا کے وجود
پر اور اس کی توحید پر۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ
اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اُس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اوتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ۔ اور اللہ کے سواء اپنے
کُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۲۳ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ
سب حمائتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو پھر اگر نہ لا سکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ
وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝۲۴
سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ تیار کر رکھی ہے کافروں کے لئے۔

اثبات توحید و رد شرک کے بعد حضور پُرنور سیّد انبیاء محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن پاک کے اعجاز کو اس آیت میں زبردست دلیل کے ساتھ بیان فرمایا۔
عبدنا سے حضور مراد ہیں۔ سورت قرآن پاک کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس کا اوّل آخر معین ہو اور وہ کم سے کم تین آیتوں پر مشتمل ہو اور اس کے لیے کوئی نام
مقرر ہو۔ تمام کتب الٰہیہ سورتوں پر مشتمل تھیں۔
مفسرین نے اس آیت کے ایک معنی یہ بھی کئے ہیں کہ مِثْلِهٖ کی ضمیر حضور علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ایک سورۃ ہی ایسی لے آؤ جو کہ محمد رسول
اللہ جیسی ذات کے مبارک منہ سے نکلی ہو، یعنی اوّلاً تو کوئی ایسی شان والا محبوب دُنیا میں ڈھونڈو، پھر اُس کے منہ سے ایسی آیت پڑھوا کر سنو (خازن و مدارک وغیرہ) اس کلام
کا مقصد یہ ہے کہ نہ ان جیسی شان کا آسمان کے نیچے کوئی ملے گا نہ ایسا کلام سُنا سکے گا جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام بے مثل اور بے نظیر ہیں + حدیث پاک میں ارشاد
ہوا اَیُّکُمْ مِثْلِیْ تم میں مجھ جیسا کون ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا وَلٰکِنِّیْ لَسْتُ کَاَحَدٍ مِّنْکُمْ لیکن ہم تمہاری طرح نہیں اور عقل کا بھی تقاضا ہے کہ حضور علیہ السلام
کی مثل کوئی نہیں ہو سکتا۔
ہم سب مومن، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ایمان، ہم لوگ صادق وہ سراپا صدق۔ لوگ علم وہ سراپا علم، کیونکہ اُن کے احوال پاک جاننے کا اُن کو پہچاننے کا نام علم ہے
ہمارا پیشاب پاخانہ ناپاک حضور علیہ السلام کی یہ تمام چیزیں اُمت کے لیے پاک (شامی جلد اوّل) ہماری نیند وضو توڑ دے اُن کی نیند حضور نہ توڑے۔ ہم سب سنکر جنت و دوزخ ذات
وصفات پر ایمان لائے ہمارا ایمان سُنا ہوا۔ حضور علیہ السلام دیکھ کر، ہم سب پر پانچ نمازیں فرض، حضور پر چھ، تہجد بھی وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ یعنی رات میں آپ
تہجد پڑھئے یہ نماز آپ کے لئے زیادہ ہے۔ سب کے لیئے اسلام کے ارکان پانچ اور حضور علیہ السلام کے لیئے صرف چار یعنی زکوٰۃ فرض نہیں (شامی کتاب الزکوٰۃ)
ہم کو چار بیویاں نکاح میں رکھنا جائز مگر حضور جس قدر چاہیں حلال۔ ہمارا مال میراث میں تقسیم ہو حضور کا نہ ہو، ہماری بیویاں ہماری موت کے بعد جس سے چاہیں نکاح
کرلیں، حضور کی ازواج پاک بعد وفات کسی کے نکاح میں نہیں آسکتیں، رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ اَبَدًا۔ غرضکہ بیشمار فرق ہیں
عبادات میں بھی اور معاملات میں بھی پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہم حضور جیسے بشر ہیں،
شہداء سے وہ معبود مراد ہیں جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے۔ اس میں اظہار ہے کہ قرآن پاک کی مثل نہ تم بنا سکتے ہو نہ وہ جنہیں تم اپنے اعتقاد باطل میں معبود سمجھتے

تو اس کا کتاب الٰہی ہونا یقینی طور پر ثابت ہو گیا۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جو اس کا مثل بنا لانے سے عاجز ہے وہ مستحق عبادت نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی کہ حضور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم برگر خدا کے رسول نہوتے تو جو کتاب وہ لائے اسکا مثل بنانے سے تمام دُنیا کے اصحاب فضل وعلم عاجز نہ ہو جاتے۔

فان لم تفعلوا جب وہ قرآن پاک کی مثل ایک چھوٹی سی عبارت بنا کر بھی نہ لا سکے اور ان کا عجز ظاہر ہو گیا تو اب واجب ہو گیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کریں اس لیے فرمایا جاتا ہے کہ جب تم عاجز رہے اور اسی طرح آئندہ بھی عاجز رہو گے تو ایمان لاؤ اور عذاب الٰہی کا خوف کرو جو مکذبین ومعاندین کے لیے ہے اس آیت میں اثبات نبوت پر دو دلیلیں ہیں ایک تو قرآن پاک کا معجز ہونا اور طاقت بشری کا مثل قرآن بنانے سے عاجز ہونا دوسری غیب کی خبر جس کو لن تفعلوا کے پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ ہرگز اس کتاب کا مثل نہ بنا سکو گے۔ قرن گزر گئے اور اس خبر کا صدق روز بروز واضح تر ہوتا گیا اس پر بھی اس کتاب کا انکار کمال عناد اور موجب نار ہے اس لیے فرمایا گیا کہ حق ظاہر ہو جانے کے بعد بھی انکار کرتے ہو تو ڈرو اس آگ سے جسکا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ پتھر میں بت بھی آ گئے جن کی وہ لوگ پرستش کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ امیدیں رکھتے تھے ان کے ساتھ انہیں بھی جہنم میں ڈال کر ان کی ذلت وتکلیف انتہا کو پہنچا دی جائے گی۔

مسئلہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیب کی خبر دینا بھی دلائل نبوت میں سے ہے اعدت للکافرین۔ مسئلہ اس آیت سے ثابت ہے کہ جہنم پیدا کر دی گئی اور موجود ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

اور خوشخبری دے انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ

جب انہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا صورت دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا اور وہ صورت

مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

میں ملتا جلتا انہیں دیا گیا اور ان کے لئے ان باغوں میں ستھری بیبیاں ہیں۔ اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے

قرآن پاک کے ظہور اعجاز کے بعد دو گروہ تھے ایک وہ جس نے اسقدر وضوح حق کے بعد بھی ضد اور ہٹ کی اور عناداً انکار کیا اس کے لیے تو اوپر کی آیت میں ارشاد ہوا فاتقوا النار التی الآیہ دوسرا وہ سعادتمند گروہ جو ایمان سے مشرف ہوا اور اس نے فرمانبرداری کے لیے سر نیاز جھکایا اس کے حق میں ارشاد ہے وبشر الذین آمنوا الآیہ صالحات سے وہ اعمال مراد ہیں جن کو شریعت میں مستحق قرار دیا گیا علماء نے فرمایا عمل صالح وہ ہے جس میں چار چیزیں ہوں علم نیت صبر اخلاص۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عمل صالح کی تفسیر عمل خالص سے فرمائی جس میں ریا نہ ہو۔ عمل صالح کو ایمان پر مرتب فرمانے میں اشارہ ہے کہ ایمان بمنزلہ اساس وبنیاد کے ہے اور عمل صالح بجائے عمارت وبنا کے جس طرح عمارت بے بنیاد معرض تلف وہلاک میں ہے اسی طرح عمل نیک بغیر ایمان کے بیکار اور رائیگاں اور جس طرح فائدہ تامہ کا حصول اس عمارت پر موقوف ہے جو مضبوط ومستحکم بنیاد پر تعمیر کی گئی ہو اسی طرح پوری کامیابی اور کامل نفع اسی میں ہے کہ ایمان وعمل صالح دونوں ہوں۔

جنت دار الثواب کا نام ہے جہاں نیکوں کو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے دائمی راحتیں اور نعمتیں عطا فرمائیگا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا جنتیں سات ہیں جنت الفردوس جنت عدن جنت النعیم دار الخلد جنت الماویٰ دار السلام علیین، ہر ایک میں بہت سے درجے اور مراتب ہیں۔ یہ جنتیں بھی پیدا کر دی گئیں اور موجود ہیں جیسا کہ آیہ اسکن انت وزوجک الجنۃ سے ظاہر ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جنت کی نہریں ہموار سطح پر جاری ہونگی دُنیا کی نہروں کی طرح غار اور نشیب کی حاجت نہیں جنتی اطعمہ صورت میں ایک دوسرے کے یا دنیوی اطعمہ کے مشابہ ہونگے لیکن ذائقہ اور مزا سب کا جُدا گانہ ہو گا دیکھنے سے معلوم ہو گا یہ وہی چیز ہے جو ہمیں پہلے مل چکی ہے لیکن کھانے سے معلوم ہو گا کہ یہ نئی ہی چیز ہے۔ جنت میں کھانا پینا ہو گا۔ بول براز تھوک کھکار کچھ نہ آئے گا بدن سے خوشبوئیں مہکتی ہونگی جنتی بی بیاں تمام نجاستوں اور زنانے عارضوں اور بری خصلتوں اور بدمزاجیوں سے پاک ہوں گی ان کے حُسن کا یہ عالم ہو گا کہ اُن کی ساق وپنڈلی کا مغز گوشت کے باہر سے نظر آتا ہو گا۔ اہل جنت میں اختلاف وبغض بالکل نہو گا سب ایک دل ہونگے مومن کو جنت میں ایک موتی کا خیمہ عطا ہو گا جس کا طول ساٹھ میل ہو گا۔ جنت کی عمارت چاندی سونے کی اینٹوں سے بنی ہوگی جنت میں نہ بیماری ہو گی نہ تکلیف نہ موت نہ وہاں کا لباس پرانا ہو گا نہ شباب میں تغیر آئیگا۔ اُس میں اہل جنت کو خلود ودوام حاصل ہو گا نہ خود ان کو موت وہلاک کا خطرہ ہو گا نہ نعمت کے زوال کا اندیشہ تک باقی ہے نعمت غیر فانی سے ہمیشہ لُطف اندوز رہیں گے اور حقیقی سرور حاصل ہو گا۔ درحقیقت جب تک بقاء دوام اور نعمت مخلد کا انعام نہ ہو بڑی سے بڑی نعمت کو بھی اندیشۂ زوال وانتقال منغص ومکدر کر دیتا ہے اور جب فنا وہلاک کا نقشہ نظر کے سامنے کھینچتا ہے تو تمام لذات بمزہ ہو جاتی ہیں اور سرور کامل حاصل نہیں ہوتا۔ اس کریم کے قربان جو اپنے فرمانبردار بندوں کو ابدی نعمت سے سرفراز فرمائے۔ اللّٰھم ارزقنا النعیم الدائم

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔ تو وہ جو ایمان لائے وہ تو

فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے رہے کافر وہ کہتے ہیں ایسی کہاوت میں خدا کا کیا مقصود ہے

مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

اللہ بہتیروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہتیروں کو اس سے ہدایت فرماتا ہے اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں

شانِ نزول منافقین کی تمثیلیں جو اوپر بیان فرمائی گئیں اور ان کے علاوہ اور مثالیں جو قرآن پاک میں وارد ہوئیں جیسے مکھی اور مکڑی کی مثال تو کفار نے اعتراض کیئے کہ خدا کی شان کے لائق نہیں ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تمثیلیں بیان کرے اس اعتراض سے مقصد قرآن پاک کا انکار تھا کہ اگر وہ کتاب الٰہی ہوتا تو اُس میں ایسی حقیر چیزوں کی مثالیں نہوتیں اُن کے دفع اعتراض اور اُن کی جہالت کے لیئے یہ آیت نازل ہوئی اور قرآن پاک کے کتاب الٰہی ہونے کو تحدی و اعجاز بے مثالی سے ثابت کرنے کے بعد کفار کے شبہے کا رد و جواب نہایت ہی برمحل ہے یہاں اُن کی حالت کو واضح کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی نادانی سے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مثال مثال دینے والے کی شان کے لائق ہونی چاہیئے یہ انتہا درجہ کی جہالت و بد عقلی ہے۔ اور ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو مثال کے مقصد و غرض سے ناآشنا اور حکمت سخنگوئی سے بالکل نابلد ہو مثال ممثل یعنی مثال بیان کرنے والے کے اظہار شان کے لیے نہیں ہوتی بلکہ مقصود ممثل لہ یعنی اس چیز کو اچھی طرح سامع کے ذہن نشین و خاطر گزین کرنا ہوتا ہے جس کی تفہیم کے لیئے مثال ذہن نشین بیان کی جاتی ہے لہذا اُسکو ممثل لہ سے کمال مناسبت رکھنی چاہیئے جس کی وہ مثال ہے لہذا نفاق و بت پرستی وغیرہ کی مثالیں ایسی ہی بیان کرنا قرین حکمت ہے جن سے ان عیوب کی حقیقت ظاہر ہو۔ یہ تو کوئی نادان بھی نہ کہے گا کہ نفاق جیسے کمینہ عیب اور بُت پرستی جیسی ذلیل و شرمناک قباحت کی تمثیل کسی عمدہ چیز سے دیجائے اور اگر کوئی نادان ایسا کرے تو مثال ممثل لہ کے مطابق نہ رہے گی اور کلام مرتبہ فصاحت سے گر جائے گا کلام الٰہی کی یہ شان نہیں لہذا تمثیلات مذکورہ نہایت برمحل اور عین حکمت ہیں۔

فاما الذین امنوا۔ اس میں بیان ہے کہ مومنین کو عقل و انصاف سے کام لینے کی عادت ہے وہ ایسی پُرحکمت تمثیل سُنکر جان لیتے ہیں کہ حق ہے اور اس کو مان لیتے ہیں یہ ان کی ہدایت کا سبب ہوتا ہے اور کفار کی عقلوں پر جہالت کے پردے پڑے ہیں مکابرہ و عناد انکا شیوہ ہے حق کا انکار ان کی عادت ہے اور یہی ان کی گمراہی کا باعث ہے۔

یضل بہ کثیرا و یھدی بہ کثیرا۔ یہ ماذا کا جواب ہے یعنی بہتوں کا اضلال اور بہتوں کی ہدایت مقصود ہے ایک ہی چیز بہت سے لوگوں کے لیئے باعث ضلالت و گمراہی ہوتی ہے۔ اور وہی بہتوں کے لئے ذریعہ رشد و ہدایت جس طرح ایک ہی نفیس غذا مریضوں کے لیئے باعث تکلیف و ازدیاد مرض ہوتی ہے اور تندرستوں کے لیئے باعث راحت و قوت اسی طرح اس تمثیل کے حق ہونیکا علم ہدایت و راہ یابی ہے۔ اور اس کے حسن و خوبی سے ناآشنا ہو کہ زبان طعن کھولنا فسق و گمراہی۔

وما یضل بہ۔ فاسق شرع میں نافرمان کو کہتے ہیں جو کبیرہ کا ارتکاب کرے۔ فاسق کے تین درجے ہیں۔ ایک وہ جو گاہ گاہ کبیرہ کا ارتکاب کرے اور اس کو بُرا جانتا ہو۔ دوسرا وہ جو کبائر میں غرق رہے اور ان کا عادی ہو اور اس کو ارتکاب کبیرہ میں کچھ باک نہ ہو۔ تیسرا وہ جو کبائر کا ارتکاب کرے اور اس کو بُرا بھی نہ جانے بلکہ بہتر سمجھے یہ کافر خارج از اسلام ہے یہاں اسی قسم کے فاسقین کا بیان ہے جیسا کہ آیت کریمہ ان المنافقین ھم الفاسقون میں بیان فرمایا گیا۔ اضلال کو صفت فسق پر مرتب فرمایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ یہ فسق ہی اُن کے ضلال کا باعث ہے کیونکہ جب کوئی حکم کسی وصف پر مرتب کیا جاتا ہے تو وہ وصف اس حکم کے لیئے باعث ہوتا ہے مثلاً یہ کہہ دینا کہ کریم کا اکرام کرو اسبات پر دلالت کرتا ہے کہ وصف کرم باعث اکرام ہے یا یہ کہنا کہ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں یہ معنی رکھتا ہے کہ قطع ید کی علت وصف سرقہ ہے اسی طرح اضلال کا یہاں صفت فسق پر ترتب دلالت کرتا ہے کہ باعث اضلال فسق و نافرمانی ہے اور یہ بات بالکل حق ہے کیونکہ ان کا کفر اور حق سے عدول اور باطل پر اصرار ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے ان کی فکر کا رُخ مثال کی طرف سے پھیر کر ممثل بہ کی حقارت کی طرف کر دیا اور اس سے اُن کی جہالت اور زیادہ راسخ ہو گئی اور ضلالت بڑھ گئی اور وہ ان کا رد استہزاء کے ساتھ پیش آئے اور کلام حق کے ساتھ تمسخر کرنے لگے اس تمام کا باعث وہی فسق و نافرمانی۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ

وہ جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں۔ پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا اور

يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ وہی نقصان میں ہیں

یہ فاسقین کی صفت اور ان کے فسق کا بیان ہے عہد پیمان موثق و محکم کو کہتے ہیں اور نقض عہد سے پیمان شکنی مُراد ہے یہاں جس عہد کے توڑنے کا بیان ہے۔ اس میں مفسرین کے چند قول ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کا مکلفین کو عقل و شعور عطا فرمانا ان پر ایک حجت قائمہ اور عہد ہے کہ وہ دلائل توحید و وجوب وجود اور تصدیق مرسلین میں نظر کریں اور عقل اس کا ادراک کرنے کے لیئے کافی ہے پھر رسولوں کا مبعوث فرمانا کتابوں کا نازل کرنا معجزات کا اظہار اس عہد کو اور موکد و موثق کر دیتا ہے اور یہ معنی بھی اس آیت سے اخذ کئے گئے ہیں واشھد ھم علی انفسھم یا وہ عہد مُراد ہے جو اُمتوں سے رسولوں کے متعلق لیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ ان کی طرف ایسے رسولوں کو مبعوث فرمائے جن کے ساتھ ان کی تصدیق کرنے والے معجزات ہوں تو یہ سب اُن رسولوں کی تصدیق کریں اور اُن کے فرمانبردار رہیں اور اُن کی شان کو نہ چھپائیں اور اُن کے حکم کی مخالفت نکریں آیہ واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب میں اس عہد کی طرف اشارہ ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ مخلوق کی طرف اللہ کے تین عہد ہیں پہلا عہد وہ جو اللہ تعالےٰ نے تمام اولاد آدم سے اُس کی ربوبیت کے اقرار پر لیا جس پر آیہ واذ اخذ ربک من بنی آدم دلالت کرتی ہے دوسرا عہد وہ جو انبیاء کے ساتھ خاص ہے کہ رسالت کی تبلیغ کریں اور دین حق کی اقامت فرمائیں اس پر آیہ واذ اخذنا من النبیین میثاقھم وال ہے۔ تیسرا عہد وہ ہے جو علماء کے ساتھ خاص ہے اور جس کا بیان آیہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ میں ہے **ایک قول** یہ ہے کہ پہلا عہد وہ ہے جو روز میثاق لیا گیا اور جس کی نسبت ارشاد ہوا الست بربکم دوسرا وہ عہد ہے جو توراۃ میں علماء یہود سے لیا گیا کہ وہ حضور انور سید ہر دو سرکار عالی وقار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور آپ کی نعت و صفت کو بیان کریں، تیسرا عہد وہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے اپنی توحید پر دلالت کرنے والی آیات کا بیان فرما کر اپنی کتاب مقدس میں محکم کیا اور کفار و منافقین نے اُس کو توڑا۔

وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (اور کاٹتے ہیں اُس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا) اس میں ہر قطیعہ آگیا جو اللہ تعالےٰ کو ناپسند ہے خواہ وہ قطع رحم اور اقارب کا ہجران یا موالات مومنین کا ترک ہو یا انبیاء علیہم السلام اور کتب الٰہیہ میں تفرقہ کرنا بعض کو ماننا اور بعض سے منکر ہو جانا

جیسا یہود نے کیا۔ اسی طرح غرض جماعتوں کا ترک اور تمام وہ چیزیں جن سے خیر کا چھوڑنا اور بدی کا اختیار کرنا لازم آتا ہو کیونکہ یہ بھی اللہ اور بندے کے درمیان رابطہ نیازمندی کے قطع کا سبب ہے اور یہی رابطہ مقصود بالذات ہے۔

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ۔ اور فساد پھیلاتے ہیں زمین میں۔ رہزنی وغیرہ معاصی اور خلق خدا کو ایمان لانے سے روکنا حق کے ساتھ استہزاء و تمسخر کرنا اور اس وصل کو قطع کرنا فساد ہے جس کے ساتھ عالم کا نظام اور اس کی صلاح متعلق ہے قتل جو اصلاح کے لئے ہو وہ فساد نہیں جیسا کہ قصاص میں جان کے عوض جان لینا اور اتحاد اگر بدی کے لیئے ہو تو فساد ہے جیسا کہ ایک جماعت کا چوری ہاڑا کہ زنی کے لیے متحد ہو جانا اور اس سے بدرجہا بدتر ہے کفار کے ساتھ اتحاد جس کی بدولت خلاف اسلام امور پر صبر کرنا اور انپر راضی ہونا پڑتا ہے قرآن کریم میں اس اتحاد کی ممانعت جابجا فرمائی گئی ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ وہی نقصان میں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے وفا کی جگہ نقص و بدعہدی اور وصل کی جگہ قطع اور صلح کی جگہ فساد اور ثواب کی جگہ عذاب اختیار کیا اور خدا کی عطا فرمائی ہوئی عقل کو معطل کر دیا اس سے کام نہ لیا اور ایمانی اعمال صالحہ کا پتہ نہ لگایا جو حیات ابدیہ کا ذریعہ ہیں اسی طرح اللہ تعالےٰ کی عطا فرمائی ہوئی کتاب قرآن کریم پر ایمان نہ لائے۔ اور آیات اور ان کے حقائق میں نظر نہ کی اور انکی نورانیت سے فائدہ نہ اٹھایا کہ دل منور ہو جاتے بلکہ بجائے اس کے طعن و انکار کی جاہلانہ راہ چلے اور ان خداداد نعمتوں سے محروم رہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

بھلا تم کیوں کر خدا کے منکر ہو گئے حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے

دلائل توحید و نبوت اور جزائے کفر و ایمان کے بعد اللہ تعالےٰ نے اپنی عام و خاص نعمتوں کا اور آثار قدرت و عجائب حکمت کا ذکر فرمایا اور قباحت کفر دلنشیں کرنے کے لیئے کفار کو خطاب فرمایا کہ تم کس طرح خدا کے منکر ہوتے ہو باوجودیکہ تمہارا اپنا حال اس پر ایمان لانے کا مقتضی ہے کہ تم مردہ تھے مردہ سے جسم بیجان مراد ہے ہمارے عرف میں بھی بولتے ہیں زمین مردہ ہو گئی عرب میں بھی موت اس معنیٰ میں آتی خود قرآن پاک میں ارشاد ہوا یحیی الارض بعد موتھا تو مطلب یہ ہے کہ تم بے جان جسم تھے عنصر کی صورت میں پھر غذا کی شکل میں پھر اخلاط کی شان میں پھر نطفے کی حالت میں اس نے تم کو جان دی زندہ فرمایا پھر عمر کی میعاد پوری ہونے پہ تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ اس سے یا قبر کی زندگی مراد ہے جو سوال کے لیئے ہوگی یا حشر کی پھر تم حساب و جزا کے لیئے اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے اپنے اس حال کو جان کر تمہارا کفر کرنا نہایت عجیب ہے۔

انسان کو خدا تعالیٰ نے تین نعمتیں ایسی عطا فرمائیں جن سے وہ عالم میں تصرف کرتا ہے نیکی یا بدی کا کسب کر سکتا ہے مستحق مدح یا ذم ہوتا ہے۔ یہ تین چیزیں دل۔ زبان جوارح ہیں **دل** تو قصد و نیت کا مبداء ہے نیک یا بدارادہ یہیں پیدا ہوتا ہے **زبان** اظہار کا آلہ ہے ہزارہا امور اس کے اقرار و انکار پر موقوف ہوتے ہیں تمام عقود و معاملات اس کی جنبش پر طے ہوا کرتے ہیں **جوارح** افعال ظاہرہ کے آلات ہیں۔ یہ تینوں کبھی تو موافق ہوتے ہیں کہ دل میں جو قصد ہوتا ہے زبان اس کی صحیح ترجمانی کرتی ہے اور افعال ظاہر اسی کی موافقت میں صادر ہوتے ہیں مثلاً زید کے دل میں بکر کی محبت ہے زبان بھی اسکا اظہار کرتی ہے اور جوارح سے بھی وہ اس کے آرام و آسائش کے کام انجام دیتا ہے تو یہاں دل زبان اور جوارح سب مطابق ہیں لیکن کبھی انمیں خلاف ہوتا ہے اور اختلاف کبھی جوارح اور زبان میں ہوتا ہے۔ کبھی زبان و قلب میں کبھی سب میں اس کی بہت صورتیں ہیں۔ زید بکر کا معتقد ہے دل میں اس کی عظمت رکھتا ہے زبان سے اُس کی تعریف کرتا ہے مگر اپنی سستی و کاہلی سے اداء خدمت میں قاصر رہتا ہے دل اور زبان تو موافق ہیں مگر جوارح نے ساتھ نہیں دیا یہی حال مومن بے عمل کا ہے دل حضرت رب العزت تبارک و تعالیٰ کی عزت و کبریائی کا معتقد ہے اُس کی توحید و ربوبیت کا گرویدہ ہے زبان سے اُس کا اعتراف کرتا ہے مگر عمل نہیں اس کے علاوہ ایک صورت یہ ہے کہ عمل اور زبان دونوں یا ان میں سے ایک تو کسی کی موافقت کا اظہار کریں مگر دل میں اُس کی طرف سے عناد و کینہ ہو ظاہر داری کا ملنا ملتے ہیں محبت کی رسمیں برتتے ہیں اور دل دشمنی سے بھرا ہوا ہے یا فقط زبان سے موافقت کا اظہار ہے اور عمل و قلب دونوں خلاف یا فقط عمل سے موافقت ہے اور زبان کبھی موافق رہتی ہے کبھی مخالفت کرتی ہے یہ تمام احوال منافقین میں پائے جاتے ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ دل بھی خلاف زبان بھی خلاف عمل بھی خلاف۔ یہ کھلے کافروں کا حال ہے جنکا اوپر کی آیات میں ذکر فرمایا گیا۔ جب اللہ تعالےٰ نے اُن کا حال بیان فرمایا کہ اُن کا باطن نجاست کفر سے آلودہ ہے اور ان کی زبان طعن و انکار میں مشغول ہے اور اُن کے افعال قبیح ہیں اور دل و زبان و جوارح سب کے سب خبث میں گرفتار ہیں تو اب اُن کی طرف بطریق التفات خطاب فرمایا اور ان کو اُن کے کفر پر توبیخ فرمائی اور ایک عجیب جملہ کیف تکفرون کا فرمایا اُن کو تعجب دلایا کہ تمہارا کفر نہایت عجیب بات ہے اگر تم اپنے حال پر نظر رکھو اور اپنے ہی آپ کو دیکھو تو تمہیں اپنے میں اللہ تعالےٰ کی قدرت و حکمت کے بیشمار شواہد موجود ملتے ہیں جن میں سے ہر ایک مقتضی ہے کہ تم اپنے رب کے حضور گردن نیاز جھکاؤ اور سر طاعت خم کرو اور اخلاص کے ساتھ جبین فرمانبرداری خاک عجز پر رکھو جب تمہارے حالات اس کے متقاضی ہیں اور قدرت الٰہی کے مناظر پیاپے تمہاری نظر کے سامنے آ رہے ہیں اور اس کی قدرت کے حکیمانہ اثر خود تم پر پیہم وارد ہو رہے ہیں اس حال میں تمہارا کفر کرنا اور اپنے پروردگار سے نافرمانی کرنا نہایت عجیب بات ہے۔ اب اُن حالات کا بیان فرماتا ہے کنتم امواتا فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون حالانکہ تم مردہ تھے اُس نے تم کو زندہ کیا پھر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اُس کی طرف پلٹ جاؤ گے اموات سے یہاں بیجان مراد ہیں اور اس سے اُن حالات کی طرف اشارہ منظور ہے جو جسم اور جان کے تعلق سے قبل گذر چکے ہیں کہ ایک وقت میں عناصر بسیطہ کی شکل میں تھے پھر اُن تغیرات ہوئے اور ایسی شکل میں آئے جو قابل غذا ہو پھر خلط کی شکل قبول کی اس کے بعد نطفہ کی پھر مضغہ کی مصور و غیر مصور صورتیں وارد ہوتی رہیں فاحیاکم پھر ماں کے پیٹ ہی میں اللہ تعالےٰ نے تمہیں زندگی عطا فرمائی جان دی اُس مضغہ گوشت میں روح ڈالی دنیا میں جاندار بنا کر پیدا کیا ثم یمیتکم پھر عمر گذرنے کے بعد تمہیں موت دیگا ثم یحییکم موت کے بعد پھر تمہیں زندہ فرمائیگا پھر تم اُس کی طرف پلٹ جاؤ گے ثم یحییکم میں قبر کے اندر زندہ کیئے جانے پر دلالت ہے اور الیہ ترجعون میں حشر و جزا پر تو گویا مدعا یہ ہے کہ قبروں میں تم کو سوال کے لیئے اور حشر میں تم کو حساب کے لیے اٹھایا جائے گا اور تمہارے اعمال کی تم کو جزا دے گا۔ جب تمہارے یہ حال ہیں اور تم خود معائنہ کر رہے ہو کہ یہ کیفیات تم پر وارد ہو رہی ہیں اور یہ نعمتیں متواتر تم کو پہنچ رہی ہیں ایسے حال میں شکر گزار ہونے اور سر جھکانے کی بجائے تمہارا کافر ہو جانا نہایت تعجب اور کمال بدنصیبی اور بہت قبیح ترین معصیت ہے۔ آیہ کیف تکفرون میں مفسرین کا ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ خطاب مومنین کو بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں احسان الٰہی پہ باخبر بنایا جائے اور کفر سے اُن کی تبعید فرمائی جائے اس صورت میں معنی یہ ہونگے

کہ اے مومنین تم سے کفر کیسے متصور ہو جبکہ حالات یہ ہیں کہ کنتم امواتاً تم مُردہ تھے اور مُردہ سے مُراد یہاں بیجان نہیں بلکہ بے علم ہے کیونکہ علم بھی ایک طرح کی حیات ہے اور اُسی پر زندگانی کا اطلاق کیا جاتا ہے جیساکہ موت کا اطلاق بے علمی و بے شعوری پر ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے ؎

زندہ اُسے کہئیے کہ جو ہو واقف و ماہر ÷ کیا جیتا ہے وہ جو کہ خبردار نہیں ہے

قرآن حکیم میں حضرت حق تبارک وتعالےٰ نے ارشاد فرمایا اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ ۔اس آیت میں موت وحیات سے یہی معنی مجازی مراد ہیں اسی معنی پر مومنین کو خطاب ہو رہا ہے کہ تمہارا سابق حال یہ تھا کہ تم پر بے علمی و بے خبری کی ایک موت طاری تھی اللہ تعالےٰ نے تم کو علم و ایمان عطا فر اکر ایک حیات مرحمت فرمائی اس کے بعد تم پر موت معروف وارد فرمائے گا او سِاس حیات ظاہری کا خاتمہ ہو جائے گا پھر دوسری مرتبہ تم کو حیات حقیقی عطا فرمائیگا پھر تم اُسی کی طرف رجوع کرو گے تو ایسی جزائیں عطا فرمائے گا کہ نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں نہ دل میں گزریں اور حقیقت میں یہ قرآن پاک کا ایک اعجاز اور فصاحت کا ایک عجیب نمونہ ہے کہ کفار و مومنین کا حال متخالف و متباین ہے ۔ان دونوں میں زمین و آسمان دونوں سے زیادہ کا فرق ہے ۔ایک جملہ ایسا ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ کافر سُنے تو اُسے اپنے حال کے موافق معلوم ہو اور اُس میں اُس کے لئے ہدایت ہو اُس کے کفر و انکار پر زجر و توبیخ ہو مومن اُس جملہ میں نظر کرے تو اس کو روئے خطاب اپنی طرف معلوم ہو اُس کے ایمان پر مدح ہو کفر کے عدم تصور کا بیان ہو اُس کے حق میں بشارتیں ہوں کیسی عجیب بات ہے سبحان اللہ۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ق ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ

وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے ۔ پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات

سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○

آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے

یہ دوسری نعمتوں کا بیان ہے جو پہلی پر مرتب ہیں پہلی میں حیات عطا فرمانے کا ذکر تھا ۔اس دوسری میں ان نعمتوں کا بیان ہے جن سے زندگانی کے حوائج پورے ہوتے ہیں اور معیشت تام وکامل ہوتی ہے اور دینی و دنیوی منافع حاصل ہوتے ہیں ۔مُراد یہ ہے کہ تم کس طرح کافر اور خُدا کے منکر ہو جبکہ اس نے تمہیں حیات بخشی پھر زندگانی کے حوائج کا اس فیاضی سے سرانجام فرمایا کہ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (زمین کی تمام کائنات تمہارے نفع کے لئے پیدا کی) خواہ وہ معاون یعنی سونے چاندی جواہرات وغیرہ کی کانیں ہوں یا مختلف قسم کے چشمے یا زمین سے اُگنے والے نباتات ہوں یا اس پر بسنے اور اس میں رہنے والے حیوانات ۔اونچے پہاڑ ہوں یا گہرے غار جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے نفع کے لئے ہے اس تمام سے دنیوی نفع بھی اٹھاتے ہو ہر طرح کا آرام پاتے ہو اور اخروی نفع بھی کہ اس نظام محکم میں نظر کرنا اور یہاں کے عجائبات کا مشاہدہ کرنا تمہیں حضرت آفریدگار عزوعلا کے صنعت و قدرت علم و حکمت کمال و یکتائی کا یقین دلاتا ہے اور عالم کے تغیرات میں اسکا دست قدرت کارکن نظر آتا ہے ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ پھر آسمان کی طرف (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے نعمتوں کے سلسلہ بیان میں اُس کی قدرت کاملہ و حکمت بالغہ کا اظہار بھی ہو گیا کہ وہ ایسا قادر عظیم القدرت ہے کہ بیجانوں کو جان عطا فرماتا ہے اور اُن کی زندگی اُسی کے دست قدرت میں ہے اُن کے تمام حوائج زندگی اور جملہ ضروریات اور کل منافع کو پیدا فرماتا ہے ۔زمین اور اُس کی تمام کائنات اور عالم سماوات سب اسکا بنایا ہوا ہے تو ضرور ہے کہ وہ تمام اشیاء کی کنہ کا عالم ہو کیونکہ مخلوقات کو اس ترتیب عجیب شان غریب کے ساتھ پیدا فرمانا اُس کے کمال علم پر دلالت کرتا ہے تو گویا بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ایک نتیجہ ہے جو مقدمات مذکورۂ بالا سے لازم آتا ہے اس میں طریقہ نظر کی تعلیم ہے کہ طالب کو مخلوقات میں نظر کر کے اسطرح نتیجہ پر پہنچنا چاہیئے اور مخلوق کی ندرت و غرابت سے صانع کے علم و حکمت تک رسائی حاصل کرنا چاہیئے ۔اوپر کی آیت میں ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ فرما کر معاد کے متعلق کفار کے باطل عقیدوں کا ابطال فرمادیا تھا کہ تناسخ کے چکر میں پھنس کر علی الدوام مختلف قالبوں میں دھکے کھانے کا اعتقاد ہی باطل ہے ۔تمہیں آخر کار اُس کی طرف رجوع کرنا ہے اسی طرح دوسرے کفار کا یہ خیال کہ ہماری ہستی کا قصہ اِسی حیات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد نہ کوئی زندگی ہے نہ پرسش اِس کا بھی اس آیت میں ابطال فرمادیا کہ تمہارا یہ خیال غلط و باطل ہے جس نے پیدا کیا احسان فرمائے بے شمار نعمتیں عطا کیں تم پر اُس کی طاعت فرض تھی ۔تمہارا انجام یہی ہے کہ تم اُس کی طرف رجوع کرو اور تم سے جزا کے لئے اعمال کا حساب ہو لیکن چونکہ ان کفار کے اوہام انہیں حشر کی نسبت تردد میں ڈالتے تھے اور وہ اپنی خام خیالی وقصور نظر سے یہ سمجھتے تھے کہ جب بدن کا نظام درہم برہم ہو گیا اور اجزاء منتشر ہو گئے اور ہر قسم کے اجزاء اپنے مشاکل سے جا ملے مٹی مٹی سے اور پانی پانی سے تو اب دوبارہ ان تمام اجزاء کا جمع کرنا کیونکر ممکن ہے اُس اختلاف کو وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کے جملہ جمیلہ نے دفع فرما دیا ۔اور ایک بُرہان قائم فرما دی کہ حشر اجساد کے لئے تین مقدمے ہیں پہلا تو یہ کہ ابدان کے مواد بالذات جمع وحیات کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ لیاقت اُن میں موجود ہے کنتم امواتاً فاحیاکم ثم یمیتکم میں اس کیطرف اشارہ ہے کہ افتراق و اجتماع و موت وحیات کا تعاقب و توارد اس کی دلیل ہے کہ یہ مواد اس کی بالذات قابلیت رکھتے ہیں اور ما بالذات کا تغیر و زوال عقلاً ناممکن و محال تو ضرور ہی یہ قابلیت اُن میں ہمیشہ باقی رہے گی کہ جب جمع کرنے والا اُنہیں جمع کرے ۔جمع ہو جائیں اور جب اُن سے حیات متعلق فرمائے تو وہ جی زندہ ہو جائیں ۔دوسری بات یہ ہے کہ حشر کرنے اور دوسری حیات عطا فرمانے والا اُن کا علم رکھتا ہو اور اُسے ہر ذرہ کی نسبت معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے اس کو بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ نے بیان فرمادیا تیسری بات یہ ہے کہ وہ ان مواد کی جمع و احیاء پر قادر ہو تو قدرت پہلی ہی آفرینش سے ظاہر ہو گئی جب یہ تینوں باتیں موجود ہیں وہ عالم بھی ہے ایک ایک ذرہ کو جانتا ہے کہ کہاں ہے ۔قادر بھی ہے ہر ذرہ کو جمع کر سکتا ہے ۔حیات دے سکتا ہے ان مواد میں قابلیت بھی ہے تو پھر صحت حشر میں کیا تردد ہے ۔ان آیات میں مضامین مذکورہ کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی کافی روشنی پڑ گئی کہ افضل المخلوق انسان اور اُس کے سوا زمین اور اُس کی تمام کائنات اور آسمان اور تمام سماوی اجرام سب کا خالق اللہ ہے اور یہ سب مخلوق ہیں تو اب چاند ہو یا سورج دیا ہو یا پہاڑ جاندار ہو یا بیجان کوئی اس کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس کی پرستش کی جائے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ کی تفسیر میں صاحب تفسیر مظہری قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر سلف صالحین نے تو یہ تفسیر فرمائی ہے کہ پھر آسمان کی طرف صعود فرمایا۔ اس تفسیر پر یہ آیت مثل اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (رحمٰن عرش پہ قائم ہوا) کے متشابہات میں سے ہوگی۔ ابن کیسان اور فراء اور نحویوں کی ایک جماعت کا میلان اس طرف ہے کہ استواء کے یہ معنے ہیں کہ آسمان پیدا کرنے پر توجہ و قصد کیا۔" کہتے ہیں کہ استوا بمعنی قصد عرب کے قول استوی الیھم کالسھم المرسل سے مشتق ہے اور یہ اُس وقت بولتے ہیں کہ جب سیدھ باندھ کر بغیر کسی دوسری طرف کی توجہ کے کسی سے کا قصد کیا ہو۔ بیضاوی نے کہا ہے کہ ثم استوی میں کلمۂ ثم (پھر) لانے کی دو وجہ ہو سکتی ہیں اول یہ کہ زمین اور اس کی کل چیزیں پیدا کرنے اور آسمان کے پیدا کرنے میں مدت فاصل ہو دوسری وجہ یہ کہ یہ بات ظاہر فرمائی ہے کہ آسمان کو زمین پر شرف وفضیلت ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر بھی کلمۂ ثم اسی لئے تراخی کے لئے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ فرمایا ہے ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ اور یہ دوسری وجہ اقرب الی الصواب ہے کیونکہ اگر مدت فاصل ہونے کی وجہ سے ثم ہو تو بظاہر دوسری آیت سے تعارض لازم آتا ہے اور وہ آیت یہ ہے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا (یعنی زمین کو آسمان وغیرہ بنانے کے بعد بچھا دیا) تو یہ آیت صاف بول رہی ہے کہ زمین کا بچھانا آسمان کے پیدا کرنے اور اُس کے برابر کرنے کے بعد واقع ہوا ہے (اور جب زمین کا درست کرنا اور بچھانا آسمان کے بعد ہوا ہے تو زمین کی اشیاء ظاہر ہے کہ بطریق اولےٰ آسمان کے بعد ہوں اور جب آسمان کے بعد ہوئیں تو کلمۂ ثُمَّ کا لانا کس طرح درست ہوگا) علامہ بغوی نے آیہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول زمین کو مع غلوں وغیرہ کے جو اس کے اندر ہیں پیدا فرمایا مگر اُسے بچھایا نہیں۔ پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی تو سات آسمان برابر بنائے پھر اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ بعض نے کہا ہے کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا کے یہ معنی ہیں کہ آسمان کے پیدا کرنے کے ساتھ ہی زمین کو بچھا دیا اور لفظ بعد بمعنی مع ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ ط (یعنی بدخو ہے اور اس سب کے ساتھ بداصل بھی ہے) یہاں بھی لفظ بعد بمعنی مع ہے۔ علامہ بغوی نے سورہ حم السجدہ کی آیت خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ الآیۃ کی تفسیر میں فرمایا کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ زمین کو اتوار اور پیر دو دن میں بنایا۔ وَقَدَّرَ فِیْھَآ اَقْوَاتَھَا اور دو دن یعنی منگل اور بدھ میں اُس کے رہنے والوں کی خوراک مقرر کردی) تو یہ دو دن پہلے دو سے مل کر چار روز ہو گئے۔ اسی واسطے فرمایا ہے وَقَدَّرَ فِیْھَآ اَقْوَاتَھَا فِیْٓ اَرْبَعَۃِ اَیَّامٍ (یعنی زمین میں اُس کے رہنے والوں کی خوراک چاروں کے اندر مقرر فرمادی) اس کے بعد فرماتا ہے فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ (پھر اُنہیں پنجشنبہ اور جمعہ دو دن میں سات آسمان بنادیے) یہی اقوال سلف سے مستفاد ہے واللہ اعلم فَسَوّٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط (تو انہیں سات آسمان ہموار بنادیے) یعنی ہموار و برابر پیدا کئے ہیں کہیں ان میں رخنہ اور دراڑ نہیں۔ ھُنَّ کی ضمیر السَّمَآءِ کی طرف اس تقدیر پر راجع ہے کہ سَمَآء کی تفسیر اجرام بمعنی اجسام سے اس بنا پر کی جائے کہ سَمَآء یا تو جمع ہے یا جمع کے معنی میں ہے اور سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس ضمیر ھُنَّ سے بدل ہے اور اگر السماء کی تفسیر اجرام سے نہ کریں تو اُس وقت ضمیر ھُنَّ مبہم ہے (یعنی کسی کی طرف راجع نہیں) اور سبع سمٰوٰت اس کی تفسیر ہے) جیسا کہ عرب کے قول رُبَّہٗ رَجُلًا میں (ضمیرہ مبہم ہے اور رجلًا اس کی تفسیر ہے) اب اگر کوئی کہے کہ اہل ارصاد نے تو نو افلاک ثابت کئے ہیں سات یہ اور آٹھواں فلک اطلس جو فلک الافلاک ہے اور نواں فلک ثوابت۔ یہ دونوں بے جز کے ہیں اور انہوں نے سات افلاک کے کچھ اجزاء ثابت کیے ہیں بعض تو اُن میں سے تین افلاک سے مرکب ہیں کہ وہ افلاک مرکز کے باہر واقع ہیں اور ان میں ایک کوکب اور ایک متمم حاوی اور ایک متمم محوی ہے اور بعض اُن میں سے پانچ افلاک خارج مرکز اور متمم حاوی اور دو متمم محوی سے مرکب ہیں اور اس میں اور بھی افلاک ہیں کہ جو بالکل ٹھوس ہیں اور انمیں بالکل خلا نہیں اور اس میں کواکب متحیرہ قائم ہیں اہل ہیئت نے اس کا نام فلک التدویر رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اہل ہیئت نے افلاک کا شمار کواکب کی حرکات کے اعتبار سے کیا ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کل کواکب اور آفتاب رات دن دورہ کرتے ہیں تو ایک فلک الافلاک ثابت کیا جو تمام کواکب کو مشرق سے مغرب کی طرف حرکت قسری دیتا ہے اور جب یہ دیکھا کہ کواکب سبعہ کے سوا اور کواکب ایک طرح حرکت کرتے ہیں اور کواکب سبعہ سیارہ کی حرکت تیزی اور سستی میں مختلف ہے اور کبھی بروج شمالیہ سے جنوبیہ کی طرف اور کبھی بروج جنوبیہ سے شمالیہ کی طرف حرکت کرتے ہیں تو انہوں نے اُن کی حرکات کے موافق فلک کی شمار کی اور جب یہ دیکھا کہ آفتاب کے سوا اور سیاروں کی حرکت کبھی تیز ہو جاتی ہے کبھی دھیمی کبھی مشرق کی طرف ہوتی ہے۔ اور کبھی مغرب کی طرف اور کبھی ٹھیر ٹھیر کر تو انہوں نے تدویرات متعددہ ثابت کر دیں۔ تو اس حساب سے افلاک کی شمار قریب تیس کے پہونچ گئی۔ اگر مفصل بحث دیکھنی منظور ہو تو علم ہیئت کی طرف رجوع کرنا چاہئے جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب جاننا چاہیئے کہ اس طرح پر افلاک کا شمار باعتبار حرکات کواکب ثابت کرنا محض باطل اور وہ بھی چند مقدمات پر مبنی ہے کہ وہ بھی بے اصل ہیں۔ ان مقدمات میں سے ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ وہ زعم کرتے ہیں کہ خرق والتیام اجرا فلکیہ کا بالکل محال ہے۔ اور ایک مقدمہ یہ ہے۔ کہ تمام افلاک ایک دوسرے سے باہم ملے ہوئے ہیں جیسا کہ پیاز کے چھلکے کہ وہ ایک دوسرے سے باہم متصل ہیں اور یہ مقدمات اسے مستلزم ہیں کہ فلک الافلاک کی حرکت سے تمام افلاک میں حرکت قسریہ ہو اور یہ جملہ مقدمات سے جو لازم آتا ہے سب کا سب باطل محض ہے کیونکہ آسمان کا پھٹ جانا عقلاً جائز اور نقلاً واجب ہے۔

ف حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ٹھہرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ اگر اسطرح افلاک کے درمیان انفصال فرض کیا جائے تو جدا جدا افلاک انکی حرکات سے واجب اور بعض دری ہونگے (اور اسمیں کوئی قباحت نہیں) ہاں محوی کا متحرک ہونا اسی صورت میں لازم ہوسکتا ہے کہ حاوی اور محوی دونوں میں تلاصق اور اتصال ہو اور یہ تعدد افلاک کے علاوہ دوسرا امر ہے (جس سے یہاں بحث نہیں) (قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں افلاک کے متلاصق ہوتے ہوئے توقف کی وجہ اہل ہیئت کا یہ خیال ہے کہ ہر کوکب اور ایسے ہی شمس وقمر کی دو حرکتیں ہیں ایک حرکت قسری جو نویں فلک کے تابع ہے جس سے اس کا دورہ ایک رات دن میں پورا ہوتا ہے اور اسی حرکت پر رات دن کی بنا ہے۔ اور دوسری حرکت طبعی مشرق کی طرف ہے جس سے ان کی حرکتوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور جس پر فصلوں کا اور مہینوں وغیرہ کے اختلاف کا مدار ہے۔ بلکہ ہر کوکب کی بوجہ قسر کے بہت سی حرکتیں ہیں ایک تو یہی ہے جو فلک الافلاک کے تابع ہے۔ دوسری متممات حاویہ اور محویہ کے قسر کی وجہ سے۔ اور متحیرہ کی طبعی حرکت اُن کی تدویرات کی ہی حرکت ہوا کرتی ہے اور جس کوکب کی تدویر نہ ہو اس کی حرکت طبعی وہی ہوا کرتی ہے جو اس کے فلک کی ہوتی ہے جس میں وہ مرکوز ہوتا ہے اور حرکت قسری تو بدون تلاصق کے متصور ہی نہیں ہو سکتی میرے نزدیک اس مقام کی تحقیق میں شبہات ہیں جنکی گنجائش اس جگہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کواکب اور شمس وقمر سب کے سب آسمان دنیا میں ہیں اور ہر ایک کی علیحدہ اور مختلف حرکت ہے ہر کوکب اپنے فلک میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مچھلی پانی میں مانیں کوئی بھی دوسرے فلک کے قسر سے نہیں رات دن اور موسموں کا اختلاف کواکب کی حرکت کے اختلاف سے مربوط ہے یہ بحث بہت طویل ہے یہ مقام اس کے مناسب نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (کہ جب آسمان پھٹ جائے گا، اور مثل اس کے بہت سی آیتوں سے آسمان کا پھٹنا ثابت ہوتا ہے۔ اور اسی طرح آسمان کا باہم متصل نہ ہونا اور ہر دو آسمان کے مابین بعد کا ہونا شرعاً ثابت ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک وقت حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم تشریف فرما تھے کہ ایک بادل آیا آپ نے فرمایا جانتے ہو یہ کیا ہے صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا ابر ہے۔ زمین کے لیے روایا کی مثل ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے ایسی قوم کی طرف بھیجتا ہے۔ کہ جو اس کا شکر نہیں کرتی نہ اس سے دعا مانگتی ہے۔ پھر فرمایا جانتے ہو یہ تمہارے اوپر کیا ہے صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ عالم ہے۔ فرمایا آسمان ہے جو ایک سقفِ محفوظ اور سوج مکفوف ہے۔ پھر فرمایا جانتے ہو تمہارے اور آسمان کے درمیان کس قدر مسافت ہے صحابہ نے عرض کیا اللہ اور رسول ہی کو خبر ہے۔ فرمایا پانسو برس کی۔ پھر فرمایا جانتے ہو کہ اس کے اوپر کیا ہے عرض کیا اللہ اور رسول کو علم ہے فرمایا ایک اور آسمان ہے کہ اس آسمان اور اس کے مابین پانسو برس کی مسافت ہے۔ اسی طرح رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سنتے رہے اور جواب دیتے رہے حتیٰ کہ آپ نے سات آسمان گنوائے اور ہر دو آسمان کے درمیان مثل اسی بعد (۵۰۰) پانسو برس کے جو آسمان دنیا اور زمین کے مابین ہے ثابت ہے فرمایا۔ پھر فرمایا جانتے ہو ان سب کے اوپر کیا ہے صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ خبر ہے۔ فرمایا ان سب کے اوپر عرش عظیم ہے اس کے اور آسمان کے مابین پانسو برس کی مسافت ہے۔ پھر فرمایا جانتے ہو تمہارے نیچے کیا ہے۔ صحابہ نے کہا اللہ اور رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں فرمایا زمین ہے پھر فرمایا کچھ خبر ہے کہ اس کے نیچے کیا ہے صحابہ نے مثل سابق ہی جواب دیا تو آپ نے فرمایا اس کے نیچے ایک اور زمین ہے اور دونوں زمینوں کے مابین پانسو برس کی مسافت ہے غرض کہ حضور نے ساتوں زمینیں شمار فرما کر ہر ایک کے مابین پانسو برس کی مسافت ظاہر فرمائی۔ پھر فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی کہ جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر تم یہاں سے ایک رسی سب سے نیچے کی طرف لٹکاؤ تو وہ ربی اللہ کی ذات پر جاکر اُترے گی پھر حضور نے یہ آیت پڑھی۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر وہی باطن ہے اور وہی ہر شے کو جاننے والا ہے) اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

اور صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معیت بلاکیف ہر شے کے لئے ثابت ہے۔ اور نیز فرماتے ہیں کہ مومن کے قلب پر جو عالم صغیر میں اللہ تعالےٰ کا عرش ہے ایک خاص تجلی ہے اور ایک تجلی خاص کعبہ کے اندر رکھی گئی ہے۔ اور اسی طرح ایک تجلی رحمانی عرش پر واقع ہے جو عالم کبیر کا قلب ہے۔ اور آیت الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى میں اسی تجلی کی طرف اشارہ ہے اور اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ حدیث سابق میں جو آیا ہے "اگر تم ایک رسی سب سے نیچے کی زمین کی جانب لٹکاؤ تو وہ اللہ کی ذات پر اترے گی" اس میں تاویل کی حاجت نہیں بلکہ حقیقۃً اس رسی کا اللہ پر اُترنا جائز ہے اور یہ ایک ایسا مضمون ہے جیسا کہ جناب باری نے اپنے کلام پاک میں فرمایا کہ "مجھے بندۂ مومن کے دل کے سوا کوئی شے بھی سما نہیں سکتی"۔ ترمذی اور ابوداؤد نے بروایت حضرت عباس ایک حدیث ذکر کی ہے کہ جس میں یہ مضمون ہے کہ آسمان اور زمین کے مابین اکہتر یا بہتر برس کا فاصلہ ہے اور جو آسمان اس سے اوپر ہے اُس کے اور اس کے مابین بھی اسیقدر فاصلہ ہے اور اس طرح حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات آسمان تک شمار فرمائے اور فرمایا کہ ساتویں آسمان کے اوپر ایک دریا ہے کہ اس کے نیچے اور اوپر والے حصہ کے مابین اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا۔ پھر اس سب کے اوپر آٹھ فرشتے بزکوہی جیسے ہیں کہ اُن کے سموں اور سرینوں کے مابین اتنی مسافت ہے جتنی ایک آسمان کی اور اُن کی پشت پر عرش عظیم ہے کہ اس کے اعلیٰ اور اسفل کے درمیان بھی اتنی ہی مسافت ہے جتنی ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی اُس پر اللہ تعالیٰ ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اختلاف جو درباره مسافت احادیث میں آیا ہے سو یہ اختلاف یا تو چلنے والوں کے اختلاف کی وجہ سے ہو کہ اگر رفتار تیز ہو تو مسافت کم مدت میں طے ہوگی اور جو دھیمی ہے تو زیادہ مدت لگے گی اور یا یہ وجہ ہو کہ مسافت کا بتلانا منظور نہیں بلکہ اُس کی زیادتی بیان کرنی مقصود ہے (جیسا کہ ہم اپنے محاورے میں بولا کرتے ہیں سیکڑوں ہزاروں" تو اس سے محض کثرت مراد ہوتی ہے نہ عدد) اور یہ جو وارد ہوا ہے کہ اکہتر یا بہتر یا تہتر تو یہ راوی کا شک ہے کہ یا تو اکہتر فرمایا بہتر یا تہتر۔ واللہ اعلم۔ سلسلۂ کلام یہاں بہت طویل ہوگیا ہے۔ حاصل مقصود یہ ہے کہ علم ہیئت بالکل باطل اور نقش برآب ہے اور عقلاً یہ امر جائز اور شرعاً ثابت ہے کہ تمام کواکب آسمان دنیا میں ثابت ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (یعنی آسمان دنیا کو ہم نے کواکب سے زینت دی) پس ہر کوکب اپنے فلک میں تیز ہو یا دھیمی جس چال سے اللہ تعالےٰ چاہتا ہے چلتے ہیں جیسے مچھلی پانی میں تیرتی پھرتی ہے اس تقدیر پر آسمان کو حرکت نہیں۔ واللہ اعلم۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ (اور وہ ہر شے کو جاننے والا ہے) یہ آیت مضمون سابق کے لئے بمنزلہ دلیل اور علت کے ہے۔ گویا حاصل مرام یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ چونکہ تمام اشیاء کی حقیقت کو پوری طرح جانتا ہے اس لیے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ بطرز مناسب کامل اور بطریق احسن نافع پیدا کیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا جو ان میں فساد پھیلائے

وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

اور خونریزیاں کرے۔ اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری پاکی بولتے ہیں فرمایا مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔

یہ تیسری نعمت کا بیان ہے۔ پہلی نعمت تو عطاء وجود وحیات ہے اور دوسری ضروریات وحوائج زندگی واسباب لذت وآسائش کے لیے ما فی الارض کی پیدائش تیسری نعمت وہ عزت وتکریم ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے اکرام وتفضل سے ان کی ذریت کو حاصل ہے کہ سکان ملکوت سے ان کو سجدہ کرایا اور انہیں اپنا نائب بنایا۔

ملائکہ یعنی فرشتے یہ اللہ تعالےٰ کی ایک فرمانبردار معصوم مخلوق ہے۔ ان کے وجود پر اور اس پر کہ وہ ذوات قائمہ بانفسہا ہیں تمام عقلاء کا اتفاق ہے البتہ ان کی حقیقت میں اختلاف ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک یہ نفوس ناطقہ کے علاوہ جواہر مجردہ قائمہ بانفسہا ہیں نصاریٰ کی ایک جماعت انہیں نفوس بشریہ مفارقہ بتاتی ہے اکثر اہل اسلام کے نزدیک ملائکہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے اشکال مختلفہ وصور متفاوتہ میں متشکل وظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔

ملائکہ کا وجود

ملائکہ کی حقیقت میں اگرچہ اختلاف ہو مگر ان کے وجود کو فلاسفہ اور اصحاب ملل بالاتفاق مانتے ہیں۔ البتہ دہریئے اور وہ لوگ جن پر دہریوں کی صحبت یا ان کے خیالات نے کچھ اثر کیا ہے یا وہ اصحاب جنہیں علوم وفنون میں مہارت حاصل نہیں ہے اور اپنے آپ کو ہمہ دان جانتے ہیں۔ فرشتوں کے وجود کا انکار کر بیٹھتے ہیں اور اس کا سبب علم کی کمی وکوتاہی اور ملحدانہ خیالات ہیں کسی چیز کا اثبات یا انکار کرنے کے لئے محض حرکت زبان وجنبش سر اہل عقل کے نزدیک کافی نہیں۔ ایک شخص آپ کو خبر دے کہ فلاں دریا میں طغیانی آگئی اور آپ بے وجہ اس کی تکذیب اور واقعہ کا انکار کر دیں تو یہ بات عقلا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور ایسے انکار کو جہالت اور ہٹ کہا جائیگا جس طرح کسی چیز کے اثبات کے لیے خبر یا شہادت یا دلیل وبرہان کی ضرورت ہے ایسے ہی کسی واقعہ کے انکار کے لئے بھی وجوہ درکار ہیں جیسے بے دلیل وخبر کسی واقعہ کا اثبات کذب وجہالت ہے ایسے ہی بے وجہ کسی امر کا انکار سفاہت وحماقت ہے۔ کسی شخص کے لئے کسی چیز کا علم نہونا۔ انکار کی وجہ نہیں ہوسکتی۔ آپ کو دُنیا کی لاکھوں چیزوں کا علم نہیں تو کیا انکا وجود ہی باطل ہوگیا اور وہ معدوم ہوگئیں۔

بجلی کی طاقت اور اس کے کرشموں کا صدیوں اور قرنوں تک انسانوں کو علم نہوا تو کیا اس کی حقیقت باطل تھی یا موجودات کے جو خواص وقویٰ ابتک آپ کو معلوم نہیں ہیں وہ حقیقت میں معدوم ہوگئے۔ ایک چیز کو آپ کی آنکھ نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تو کون کہتا ہے کہ یہ اس کے معدوم ہونے کی دلیل ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان اسی چیز کو معلوم کر سکتا ہے جس کے دریافت کرنے کے آلات اس کے پاس موجود ہوں اور اگر اس چیز کے آلات سے دریافت کرنے کے لیئے کوئی مشق ومہارت درکار ہے تو ایسی مشق بہم پہنچانا بھی ضروری ہے۔ ایک جوہری جواہرات کے انبار میں سے سچے اور جھوٹے پتھروں کو ایک نظر میں ممتاز کر لیتا ہے۔ مگر دوسرے لوگ گھنٹوں تک تاکا اور گھورا کریں کچھ نتیجہ نہیں آنکھ ان کے پاس بھی ہے مگر مشق ومہارت نہیں اس لیئے نگینہ کو پہچان نہیں سکتے۔ ہمارے ملک کے بیکار لوگوں کے پاس جہاں دل بہلانے کے اور مشاغل تھے وہاں جھوٹی کہانیاں بھی تھیں اور ان سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کہانیوں کے بنانے والے اپنے وہم وخیال سے ایسی ایسی چیزیں بنا ڈالتے تھے جو خود ان کے یقین میں ناممکن ومحال ہوتی تھیں انہوں نے اپنی داستانوں میں ایسے الوپ انجن تجویز کیئے جن کی ایک سلائی آنکھ میں لگاتے ہی آدمی تمام جہان کی نظر سے غائب ہو جاتا تھا۔ اور تمام عالم کے آنکھ والے اس کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے ایسے حوض تجویز کیئے تھے جن میں غوطہ مار کر آدمی مچھلی طوطہ بینا جس کے قالب میں چاہتا تھا چلا جاتا تھا اور پھر اسی حوض میں دوسرا غوطہ لگا کر اپنا اصلی روپ پالیتا تھا۔ اسی طرح انہوں نے لطف داستان کے لیے ایسے اُڑن کھٹولے فرض کیے تھے جن کی کیل دبا کر وہ اُڑجایا کرتے تھے۔ یہ کہانیاں سننے والے ان سے دل تو بہلاتے تھے مگر یقین جانتے تھے کہ یہ اکاذیب واباطیل ہیں۔ محض جھوٹ اور بے حقیقت بلکہ ناممکن باتیں ہیں۔ مدتوں تک دُنیا ان باتوں کو ناممکن ومحال جانتی رہی۔ مگر آج اُڑن کھٹولا نہیں تخت سے بھی کہیں بڑی وزنی گاڑی ہواپیں اُڑتی پھرتی ہے اور صدہا کوس کی مسافت فضا میں طے کرتی ہے تو کیا پچھلے زمانہ کے لوگوں کا اس کو محال اور ناممکن جاننا ہوائی جہاز کی حقیقت کو باطل کر سکتا ہے۔ نہ جاننا خود اپنی نارسائی اور تاریکی ہے عالم اور اس کے واقعات اس سے متاثر نہیں ہوتے اور کوئی موجود شے کسی کے نہ جاننے اور بے علمی کے ساتھ انکار کرنے سے معدوم اور ناپید نہیں ہو جاتی۔ مگر جو اس کے معدوم ہونیکا اعتقاد کرلے وہ اس کی وجہ کا پتہ لگانے اور علم حاصل کرنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ پھول دماغ مہکاتے اور مجلس معطر کرنیوالی خوشبو ہے ہم اس کا لطف اٹھاتے اور اس سے راحت پاتے ہیں لیکن اگر ہمارے پاس قوت شامہ نہ ہوتی اور قدرت ہمیں سونگھنے کی قوت عطا نہ فرماتی تو کیا ہم ہاتھ سے چھوکر یا آنکھ سے دیکھ کر زبان سے چکھ کر یا کان لگا کر کسی طرح بھی اس کی وجود کا پتہ چلا سکتے تھے۔ لیکن ہمارا اس خوشبو سے ناواقف ہونا کیا اس کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتا تھا۔ اسی طرح اگر ہمارے حواس ملائکہ کا احساس نہ کر سکیں تو کیا انکا وجود ہی نہ رہے گا۔

اتنی تقریر سے یہ ثابت ہوگیا کہ ہمارا کسی چیز سے بے خبر ہونا اس کے عدم ونیستی کی دلیل نہیں ہو سکتا تو فرشتوں کا صرف اس بنا پر انکار کہ اُن کو ہماری آنکھ نے نہیں دیکھا ہمارے ہاتھ نے نہیں چھوا یقیناً جہل ونادانی ہے۔

الحاصل عدم علم کو عدم شے کی دلیل بنانا اور اپنی نادانی کو کسی چیز کے نہ ہونے کی سند قرار دینا انتہا درجہ کی بدعقلی اور غایت درجہ کا جہل ہے جو کسی دانشمند اور صاحب عقل کا کام نہیں تو جو شخص اپنی بے شعوری وبے ادراکی کو وجود ملائکہ کے انکار کی سند بناتا ہے وہ اپنی نادانی کی شہادت دیتا ہے اور اپنی عقل کی توہین کرتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ جس شے کے عدم پر کوئی دلیل نہو اور اس کے معدوم ہونیکا دعویٰ درست ہو محض اتنی وجہ سے اس کو موجود بھی نہیں مانا جا سکتا کیونکہ جس طرح عدم کا حکم کرنا محتاج دلیل تھا اسی طرح وجود کا دعویٰ بھی ثبوت چاہتا ہے تو اگرچہ فرشتوں کے عدم پر کوئی دلیل نہو اور ان کا وجود ناممکن ومحال بھی نہو تاہم اس کے ثبوت کے لیئے دلیل درکار ہے لہذا یہ تلاش بیجا نہیں کہ فرشتوں کا وجود کس دلیل سے ثابت ہے سب سے بڑی دلیل تو شریعت کا بیان اور انبیاء علیہم السلام کی خبریں ہیں کیونکہ جس چیز تک ہمارے حواس اور آلات ادراک رسائی نہیں کرتے اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس خبر صادق ہے۔ اور خبر صادق اسباب علم میں ایک قوی سبب ہے بیشمار معلومات اس پر منحصر ہیں دُنیا کا کوئی عاقل خبر کے افادۂ علم کا انکار نہیں کر سکتا۔ تمام عالم کے کام اسی پر موقوف ہیں اور جہاں کے نظم کا مدار خبر کے اوپر ہے اگرچہ کوئی واقعہ ہم نے اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو ہمارے آلات حواس کے ذریعہ سے مدرک نہ ہوا ہو لیکن خبر کے ذریعہ سے ہمیں اس کا دیکھی اور محسوس کی ہوئی چیز سے زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے مریض ڈاکٹر کے معائنہ پر اعتماد کرتا ہے حکومت انجینیر کی تجویز پر عمل کرتی ہے جس محکمہ کا علم جس کے پاس ہے اس بات میں اس کی خبر کا اعتبار ہے تو کیا وجہ ہے کہ امور کونیہ میں کائنات کے خالق اور اس کے رسولوں کی خبر مدار علم نہو جب کتاب الہٰی کا پیام ربانی ہونا بُرہان قطعی سے ثابت ہوگیا جب رسول کی رسالت معجزات کی روشنی میں بے اشتباہ دیکھ لی گئی اور شک وشبہ کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ رسول علیہ السلام یا قرآن کریم کی خبر سے جزم ویقین حاصل نہو ضرور ہوگا اور اگر کسی کو ادنے سا شبہ بھی رہ جائے تو یہ اس کا مرض قلب اور دل کی کدورت ہے اُس کا آئینہ خاطر اندھا ہو رہا ہے اس کو اپنی بیماری دل کا علاج کرنا چاہیئے۔

معجزات کی تائید وہ زبردست چیز ہے جو انسان کو صاحب معجزہ کے صدق کا اطمینان دلاتی اور اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیتی ہے عرب کے کفار باوجود عناد وعداوت اور بغض وحسد کے حضور سرور انبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ایک ایک کلمہ کے معتقد تھے اور جو بات زبان اقدس سے ادا ہوتی تھی ہر کافر کا دل یقین کرتا تھا کہ اس کا خلاف ممکن نہیں۔ بارہا ان کی زبانوں نے اس کا اعتراف کیا۔ غرض رسول وقرآن کی خبر علم یقینی کو مفید ہے۔ جب قرآن پاک اور احادیث رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں ملائکہ کے وجود ان کے صفات وافعال کی متواتر خبریں

دی گئی ہیں تو ایک عاقل منصف کے لیئے کوئی جائے تردد باقی نہیں رہتی . بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ کتب سابقہ تورات وانجیل وغیرہ سے بھی ان پاک ہستیوں کے ثبوت ملتے ہیں اور ملل مختلفہ ان کے وجود پر متفق ہیں اور جُداگانہ ادیان میں مختلف زمانوں کے پیغمبروں نے علیہ الصلوٰۃ والسلام اُن کے وجود کی خبریں دی ہیں اور وہ اُن کے اہل ملت میں آج تک بنقل متواتر منقول چلی آتی ہے تو کسی صاحب بصیرت کے لیے شک واشتباہ کی کوئی وجہ باقی نہ رہی اور اس بُرہان قوی نے دُنیا کو اُن کے وجود کی طرف سے مطمئن کر دیا اب ملحدین کا انکار اُن کی بے بصری اور عناد کی بُرہان ہے علاوہ بریں حکمت الٰہیہ کے اصول جو کارخانۂ عالم میں کار فرما ہیں اُن پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے ۔ کہ کائنات کی ہستیاں نفع وضرر دونوں کی صلاحیت رکھتی ہیں ایک درخت میں نشوونما پاکر پھلنے پھولنے چمن کو اپنے آب ورنگ سے مزین کرنے اور دماغوں کو اپنے روائح طیبہ سے معطر بنانے کی قابلیت بھی ہے اور خشک ہونے مُرجھا جانے بلکہ گلنے اور سڑنے کی صلاحیت بھی ۔ اب عالم نباتات لیجئے یا عالم حیوانات یا اور کوئی عالم ہر کہیں آپ کو یہ اصول حکمت جلوہ فرما نظر آئیگا اور اسی بناپر ہم اس عالم کو عالم کون وفساد کہتے ہیں ۔ ہمارے روزمرہ کے مشاہدے ہیں کہ جہاں چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا ہوتی پلتی اور بڑھتی ہیں حیرت انگیز ترقیاں کر جاتی ہیں اور پھر خراب ہونا شروع ہوتی ہیں ۔ ایک روز اُنکا وجود نیستی کا لقمہ ہوجاتا ہے ۔ غرض یہ ہے کہ وجودات عالم جن میں عالم انسان بھی ہے نفع وضرر کی صلاحیتوں سے خالی نہیں ہے اور جس طرح یہ اصول حکمت عالم اجسام میں کار فرما نظر آتا ہے ایسے ہی عالم ارواح میں بھی جلوہ افروز ہے ۔ روحانیت بہترین صفات سے ترقی کرتی اور منور ہوتی اور رذائل اوصاف سے اُس میں کدورت وظلمانیت پیدا ہوتی ہے ۔ نفع وضرر کی صلاحیت اُس میں بھی موجود ہے اور جس طرح تمام وہ چیزیں جن میں صلاحیت نفع وضرر ہے اُن کے لئے نفع وضرر کے خارجی اسباب بھی قدرت نے مقرر فرمائے ہیں ان میں بعض اسباب ظاہر ہوتے ہیں اور بعض خفی مثلاً عالم ابدان کے لئے اسباب امراض مؤثرات خارجیہ ہیں کبھی تو وہ ظاہر ہوتے ہیں جیسے دھوپ میں رہنے سے دردسر اور بخار کا عارض ہونا کہ اس مرض کے لئے دھوپ کی گرمی سبب ظاہر ہے اور کبھی اسباب اس قدر مخفی ہوتے ہیں کہ حاذق طبیب اور تجربہ کار معالج بھی اُن کے معلوم کرنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن مرض کی حالت یقین دلاتی ہے کہ اس کے لئے کوئی سبب ضرور ہے اور جب ظاہر میں کوئی سبب نظر نہیں آتا تو ہم حکم کرتے ہیں کہ باطن میں کوئی خفی سبب ہے گو اس کو ہماری آنکھ نے نہیں دیکھا ہمارے حواس نے دریافت نہیں کیا لیکن مرض کا وجود اور اُسکا سبب کے ساتھ مرتبط ہونا ایک سبب خفی کے وجود کا ہم کو یقین دلا دیتا ہے اسی طرح روحانیت کے نفع وضرر کے لیئے بھی اسباب ہیں بہترین صفات ہوں یا بدترین اخلاق دونوں کے لئے کچھ بواعث ومحرکات ہیں مثلاً نیک صحبت عمدہ تربیت ، اساتذہ ومشائخ کی تعلیم ہادی ورہنما کی نصیحت بہترین اخلاق کے لیئے محرکات قویہ ہیں جو نفس کو فضائل کی طرف شوق دلا کر حرکت میں لاتے ہیں اور کسب فضائل پر آمادہ کر دیتے ہیں ۔ ایسے ہی بُری صحبتیں اور مخرب اخلاق مضامین کا مطالعہ بدترین صفات کے لئے محرک اور داعی ہیں اور اُس سے نفس کو رذائل کی طرف رغبت ہوتی ہے اور کسب فضائل کا شوق مُردہ ہو جاتا ہے نفس میں تاثیر کرنے والے نفع وضرر کے اسباب بھی کائنات عالم کے جملہ اسباب نفع وضرر کی طرح مقتضائے حکمت ہے کہ ظاہر و خفی دونوں طرح کے ہوں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کو نیکی کی طرف رغبت ہے اور محاسن اعمال کی طرف اُسکا نفس کوئی شوق رکھتا ہے فضائل اوصاف کے ساتھ ومبدم اُسکا علاقہ قوی ہوتا چلا جاتا ہے اور محرکات ظاہرہ موجود نہیں ہیں تو جس طرح طبیب مرض کے اسباب ظاہرہ نہ پاکر اسباب خفیہ کے یقین پر مجبور ہوتا ہے اسی طرح اسباب روحانیت میں نظر کرنیوالا محرکات ظاہرہ کے فقدان سے محرکات خفیہ کے وجود کا یقین کرنے پر مجبور ہے یہ محرکات خفیہ جو نفس کو کسب فضائل پر آمادہ کرتے اور محاسن اوصاف کا شوق دلاتے ہیں انہیں کو ہم غیب اور ملک کہتے ہیں اسی طرح ضرر کے اسباب خفیہ ومحرکات غیر مرئیہ کا نام شیاطین ہے دونوں اپنے اپنے کام کرتے ہیں اب عقلی طور پر ملائکہ اور شیاطین کا وجود ثابت ہو گیا اس کے علاوہ ایک دوسرے پیرایہ میں مُدعا کو آپ یوں سمجھئے کہ بہت سے اشخاص ایسے ہیں جو عقل وشعور بھی رکھتے ہیں علم ودانش بھی صحبتیں بھی اچھی ہیں والدین اور اساتذہ اُن کو نیکی کی تلقین یہی کرتے رہتے ہیں اور وہ اپنے علم وعقل سے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جھوٹ بولنا حرامکاری ظلم بددیانتی یہ سب گناہ کی باتیں ہیں ان سے قلب پر تاریکی آتی ہے روحانیت خراب ہوتی ہے دُنیا میں بھی اس کے نتائج بُرے ہیں اور آخرت میں بھی اس کے لئے سخت سزائیں ہیں لیکن یہ جانتے ہوئے بھی اُن سے اس قسم کے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں جبکہ عقل مآل اندیش ان قبائح اعمال کو مضر اور مہلک جانتی ہے اور نفس انسانی کی سرشت یہ ہے کہ وہ نفع کی طرف راغب اور ضرر سے ہارب ہوتا ہے ۔ باوجود اس کے اگر عاقل وہوشمند انسان بدی کی طرف جاتا ہے گناہ کے کام کرتا ہے تو کیوں ، جب عقل نے اُس میں نفع نہ بتایا بلکہ ضرر دکھایا اور نفس کو شوق ہے نفع کا تو وہ کیسے ضرر کی طرف مائل ہو گیا اور اُس نے ناصحوں کی نصیحت ، مربیوں کی تربیت ، عزیز واقارب کی نصیحت عقل وخرد کی ہدایت سب کے خلاف کیوں کیا گیا ۔ اگر کیا دبکانے والا نہیں ہے تو عقل پر کیوں پردے پڑ گئے نفس کیوں اپنے ضرر کی طرف دوڑ پڑا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مکار مغوی ضرور اغوا کرتا ہے اور جب ظاہر میں نظر نہیں آتا تو وہ اس مخلوقات میں سے ہے جس کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں ، اس کو شیطان کہتے ہیں ۔ اس طرح جو نیکی کا الہام کرنے والا ہے وہ ملک ہے غرضکہ ملائکہ وشیاطین کے وجود پر عقل جزم کرتی ہے ۔ اب ان کا وجود عقلی ونقلی دونوں دلیلوں سے ثابت ہوا ۔ جو لوگ ملائکہ وشیاطین کے وجود کے منکر ہیں وہ بیدین اور گمراہ ہونے کے علاوہ علم وعقل کے بھی دشمن ہیں الحمدللہ علیٰ احسانہ ونوالہ کہ شیاطین و ملائکہ کے وجود پر عقلی ونقلی دونوں پہلوؤں سے ایسی کافی اور ارباب عقل وانصاف کو مطمئن کرنے والی بحث معرض تحریر میں آئی جو اس تفسیر کے سوا کہیں نہ ملیگی اب یہ سوال باقی رہا کہ ملائکہ سے یہ فرمانے کی کیا حکمت ہے کہ میں زمین میں خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا فرمانے میں بہت حکمتیں اور کثیر فوائد ہیں ۔

پہلا فائدہ ۔ یہ اظہار کرنا ہے کہ قبول فیض کے لئے مستفیض کو مفیض کے ساتھ مناسبت شرط ہے ؛ اور ساکنان ارض کدورات نفسانیہ وظلمات جسمانیہ میں گرفتار ہیں ، اور حضرت رب العزۃ جل جلالہٗ کے تقدس وعلو کا اندازہ مدرکہ کے حدود پرواز سے بالا تر ہے تو یہ تاریکی میں پڑی ہوئی مخلوق اس سے کس طرح استفاضہ کر سکتی ۔ اس لئے یہ وصول فیض میں ایسے واسطہ کی محتاج ہوئی ، جو تجرد وتعلق کی دونوں حیثیتیں رکھتا ہو تا کہ فیاض کریم سے فیض حاصل کرے اور مخلوق کو پہنچائے ، یہی خلیفہ مقرر فرمانے کی حکمت ہے ، اور اسی لئے انبیاء علیہم السلام جو خلیفہ حق ہیں مبعوث فرمائے گئے ۔ ؎

ادھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق میں شامل ؛ خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرف مشدد کا

اور یہی حکمت ہے کہ کبھی کوئی فرشتہ نبی نہ بنایا گیا کیونکہ وہ مجردات میں ہونے کی جہت سے اہل ارض کیساتھ مناسبت تام نہ رکھتا اور یہ عدم مناسبت

کی وجہ سے اُس سے پوری طرح انتفاع نہ کر سکتے۔ اسی حکمت کو اس آیہ کریمہ میں بیان فرمایا۔ ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا یعنی اگر ہم فرشتہ کو خلیفہ بناتے بالفرض تو اس کو بھی مرد کرتے یعنی صورت بشری اور ہیکل انسانی میں بھیجتے تاکہ اس مناسبت کی وجہ سے اہل ارض اُس سے فیض حاصل کرنے پر قادر ہو سکے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ ملائکہ سے اپنے ارادہ آفرینش خلیفہ کا اظہار فرمانا اپنے بندوں کے حق میں مشورہ کی تعلیم ہے کہ انہیں جب کوئی کام کرنا ہو تو چاہیے کہ مشورہ کر لیا کریں۔ اگرچہ اللہ تعالےٰ مشورہ اور ہر حاجت سے پاک ہے لیکن بندوں کے فائدے کے لئے انہیں یہ تعلیم دی گئی تاکہ وہ اپنے امور کو باہمی مشاورت سے مکمل کر سکیں، ہر کام میں مشورہ سنّت ہے، حدیث شریف ارشاد ہوا ما خاب من استخار وما ندم من استشار یعنی استخارہ کرنیوالا ٹوٹے میں نہیں رہتا اور مشورہ کرنے والا نادم و شرمندہ نہیں ہوتا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ شان خلیفہ کی عظمت کا اظہار ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ساکنان عالم بالا کو اس کے وجود کی خبر دی اور اس کی پیدائش سے پہلے اُس کو خلیفہ کے معزز لقب و خطاب سے مخاطب فرمایا اور اس طرح اس کی فضیلت کا اظہار کیا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ علم کا رتبہ عبادت سے زیادہ ہے اور عالم کا درجہ عابد سے اونچا۔ کیونکہ ملائکہ نے جب اُس کے فساد و خونریزی کا ذکر کیا تو ان پر اثبات استحقاق کے لئے خلیفہ کی وسعت علمی ظاہر کی گئی۔

ایک فائدہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ علم شرط خلافت ہے۔ نہ عصمت، اس میں روافض کا رد ہے، جو خلیفہ کے لئے معصوم ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ خلیفہ احکام و اوامر کے اجراء و دیگر تصرفات میں اس کا نائب ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں اگرچہ اور تمام انبیاء بھی اللہ کے خلیفہ ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں فرمایا داود انا جعلنٰك خلیفة فی الارض فرشتوں کو خلافت آدم کی خبر اس لئے دی گئی کہ وہ ان کے خلیفہ بتائے جانے کی حکمت دریافت کرکے معلوم کر لیں اور ان پر خلیفہ کی عظمت و شان ظاہر ہو کہ ان کو پیدائش سے قبل ہی خلیفہ کا لقب عطا ہوا اور آسمان والوں کو ان کی پیدائش کی بشارت دی گئی مسئلہ اس میں بندوں کو تعلیم ہے کہ وہ کام سے پہلے مشورہ کیا کریں اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو مشورہ کی حاجت ہو۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ ملائکہ نے عرض کیا کیا ایسے کو نائب کرے گا جو اُس (زمین) میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے

ملائکہ کو الہام سے یا لوح محفوظ سے معلوم ہو چکا تھا کہ اولاد آدم زمین میں فساد و خونریزی کی مرتکب ہوگی یا اُنہوں نے استنباط و قیاس سے سمجھ لیا تھا بہر حال یہ معلوم ہونے کے بعد اُنہیں حیرت پیش آئی کہ جو قوم فساد کرے اور خونریزی کی مرتکب ہو، کس طرح سزاوار خلافت ہو سکتی ہے اور زمین کی آبادی اور درستی اُس سے کیسے سر انجام پا سکتی ہے۔ اس حیرت کو دور کرنے اور حکمت خفیہ دریافت کرنے کے لئے انہوں نے سوال کیا۔ مقصود سوال یہ ہے کہ ہماری عقلیں اس امر میں حیران ہیں کردگار حکیم تو اس کی حکمت سے ہمیں خبردار فرما اور ہمارے شبہ کو دور کر دے اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی امر میں حیرت پیش آئے اور کوئی امر دینی یا مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تو وہ جاننے والے اور مرشد یا اُستاد سے دریافت کرکے اپنے دل کا خدشہ دور کر لے۔ اور طریق ادب کے ساتھ اطمینان حاصل کرنے کے لئے سوال عرض کرے اس مضمون کو دوسری آیت میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔ فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون اور حدیث شریف میں بھی انما شفاء العی السوال ارشاد ہوا اس لئے ملائکہ نے حکمت دریافت کرنے کے لئے سوال کیا۔ سوال میں خالق عالم پر اعتراض یا حضرت آدم پر طعن کا شائبہ بھی نہیں ہے اور ملائکہ کرام کا مرتبہ اس سے اعلیٰ ہے کہ اُن کی نسبت ایسا وہم بھی کیا جا سکے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کی شان میں فرمایا۔ عبادٌ مکرمون لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون۔ اس کے بعد اُن کا یہ عرض کرنا۔ نحن نسبح بحمدك ونقدس لك کہ ہم تیری ستائش کرتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور پاکی بیان کرتے ہیں۔ اُسی سوال کا ایک جزو ہے مدعا یہ ہے کہ بنی آدم سے گناہ صادر ہونگے اور اُن میں سے بعض خطا کار ہونگے جو فساد و خونریزی کریں گے اور ہم معصوم ہیں، گناہ کے پاس نہیں جاتے، تسبیح و تقدیس میں مشغول و مصروف رہتے ہیں باوجود اس کے بنی آدم کی ترجیح اور خلافت کے لئے اُن کو خاص فرمانا یقیناً کسی حکمت سے ہے وہ حکمت بتا دی جائے، بعض مفسرین نے اس مضمون کو اس پیرایہ میں تعبیر کیا ہے کہ جب ملائکہ کو معلوم ہوا کہ جو قوم خلیفہ بنائی جائے گی، کارکنان قضاء و قدر نے اُس کا مدار کار تین قوتوں پر رکھا ہے دو تو شہوانی و غضبانی قوتیں ہیں یہ دونوں فساد و خونریزی کا باعث ہونگی۔ تیسری قوت عقلیہ ہے، یہ قوت بیشک معرفت و طاعت کی طرف رہنمائی کرتی ہے لیکن وہ قوتیں جو فساد کو چاہتی ہیں وہ اس ایک قوت پر غالب رہیں گی تو حکمت آلہی نے کس لئے تاج خلافت ایسی قوم کے سر پر رکھا اور ہماری قوم پر اس کو ترجیح دی، باوجودیکہ ہم معصوم ہیں اور مفاسد کے پیش آنے سے امن ہیں، تو وہ خاص امر دریافت کرنا ہے جو ملائکہ پر آدم کی ترجیح کا باعث ہوا، اس قیاس میں ملائکہ نے قوت شہوانی و غضبانی کی جداگانہ تاثیر پر نظر کی، اور اس سے وہ غافل رہے کہ ان میں سے ہر ایک قوت جب عقل کے ماتحت رہ کر کام کرے تو امور خیر میں اس سے بڑے بڑے اعلیٰ نتیجے حاصل ہو سکتے ہیں جیسے کہ عفت اور شجاعت اور مجاہدہ و انصاف یہ تمام صفات ان ہی قوتوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ ملائکہ کی نظر اس طرف بھی نہیں گئی کہ فرداً فرداً ہر ایک چیز جو کام نہیں کر سکتی وہ نتائج مرکب اور مجموعہ سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسے کہ جزئیات کا احاطہ عجائب غرائب صنائع کا استخراج کائنات میں ودیعت رکھے ہوئے منافع اور فوائد کا قوت سے فعل میں لانا، جو امور خلیفہ بنانے سے مقصود و منظور ہیں وہ ان قویٰ سے انجام پاتے ہیں اسی کی طرف انی اعلم ما لا تعلمون میں اشارہ فرمایا گیا کہ ان قویٰ کے نتائج و ثمرات اور مقصد استخلاف میں ان کا قرین حکمت ہونا یہ وہ بات ہے جو تم نہیں جانتے اور ہمارے علم میں ہے۔

مسئلہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ دقائق حکمت سے ناواقفیت کی حالت میں طالب کو طریق ادب سے سوال کرنا جائز ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جن امور کی حکمت غامضہ تک بندوں کی فہم رسائی نہ کر سکے، وہاں اُنہیں چاہئے کہ اپنے قصور علم کا اعتراف کرکے اللہ تعالےٰ کے علم و حکمت پر اعتماد کریں، سعادت کی یہی راہ ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔ پھر سب اشیاء ملائکہ پر پیش کرکے فرمایا سچے ہو تو ان کے نام بتا دو

یہ تعلیم کس طرح ہوئی اس میں چند قول ہیں ایک تو یہ کہ جس طرح اللہ سبحٰنہٗ نے اپنے بندوں میں بدیہیات کا ایک علم پیدا کیا ہے جس سے وہ بدیہیات کو بلاکسب ونظر معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح تمام کائنات کے اسمار کا علم بدیہی حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام میں پیدا فرمایا، یا القار الہام کے ذریعہ سے یہ تمام علوم تعلیم فرمائے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ نے حضرت آدم کو اجزاء مختلفہ سے پیدا کیا، اور قلب جگر، دماغ وغیرہ اعضاء عنایت کیے اور بہت سے قوتیٰ مرحمت فرماکر انواع واقسام میں مدرکات کے ادراک کی قابلیت بخشی کہ وہ اس خلقت کے سبب سے معقولات، محسوسات، متخیلات، موہومات وغیرہ کو جان سکیں۔ پھر اشیار کی ذوات اور اُن کے خواص واسمار اور علوم کے اصول اور صناعات کے قوانین وآلات وغیرہ سب کا الہام فرمایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جمیع اشیاء کے اسمار تعلیم فرمائے یہاں تک کہ پیالا اور پیالی یعنی چھوٹی سے چھوٹی اور حقیر سے حقیر چیز بھی باقی نہ رہی۔ کائنات میں جو ہو گذرا اور جو ہونے والا ہے، جو شے عالم وجود میں آنیوالی ہے یا جس کے لئے کوئی نام ہوگا، اُس سب کو حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم شامل ہوگا اس میں تمام لغات بھی آگئے کل زبانیں بھی آگئیں۔ عام اس سے کہ وہ لغات دُنیا میں اب تک جاری ہو چکے ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں۔ کوئی علم حضرت آدم سے خارج نہ رہا۔ لغات کی وضع کے متعلق اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ تمام لغات کا واضع اوّل اللہ رب العزت ہے تبارک وتعالےٰ، خواہ عالم ظہور میں بندوں نے ہی اُن اسمار کو وضع کیا ہو۔ جیسے کہ ہر ایک شخص اپنی اولاد کے لئے ایک نام رکھتا ہے اور اپنی ایجاد اور بنائی ہوئی چیز کا کوئی اسم مقرر کرتا ہے۔ یا اصحاب علوم وارباب فنون اپنے مقاصد کی تعبیر کیلئے اصطلاحیں مقرر کرتے ہیں یہ سب کچھ وضع الٰہی میں پہلے آچکا ہے تو یہ جمیع اسمار ہر لغت اور ہر زبان کے اور تمام اصطلاحات علوم وفنون کے اور اُن کے کل مسمیات کے علوم حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو مرحمت فرمائے اور اس علم کو اُن کا مدار فضل قرار دیا۔

اگرچہ ملائکہ کی خلقت، حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے مدتوں پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اور قبل خلقت آدم بے شمار امور ان کی نظر میں آئے اس لئے ملائکہ یہ سمجھے تھے کہ ہمیں علم کی حیثیت سے حضرت آدم پر فضیلت رہے گی۔ مگر فیض ربانی نے قلب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو وہ نور بخشا جس سے تمام اشیاء آپ پر منکشف ہو گئیں اور علوم کے اصول وقوانین آپ پر روشن ہو گئے اور تمام لغات پر آپ کو اطلاع ہو گئی۔ اس میں علمار کا اختلاف ہے کہ حضرت آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات اپنے عہد مبارک میں ایک ہی لغت میں کلام فرماتے تھے یا تمام لغات میں اور آپ کی اولاد بھی آپ کے زمانہ میں ایک ہی لغت کی عادی تھی یا لغات کثیرہ کی۔ بعض علمار فرماتے ہیں۔ کہ زمانہ طوفان حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات تک اولاد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات میں ایک ہی لغت رائج رہا اور ایک ہی زبان میں وہ سب گفتگو کیا کرتے تھے۔ لیکن دوسرے محققین اس کا انکار کرتے ہیں اور ان کی تحقیق یہ ہے کہ طوفان حضرت نوح علیہ السلام کے بعد تک بھی بنی آدم تمام زبانیں جانتے تھے اور انہیں حضرت آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات سے تمام لغات ملے تھے۔ جب لوگ متفرق ہو کر مختلف خطوں میں آباد ہوئے تب انہوں نے ایک ایک لغت اختیار کر لیا اور اُن کی اولاد اُسی ایک لغت میں کلام کرتی رہی، اس لئے ممالک وبلدان کی زبانیں جدا جدا ہو گئیں۔

آیۃ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لغات توقیفی ہیں اور حضرت رب العزت عزوعلی تبارک تعالےٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کو تعلیم فرمائے گئے۔

مسئلہ توحد السنہ مذکورہ صدر بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ اصولی زبانوں کے باہم مختلف ہیں، اور روایات سے بھی اسی کو تقویت پہنچتی ہے۔ بعض حضرات جو زبانوں میں ادنیٰ مناسبتیں دیکھ کر اس کے قائل ہو گئے ہیں ایک اصل زبان ایک ہے اور اس میں مختلف قسم کے تغیرات پیدا ہونے سے صدہا زبانیں ہو گئیں، انکی یہ رائے کسی دلیل پر مبنی نہیں بلکہ چند زبانوں کے بعض لغات میں کچھ مشاکلت ومشابہت دیکھ کر انہوں نے یہ رائے قائم کی۔ لیکن کلمات کا تشاکل وحدت السنہ کے لئے کوئی قرینہ تو یہ بھی نہیں ہے چہ جائیکہ دلیل وبرہان زبانوں کا مادہ اصوات مقطعہ ہیں جو انسان کو قدرت نے محدود عطا فرمائے ہیں۔ تو ہر ملک اور ہر زبان والے کے لئے حروف کی شمار ایک معین حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی کہ جس کے اصول چالیس سے زائد نہیں ہیں۔ کوئی قوم اتنے حروف سے کام لیتی ہے اور کوئی اس سے کم پر اکتفا کرتی ہے۔ لیکن حروف کی آوازیں ہر زبان والوں کی یکساں ہوتی ہیں۔ اگرچہ حروف کے نام میں فرق ہو ایک حرف کا نام ایک کے نزدیک ہمزہ ہے، دوسرے کے نزدیک آتیسرے کے نزدیک ایک گونا موں میں تفاوت ہے مگر مسمّیٰ واحد ہے، آواز سب کی یکساں ہے خواہ کسی ملک کا رہنے والا ہو کسی زبان کا بولنے والا ہو جب اس حرف کا تلفظ کریگا وہی آواز نکلے گی جو دوسرے دور دراز ملک کے رہنے والے سے ادا ہوتی ہے اب ان اصوات سے جو کلمات مرکب کئے جائیں گے وہ کہیں بھی ایک دوسرے سے نہ ملیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ہر زبان کے دس بیس یا اس سے زیادہ الفاظ دوسری زبان سے ملجائیں اور کچھ الفاظ دوسری زبان کے الفاظ سے قریب ہو جائیں تو یہ کچھ بعید نہیں ہے اور ایسا اتفاق زبانوں کے اتحاد کی دلیل نہیں ہو سکتا جس طرح حیوانات ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہی چیزوں میں شریک ہیں بہت سے اعضاء وقویٰ مشترک ہیں بہت سے انداز ایک نوع کے دوسری نوع کے قریب تر ہیں مگر اس سے اُن کے اتحاد نوعی پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مقاربت کلمات ومشاکلت الفاظ یا مشارکت لغات اتحاد السنہ کی دلیل نہیں ہو سکتی، یہ وہم کی کارسازیاں ہیں اور قوت وہمیہ کے پروبال اصحاب اوہام کو اس طرف اُڑا کر لیجاتے ہیں اور گرفتاران وہم اپنے وہمی منصوبوں کو براہین تو یہ سے زیادہ وقعت دیتے ہیں لیکن جو یائے حقیقت اور صاحب نظران چیزوں کی طرف التفات بھی نہیں کرتا موجودہ زمانہ میں یورپ کی اوہام پرستی جن خشک دماغوں پر مسلط ہو گئی ہے وہ ایسے وہمیات پر شیفتہ ہو کر منزل سے دور ہو جاتے ہیں اور قلوب پر جب وہمانی تاریکیاں غالب ہو جاتی ہیں تو ذوق صحیح مکدر ہو جاتا ہے اور نور باطن کی مشعل ومبدم ماند اور کمزور ہوتی جاتی ہے اور اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بے خرد انسان اوہام جیسی ذلیل چیز کا گرویدہ ومعتقد ہو جاتا ہے اور انبیا کی تعلیم اخبار واحادیث سے گریز کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس حال سے محفوظ رکھے اور قلب کو ایمانی نورانیت سے منور ومعمور فرمائے آمین، الحاصل اتحاد السنہ کا دعویٰ محض بے دلیل ہے اب رہا یہ مسئلہ کہ لغات (زبانیں) سب الہام ہوئی ہیں۔ یہ روایات سے بھی ثابت ہے اور آیۃ کے عموم سے بھی مستفاد اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ قدرت نے انسان کے اقصائے حلق سے لب تک جو مخارج رکھے ہیں آواز جب ان مخارج پر ہو کر نکلتی ہے حروف پیدا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے قدرت نے انسان کی خلقت کے ساتھ ہی حروف کی پیدائش کا انتظام بھی فرمایا اور کلام کا مادہ حروف ہی ہیں اونہیں سے کلمات اور کلمات سے جملے مرکب ہوتے ہیں تو جس کارساز نے ہمیں حروف کے مخارج عطا فرمائے اور ان مخارج پر حروف پیدا کئے اُس کا کرم لغات کا الہام فرمائے تو یہ اس حکمت کے عین مناسب ہے، اسلئے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو لغات کا الہام ہونا نظر عقل کے بھی بالکل موافق ہے۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ؕ پھر سب اشیاء ملائکہ پر پیش فرماکر فرمایا سچے ہو تو اُن کے نام بتاؤ

ملائکہ پر اشیار کا پیش کرنا کس طرح تھا۔ اس کے متعلق مفسرین کے چند قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ جو اسمار حضرت رب العزت نے آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام

کو تعلیم فرمائے، ان کے معانی کو پیدا کر کے ملائکہ کے سامنے کر دیا۔ اور دریافت فرمایا کہ ان چیزوں کے کیا نام ہیں۔ ذوات اشیاء کے متعلق تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ذوات کو پیدا فرما کر ملائکہ کے روبرو کر دیا ہو۔

لیکن فرح سرور علم جہل قدرت ارادہ وغیرہ معانی اور اوصاف و اعراض کی نسبت سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کس طرح پیش کیا گیا ہوگا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ معانی و اوصاف کے عرض کرنے اور پیش فرمانے کی صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے قلب مبارک میں ان کا القاء فرمایا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں سمجھا اور آپ کو انکا ادراک حاصل ہوا۔ اسی طرح معانی ملائکہ پر بھی پیش کئے گئے۔ دوسرا قول اشیاء کے پیش کرنے کے متعلق یہ ہے کہ اشیاء کی صورتیں آئینہ ہائے قلوب میں جلوہ گر فرما کر انہیں مشاہدہ کرا دیا۔ اس کے بعد ملائکہ سے فرمایا کہ اگر سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔

یہ سوال نہ استفہام ہے نہ ان کو نام بتانے پر مکلف کیا جاتا ہے نہ انبئونی کا امر وجوب کے لئے ہے۔ بلکہ یہ تعجیز ہے یعنی ملائکہ کے عجز کا اظہار منظور ہے اور یہ تنبیہ فرمانا مقصود ہے۔ کہ تم امور خلافت کے سرانجام دینے سے عاجز ہو اس لئے خلافت کے مستحق اور اس کے اہل نہیں۔ کیونکہ تصرف و تدبیر اور عدل کا قائم کرنا جو خلیفہ کے منصبی فرائض میں سے ہے معرفت اور مراتب استعداد کی واقفیت اور حقوق کے جاننے پر موقوف ہے بغیر اس کے عدل و تصرف ناممکن و محال ہے تو اگر تم استحقاق خلافت کے دعوی میں سچے ہو تو ان اشیاء کے اسماء بتاؤ کیونکہ اگر نہ بتا سکے تو ثابت ہوا کہ تمہارا دعوی درست نہ تھا۔ مسئلہ۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔

قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ○

بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بیشک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔

یہ ملائکہ کی طرف سے اپنے عجز و قصور کا اعتراف ہے اور اس میں انہیں یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اُن کے سوال کا منشا خلافت حضرت آدم کی حکمت دریافت کرنا تھا۔ نہ کہ اعتراض کیونکہ وہ یقین سے جانتے تھے کہ حکیم مطلق کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں مگر جو حکمت سمجھ میں نہ آئی اور جو صورت حالات اُن کے زعم میں روکش ہوئی اُس کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے حکمت دریافت کرنے کے لئے سوال کیا (سبحانک لا علم لنا) میں اعتذار بھی ہے اور اس کا اظہار بھی کہ جو حکمت اُن پر مخفی تھی وہ اب ظاہر ہو گئی اور انسان کی فضیلت اور اسکی آفرینش کی حکمت اُن پر منکشف ہو گئی اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو ان کے اس عقدہ کو حل فرمایا اُس کا شکر بھی ہے اور ادباً اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض علم بھی اور اس بات کا اقرار بھی کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس کے ہر فعل میں حکمت بالغہ ہے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ علم عمل سے افضل ہے اور خلوتوں اور تنہائیوں میں عبادت اور زاہدانہ ریاضت سے علم کا مرتبہ برتر ہے کیونکہ باوجود ملائکہ کی خالص عبادت اور تسبیح و تقدیس کے حضرت آدم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کو ملائکہ پر ترجیح دی گئی اور علم اسماء کو ان کے فضل کا مدار قرار دیا گیا، حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم۔ یعنی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عالم کو عابد پر اتنی فضیلت حاصل ہے جیسی مجھ کو تم میں سے ادنیٰ شخص پر۔ مراد یہ ہے کہ عالم کو عابد پر فضل کثیر و شرف کبیر اور مرتبہ عظیم حاصل ہے جس کا اندازہ دشوار ہے حقیقتاً علم کا مرتبہ زہد و ورع سے بہت بالاتر ہے اس لئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا۔ ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بے علم علم والوں کے برابر نہیں ہو سکتے، دوسری آیت میں ارشاد ہوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم یعنی اللہ کی اطاعت کرو رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولو الامر کی اطاعت کرو، اولو الامر سے مراد علماء ہیں، چونکہ بادشاہوں پر ان کی اطاعت واجب ہے اہل علم کی فضیلت میں بکثرت آیتیں وارد ہیں، ایک جگہ فرمایا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اوتوا العلم درجت، دوسری آیت میں ارشاد ہوا انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جسے اُن لوگوں کو دیکھنا پسند ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے نار سے آزاد فرمایا ہے اُنہیں چاہیئے کہ طلبۂ علم کو دیکھیں اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کوئی طالبعلم ایسا نہیں جو عالم کے دروازے پر جاتا ہو مگر اللہ تعالےٰ اس کے ہر ایک قدم کے بدلے ایکسال کی عبادت لکھتا ہے اور ہر قدم کے بدلے اُس کے لئے جنت میں ایک شہر بنا فرماتا ہے اور جب طالب علم زمین پر چلتا ہے زمین اس کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ

فرمایا اے آدم بتادے انہیں سب اشیاء کے نام جب آدم نے انہیں سب کے نام بتا دیئے۔ فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں

غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ○

آسمانوں اور زمینوں کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

ملائکہ کا عجز ظاہر ہونے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے بامر الٰہی تمام اشیاء کے نام بتا دیئے اور ان کی پیدائش میں جو حکمتیں تھیں انکا بیان کیا۔ اب حضرت آدم علیہ السلام کی علمی فضیلت کا اظہار ہو گیا تب اللہ تعالےٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں نے تم سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ میں آسمان و زمین کے غیب جانتا ہوں اور انہیں میں سے احوال آدم بھی ہیں جو تمہیں ان کی خلقت سے پہلے معلوم نہ تھے مگر ہم پر تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ ہم ان کے اس علم و فضل کو جانتے تھے جو تم پر اب ظاہر ہوا اور ہم وہ بھی جانتے ہیں جو تم ظاہر کرتے ہو جیسا کہ تمہارا یہ قول کہ کیا تو زمین میں فساد انگیزی اور خونریزی کرنے والے کو پیدا کریگا اور ہم وہ بھی جانتے ہیں جو تم چھپاتے ہو جیسے تمہارا یہ قول کہ اللہ تعالےٰ ہم سے افضل و اعلیٰ کوئی مخلوق پیدا نہ کریگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما نے فرمایا مَا تُبۡدُوۡنَ سے ملائکہ کی طاعت و عبادت مراد ہے اور مَا تَکۡتُمُوۡنَ سے ابلیس کی معصیت جس کو وہ چھپاتا تھا۔ اس تفسیر پر مطلب یہ ہوگا کہ ہم تمہاری طاعت و عبادت کو بھی جانتے ہیں جس کا تم نے اظہار کیا اور ابلیس کی معصیت نافرمانی کو بھی جس کو چھپایا۔ اس انداز بیان میں ملائکہ پر ایک لطیف تعریض ہے کہ ان سے ترک اولیٰ واقع ہوا کیونکہ ان کے حق میں اولیٰ افضل یہی تھا کہ وہ توقف کرتے اور منتظر رہتے کہ حقیقت حال انپر ظاہر ہو اور خلافت حضرت آدم میں جو حکمت ہے اس سے وہ باخبر کئے جائیں۔

ان آیات سے انسان کی شرافت و فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ ملائکہ کو بھی جو رتبہ نہیں ملا وہ انسان کو عطا فرمایا گیا۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علم بہترین نعمت و جلیل فضیلت ہے اور علم کا مرتبہ عبادت سے بالا ہے اسی لیئے ملائکہ باوجود کثرت عبادت مستحق خلافت نہ ہو سکے۔ انہیں آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علم خلافت کے لئے شرط ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف صحیح و درست ہے اگرچہ لفظاً معلم کا اطلاق اللہ سبحٰنہ تعالےٰ پر جائز نہیں

اور اسکی وجہ یہ ہے کہ عرف میں معلّم پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں، حتیٰ کہ جو شخص تعلیم کو ذریعۂ معاش اور پیشہ نہیں بناتا، وہ اگرچہ تعلیم دیتا ہو، اُسکو معلّم نہیں کہا جاتا۔
نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لغات توقیفی ہیں، یعنی ہماری زبانوں میں جو الفاظ متداول ہیں اور اُن کا کوئی واضع متعین نہیں، اُن کی وضع جانبِ حق سبحٰنہٗ سے ہے۔ ذھب الیہ الشیخ الاشعری وقال ابو ھاشم بالاصطلاح والاستاذ بالتوزیع۔ تعلیم اسمار کے یہی معنی ہیں کہ اسمار مع معنی کے متعلم پر القار کیے جائیں، اور یہ تقدمِ وضع کو مستلزم ہے، اور حضرتِ آدم علیہ السلام سے قبل اور کوئی ایسا ہے نہیں جسکو ان اسمار کا واضع کہہ سکیں۔ تو ظاہر ہے کہ وضع جانبِ حق سبحٰنہٗ سے ہوگی۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ملائکہ کے علوم اور اُنکے کمالات زیادت و ترقی کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیونکہ حکمتِ استخلاف پہلے ملائکہ کو معلوم نہ تھی، اسی لیے اُنھوں نے سوال کیا تھا، اب ظاہر فرمادی گئی تو معلوم ہوگئی، اور علم زیادہ ہوگیا۔ اسی طرح اشیار کے اسمار اُنھیں معلوم نہ تھے، جب حضرتِ آدم علیہ السلام نے بتائے تب معلوم ہوئے۔ اس سے فلاسفہ کے اس خیال کا بطلان ہوتا ہے کہ ملائکہ سماوی وارضی، یعنی نفوسِ مدبّرہ کے سوا ملائکہ کا اعلیٰ طبقہ جسکو فلسفی اپنی اصطلاح میں عقول کہتے ہیں انکے علم میں زیادتی نہیں ہوسکتی، یہ خیال اس آیت نے باطل کردیا۔ نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرتِ آدم ملائکہ سے افضل ہیں، کیونکہ اُن سے اعلم ہیں، اور اعلم افضل ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ نیز آیات نے اس پر بھی دلالت کی کہ اللہ تعالیٰ اشیار کی پیدائش سے قبل ان کا عالم ہے۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو بکثرت صفاتِ حمیدہ و کمالاتِ پسندیدہ عطا فرمائے تھے، اور آفرینشِ آدم میں اُسکی قدرت کی بیشمار حکمتیں موجود تھیں، لیکن حضرتِ آدم کی فضیلت کے اظہار کے لیے اُن میں سے سوائے علم کے کسی کو پیش نہ فرمایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ علم تمام کمالات سے اعلیٰ ہے، کیونکہ عالمِ امکان میں کسی شے کا وجود بھی علم سے اشرف ہوتا تو اس موقع پر اُسی کا اظہار فرمایا جاتا، مگر یہاں علم کے سوا اور کسی کمال کا ذکر نہ فرمانا دلیل ہے اسکی کہ علم سب سے اشرف و اعلیٰ ہے، اور اس پر بہت آیات و احادیث دلالت کرتی ہیں، اور دلائلِ عقلیہ بھی بکثرت قائم ہیں۔ ان میں سے نمونہ کے طور پر ہم چند کو ذکر کرتے ہیں۔

آیاتِ قرآنیہ

آیت (۱) أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔ اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ اولوالامر کی اطاعت واجب فرمائی۔ اولوالامر کی رفعتِ منزلت تعلیم ہوتی ہے، اور اصح اقوال میں اولوالامر سے علمار مراد ہیں، کیونکہ بادشاہوں پر علمار کی اطاعت واجب ہے۔

(۲) شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ۔ ان دونوں آیتوں میں علمار کا ذکر دوسرے مرتبہ میں ہے۔ اس سے اور زیادہ اکرام یہ ہے کہ دو آیتوں میں علمار کو پہلے مرتبہ ذکر فرمایا گیا۔ (۳) مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ۔ (۴) قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ۔ ان دونوں آیتوں میں علمار کا ذکر پہلے مرتبہ میں ہے۔ (۵) يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ۔ درجے بلند فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اُن کے جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے درجات کے لیے چار فریقوں کا ذکر فرمایا۔ ایکؔ مومنینِ اہلِ بدر، جنکے حق میں فرمایا إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے اُنکے دل خائف ہوں، اور جب پڑھی جائیں اُن پر اللہ کی آیتیں تو وہ اُنکے ایمان بڑھائیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھیں، وہ جو نمازیں قائم رکھیں اور ہمارے دیئے ہوئے سے خرچ کریں، وہی سچے مومن ہیں اُن ہی کے لیے اپنے رب کے پاس درجے ہیں۔

دوسؔرا فریق مجاہدین، جنکے حق میں فرمایا وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً۔ اور فضیلت دی اللہ نے مجاہدین کو، بیٹھ رہنے والوں پر بڑے ثواب سے، اُس کی طرف سے درجے اور مغفرت و رحمت۔

تیسؔرا فریق صالحین، جنکے حق میں فرمایا وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ۔ اور جو اُسکے پاس ایماندار ہوکر آئے کہ اُس نے نیک عمل کیے ہوں، تو یہی لوگ ہیں جنکے لیے بلند درجے ہیں۔

چوؔتھا فریق علمار، جنکے حق میں فرمایا وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ۔ اللہ تعالیٰ اُنکے درجے بلند فرماتا ہے، جنکو علم دیا گیا۔

اب دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو دوسرے مومنین پر کئی درجے فضیلت دی۔ اور مجاہدین کو قاعدین پر کئی درجے فضیلت عطا فرمائی۔ اور صالحین کو ان سب سے کئی درجے فضیلت عنایت کی۔ پھر علمار کو ان تمام فریقوں پر درجوں فضیلت مرحمت فرمائی، تو نتیجہ یہ نکلا کہ علمار طبقاتِ انسان میں ان سب سے افضل ہوئے۔

(۶) إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ اللہ تعالیٰ سے اُسکے بندوں میں سے علمار ہی ڈرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں پانچ وصفوں کے ساتھ علمار کی توصیف فرمائی۔ ایکؔ ایمان، چنانچہ فرمایا وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ۔ دوسؔرے توحید و شہادت، چنانچہ فرمایا شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ۔ تیسؔرے بکار، چنانچہ فرمایا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ۔ چوؔتھے خشوع، چنانچہ فرمایا إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا۔ پانچوؔیں خشیت، چنانچہ فرمایا إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔

احادیثِ نبویہ

حدیث (۱) ثابت نے حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور پُرنور رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جسے پسند ہو اُنکو دیکھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے نار یعنی آتشِ جہنم سے آزاد فرمایا، وہ تعلیم دینے والوں کو دیکھے، اُس ذات کی قسم جسکے دستِ قدرت میں میری جان ہے کوئی طالبِ علم ایسا نہیں جو کسی عالم کے در وازہ پر آتا جاتا ہو، مگر اللہ تعالیٰ اُسکے ہر قدم کے بدلے ایک سال کی عبادت لکھتا ہے، اور ہر قدم کے بدلے جنّت میں ایک شہر بناتا ہے، وہ زمین پر چلتا ہے اور زمین اُسکے لیے دعائے مغفرت کرتی ہے وہ شام و سحر کرتا ہے اس حال میں کہ اُسکے گناہوں کی مغفرت فرمادی جاتی ہے، ملائکہ اُنکے لیے گواہی دیتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد فرمائے ہوئے ہیں آتشِ دوزخ سے۔

(۲) حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سرورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کے لیے علم طلب کیا، وہ ایسا ہے جیسا کہ دن میں ہمیشہ روزہ رکھنے والا اور شب میں ہمیشہ بیدار رہ کر مصروفِ عبادت رہنے والا، اور بیشک علمِ دین کا ایک باب جسکو آدمی سیکھتا ہے اُسکے لیے اس سے بہتر ہے کہ ابوقبیس پہاڑ اُسکے لیے سونا ہوجائے اور وہ اسکو راہِ خدا میں خرچ کرڈالے۔ (۳) حضرتِ حسن سے مرفوعًا مروی ہے کہ جسکو اس حال میں موت آئی کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لیے علم کی طلب میں مشغول تھا، اسکے بعد انبیار علیہم السلام کے درمیان جنت میں ایک درجہ ہوگا۔ (۴) حضرتِ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعًا مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو روزِ قیامت اُٹھائے گا، پھر علمار کو ممتاز فرمائیگا، پھر فرمائیگا اے گروہِ علمار میں نے تم پر اپنا نور اسلیے رکھا کہ میرا علم تمہارے ساتھ ہے، اور میں نے تم میں اپنا علم اسلیے نہیں رکھا ہے کہ تمکو عذاب کروں، جاؤ میں نے تمہاری مغفرت فرمادی۔ (۵) حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا نیکی کا تعلیم دینے والا (یعنی عالمِ دین) جب مرتا ہے، تو اُس پر آسمانی پرند اور زمین کے جانور اور دریا کی مچھلیاں روتی ہیں۔ (۶) حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعًا مروی ہے کہ جس نے علما میں سے کسی عالم کے پیچھے نماز پڑھی گویا کہ اُس نے انبیار علیہم السلام سے ایک نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔ (۷) حضرتِ ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعًا مروی ہے کہ عالم کو عابد پر ستّر درجے فضیلت ہے۔ ہر دو درجوں کے درمیان ستّر سال گھوڑے کی دوڑ کا فاصلہ ہے۔ اسکا باعث یہ کہ شیطان لوگوں کیلیے بدعت نکالتا ہے، عالم اُسکو دیکھتا اور اسکا ازالہ کرتا ہے، اور عابد اپنی عبادت میں مشغول رہتا ہے اسکی طرف التفات نہیں کرتا۔ (۸) حضرتِ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ حضور سیدِ انبیار صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم وسلامہٗ نے فرمایا

میرے خلفاء پر اللہ کی رحمت۔ عرض کیا گیا حضور کے خلفاء کون ہیں؟ فرمایا جو میری سنت کو محبوب رکھیں اور اللہ کے بندوں کو اسکی تعلیم دیں۔ (۹) حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص تحصیلِ علم کے لیے سفر میں نکلا اس غرض سے کہ اس سے باطل کو شکست دے اور حق کو واضح کرے، یا ضلال کو شکست دے اور ہدایت کو قوت پہنچائے اُسکا عمل چالیس سال کی عبادت کی برابر ہے۔ (۱۰) حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علیِ مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کی طرف روانہ فرماتے وقت ارشاد فرمایا کہ یقیناً اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت دے، تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اُس سے جس پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے۔ (۱۱) عامر جہنی سے مرفوعاً مروی ہے کہ روزِ قیامت طالب علموں کی دوات کی سیاہی اور شہداء کا خون وزن کیا جائیگا دونوں برابر رہینگے، ان میں سے کوئی دوسرے پر نہ بڑھے گا۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ علماء کی روشنائی غالب ہو جائے گی ——— اسکے علاوہ بکثرت احادیث علم کی فضیلت میں وارد ہیں۔ اب چند آثار بزرگوں کے ذکر کیے جاتے ہیں۔

آثار (۱) عالم شاگرد پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہوتا ہے، کیونکہ ماں باپ اولاد کو دنیا کی اور دنیا کی آفات سے بچانے کی سعی کرتے ہیں، اور علماء اپنے تلامذہ کو آخرت کی آگ اور وہاں کے شدائد سے بچاتے ہیں۔ (۲) حضرتِ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے ایسا بڑا علم کسطرح حاصل کیا؟ فرمایا زبانِ سائل وقلب عاقل سے۔ مُراد یہ ہے کہ انسان کو طلبِ علم کے لیے سوال کرنے سے نہ شرمانا چاہیئے، اور عالم کی باتوں کو غور کر کے عقل سے سمجھنا چاہیئے۔ (۳) بعض اکابر نے فرمایا نادانوں کی طرح پوچھو، اور ہوشیاروں کی طرح یاد رکھو۔ کیا خوب تعلیم ہے! دریافت کرنے میں پندار اور خود بینی دخل نہ پا سکے، ورنہ فیضِ علم حاصل نہ ہو سکے گا، اور جب علماء مسئلہ بتائیں تو اُسکو پوری توجہ کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے۔ (۴) مصعب ابنِ زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے فرزندِ ارجمند سے فرمایا، اے نورِ نظر! علم حاصل کر، اگر تیرے پاس مال ہوا تو علم تیرے لیے جمال ہوگا، اور اگر مال نہ ہوگا، تو علم ہی تیرا مال ہوگا۔ (۵) حضرتِ علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، عالم کی خاموشی بہتر نہیں، جیسا کہ جاہل کی گفتگو بہتر نہیں۔ (۶) بعض محققین نے فرمایا عالم تین قسم کے ہیں، ایک عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ، دوسرا عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ، تیسرا عالم باللہ و بامر اللہ۔ پہلا تو وہ بندہ ہے جسکے قلب پر معرفتِ الٰہیہ کا استیلا ہو، اور وہ مشاہدہ نورِ جلال میں مستغرق ہو گیا، اور قدرے ضروری کے سوا زائد علمِ احکام کے سیکھنے کی اسکو فراغت نہ ملی۔ دوسرا وہ ہے جس نے حلال وحرام و حقائقِ احکام کو پہچانا، لیکن اسرارِ جلالِ الٰہی کی معرفت حاصل نہ کر سکا۔ تیسرا وہ ہے جو عالم معقولات ومحسوسات کی حدِ مشترک پر جالس ہے۔ کبھی تو اُسکو عشقِ الٰہی میں مع اللہ کا مقام حاصل ہوتا ہے، اور کبھی شفقت و رحمت کے ساتھ خلق کی معیت میں ہوتا ہے، جب رب کی طرف سے خلق کی جانب متوجہ ہوتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ انہی میں سے ہی اور جب اپنے رب کے ذکر و طاعت میں ہوتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلق کو جانتا ہی نہیں، یہ طریقہ مرسلین و صدیقین کا ہے۔ حضرت شقیق بلخی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ان تینوں میں سے ہر ایک کے لیے تین تین علامتیں ہیں، عالم بامر اللہ غیر عالم باللہ کی علامتیں یہ ہیں کہ اُس کی زبان ذاکر ہوتی ہے نہ دل اور وہ خلق سے ڈرتا ہے نہ خدا سے، اور وہ لوگوں سے ظاہری شرم رکھتا ہے اور نہ اللہ سے باطنی۔ (معاذ اللہ)۔ عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ، اُسکا دل ذاکر ہوتا ہے نہ زبان، اور اُسکو ریا کا خوف ہوتا ہے نہ کہ معصیت کا، اور خطرات قلب سے اُس کو حیا ہوتی ہے نہ کہ ظاہر سے۔ عالم باللہ و بامر اللہ، اس میں چھ علامتیں ہوتی ہیں، تین تو وہ ہوتی ہیں جو عالم باللہ غیر عالم بامر اللہ کے حق میں مذکور ہوئیں، اور تین اُنکے علاوہ یہ ہیں کہ ایک تو وہ عالمِ غیب و عالمِ شہادت کی حدِ مشترک پر جالس ہوتا ہے، دوسری یہ کہ وہ دونوں گروہوں یعنی عالم باللہ و عالم بامر اللہ کا معلم و اُستاد ہوتا ہے، تیسری یہ کہ یہ دونوں فریق اسکے محتاج ہوتے ہیں اور وہ اُن سے غنی ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم باللہ و بامر اللہ آفتاب کی طرح نہ بڑھے نہ گھٹے، اور عالم باللہ قمر کی طرح ہے کبھی کامل ہوتا ہے کبھی ناقص ہوتا ہے، اور عالم بامر اللہ کی مثال چراغ کی طرح ہے، جو آپ تو جلتا ہے اور دوسرے کو روشن کرتا ہے۔ (۷) فتح موصلی نے فرمایا کہ مریض سے جب کھانا پینا دوا سب روک لی جائے، تو کیا وہ مر نہ جائیگا؟ یہی دل کا حال ہے جب اُس سے علم و فکر و حکمت کو روک دیا جاتا ہے، مُردہ ہو جاتا ہے۔ (۸) حضرت شقیق بلخی نے فرمایا، میری مجلس سے تین قسم کے لوگ اُٹھتے ہیں، ایک کافرِ محض، ایک منافقِ محض، ایک مومن خالص۔ کیونکہ میں قرآنِ پاک کی تفسیر بیان کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ اور اُسکے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکام سُناتا ہوں، تو جو اُس میں میری تصدیق نہ کرے وہ کافرِ محض ہے، اور جسکا دل اُس سے تنگ ہو وہ منافقِ محض ہے، اور جو اپنے گناہ پر نادم ہو اور آئندہ گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرے وہ مومنِ خالص ہے۔

(۹) حضرت علیِ مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا علم کو مال پر سات وجہ سے فضیلت ہے۔ اوّل یہ کہ علم انبیاء کا ورثہ ہے اور مال فراعنہ کی میراث۔ دوم علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا اور مال گھٹ جاتا ہے۔ سوم مال نگہبان کا محتاج ہے، اور علم صاحبِ علم کا محافظ ہے۔ چہارم مرنے کے بعد مال یہیں رہ جاتا ہے، اور علم قبر میں ساتھ جاتا ہے۔ پنجم مال مومن، کافر سب کو حاصل ہوتا ہے، اور علم صرف مومن کو۔ ششم تمام لوگ دینی امور میں عالم کے محتاج ہیں، نہ صاحبِ مال کے۔ ہفتم علم راہِ صراط پر گزرنے میں مدد دیگا نہ مال۔ (۱۰) فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ نے فرمایا جو شخص عالم کی صحبت میں بیٹھے اور اُسکی باتوں کو یاد بھی نہ رکھ سکے، اُسکو بھی سات فضیلتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اُسکو طالب علموں کی فضیلت اور اُسکا ثواب ملتا ہے۔ دوم جبتک علماء کی خدمت میں حاضر رہے گناہوں سے بچتا ہے۔ سوم یہ کہ جب اپنے گھر سے اُنکے مکان کی طرف طلبِ علم کے لیے چلے اُس پر رحمت نازل ہوتی ہے۔ چہارم مجلسِ علم میں جو رحمتِ الٰہی نازل ہوتی ہے اُس میں سے حصہ پاتا ہے۔ پنجم جب تک علماء کی باتیں سنتا ہے اُسکے لیے عبادت لکھی جاتی ہے۔ ششم جب عالم کی بات سُنتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتی، اِس سے اُسکا دل تنگ ہوتا ہے، تو بارگاہِ الٰہی میں یہ غم وسیلہ ہوتا ہے اُسکا کہ جو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں ٹوٹے دلوں کے پاس ہوں، اسکے انقباض کو دُور فرماتا ہے۔ ہفتم جب یہ دیکھتا ہے کہ مسلمان عالم کی عزت کرتے ہیں، اور فاسق کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تو اُسکا دل فسق سے متنفر اور علم کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صالحین کے پاس بیٹھنے کا حکم فرمایا ہے۔

فقیہ ابو اللیث نے فرمایا آٹھ قسم کے لوگ ہیں جنکی ہمنشینی سے آٹھ باتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اغنیاء کی ہمنشینی سے دنیا کی محبت و رغبت۔ فقراء کی صحبت سے شکر و صبر۔ بادشاہوں کی حضوری سے تکبر و قساوتِ قلب۔ عورتوں کے پاس بیٹھنے سے جہل و شہوت۔ بچوں کے پاس بیٹھنے سے لہو و تمسخر۔ فاسقوں کی رفاقت سے گناہوں پر جرأت اور توبہ میں سستی۔ صالحین کے قرب سے طاعت کی رغبت۔ علماء کی خدمت سے علم و تقویٰ۔ (۱۱) حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ روزِ قیامت سونے کے منبر قائم کیئے جائینگے اُن پر نقرئی قبے نصب ہونگے، جو ہر و ارید یاقوت وغیرہ جواہرات سے مرصع ہونگے، اُن پر سندس و استبرق کے نفیس ریشمی غلاف ہونگے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی ندا کریگا، کہاں ہیں وہ جو رضائے حق کے لیے اُمتِ محمدیہ کی طرف علم کے حامل ہوئے، اِن منبروں پر جلوس فرمائیں، تم پر کوئی خوف نہیں، یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو۔

حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا اُمتِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علماء و حکماء ہیں، فقہ کی بدولت وہ پرتوِ انبیاء ہیں، تھوڑے رزق پر اللہ سے راضی ہیں، اور اللہ تعالیٰ تھوڑے عمل پر اُن سے راضی، لا اِلٰہ اِلّا اللہ کے ساتھ جنت میں داخل ہونگے۔

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جسکے قدم طلب علم میں غبار آلود ہوئے، اللہ تعالیٰ اُسکے جسم کو آگ پر حرام فرماتا ہے، اور اُسکے لیے فرشتے استغفار کرتے ہیں۔ اور اگر وہ راہِ خدا میں مر جائے، تو شہید مرے، اور اُسکی قبر جنت کا باغ ہو جائے گی، اور اُس کی قبر میں تاحدِ نظر وسعت کیجاتی ہے، اور اُسکے دائیں بائیں آگے پیچھے چالیس چالیس قبریں منور کیجاتی ہیں۔ عالم کا سونا عبادت، باتیں تسبیح، انفاس صدقہ ہیں، ہر قطرۂ اشک جو اُس کی آنکھ سے نکلے جہنم کے ایک قطعہ کو سرد کرتا ہے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص علمِ دین کی طلب میں راہ چلے، اللہ تعالیٰ اُسکے لیے راہِ جنت آسان فرماتا ہے، جو قوم اللہ کی مسجدوں میں سے کسی مسجد میں قرآن پاک کی تلاوت کرے اور اُسکا درس رکھے اس پر سکینہ نازل ہوتی ہے، اور رحمتِ الٰہی اُسکو چھپا لیتی ہے، اور ملائکہ اُس پر چھا جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ میں اُسکا ذکر فرماتا ہے۔

حضور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزِ قیامت تین گروہ شفاعت کرینگے، انبیا، پھر علما، پھر شہدا۔ حضور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدمی مرجاتا ہے اسکے عمل منقطع ہوجاتے ہیں بجز تین کے، ایک تو صدقۂ جاریہ، اور ایک علمِ نافع، اور نیک اولاد جو اسکے لیے دعائے خیر کرے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ عالم بن یا طالبِ علم یا سامع یا محب پانچواں نہ بن کہ ہلاک ہوجائیگا۔ ایک اور حدیث میں وارد ہوا کہ حضور نے فرمایا آدمی دو ہی ہیں عالم یا طالبِ علم، باقی ہیچ، اُن میں کچھ بھلائی نہیں۔ راوی نے ان دونوں حدیثوں میں اسطرح توفیق دی ہے کہ پہلی میں عالم وطالبِ علم کے سوا مستمع ومحب کا جو ذکر ہے، وہ دونوں بمنزلہ متعلم کے ہیں، حدیثِ ثانی میں اسی کا لحاظ فرماکر متعلم کے ذکر پر اکتفا فرمایا گیا کہ اسکے متعلقات کا جداگانہ ذکر ضروری نہیں ہے۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کے مفاتیح اور انبیار کے خلفا، علما ہیں۔ راوی نے کہا کہ اسکے معنی یہ ہیں کہ علمار کا علم جنت کی کنجی ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ جو خواب میں دیکھے کہ اسکے ہاتھ میں جنت کی کنجیاں ہیں، تو اسکی تعبیر یہ ہے کہ اسکو علمِ دین حاصل ہوگا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ ہمنے جبریل سے فرمایا، میری امت کے لیے کون عمل بہتر ہے؟ اُنھوں نے عرض کیا علم۔ ہمنے ارشاد فرمایا، اسکے بعد کون عمل بہتر ہے؟ انھوں نے عرض کیا، عالم کا دیدار۔ پھر ہمنے فرمایا، اسکے بعد کس عمل کا مرتبہ ہے؟ عرض کیا عالم کی زیارت کا۔ فرمایا جس نے اللہ کے لیے علم تحصیل کیا، اور اُس سے اپنی اور مسلمانوں کی درستی واصلاح کی نیت کی، اور طلبِ دنیا کا خیال نہ کیا، اُسکے لیے جنت کا ضامن ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا دس گروہ مستجاب الدعوات ہیں۔ ایک عالم، دوسرا طالبِ علم، تیسرا خوش خلق، چوتھا بیمار، پانچواں یتیم، چھٹا غازی، ساتواں حاجی، آٹھواں مسلمانوں کا خیر اندیش، نواں اپنے ماں باپ کا فرمانبردار فرزند، دسویں شوہر کی اطاعت کرنے والی بی بی۔ ایک مرتبہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک شخص سے گفتگو فرمارہے تھے، آپ کے پاس اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ جس سے آپ بات کررہے ہیں اسکی عمر صرف ایک ساعت (ایک گھنٹہ) باقی رہ گئی ہے، یہ عصر کا وقت تھا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُسکو اِس پر خبردار کیا، وہ نہایت مضطرب ہُوا، کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم مجھے اسوقت کوئی کارآمد عمل بتائیے۔ فرمایا علم سیکھنے میں مشغول ہو۔ وہ تحصیلِ علم میں مشغول ہوگیا اور قبلِ مغرب اُسکی رُوح قبض کرلی گئی۔ راوی کا قول ہے کہ اگر کوئی چیز علم سے مرتبہ میں برتر ہوتی، تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسوقت میں اُسکو وہی تعلیم فرماتے۔ حدیث شریف میں ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ عالموں کے سوا باقی تمام انسان مُردے ہیں۔ سبحان اللہ کیا نفیس ارشاد فرمایا، یقیناً علم ہی حیات ہے، اور بے علمی موت۔ حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا سات چیزیں ہیں کہ جو بندہ کی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہیں۔ جس شخص نے علم سیکھا اُسکا علم، جس نے نہر جاری کی، جس نے کنواں کھدوایا، جس نے مسجد بنائی، جس نے قرآنِ پاک دیا، جس نے نیک بیٹا چھوڑا جو اُسکے لیے دعائے خیر کرتا ہے، جس نے ایسا صدقہ دیا جو اُسکی موت کے بعد باقی رہے۔ یہ تمام نیکیاں موت کے بعد باقی رہنے والی ہیں، ان سب میں حضور نے تعلیم کو مقدم فرمایا، کیونکہ وہ روحانی ہے اور روحانی جسمانیات سے زیادہ باقی رہنے والی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا علمار کی صحبت میں نہ بیٹھو، مگر جبکہ وہ تمہیں پانچ چیزوں کی طرف دعوت دیں، شک سے یقین کی طرف، تکبر سے تواضع کی طرف، عداوت سے خیر خواہی کی طرف، ریا سے اخلاص کی طرف، رغبت سے ضعف کی طرف۔ حضور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت مولیٰ علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہٗ کو وصیت فرمائی کہ اے علی تم توحید کے محافظ رہو، وہ میرا راس المال یعنی اصل سرمایہ ہے۔ عمل کو لازم رکھو، وہ میرا پیشہ ہے۔ نماز کو قایم کرو، وہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ رب کا ذکر کرو، وہ میرے دل کی بینائی ہے۔ علم کو کام میں لاؤ، وہ میری میراث ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے اس حال میں کہ اُس پر تہامہ کے پہاڑ کی برابر گناہ ہوتے ہیں، جب وہ علم کی باتیں سنتا ہے، اور خوفِ الٰہی اُس میں پیدا ہوتا ہے، اور وہ اپنے گناہوں پر نادم ہوکر رجوع الی اللہ کرتا ہے، تو اپنے گھر کی طرف ایسا پاک وصاف واپس آتا ہے کہ اُس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، تو تم علمار کی مجالس نہ چھوڑو۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی خاک مجالسِ علمار سے زیادہ کرامت والی نہ پیدا کی۔ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ سلیمان علیہ السلام کو اختیار دیا تھا کہ ملک ومال اور علم میں سے جو چاہیں پسند فرمائیں۔ حضرت نے علم پسند فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے علم وملک دونوں مرحمت فرمائے۔ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنے صاحبزادہ کو وصیت فرمائی، اے فرزند علم کو لازم کر کہ وہ مروّت کی دلیل ہے، وحشت کا مونس ہے، غربت ومسافرت کا رفیق ہے، حضر کا قرین وہمنشین ہے، مجلس میں صدر ہے، جب کوئی وسیلہ نہ رہے تو وسیلہ ہے، ناداری کیوقت غنا ہے، کم رتبہ کے لیے ذریعۂ رفعتِ مرتبت ہے، صاحبِ شرافت کے لیے کمال ہے، بادشاہ کے لیے جلالت ہے۔ حضرتِ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا عالم کے قلم کی آواز تسبیح ہے علمی مضامین کا لکھنا عبادت ہے، علما کی دوات کی سیاہی کسی کپڑے میں لگ جائے تو گویا شہید کا خون لگ گیا، اور اگر کوئی قطرہ اُسکا زمین پر گرجائے، تو زمین اُسکے نور سے چمک اٹھتی ہے جب عالم اپنی قبر سے اُٹھے گا، تو اہلِ محشر اُسکی طرف دیکھیں گے، اور کہا جائیگا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے وہ بندہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے کرامت عطا فرمائی، اور عالم کا حشر انبیار علیہم السلام کے ساتھ ہوگا۔ کسی حکیم سے کہا گیا مت دیکھ، اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کہا گیا مت سن، اُس نے کان بند کرلیے۔ پھر کہا گیا مت بول، اُس نے مُونھ پر ہاتھ رکھ لیا، پھر کہا گیا مت جان، اُس نے کہا میں اس پر قادر نہیں۔ ایک حکیم کا قول ہے اپنے بھائیوں کے دل اپنے بصیرت افروز بیانوں سے زندہ کرو، جیسا کہ مُردہ زمینوں کو زندہ کرتے ہو، اسلیے کہ ایک جان اگر شہوات وشبہات سے نجات پائے، تو اُس زمین سے بہتر ہے، جو نبات یعنی سبزہ کے قابل ہوجائے دفی الجہل قبل الموت موت لاھلہ واجسامہم قبل القبور قبور وان امرأ لم یحیی بالعلم میت ولیس لہ حتی النشور نشور۔

نکات حضرتِ یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جب بادشاہ ہوئے، آپ کو وزیر کی حاجت ہوئی، پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں عرض کی، حضرتِ جبریل آئے اور پیامِ الٰہی لائے کہ فلاں شخص کو وزیر بنالیجئے۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ملاحظہ فرمایا، تو وہ بہت شکستہ حال تھا، آپ نے حضرتِ جبریل سے فرمایا کہ یہ شخص بایں حال کسطرح وزارت کے لائق ہے، اسکی تجویز میں کیا حکمت ہے؟ حضرتِ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندہ کو آپ کی وزارت کے لیے اسواسطے متعین فرمایا کہ اس نے آپ پر سے طعن دفع کیا تھا، اور یہ کہا تھا کہ اِنْ کَانَ قَمِیْصُہٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَکَذَبَتْ وَھُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا کُرتا پیچھے سے پھٹا ہو، تو وہ جھوٹی ہے اور حضرتِ یوسف علیہ السلام سچے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ جس نے حضرتِ یوسف علیہ السلام پر سے طعنِ مخالف کو دفع کیا، دنیا میں اُسکی جزا یہ پائی کہ آپ کی سلطنت میں شرکت کا مستحق کردیا گیا۔ تو جو شخص دینِ قویم سے دشمنِ ملّت کے مطاعن کو برہانِ مستقیم کے ساتھ دفع کرے، وہ کیوں نہ اسلام کے کرم واحسان سے مستحق اجرِ عظیم ہوگا! (سبحان اللہ انبیار کی ساحتِ عزت وجلالت میں ایک کلمۂ موافقت تائید، انسان کو کن نعمتوں کا مستحق بناتا ہے۔

ایک صاحب نے بادشاہ کے یہاں درخواست دی کہ اُنھیں شاہی خدمات پر مقرر فرمایا جائے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ پہلے تحصیلِ علم کرو، جب قابلیت پیدا ہوجائے، اور میری خدمت کے لائق ہوجاؤ تب آؤ۔ اُنھوں نے جاکر تحصیلِ علم شروع کردی۔ اس میں مشغول ہوگئے، اور علم کی لذت میں اُنھیں شاہی خدمت کا ذوق بھی نہ رہا۔ ایک مدت کے بعد بادشاہ نے اُنکے پاس ایک حکمنامہ بھیجا، جس کا یہ مضمون تھا کہ "آپ کی قابلیت کا حال معلوم ہُوا، اب آپ خدمتِ شاہی کے قابل ہوگئے ہیں، مدرسہ چھوڑ دیجئے چلے آیئے کہ آپ کو دربارِ سلطانی کی جلیل خدمت پر مامور کیا جائیگا"۔ اُنھوں نے اسکے جواب میں تحریر فرمایا کہ "میں اُسی وقت تیری خدمت کے لائق تھا جب تو نے مجھے اس قابل نہ سمجھا تھا، اب جو تو مجھے شایانِ خدمت خیال کرتا ہے، میں اِسوقت اپنے آپ کو طاعتِ الٰہی کا اہل پاتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ اُسوقت جہل کی وجہ سے میں تیرے بھی دروازہ کو بابِ نعمت سمجھتا تھا، اور اب رب العالمین کے دروازہ پر میری نظر ہے ایک حکیم کا قول ہے کہ قلب مُردہ ہے، تو اُسکی زندگانی علم ہے، اور علم مُردہ ہے، تو اُسکی جان طلب ہے، اور طلب کمزور ہے، تو اُسکی قوت مدارست ہے۔ جب وہ مدارست سے قوت پائے تو محجوب رہتا ہے، اُسکا اظہار مناظرہ سے ہے۔ جب مناظرہ سے ظہور ہو، تو وہ عقیم (بے اولاد) ہے، اور اسکا انتاج (بارور ہونا) عمل کے ساتھ ہے، جب علم کی عمل سے تزویج ہو، تو اُس کی

نسل و نتیجہ ابدی ہے جس کی نہایت نہیں ۔

نکتہ: کتّا جبکہ اُسکو شکار سکھایا جائے، اور آدابِ شکار کا عادی بنالیا جائے، تو اُسکو مُعلَّم کہتے ہیں، جب مالک اس کُتّے کو بِسمِ اللہِ اللہُ اَکبَر کہکر شکار پر چھوڑتا ہے تو اُسکا شکار پاک ہوتا ہے، باوجودیکہ کتّا ناپاک ہے، جس چیز میں مُونھ ڈالدے وہ ناپاک ہوجائے، مگر یہ علم کی برکت ہے کہ تعلیم کی بدولت اُسکا شکار طاہر رہتا ہے۔ نفس و روح اصلِ فطرت میں طاہر ہیں، مگر گناہوں کی نجاستوں سے ملوّث ہوگئے، اسکے بعد اگر تعلیم پائیں، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم حاصل کرلیں، تو اُسکے لطفِ عمیم سے اُمید ہے کہ نجس کو طاہر، اور مردود کو مقبول بنائے ۔

حکایات

ہارون رشید بادشاہ کی صحبت میں اکثر علماء و فقہاء رہتے تھے۔ ایک روز اُس کی مجلس میں فقہاء کا مجمع تھا، اور اُس جماعت میں حضرت امام ابو یوسف (تلمیذ امام اعظم) رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تشریف فرما تھے۔ ایک آدمی پکڑ کر لایا گیا، جس پر ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے رات کو اُسکے گھر سے مال لیا ہے۔ لینے والے سے دریافت کیا تو اُس نے اقرار کرلیا۔ فقہاء نے بالاتفاق اُسکے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا، اسکے ہاتھ نہ کاٹے جائینگے۔ فقہاء نے اسکی وجہ دریافت کی۔ فرمایا اس نے لینے کا اقرار کیا ہے، چوری کا نہیں کیا، اور ہاتھ چوری پر کاٹے جاتے ہیں۔ تمام فقہاء نے اسکو تسلیم کیا۔ اور پھر دوبارہ اُس شخص سے دریافت کیا کہ کیا تونے وہ مال چُرایا تھا؟ اُس نے اسکا بھی اقرار کیا۔ ابتو تمام فقہاء نے باتفاق حکم دیدیا کہ اسکا ہاتھ کاٹنا واجب ہے، کیونکہ اس نے سرقہ کا اقرار کرلیا۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ہاتھ نہ کاٹا جائیگا، اسلیے کہ اس شخص نے اگرچہ سرقہ کا اقرار کیا ہے، لیکن اقرار بالاخذ سے ضمان واجب ہونے کے بعد تو اس اقرار سرقہ سے وہ اپنے اُوپر سے ضمان ساقط کرتا ہے، اسلیے اسکا اقرار مسموع و مقبول نہ ہوگا، تمام فقہاء نے اس کو بھی تسلیم کیا، اور وہ آپ کے وفورِ علم تعجب میں رہ گئے ۔

شعبی سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ میں حجاج بن یوسف کے پاس تھا (یہ بڑا ظالم بادشاہ گزرا ہے) کہ یحییٰ ابن یعمر فقیہ خراسان سے بلخ گرفتار کرکے اُسکے سامنے لائے گئے، اُنکے پاؤوں میں آہنی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حجاج نے اُن سے کہا وہ تم ہی ہو جسکا خیال ہے کہ حسن اور حسین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذرّیت ہیں؟ اُنھوں نے فرمایا کہ ہاں۔ حجاج نے کہا کہ یا تو قرآن پاک سے اسکی واضح دلیل لائیے، ورنہ میں آپکے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالوں گا۔ فرمایا میں اسکی واضح دلیل پیش کرونگا اے حجاج۔ شعبی کہتے ہیں کہ مجھے اُنکی جراٴت سے تعجب ہوا کہ اُنھوں نے اُسکے سامنے "یا حجاج" کا لفظ فرمادیا، کیونکہ حجاج "کے معنی "جھگڑالو" کے ہیں۔ حجاج نے کہا اور یہ آیت نہ پیش کرنا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ الخ۔ یحییٰ ابن یعمر نے یہ آیت پیش فرمائی وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى۔ فرمایا کہ عیسیٰ کے باپ کا نام معلوم ہو تو بتا؟ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ذرّیتِ نوح میں داخل فرمایا، باوجودیکہ وہ ماں ہی کی طرف ملتے ہیں، یعنی جب وہ اپنی والدہ وساطت سے ذرّیتِ نوح میں داخل ہوئے، تو کیا وجہ اماميين کریمین حسنین جمیلین اپنی والدہ کی وساطت سے اولادِ رسول نہ قرار پائیں؟ اس جواب نے حجاج کو حیرت میں ڈالدیا، اور دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔ سر اُٹھا کر کہنے لگا کہ میں نے گویا کہ یہ آیت پڑھی ہی نہ تھی، ان قید توڑ دو، اور مالِ کثیر نذر پیش کرنے کا حکم دیا۔ سُبحَانَ اللہ !

ایک مرتبہ اہلِ مدینہ کی ایک جماعت حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اسلیے آئی کہ مسئلہ قراٴت خلف الامام میں آپ سے مناظرہ کرے، اور اُنھوں نے آکر شور و شغب شروع کردیا، اور طعن و تشنیع کے درپے ہوگئے۔ امام صاحب نے فرمایا، یہ کسطرح ممکن ہے کہ ایک شخص اتنی بڑی جماعت میں سب سے ایک ساتھ مناظرہ کرے، اگر مناظرہ منظور ہے، تو اپنی جماعت میں جسکو سب سے زیادہ اعلم اور قابل سمجھو اُسکو معیّن کردو، میں اُسسے مناظرہ کرونگا۔ اُنھوں نے اپنی جماعت میں سے ایک شخص کو منتخب کرلیا۔ امام صاحب نے دریافت فرمایا کہ تمہیں اتفاق ہے کہ یہ تم میں سب سے بڑا عالم ہے؟ اُنھوں نے اقرار کیا۔ پھر امام صاحب نے فرمایا کہ اسکے ساتھ مناظرہ کرنا تم سب سے مناظرہ ہوجائیگا؟ اُنھوں نے کہا ہاں۔ فرمایا اس پر جو الزام قائم کیا جائیگا وہ تم سب پر ہوگا؟ انھوں نے کہا ہاں۔ فرمایا کہ اگر میں اس سے مناظرہ کروں اور اس پر حجّت لازم کروں، تو تم سب پر لازم ہوگی؟ اُنھوں نے کہا ہاں۔ امام نے فرمایا یہ کسطرح؟ اُنھوں نے کہا کہ یہ اسلیے کہ اسے ہمنے اپنا امام مان لیا، تو اسکا قول ہمارا ہی قول ہوگا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یہ بات ہے، تو مسئلہ طے ہوگیا۔ ہم بھی نماز میں جس شخص کو امام بنا لیتے ہیں، اُسکی قراٴت ہماری ہی قراٴت ہوتی ہے، وہ قراٴت میں ہمارا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے۔ سب نے امام کے اس جواب کو پسند کیا، اور اس الزام کا اقرار کیا کہ ٹھیک ہے ۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا، اُس نے کہا کہ میں نے قسم کھائی کہ میں اپنی عورت سے کلام نہ کرونگا جبتک وہ خود مجھ سے نہ بولے، اور اُس نے بھی قسم کھائی کہ وہ اگر مجھ سے بولے تو اُسکا سارا مال صدقہ ہے جبتک کہ میں اُس سے کلام نہ کروں۔ فقہاء اس میں متحیر ہوگئے۔ سفیان نے فرمایا کہ ان میں سے جو کوئی بھی بولے گا حانث ہوجائیگا اُس کی قسم ٹوٹ جائیگی۔ حضرتِ امام نے فرمایا جا کلام کر، تم دونوں میں سے کوئی حانث نہ ہوگا، کسی کی قسم نہ ٹوٹے گی۔ وہ شخص حضرتِ سفیان کے پاس پہنچا اور اُنھیں خبر دی کہ حضرتِ امام اعظم نے یہ حکم دیا ہے۔ اُن کو بہت طیش آیا، اور وہ حضرتِ امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے "تم حرام کو حلال کرتے ہو؟ امام صاحب نے فرمایا کہاں! سفیان نے اُن لوگوں سے کہا کہ پھر انکے سامنے سوال بیان کرو، اُنھوں نے پھر سوال بیان کیا۔ امام صاحب نے پھر وہی فتویٰ دیدیا۔ سفیان نے کہا یہ آپ کہاں سے کہتے ہیں؟ فرمایا مرد کی قسم کھانے کے بعد، جب عورت نے اُس سے یہ کہا کہ اگر میں تجھ سے کلام کروں تو میرا سارا مال صدقہ ہے، تو یہ کلام ہی تو ہوگیا، اب مرد کی قسم پوری ہوگئی، اس حالت میں وہ اس سے کلام کرے، تو وہ حنث نہیں، اور مرد کے کلام کرنیکے بعد پھر عورت اُس سے کلام کرے، تو حنث نہیں قسمیں دونوں سے ساقط ہوگئیں۔ سفیان نے کہا کہ آپ پر علم کے وہ رموز کھلتے ہیں، جن سے ہم غافل ہیں۔

ایک آدمی کے گھر میں چور گھسے، اور اُسکے گھر کا تمام مال متاع لے لیا، اسکے بعد اُسے پکڑ کر قسم دلائی کہ کسی کا اُنکا نام نہ بتائے، ورنہ اسکی عورت پر تین طلاقیں۔ اُس نے مجبور ہوکر کہدیا کہ میں اگر کسی سے کہوں کہ تم نے چُرایا ہے یا تمہارا نام بتاؤں تو میری بیوی پر تین طلاقیں۔ اب صبح ہوئی تو چور اُسکا مال اُسکے سامنے بیچ رہے ہیں اور وہ بول نہیں سکتا۔ نہایت پریشان حضرت امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ حضور چوروں نے مجھے ایسی قسم دلائی، اور اب میرا مال میرے سامنے بک رہا ہے اور میں دم نہیں مار سکتا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اپنی مسجد کے امام اور اہلِ محلہ کو میرے پاس بُلالا۔ وہ بُلالایا، امام صاحب نے اُن سے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اسکا سامان اسے واپس دلادے؟ اُن سب نے کہا ہاں۔ فرمایا تو تمام اہلِ محلہ کو ایک مکان میں جمع کرو، اور ایک ایک کو نکالو، اور اس سے کہو کہ یہ تیرا چور ہے؟ جو چور نہ ہو اسکی نسبت کہدے کہ یہ چور نہیں ہے، اور جو چور ہو، اُس کی نسبت کچھ نہ کہے چُپ رہے، اُس کو پکڑ لو اس طرح وہ چوری پکڑی گئی اور اُس کا مال واپس ہوا۔

لیث بن سعد سے منقول ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ایک شخص نے عرض کیا، میرا بیٹا بہت بدخصلت ہے، اُسکیلیے لونڈی خریدتا ہوں مالِ کثیر خرچ کرتا ہوں، آزاد کردیتا ہے۔ کسی عورت سے گرانقدر مہر پر اُسکا نکاح کردیتا ہوں، تو طلاق دیدیتا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اُسے بردہ فروشوں کے بازار میں لیجا، جس کنیز پر اُس کی نظر پڑے اُسکو تو خریدلے، اپنی ملک پر خریدلے۔ پھر اُسکے ساتھ نکاح کردے۔ اگر وہ اُسے طلاق دیدیگا تو تیری ملک میں باقی رہ جائیگی، آزاد کرنا چاہیگا تو اُسکے آزاد کرنے سے آزاد نہ ہوگی۔ لیث کہتے ہیں کہ جواب تو تھا ہی حیرتناک، اُس سے زیادہ عجیب بات مجھے سُرعتِ جواب معلوم ہوئی کہ ذرا بھی فکر کی حاجت پیش نہ آئی ۔

حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک مرتبہ یہ سوال پیش ہوا کہ ایک شخص نے قسم کھائی ہے کہ وہ ماہِ رمضان میں دن کے وقت اپنی بیوی سے قربت کریگا اسکا جواب کسی سے بن نہ آیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اپنی عورت کو ساتھ لیکر سفر کرے اور رمضان کے دن میں اُس سے قربت کرے قسم پوری ہوجائے گی ۔

رشید خلیفہ نے ایک روز حضرت امام ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا جعفر بن عیسیٰ کے پاس ایک کنیز ہے، اُس سے مجھے کمال محبت ہے۔ جعفر کو جب یہ بات معلوم ہوئی

تو اُس نے قسم کھالی کہ نہ بیچے نہ ہبہ کرے نہ آزاد کرے۔ اور اب وہ چاہتا ہے مگر قسم سے مجبور ہے۔ فرمایا نصف ہبہ کر دے نصف بیع کر دے حانث نہ ہوگا۔

ایک روز امام محمد بن حسن شیبانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شب کو استراحت فرما رہے تھے کہ اچانک کسی نے دروازہ پر کھٹکا کیا۔ فرمایا دیکھو کون ہے؟ خدام نے عرض کیا، خلیفہ کا قاصد حضور کو بلانے آیا ہے۔ فرماتے ہیں مجھے اپنی جان کا خوف ہوا، خیر میں اُٹھ کر چلا، جب دربارِ شاہی میں داخل ہوا، تو خلیفہ نے کہا کہ میں نے آپ کو ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لیے تکلیف دی ہے، وہ یہ ہے کہ میں نے اپنی بی بی زبیدہ خاتون سے کہا تھا کہ میں امام عادل ہوں، اور امام عادل جنتی ہوتا ہے۔ زبیدہ نے کہا، تو ظالم عاصی ہے، اور تو نے اپنے نفس کے لیے جنت کی شہادت دی، تو کافر ہو گیا کہ اللہ پر تو نے جھوٹ بولا، اور میں تجھ پر حرام ہو گئی۔ (سبحان اللہ! زبیدہ خاتون کا علم اور مسائلِ دین سے واقفیت) امام فرماتے ہیں میں نے کہا اے امیر المومنین جب تجھے کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے، تو تجھے اُسوقت یا اسکے بعد خوفِ الٰہی ہوتا ہے؟ اُس نے کہا جی ہاں، خدا کی قسم بہت شدید خوف ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے لیے ایک جنت نہیں، دو جنتیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ اس جواب سے بادشاہ کا رنج و غم جاتا رہا، اور عقدہ حل ہو گیا، اور اُس نے حضرتِ امام کے ساتھ بہت ملاطفت کی۔

ایک شب خلیفہ رشید کا قاصد حضرت امام ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُس نے کہا بادشاہ نے بہت جلد حضور کو بلایا ہے۔ آپ تشریف لے گئے، خلیفہ نے اپنے پاس بٹھا کر عرض کیا کہ ہمارا کچھ زیور مکان میں گم ہو گیا، میں نے مکان کی کنیزوں میں سے ایک پر الزام لگایا، اور قسم کھالی کہ تو مجھ سے اگر سچ بات نہ کہہ دی، تو میں تجھ کو قتل کر ڈالوں گا اب اس کے بعد میں نادم ہوں، تو اب وجہ خلاصی بتایئے؟ فرمایا میں اُس کنیز سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ امام صاحب نے اُس سے دریافت فرمایا کہ تو نے زیور لیا ہے؟ اُس نے قسم کھالی کہ نہیں۔ فرمایا جو بات میں کہوں وہ یاد رکھ، اور اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی نہ کرنا، جب تجھے خلیفہ بلائے اور دریافت کرے کہ کیا تو نے زیور چرایا ہے، تو کہدینا "جی ہاں"۔ پھر جب تجھ سے کہے لا، تو کہدینا "میں نے نہیں چرایا"۔ پھر امام صاحب نے خلیفہ کے سامنے کنیز کو بلایا، اور خلیفہ سے فرمایا کہ اس سے زیور کو دریافت کرو۔ خلیفہ نے کہا "کیا تو نے زیور چرایا ہے"؟ اُس نے کہا "جی ہاں"۔ بادشاہ نے کہا "لا کہاں ہے"؟ اُس نے کہا "میں نے بخدا نہیں چرایا"۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اس نے اقرار بھی کیا، انکار بھی کیا، اسمیں ایک بات ضرور سچی ہے، تیری قسم تو پوری ہو گئی۔ رشید کا غصہ تو ٹھنڈا ہو گیا، اور اُس نے حکم دیا کہ ایک لاکھ درہم امام کے درِ دولت پر پہنچائے جائیں۔ خدام نے عرض کیا کہ خزانہ بند ہے خزانچی موجود نہیں ہے، اجازت ہو تو ہم صبح پہنچا دیں۔ خلیفہ نے کہا کہ قاضی نے ہمیں شب میں آزاد کیا ہم صلہ کو صبح تک روکنا نہیں چاہتے۔ یہاں تک کہ وہ روپیہ اُسی وقت حضرت امام ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دولت سرا پر پہنچا دیا گیا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک اعرابی حاضر ہوا، اور اُس نے سلام کے بعد اپنی حاجت کا سوال اسطرح کیا کہ اے امام میں نے آپ کے جدِ کریم سے سُنا، فرماتے تھے جب تم کسی حاجت کی درخواست کرو، تو چار شخصوں میں سے کسی ایک شخص سے کرنا، یا تو کسی شریف عرب سے، یا کسی کریم مولیٰ سے، یا حاملِ قرآن سے، یا کسی خوبرو سے عرب کو تو شرافت آپ کے جد سے ملی، اور کرم آپ کی خصلت ہے، اور قرآن آپ کے گھر میں نازل ہوا، اور خوبروئی کا یہ حال ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھے دیکھنا چاہو، تو حسن و حسین کو دیکھ لینا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کہ تو کیا حاجت رکھتا ہے؟ اُس نے حاجت زمین پر لکھدی۔ حضرت امام نے فرمایا کہ میرے پاس ایک سر بمہر کیسہ مال کا ہے، عراق سے آیا ہے، میں تجھ سے تین مسائل دریافت کرتا ہوں، اگر تو ایک کا جواب خوبی سے دے، تو تجھے ایک ثلث، اور دو کا جواب دے، تو دو ثلث، اور تینوں کا جواب دے، تو کل دیدیا جائیگا۔ کہنے لگا کہ اللہ ہی مدد فرمانے والا ہے سوال کیجئے، فرمایا عمل کونسا افضل ہے؟ کہا ایمان۔ فرمایا ہلاکت سے بندہ کی نجات کیسے ہوتی ہے؟ کہا اللہ کے بھروسے سے۔ فرمایا کہ آدمی کی زینت کیا ہے؟ کہا علم مع حلم۔ امام نے فرمایا اگر یہ بتلیئے؟ کہا تو مال مع کرم۔ فرمایا اگر یہ بھی بتایئے؟ کہا تو پھر فاقہ مع صبر۔ فرمایا اگر یہ بھی بتایئے؟ اعرابی نے کہا تو پھر آسمان سے بجلی گرے اور اُسے جلادے۔ حضرتِ امام ہنس پڑے، اور تھیلی اُس کے پاس پھینکدی۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوا ابلیس کے منکر ہوا اور مغرور کیا اور کافر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا خلیفہ کیا، اور اُنکے وجودِ مبارک کو تمام موجودات کا نمونہ اور عالمِ روحانی و جسمانی کا مجموعہ بنایا۔ اُنھیں فرشتوں کے لیے حصولِ کمالات کا وسیلہ و ذریعہ کیا۔ اسی لیے ملائکہ کو حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، کیونکہ اُنھوں نے حضرتِ آدم کے وجود میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ عظمیٰ و آیاتِ کبریٰ کا مشاہدہ کیا، اور حضرت آدم علیہ السلام کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اُن پر انعام فرمایا، تو اب شکر گزاری اور فضیلتِ حضرتِ آدم کے اعتراف اور اپنے مقولہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کی معذرت کے لیے اُنھیں حکم دیا گیا کہ حضرتِ آدم کو سجدہ کریں۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش سے قبل ہی فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تھا، اسکی سند میں یہ آیت پیش کرتے ہیں فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (بیضاوی)۔ اصح یہ ہے کہ اس سجدہ کا حکم تمام ملائکہ کو دیا گیا تھا۔ (خازن)

یہاں یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ملائکہ کا یہ سجدہ حضرتِ آدم کے لیے تھا، یا اللہ تعالیٰ کے لیے؟ شعبہ نے قتادہ سے روایت کیا کہ حضرتِ آدم کے اکرام کے لیے اُن کا سجدہ کرنے میں طاعتِ الٰہی تھی۔ یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ یہ سجدہ اللہ کی عبادت کے لیے ہو، اور حضرتِ آدم کی تحیۃ و تکریم اس سے منظور ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا، اور حضرتِ آدم علیہ السلام بمنزلہ قبلہ تھے۔ لیکن یہ قول نہایت ضعیف اور بالکل ناقابلِ التفات ہے، کیونکہ اس صورت میں حضرتِ آدم کے لیے تفضیل و تکریم باقی نہیں رہتی، اور درحقیقت یہاں سجدہ کا امر فرمانے سے حضرتِ آدم علیہ السلام کی تفضیل و تکریم ہی مُراد ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک میں وارد ہوا ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ۔ اس سے ثابت ہوا کہ امرِ سجدہ کا مقصود تفضیل و تکریمِ حضرتِ آدم علیہ السلام ہے۔ اور محض قبلہ بنانے میں مسجود الیہ کا ساجد سے افضل ہونا لازم نہیں، جیسا کہ کعبۂ معظمہ حضور سیدِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قبلہ مسجود الیہ ہے باوجودیکہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کعبۂ معظمہ سے افضل ہے۔ اس صورت میں حضرتِ آدم علیہ السلام کی ملائکہ پر نہ فضیلت ثابت ہوتی ہے، اور نہ ابلیسِ لعین کے لیے کوئی وجہ حسد و انکار کی باقی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ قول کہ حضرتِ آدم محض قبلہ کی مثل تھے بالکل قابلِ اعتبار نہیں، تو ضروری ہوا کہ سجدہ حضرتِ آدم علیہ السلام کو ہو۔ اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ یہ سجدہ کس قسم کا تھا؟

سجدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سجدۂ عبادت جس میں اپنا غایتِ تذلل و اظہارِ بندگی، اور مسجود کی غایتِ تعظیم اور اُس کی معبودیت کا اعتراف ملحوظ و منظور ہوتا ہے اسکو سجدۂ عبادت کہتے ہیں، اور یہ غیرِ خدا کے لیے کبھی کسی حال میں جائز نہیں ہو سکتا، نہ کسی شریعت میں کہیں اس کی اجازت ہوئی۔ ایسا سجدہ غیرِ خدا کے لیے شرک، اور اس قسم کا سجدہ کرنیوالا کافر خارج از اسلام ہے۔ لہٰذا یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ملائکہ کو حکم دیا جائے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدۂ عبادت کریں معاذ اللہ۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ سجدہ تو علیٰ وجہ العبادۃ ہو اور حضرت آدم علیہ السلام مثلِ قبلہ کے محض مسجود الیہ ہوں، کیونکہ اس میں شرف و فضل حضرتِ آدم کا اظہار نہیں ہوتا جو مقصود ہے، جیسا کہ مفصل و مدلل مذکور ہو چکا۔

سجدہ کی دوسری قسم سجدۂ تحیۃ ہے، جس سے مسجودلہٗ کی عظمت کا اظہار منظور ہوتا ہے۔ یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں مخلوق کے لیے جائز تھا، اور زمانۂ حضرت یوسف علیہ السلام تک اسکا جواز باقی رہا۔ اُن اُمتوں کے لیے جو شخص مستحقِ تعظیم و اکرام ہوتا، اُس تبجیل و تکریم کے لیے سجدۂ تحیۃ اسی طرح جائز تھا جیسا ہماری شریعت میں مصافحہ و معانقہ اور بزرگوں کی دست و پا بوسی بنظرِ ادب و احترام جائز ہے۔ لیکن اب ہماری شریعت میں سجدۂ تحیۃ بھی غیرِ خدا کے لیے جائز نہیں، اسکا جواز منسوخ ہو چکا جیسا کہ حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ و حضرت جابر بن عبد اللہ و انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ما ینبغی لبشر ان یسجد لبشر ولو صلح لبشر ان یسجد لبشر لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا۔ آدمی کو درست نہیں کہ آدمی کو سجدہ کرے۔ کیونکہ یہ حدیث سجدۂ تحیۃ کی ناسخ ہے، تاہم سجدۂ تعظیمی اگرچہ غیرِ خدا کیلیے جائز نہیں مگر شرک بھی نہیں۔ (مدارک و احکام القرآن عربی)

سجدہ میں ایک یہ بھی گفتگو ہے کہ ملائکہ کا سجدہ محض اختبار یعنی صرف جھکنا تھا، یا زمین پر پیشانی رکھ کر وضع جبہ کے ساتھ تھا؟ صحیح یہی ہے کہ وضع جبہ کے ساتھ پیشانی رکھ کر تھا۔ اس پر جمہور ہیں۔ (مدارک) ملائکہ میں سب سے پہلے سجدہ کرنے والے حضرت جبرئیل ہیں، پھر میکائیل، پھر اسرافیل، پھر عزرائیل، پھر اور ملائکہ مقربین علیہم السلام۔ یہ سجدہ روزِ جمعہ وقتِ زوال سے عصر تک کیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکہ مقربین اس سجدہ میں سو برس، اور ایک قول پانچسو برس رہے۔ شیطان نے سجدہ نہ کیا، اور تکبر و خود بینی سے یہ اعتقاد کرتا رہا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہے، اور اسکے لیے سجدہ کا حکم خلافِ حکمت ہے۔ اس اعتقادِ باطل سے وہ کافر اور راندۂ درگاہ ہوا۔ آیت مبارکہ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ملائکہ سے افضل ہیں، چنانچہ انھیں فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔ یہ مسئلہ بھی اس آیت سے معلوم ہوا کہ تکبر و خود بینی نہایت قبیح عیب ہیں اور متکبر کو اس سے ضرر پہنچتا ہے، حتیٰ کہ کبھی تکبر کی شامت سے متکبر مبتلائے کفر ہو کر دائمی لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا

اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جنت میں رہنے اور اسکو اپنا ماویٰ و منزل بنانے کا ارشاد ہوا۔ جنت میں آپ تنہا تھے، اور کوئی دوسرا آپ کا ہمجنس، وجود نہ تھا، جسکے ساتھ مانوس ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے حضرت حوا کو پیدا کیا، اور حضرت آدم و حوا کو بفراغت عیش کی اجازت دی۔ معتزلہ نے جو ایک گمراہ فرقہ ہے یہ کہا کہ جنت سے یمن کا ایک باغ مراد ہے۔ اور انکے اس قول کا باعث یہ ہوا کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ جنت میں نہ کوئی چیز واجب کیجاتی ہے، نہ کوئی شخص اس میں داخل ہونے کے بعد نکلتا ہے، اور حضرت آدم پر درختِ ممنوع سے اجتناب واجب ہوا، اور وہ جنت سے نکل کر زمین پر گئے۔ لہذا معتزلہ نے جنت سے جنتِ عرفی شرعی، یعنی دار الثواب ہونا بعید سمجھا۔ لیکن معتزلہ کا یہ خیال غلط ہے، چونکہ اہلِ جنت معرفت و توحید کے مکلف ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ کا یہ خیال کہ اہلِ جنت پر جنت میں مطلقاً کچھ واجب نہیں ہوتا، صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح اُن کا یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے کہ جنت میں داخل ہو کر وہاں سے کوئی نکلتا ہی نہیں، کیونکہ شبِ معراج حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جنت میں داخل ہوئے پھر وہاں سے واپس تشریف لائے۔ نقلِ مشہور سے ثابت ہے کہ جنت سے جنتِ خلد مراد ہے۔ (مدارک)

شجرہ سے یہاں گیہوں، یا انگور، یا اسی کی مثل اور کوئی درخت مراد ہے، روایتیں اس میں مختلف ہیں، اور جبتک دلیلِ قاطع نہ ہو، اُسوقت تک یقینی طور پر کسی درخت کی تعیین نہیں کی جاسکتی، اور مقصود تعیین پر موقوف بھی نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ حضرت آدم و حوا کو جنت میں ایک درخت کے پاس جانے سے منع کیا گیا تھا۔ نہی کا قرب سے متعلق کرنا افادہ کرتا ہے کہ تناول کی ممانعت اور اُس سے اجتناب میں اسقدر مبالغہ منظور ہے کہ اُسکے قرب سے بھی منع فرما دیا، جو اُسکے مقدمات سے ہے، اس میں اشعار و تنبیہ ہے کہ کسی شے سے قرب اسکی طرف داعیہ اور میل پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے شرعِ مطہر نے مقدماتِ فجور سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

ظلم کے معنی ہیں کسی شے کو بے محل وضع کرنا، اور یہ ممنوع ہے۔ ہر شے کی وضع اُسکے محل ہی پر مناسب ہوتی ہے، اور ہر شے کا محلِ صحیح وہی ہے جو اللہ تعالیٰ یا اُسکے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بتایا ہو۔ یہاں لفظِ ظلم اپنے حقیقی معنی میں نہیں ہے، بلکہ خلافِ اولیٰ کے معنی میں ہے، کیونکہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہیں، اُن سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

مسئلہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں لفظِ ظالم کہنا اہانت و کفر ہے، اگر کوئی ایسا کہے کافر ہو جائے گا، اور اُس کا یہ عذر باطل و نامسموع ہو گا کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا کے حق میں "فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک و مولیٰ ہے، اُسکو حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جو چاہے فرمائے، لیکن دوسرے کی کیا مجال کہ وہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی و محبوبانِ حضرتِ حق کی جناب میں کوئی کلمہ خلافِ ادب زبان پر لائے۔ اسلیے حضرتِ رب العزت تبارک و تعالیٰ کی طرف جہاں ایسے کلمے پائے جائیں، وہ سب بجا و درست ہیں، ہمارا اُنکی حقیقت پر ایمان ہے، اور اُنکے مزے اور لذت سے کچھ وہی لوگ آشنا ہیں، دوسروں کے لیے اپنی طرف سے اُن کاموں کا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں استعمال کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

تو شیطان نے جنت سے انھیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انھیں الگ کر دیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا

عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ

دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے

كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

کچھ کلمے تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کی، بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

واقعہ یہ ہوا کہ شیطان کسی طرح کسی حیلہ سے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے پاس پہنچا، اور اُن سے چاپلوسی کی باتیں کیں، اور قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اُنھیں گمان تھا کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا، اور اُنکے خیالِ مبارک میں نہیں آسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینے، اور اُسکے ساتھ حلف کرنے کے بعد کسی بندہ کو جھوٹ بولنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ قسم کھا کر شیطان نے کہا کہ میں شجرِ خلد بتا دوں، اور شجرِ ممنوعہ کی طرف رغبت دلائی۔ حضرت حوا نے اُس میں سے کچھ کھایا، اور کچھ حضرت آدم علیہ السلام کو دیا۔ آپ نے بھی تناول کیا، اور خیال آیا یہ فرمایا کہ "لَا تَقْرَبَا" کی نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ اس نہی کو تحریمی سمجھتے، تو شجرِ ممنوعہ کا پھل ہرگز نہ کھاتے، اسلیے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اجتہاد میں خطا واقع ہوئی، اور خطائے اجتہادی معصیت و گناہ نہیں ہوتی، مگر مقربین سے ترکِ اولیٰ پر بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم و حوا کو اور اُن کی ذریت کو، جو ابھی تک صلبِ آدم میں تھی، جنت سے زمین پر جانے کا حکم ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام سرزمینِ ہند میں، جزیرۂ سراندیپ کے پہاڑ لوذ پر، اور حضرت حوا جدہ میں اُتارے گئے۔ (خازن) حضرت آدم علیہ السلام کی برکت سے اس زمین کے اشجار میں پاکیزہ خوشبو پیدا ہوئی۔

حضرت آدم علیہ السلام کے زمین میں استقرار و تمتع کے لیے ایک میعاد بیان فرمائی گئی، وہ یا وقتِ موت ہے یا قیامت۔ وقتِ موت بھی میعاد ہو سکتا ہے، کیونکہ موت سے استقرار و تمتع منقطع ہوتے ہیں۔ اور قیامت کا مراد ہونا بھی مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ قبر کی سکونت میں بھی ایک طرح کا استقرار و تمتع ہے، اُس کا انقطاع قیامت ہی ہو گا۔

اس میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے تسلی اور بشارت ہے کہ وہ دنیا میں ایک محدود مدت کے لیے بھیجے گئے ہیں، اسکے بعد انھیں پھر جنت کی طرف رجوع فرمانا ہے، اور اولادِ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے معاد یعنی اخروی حیات پر دلالت ہے کہ دنیا کی زندگی ایک وقتِ خاص، اور ایک میعادِ مقرر تک اُسکے تمام ہونیکے بعد عالمِ آخرت کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔

حضرت آدم علیہ السلام جب زمین پر اتارے گئے تو تین سو برس تک آپ نے حیاءً آسمان کی طرف سر نہ اٹھایا، اور اسقدر روئے جسکا کچھ اندازہ اُس روایت سے کیا جا سکتا ہے

جس میں فرمایا گیا ہے کہ تمام باشندگانِ خطۂ خاک کے جنھوں نے زمین پر سکونت کی ہے، یا کرنے والے ہیں، اور جنھوں نے دنیا میں آنکھ کھولی ہے، اگر ان سب کے آنسو جمع کیے جائیں، تو سیدنا حضرت داؤد علیہ السلام کے آنسو اس سے زیادہ ہوں، اور اگر تمام اہلِ ارض کے آنسوؤں کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کے گوہر اشک بھی جمع کر لیے جائیں، تو اس تمام مجموعہ سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا بحر اشک زیادہ ہوگا۔ (خازن) طبرانی وحاکم وابو نعیم وبیہقی نے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ حضور سیدِ کائنات صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شجرِ ممنوعہ کھانے کا صدور ہوا، اور آپ پر عتاب کیا گیا، تو آپ فکر توبہ میں نہایت حیران تھے، اس پریشانی کے عالم میں آپ کو وہ اپنی پیدائش کا وقت یاد آیا جب آپ کے جسمِ مبارک میں رُوح داخل فرمائی گئی تھی، اور آپ نے سر مبارک اٹھا کر عرشِ الٰہی پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ مکتوب دیکھا تھا، اسی وقت سمجھا تھا کہ بارگاہِ الٰہی میں حضرت محبوبِ حق محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ قرب ومنزلت حاصل ہے دوسرا کوئی آپ کا ہمرتبہ نہیں کہ آپ کا نام اقدس اللہ تعالیٰ نے اپنے نام پاک کے ساتھ عرش پر مکتوب فرمایا ہے، یہ بات یاد آنے پر حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی دعا میں رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ کے ساتھ یہ عرض کیا اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ اور ابن منذر کی روایت میں یہ کلمے ہیں اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُكَ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَكَرَامَتِهٖ عَلَيْكَ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ خَطِيْئَتِیْ۔ یعنی اے رب میں تیرے بندۂ خاص محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جاہ ومرتبت کے طفیل، اور اُس کرامت ومنزلت کے صدقہ میں جو اُنھیں تیرے دربار میں حاصل ہے تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں۔ یہ دعا کرنی تھی کہ حضرت حق تعالیٰ نے اُنکی مغفرت فرمائی، اور وحی بھیجی کہ تم نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کہاں سے جانا؟ حضرت آدم علیہ السلام نے حال عرض کیا۔ فرمانِ الٰہی پہنچا، اے آدم محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمہاری ذرّیت میں سب سے آخر پیغمبر ہیں، اگر وہ نہ ہوتے، تو میں تمہیں پیدا نہ کرتا۔ مسئلہ اس روایت سے ثابت ہُوا کہ مقبولانِ بارگاہ مقربانِ درگاہ کے وسیلہ سے دعا کرنا بحق فلاں اور بجاہِ فلاں کہکر جائز ہے، اور عالمِ ظہور میں سب سے پہلے آنے والے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق واجب نہیں ہوتا، لیکن فضلاً وکرماً وہ اپنے مقبولوں کو حق دیتا ہے، اسی تفضّلی حق کے وسیلہ سے دعا کیجاتی ہے، اور صحیح احادیث سے یہ حق ثابت ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَامَ رَمَضَانَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ۔ یعنی جو اللہ اور اُسکے رسول پر ایمان لایا اور جس نے نماز قایم کی اور رمضانِ مبارک کے روزے رکھے، اللہ پر حق ہے کہ اُسکو جنت میں داخل فرمائے۔ یہ وہی تفضّلی حق ہے جو اُس نے رحمۃً اپنے ذمہ کرم پر مقرر فرمایا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ روزِ عاشورہ یعنی دسویں محرم کو قبول ہوئی، جسوقت جنت سے آپ کا اخراج کیا گیا تھا، اور جنتی پوشاکیں اور تاج جسم مبارک وسرِ اقدس سے جدا کیا گیا تھا، اُسوقت عربی زبان بھی آپ سے سلب کر لی گئی تھی، اسکے بجائے سُریانی زبان جاری کردی گئی تھی۔ توبہ کے قبول فرمانے کے بعد الطافِ ربانی نے کرم کیا پھر عربی زبان عطا ہوئی۔ (فتح العزیز)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا

ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اُتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہو اُسے

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

نہ کوئی اندیشہ اور نہ کچھ غم

یا تو تاکید کے لیے یہ تکرار فرمائی گئی، یا اختلافِ مقصود کی وجہ سے یہ مضمون دوبارہ ارشاد ہُوا۔ یعنی پہلے مقام پر ذکرِ اہباط تعادی وعدم خلود کی بنا پر ہے اس صورت میں امرِ تکوینی ہے، اور ثانی میں یہ اِشعار ہے کہ یہ اہباط تکلیف کے لیے ہُوا، تاکہ حق طلب راہ پائے، اور ناحق کوش ہلاک ہو جائے، اور یہ امر تکلیفی ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حکمِ اول میں اہباط جنت سے سماءِ دنیا کی طرف، اور ثانی میں سماءِ دنیا سے زمین کی طرف مراد ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

اور اگر تمہارے پاس میری طرف سے کتابیں نازل کرے، یا رسول بھیجکر ہدایت پہنچے، تو جو کوئی اُسکا اتباع کرے، وہ ناجی اور فائز المرام ہے۔ اور اُنھیں نہ فزعِ اکبر کے وقت خوف ہو، نہ آخرت میں غم، وہ بے اندیشہ وبے غم جنت میں داخل ہونگے۔ یہ مومنین صالحین کے لیے بشارت ہے۔ خوف اور حزن دو چیزیں ہیں، آئندہ پیش آنے والی مصیبت پر جو اندیشہ ہوتا ہے اُسکو خوف کہتے ہیں، اور گزری ہوئی کسی چیز کے فوت ہونے پر، یا کسی خلافِ مرضی ہو جانے والی حالت پر جو رنج وملال ہو، اُسکو حزن کہتے ہیں یہاں دونوں کی نفی فرمادی گئی۔ اس سے نفیِ عذاب بھی حاصل ہوئی اور ثبوتِ ثواب بھی، کہ جسے عذاب ہونے والا ہو، اُسکے لیے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسکے لیے کوئی اندیشہ نہیں، اور جسے ثواب سے محروم کردیا جائے اُسکے لیے کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ اُسکے لیے کوئی غم نہیں۔ سبحان اللہ! قرآنی بلاغت کیا عجیب ہے، کس لطیف پیرایہ کے ساتھ فرمانبردار بندوں کی نجات وثواب کا بیان فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں اُنکو ہمیشہ اُس میں رہنا

ہدایت کا اتباع کرنیوالوں کا حال بیان کرنے کے بعد اُن کا حال بیان فرمایا جاتا ہے، جنھوں نے اس ہدایت کا اتباع نہ کیا، بلکہ کفر کیا، آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔

اس آیت میں اس پر دلالت ہے کہ جنت مخلوق ہے، پیدا فرمادی گئی، اور وہ جانبِ بالا میں ہے کلمۂ اِهْبِطُوْا اس پر دلالت کرتا ہے، اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ درگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ ہدایت کا قبول کرنے والا مامون العاقبت ہے، اور یہ بھی کہ عذابِ دائمی کفار کیلیے ہے اور غیر کافر کے لیے خلود نہیں۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ

اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا

بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ○ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا

عہد پورا کرونگا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو اور ایمان لاؤ اُس پر جو میں نے اُتارا تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور

تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؗ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ○

سب سے پہلے اُس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ ودانستہ حق نہ چھپاؤ

سجدہ میں ایک یہ بھی گفتگو ہے کہ ملائکہ کا سجدہ محض انحنا تھا یعنی صرف جھکنا تھا، یا زمین پر پیشانی رکھ کر وضع جبہ کے ساتھ تھا؟ صحیح یہی ہے کہ وضع جبہ کے ساتھ پیشانی رکھ کر تھا۔ اس پر جمہور ہیں۔ (مدارک) ملائکہ میں سب سے پہلے سجدہ کرنے والے حضرت جبرئیل ہیں، پھر میکائیل پھر اسرافیل، پھر عزرائیل، پھر اور ملائکہ مقربین علیہم السلام۔ یہ سجدہ روزِ جمعہ وقتِ زوال سے عصر تک کیا گیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکہ مقربین اس سجدہ میں سَو برس، اور ایک قول پانچسو برس رہے۔ شیطان نے سجدہ نہ کیا، اور تکبّر و خود بینی سے یہ اعتقاد کرتا رہا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہے، اور اسکے لیے سجدہ کا حکم خلافِ حکمت ہے۔ اس اعتقادِ باطل سے وہ کافر اور راندۂ درگاہ ہوا۔ آیت مبارکہ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ملائکہ سے افضل ہیں، چنانچہ انھیں فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔ یہ مسئلہ بھی اس آیت سے معلوم ہوا کہ تکبّر و خود بینی نہایت قبیح عیب ہیں اور متکبّر کو اس سے ضرر پہنچتا ہے، حتّٰی کہ کبھی تکبّر کی شامت سے متکبّر مبتلائے کفر ہو کر دائمی لعنت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا

اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○

مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

حضرتِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جنت میں رہنے اور اُسکو اپنا ماویٰ و منزل بنانے کا ارشاد ہوا۔ جنت میں آپ تنہا تھے، اور کوئی دوسرا آپ کا ہمجنس وجود نہ تھا، جسکے ساتھ مانوس ہوتے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے کرم سے حضرت حوّا کو پیدا کیا، اور حضرتِ آدم وحوّا کو بفراغت عیش کی اجازت دی۔ معتزلہ نے جو ایک گمراہ فرقہ ہے یہ کہا کہ جنّت سے یمن کا ایک باغ مراد ہے۔ اور انکے اس قول کا باعث یہ ہُوا کہ اُنھوں نے یہ سمجھا کہ جنّت میں نہ کوئی چیز واجب کیجاتی ہے، نہ کوئی شخص اُس میں داخل ہونے کے بعد نکلتا ہے، اور حضرتِ آدم پر درختِ ممنوع سے اجتناب واجب ہُوا، اور وہ جنّت سے نکل کر زمین پر آئے۔ لہٰذا معتزلہ نے جنّت سے جنّتِ عرفی شرعی، یعنی دار الثواب ہونا بعید سمجھا۔ لیکن معتزلہ کا یہ خیال غلط ہے، چونکہ اہلِ جنّت معرفت و توحید کے مکلّف ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ کا یہ خیال کہ اہلِ جنّت پر جنّت میں مطلقاً کچھ واجب نہیں ہوتا، صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح اُن کا یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے کہ جنّت میں داخل ہو کر وہاں سے کوئی نکلتا ہی نہیں، کیونکہ شبِ معراج حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جنّت میں داخل ہوئے پھر وہاں سے واپس تشریف لائے نقلِ مشہور سے ثابت ہے کہ جنّت سے جنّتِ خلد مراد ہے۔ (مدارک)

شجرہ سے یہاں گیہوں، یا انگور، یا اسی کی مثل اور کوئی درخت مراد ہے، روایتیں اس میں مختلف ہیں، اور جبتک دلیلِ قاطع نہ ہو، اُسوقت تک یقینی طور پر کسی درخت کی تعین نہیں کی جاسکتی، اور مقصود تعین پر موقوف بھی نہیں ہے۔ صرف یہ بتانا ہے کہ حضرتِ آدم وحوّا کو جنّت میں ایک درخت کے پاس جانے سے منع کیا گیا تھا۔ نہی کا قرب سے متعلق کرنا افادہ کرتا ہے کہ تناول کی ممانعت اور اُس سے اجتناب میں اسقدر مبالغہ منظور ہے کہ اُسکے قرب سے بھی منع فرمادیا، جو اُسکے مقدمات سے ہے، اس میں اشعار و تنبیہ ہے کہ کسی شئے سے قرب اسکی طرف داعیہ اور میل پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے شرعِ مطہر نے مقدماتِ فجور سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

ظلم کے معنی ہیں کسی شئے کو بے محل وضع کرنا، اور یہ ممنوع ہے۔ ہر شئے کی وضع اُسکے محل ہی پر مناسب ہوتی ہے، اور ہر شئے کا محل صحیح وہی ہے جو اللہ تعالیٰ یا اُسکے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بنایا ہو۔ یہاں لفظِ ظالم اپنے حقیقی معنیٰ میں نہیں ہے، بلکہ خلافِ اولیٰ کے معنیٰ میں ہے، کیونکہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہیں، اُن سے گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

مسئلہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں لفظِ ظالم کہنا اہانت و کفر ہے، اگر کوئی ایسا کہے کافر ہو جائے گا، اور اُس کا یہ عذر باطل و نامسموع ہوگا کہ خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرتِ آدم وحوّا کے حق میں فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک و مولیٰ ہے، اُسکو حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کو جو چاہے فرمائے، لیکن دوسرے کی کیا مجال کہ وہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی و محبوبانِ حضرتِ حق کی جناب میں کوئی کلمہ خلافِ ادب زبان پر لائے۔ اسلیے حضرتِ رب العزت تبارک و تعالیٰ کی طرف جہاں ایسے کلمے پائے جائیں، وہ سب بجا و درست ہیں، ہمارا اُنکی حقیقت پر ایمان ہے، اور اُنکے مزے اور لذت سے کچھ وہی لوگ آشنا ہیں، دوسروں کے لیے اپنی طرف سے اُن کاموں کا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں استعمال کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ

تو شیطان نے جنت سے انھیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انھیں الگ کردیا اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا

عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ○ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ

دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے

كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○

کچھ کلمے تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کی، بیشک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

واقعہ یہ ہُوا کہ شیطان کسی طرح کسی حیلہ سے حضرتِ آدم وحوّا علیہما السلام کے پاس پہنچا، اور اُن سے چاپلوسی کی باتیں کیں، اور قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ اُنھیں گمان تھا کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا، اور اُنکے خیالِ مبارک میں نہیں آسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینے، اور اُسکے ساتھ حلف کرنے کے بعد کسی بندہ کو جھوٹ بولنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ قسم کھا کر شیطان نے کہا کہ میں شجرِ خُلد بتا دوں، اور شجرِ ممنوعہ کی طرف رغبت دلائی۔ حضرتِ حوّا نے اُس میں سے کچھ کھایا، اور کچھ حضرت آدم علیہ السلام کو دیا۔ آپ نے بھی تناول کیا، اور خیال یہ فرمایا کہ لَا تَقْرَبَا کی نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ اس نہی کو تحریمی سمجھتے، تو شجرِ ممنوعہ کا پھل ہرگز نہ کھاتے، اسلیے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ حضرتِ آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے اجتہاد میں خطا واقع ہوئی، اور خطائے اجتہادی معصیت و گناہ نہیں ہوتی، مگر مقربین سے ترکِ اولیٰ پر بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ حضرت آدم وحوّا کو اور اُن کی ذرّیت کو، جو ابھی تک صلبِ آدم میں تھی، جنّت سے زمین پر جانے کا حکم ہُوا۔ حضرتِ آدم علیہ السلام سرزمینِ ہند میں، جزیرۂ سراندیپ کے پہاڑ لُودھ پر، اور حضرتِ حوّا جدّہ میں اُتارے گئے۔ (خازن) حضرت آدم علیہ السلام کی برکت سے اس زمین کے اشجار میں پاکیزہ خوشبو پیدا ہوئی۔

حضرت آدم علیہ السلام کے زمین میں استقرار و تمتع کے لیے ایک میعاد بیان فرمائی گئی، وہ یا وقتِ موت ہے یا قیامت۔ وقتِ موت بھی میعاد ہو سکتا ہے، کیونکہ موت سے استقرار و تمتع منقطع ہوتے ہیں۔ اور قیامت کا مُراد ہونا بھی مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ قبر کی سکونت میں بھی ایک طرح کا استقرار و تمتع ہے، اُس کا انقطاع قیامت ہی ہوگا۔

اس میں حضرتِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے تسلّی اور بشارت ہے کہ وہ دنیا میں ایک محدود مدّت کے لیے بھیجے گئے ہیں، اسکے بعد اُنھیں پھر جنّت کی طرف رجوع فرمانا ہے، اور اولادِ حضرتِ آدم علیہ السلام کے لیے معاد یعنی اُخروی حیات پر دلالت ہے کہ دُنیا کی زندگی ایک وقتِ خاص، اور ایک میعادِ مقرر تک ہے، اُسکے تمام ہونیکے بعد عالمِ آخرت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

حضرتِ آدم علیہ السلام جب زمین پر اُتارے گئے تو تین سَو برس تک آپ نے حیاءً آسمان کی طرف سر نہ اُٹھایا، اور اسقدر روئے جسکا کچھ اندازہ اُس روایت سے کیا جاسکتا ہے

جس میں فرمایا گیا ہے کہ تمام باشندگانِ خطۂ خاک کے جنھوں نے زمین پر سکونت کی ہے، یا کرنے والے ہیں، اور جنھوں نے دنیا میں آنکھ کھولی ہے، اگر ان سب کے آنسو جمع کیے جائیں، تو سیدنا حضرتِ داؤد علیہ السلام کے آنسو اس سے زیادہ ہوں، اور اگر تمام اہلِ ارض کے آنسوؤں کے ساتھ حضرتِ داؤد علیہ السلام کے گوہر اشک بھی جمع کر لیے جائیں، تو اس تمام مجموعہ سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا بحرِ اشک زیادہ ہوگا۔ (خازن) طبرانی وحاکم و ابو نعیم و بیہقی نے حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ حضور سید کائنات صلوات اللہ علیہ وسلامہ نے فرمایا کہ جب حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شجرِ ممنوعہ کھانے کا صدور ہوا، اور آپ پر عتاب کیا گیا، تو آپ فکرِ توبہ میں نہایت حیران تھے، اس پریشانی کے عالم میں آپ کو وہ اپنی پیدائش کا وقت یاد آیا جب آپ کے جسم مبارک میں روح داخل فرمائی گئی تھی، اور آپ نے سر مبارک اٹھا کر عرشِ الٰہی پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ مکتوب دیکھا تھا، اسی وقت سمجھا تھا کہ بارگاہِ الٰہی میں حضرت محبوبِ حق محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ قرب و منزلت حاصل ہے دوسرا کوئی آپ کا ہمرتبہ نہیں کہ آپ کا نام اقدس اللہ تعالیٰ نے اپنے نام پاک کے ساتھ عرش پر مکتوب فرمایا ہے، یہ بات یاد آنے پر حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی دعا میں رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ کے ساتھ یہ عرض کیا اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ اور ابنِ منذر کی روایت میں یہ کلمے ہیں اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُكَ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَكَرَامَتِهٖ عَلَيْكَ اَنْ تَغْفِرَ لِیْ خَطِيْئَتِیْ۔ یعنی اے رب میں تیرے بندۂ خاص محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جاہ و مرتبت کے طفیل، اور اس کرامت و منزلت کے صدقہ میں جو انھیں تیرے دربار میں حاصل ہے تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں ۔ یہ دعا کرنی تھی کہ حضرت حق تعالیٰ نے اُنکی مغفرت فرمائی، اور وحی بھیجی کہ تم نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کہاں سے جانا؟ حضرت آدم علیہ السلام نے حال عرض کیا۔ فرمانِ الٰہی پہنچا، اے آدم محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمہاری ذریت میں سب سے آخر پیغمبر ہیں، اگر وہ نہ ہوتے، تو میں تمہیں پیدا نہ کرتا۔ **مسئلہ** اس روایت سے ثابت ہوا کہ مقبولانِ بارگاہ مقربانِ درگاہ کے وسیلہ سے دعا کرنا بحقِ فلاں اور بجاہِ فلاں کہکر جائز ہے، اور عالمِ ظہور میں سب سے پہلے آنے والے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق واجب نہیں ہوتا، لیکن فضلاً و کرماً وہ اپنے مقبولوں کو حق دیتا ہے، اسی تفضلی حق کے وسیلہ سے دعا کیجاتی ہے، اور صحیح احادیث سے یہ حق ثابت ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَامَ رَمَضَانَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّدْخِلَ الْجَنَّةَ۔ یعنی جو اللہ اور اُسکے رسول پر ایمان لایا اور جس نے نماز قائم کی اور رمضانِ مبارک کے روزے رکھے، اللہ پر حق ہے کہ اُسکو جنت میں داخل فرمائے۔ یہ وہی تفضلی حق ہے جو اُس نے رحمۃً اپنے ذمہ کرم پر مقرر فرمایا۔

حضرتِ آدم علیہ السلام کی توبہ روزِ عاشورہ یعنی دسویں محرم کو قبول ہوئی، جسوقت جنت سے آپ کا اخراج کیا گیا تھا، اور جنتی پوشاکیں اور تاج جسم مبارک و سرِ اقدس سے جدا کیا گیا تھا، اُسوقت عربی زبان بھی آپ سے سلب کر لی گئی تھی، اسکے بجائے سُریانی زبان جاری کر دی گئی تھی۔ توبہ کے قبول فرمانے کے بعد الطافِ ربانی نے کرم کیا پھر عربی زبان عطا ہوئی۔ (فتح العزیز)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا

ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہو اُسے

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

نہ کوئی اندیشہ اور نہ کچھ غم

یا تو تاکید کے لیے یہ تکرار فرمائی گئی، یا اختلافِ مقصود کی وجہ سے یہ مضمون دوبارہ ارشاد ہوا۔ یعنی پہلے مقام پر ذکرِ اہباط تعادی و عدم خلود کی بناء پر ہے اس صورت میں امرِ تکوینی ہے، اور ثانی میں یہ اِشعار ہے کہ یہ اہباط تکلیف کے لیے ہوا، تاکہ حق طلب راہ پائے، اور ناحق کوش ہلاک ہو جائے، اور یہ امر تکلیفی ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ حکمِ اول میں اہباط جنت سے سماءِ دنیا کی طرف، اور ثانی میں سماءِ دنیا سے زمین کی طرف مراد ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

اور اگر تمہارے پاس میری طرف سے کتابیں نازل کرے، یا رسول بھیجکر ہدایت پہنچے، تو جو کوئی اُسکا اتباع کرے، وہ ناجی اور فائز المرام ہے۔ اور اُنھیں نہ فزعِ اکبر کے وقت خوف ہو، نہ آخرت میں غم، وہ بے اندیشہ و بے غم جنت میں داخل ہونگے۔ یہ مومنین صالحین کے لیے بشارت ہے۔ خوف اور حزن دو چیزیں ہیں، آئندہ پیش آنے والی مصیبت پر جو اندیشہ ہوتا ہے اُسکو خوف کہتے ہیں، اور گزری ہوئی کسی چیز کے فوت ہونے پر، یا کسی خلافِ مرضی ہو جانے والی حالت پر جو رنج و ملال ہو، اُسکو حزن کہتے ہیں یہاں دونوں کی نفی فرما دی گئی۔ اس سے نفیِ عذاب بھی حاصل ہوئی اور ثبوتِ ثواب بھی، کہ جسے عذاب ہونے والا ہو، اُسکے لیے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسکے لیے کوئی اندیشہ نہیں، اور جسے ثواب سے محروم کر دیا جائے اُسکے لیے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اُسکے لیے کوئی غم نہیں۔ سبحان اللہ! قرآنی بلاغت کیا عجیب ہے، کس لطیف پیرایہ کے ساتھ فرمانبردار بندوں کی نجات و ثواب کا بیان فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

اور وہ جو کفر کریں اور میری آیتیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ والے ہیں اُنکو ہمیشہ اس میں رہنا

ہدایت کا اتباع کرنیوالوں کا حال بیان کرنے کے بعد اُن کا حال بیان فرمایا جاتا ہے، جنھوں نے اس ہدایت کا اتباع نہ کیا، بلکہ کفر کیا، آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔

اس آیت میں اس پر دلالت ہے کہ جنت مخلوق ہے، پیدا فرما دی گئی، اور وہ جانبِ بالا میں ہے کلمۂ اِهْبِطُوْا اس پر دلالت کرتا ہے، اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ درگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتی ہے، اور یہ بھی کہ ہدایت کا قبول کرنے والا مامون العاقبت ہے، اور یہ بھی کہ عذابِ دائمی کفار کیلیے ہے، اور غیر کافر کے لیے خلود نہیں۔

يٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ

اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور میرا عہد پورا کرو میں تمہارا

بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ ○ وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا

عہد پورا کرونگا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو اور ایمان لاؤ اُس پر جو میں نے اُتارا تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور

تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّایَ فَاتَّقُوْنِ ○

سب سے پہلے اُس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھی سے ڈرو

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ و دانستہ حق نہ چھپاؤ

اسرائیل عبری زبان کا لفظ ہے۔ "اسرا" کے معنی زبانِ عبری میں "بندہ" اور "برگزیدہ" کے ہیں، اور "ایل" اُنکی لغت میں بمعنی "اللہ" کے ہے۔ اس لحاظ سے اسرائیل کا ترجمہ عبداللہ یا صفوۃ اللہ ہُوا۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ بعض قراءتوں میں اسرائیل بحذفِ یا، اور بعض میں "اسرال" بحذفِ یا و ہمزہ، اور بعض میں "اسرایل" بتبدیل ہمزہ بیا آیا ہے۔ کلبی نے اپنی تفسیر میں کہا کہ حضرت رب تبارک و تعالیٰ نے اول تمام انسانوں کو دعوتِ عام دی یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ پھر اُنکے مبدء کا ذکر فرمایا وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ الآیہ، اسکے بعد بنی اسرائیل کو خصوصیت کے ساتھ دعوت دی۔ یہ لوگ یہود ہیں، اور یہاں سے پارۂ الٓمّٓ کے آخر تک اُنکے ساتھ مختلف عنوانوں سے کلام جاری ہے۔ کبھی ملاطفت کے ساتھ انھیں دعوت دیجاتی ہے، اور اُن پر اور اُنکے آبا پر اللہ تعالےٰ کے جو احسان و انعام ہُوئے ہیں وہ انھیں یاد دلائے جاتے ہیں۔ کبھی عذابِ الٰہی اور سزا کا خوف دلایا جاتا ہے۔ کبھی حجت قایم فرمائی جاتی ہے۔ کبھی اُنکے اعمالِ قبیحہ پر زجر و توبیخ کی جاتی ہے۔ کبھی اُن عقوبات کا ذکر کیا جاتا ہے جو اُن پر کی گئیں۔

نعمتوں میں سے یہاں دس چیزیں ذکر کی گئیں۔ اول فرعون اور اُسکے ظلم و ستم سے نجات دینا۔ دوم دریا میں اُنکے لیے خشک راستے بنا دینا۔ سوم موت کے بعد زندہ کر دینا چہارم اُنکے لیے ابر کو سائبان بنانا۔ پنجم و ششم مَنّ و سلویٰ نازل فرمانا۔ ہفتم عفو فرمانا۔ ہشتم مغفرت کا وعدہ۔ نہم حضرتِ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اُنکی ہدایت کے لیے کتاب فرقان عطا فرمانا۔ دہم اُن کے لیے بارہ چشمے جاری کرنا۔ یہ تو دس عظیم نعمتیں ذکر فرمائیں، جو بنی اسرائیل پر ہوئی تھیں۔ اور اُنکی بدافعالیوں میں سے بھی دس باتیں ذکر فرمائیں: اول اُن کا قول سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا۔ دوم گؤسالہ کو پوجنا۔ سوم یہ کہنا کہ ہمیں اللہ کو ظاہر دکھاؤ۔ چہارم قول کی تبدیل۔ پنجم ایک قسم کے کھانے پر صبر نہ کرنا۔ ششم آیاتِ الٰہیہ میں تحریف ہفتم تولّی و اعراض۔ ہشتم سخت دلی و قساوتِ قلبی۔ نہم آیاتِ الٰہیہ کا انکار۔ دہم حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرنا۔ یہ چیزیں اُنکے شنائع اعمال میں سے ذکر کی گئیں۔

اور دس چیزیں عقوبات میں سے ذکر فرمائیں جنکے وہ سزاوار مستحق ہوئے:۔ اول ذلّت، دوم مسکنت کا اُن پر لازم کیا جانا، سوم غضبِ الٰہی کا مورد ہونا، چہارم اُن پر جزیہ کا مقرر ہونا پنجم اُن کا باہم ایک دوسرے کو قتل کرنا، ششم اُن کا بندروں کی شکلوں میں مسخ ہونا، ہفتم آسمان سے عذاب کا نازل ہونا، ہشتم بجلی کا گرنا اور اُنکو ہلاک کرنا۔ نہم اُنکے دلوں کا سخت کر دیا جانا۔ دہم طیبات کا اُنکے حق میں حرام کر دینا۔ یہ تمام معاملات اُنکے آبار و اجداد کے ساتھ ہوئے، اور مخاطب اُنکی اولاد ہے جو حضور سید عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں موجود ہے، کیونکہ یہ لوگ اپنے آبار کے متبع اور اُنکے افعال سے راضی ہیں۔

حضورِ اقدس سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود کو انکے علاوہ اور دس شناعتوں پر توبیخیں فرمائی گئیں، وہ دس یہ ہیں:۔ (۱) حضور سید عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اچھی طرح پہچان کر آپ کے حالِ مبارک کا چھپانا، اور توریت میں جو حضور کی نعت و صفت وارد ہے اُسکا اخفار کرنا۔ (۲) کتاب الٰہی کے کلمات میں تحریف کرنا۔ (۳) اُن محرّف مضامین کو حضرتِ رب العزت تبارک و تعالیٰ کی طرف منسوب کر دینا۔ (۴) باہم قتال۔ (۵) اپنے ایک فریق کو اُنکی بستیوں سے نکالنا اور بے وطن کرنا (۶) دنیا کی زندگی پر بہت زیادہ حریص ہونا۔ (۷) حضرت جبریل امین سے عداوت رکھنا۔ (۸) سحر کا اتباع۔ (۹) اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا۔ (۱۰) اللہ کا ہاتھ بند معا بتانا۔ —— یہاں بنی اسرائیل کو مذکورہ بالا نعمتیں یاد دلائی جاتی ہیں کہ تمہارے آبار و اجداد پر اللہ جل جلالہ کے کیسے کیسے عظیم احسان ہُوئے، اُن سب کو یاد کرو اور یاد کرنا یہ ہے کہ اطاعت و بندگی کے شکر بجالاؤ، کیونکہ کسی کی نعمت کا شکر نہ کرنا یہی اُسکا بھلا دینا ہے۔ اِسکے ساتھ وفارِ عہد کا حکم دیا گیا کہ تم ایمان و طاعت کے ساتھ میرا عہد پورا کرو، میں جزار و ثواب کے ساتھ تمہارا عہد پورا کرونگا۔ اِس عہد کا ذکر آیۂ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ میں ہے۔

مسئلہ اس آیت میں شکرِ نعمت اور وفارِ عہد کے واجب ہونے کا بیان ہے، اور یہ بھی کہ مومن کو چاہیے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا اور کسی سے نہ ڈرے۔

دوسری آیت میں قرآن کریم پر ایمان لانے کا حکم فرمایا گیا، اور یہ سُنایا گیا کہ جو کتابیں تمہارے ساتھ ہیں توریت و انجیل، قرآن پاک اُن کا مصدّق ہے بایں حیثیت کہ کُتبِ سابقہ میں جو شان اس کتاب کی بیان کی گئی ہے، یہ بالکل اُسکے مطابق ہے۔ اور اس معنی سے بھی مصدّق ہے کہ دعوتِ توحید اور عبادت و عدل کا حکم، اور معاصی و فواحش سے ممانعت اور مواعید جیسے اُن کتابوں میں مذکور ہیں اِس کتاب میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور جب یہ کتاب پچھلی کتابوں کے ساتھ اصولِ دین میں موافق ہے، تو پھر اہلِ کتاب کو اسکی مخالفت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اُن پر تو لازم ہے کہ اس کتاب پر سب سے پہلے وہی ایمان لائیں، اسلیے اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم سب سے پہلے کافر نہ بنو کہ پھر جو کوئی بھی تمہارا اتباع کرکے کافر بنے، اُسکا وبال بھی تمہاری گردن پر ہو۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا٘ میں توریت و انجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں، جن میں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت و صفت کا بیان ہے۔ مُراد یہ ہے کہ حضور کی نعت چھپا کر دولتِ دنیا حاصل مت کرو کہ وہ ثمنِ قلیل اور نعمتِ آخرت کے مقابل حقیر و ذلیل ہے۔

شانِ نزول کعب بن اشرف یہودی، اور اسکے سوا دوسرے یہود کے علمار و رؤسار کا دستور تھا کہ وہ اپنی قوم کے جاہلوں، اور چھوٹے درجہ کے لوگوں سے زر وصول کرتے تھے، اور اُنھوں نے اپنے سالانہ مقرر کر لیے تھے۔ کھیتوں، پھلوں اور نقد اموال میں اپنے حقوق مقرر کر رکھے تھے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد اُنھیں اندیشہ ہُوا کہ توریت میں جو حضور پُر نور آخر الانبیار صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نعت و صفت ہے، اگر یہ لوگ اُسکو ظاہر کر دیں، تو یہود حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لے آئینگے اور حضور کے متبع ہو جائینگے، پھر انھیں کوئی نہ پوچھے گا، اور یہ تمام منافع اور آمدنی کے ذرائع اُنکے ہاتھوں سے جاتے رہینگے، انکی سرداریاں باقی نہ رہینگی، یہ خیال کرکے اُنھوں نے اپنی کتابوں میں تحریف و تغیر کی، اور حضور پُر نور آخر الانبیار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت و اوصاف کو بدل ڈالا۔ اور یہ طریق عمل اختیار کیا کہ جب قوم کے لوگ اُن سے دریافت کرتے اور کہتے کہ توریت شریف میں حضرت خاتم الانبیار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وصفِ شان جو مذکور ہے وہ سُناؤ؟ تو وہ ہرگز نہ سُناتے اور چھپا لیتے۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور انھیں آگاہ کیا گیا کہ دنیائے ناپائیدار کی قلیل و ذلیل متاع اور تھوڑی پونجی کی طمع میں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف چھپا کر آخرت کی دائمی نعمت برباد نہ کرو، اور توریت شریف سے حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف مٹا کر اُس کی جگہ اپنی تراشیدہ اور گھڑی ہوئی عبارتیں درج کرکے باطل کو حق کے ساتھ نہ ملاؤ، اور دیدہ و دانستہ حق پوشی و ناحق کوشی نہ کرو۔ **مسئلہ** اس آیت سے معلوم ہُوا کہ عالِم کی خطا جاہل سے سخت اور قبیح تر ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ۝

اور نماز قایم رکھو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

اس آیت میں نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کا بیان ہے، اور اَقِیْمُوْا فرمانے میں اسطرف اشارہ ہے کہ نمازوں کو اُنکے اوقات پر تمام حقوق و حدود اور ارکان کی حفاظت و رعایت کے ساتھ باحتیاط ادا کرو، اور رکوع کرنیوالوں کے ساتھ رکوع کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اہلِ اسلام کی سی نماز پڑھو، جس میں رکوع ہے، نہ یہود کی سی نماز کہ جو رکوع سے خالی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اسلام لاؤ، اور اہلِ اسلام کے سے عمل کرو۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ رکوع سے نماز مراد ہے، جزو سے کل تعبیر فرمایا گیا، جیسے سجدہ سے نماز تعبیر کیجاتی ہے اور اس میں نمازِ باجماعت کی ترغیب دی ہے، کیونکہ نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھنا، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنا، نمازِ باجماعت میں حاصل ہوتا ہے۔ شریعت میں نمازِ باجماعت کی بہت تاکید آئی ہے۔ **حدیث** شریف میں ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے ۲۷ درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝

کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں

شانِ نزول:۔ یہ آیت علمارِ یہود کے حق میں نازل ہوئی، جن سے اُنکے مسلمان رشتہ داروں اور حلیفوں نے دینِ اسلام اور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نسبت دریافت کیا

تو انہوں نے کہا کہ تم اس دین پر قائم رہو یہ دین حق اور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا کلام سچا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ایک قول یہ بھی ہے کہ یہود کی ایک جماعت نے عرب کے مشرکین سے کہا تھا کہ تم میں ایک رسول ظاہر ہونگے اور دین حق کی دعوت دیں گے اور انہوں نے مشرکین کو حضور کی بعثت کی خبر دینے کے ساتھ حضور کا اتباع کرنے کی رغبت دلائی تھی پھر جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو یہ ہدایت کرنے والے یہود حضور سے حسد کرنے لگے اور آپکا انکار کیا اس پر اللہ تبارک تعالیٰ نے اون کو توبیخ کی اور اونپر زجر فرمایا کہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کی بعثت مبارکہ سے پہلے تو دوسروں کو آپکے اتباع کا حکم دیتے تھے اور ظہور مبارک کے بعد آپ سے پھر گئے تو کیا سبب کہ جس بات کا دوسروں کو حکم دیتے ہو خود کیوں نہیں کرتے باوجودیکہ تم کتاب یعنی توریت شریف کو پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس میں سید عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت وصفت موجود ہے تو کیا تم عقل نہیں رکھتے یعنی دوسروں کو نیک راہ بتانا اور اپنے آپ نہ اختیار کرنا کمال بے عقلی کی بات ہے اور بڑی ونادانی ہے بخاری مسلم میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا فرماتے تھے ایک شخص روز قیامت دوزخ میں ڈالا جائے گا اوس کے پیٹ کی آنتیں باہر نکلیں گی وہ اون کے ساتھ اس طرح گھومے گا جیسے چکی کا گدہ گھومتا ہے دوزخی اوس کے پاس آکر کہیں گے اے فلاں شخص آج تیرا کیا حال ہے تو تو دنیا میں لوگوں کو نیک بات بتانا تھا اور بدی سے روکتا تھا وہ کہے گا ہاں میں دوسروں کو نیک بات بتاتا تھا خود نہیں کرتا تھا اور دوسروں کو بدی سے روکتا تھا اور آپ کرتا تھا۔

امام بغوی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی کہ حضور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مینے شب معراج کچھ لوگ دیکھے جن کے ہونٹ آتشیں قینچیوں سے کاٹے جاتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا اے جبرئیل یہ کون ہیں جبرئل نے عرض کیا یہ واعظ لوگ ہیں جو دوسروں کو نیک بات بتاتے تھے اور اپنے آپ کو بھول جاتے تھے علماء نے فرمایا جو دوسروں کو نیکی کی تعلیم دے اور خود عمل نہ کرے وہ چراغ کی مثل ہے۔ جو دوسروں کو تو روشن کرتا ہے اور خود جلتا ہے بعض علماء نے فرمایا جو صرف زبان سے وعظ کہتا ہے اونکا کلام ضائع ہے اور جو اپنی فعل سے نصیحت کرتا ہے اس کا تیر نشانہ پر پہنچا مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا ؎ ہر کیے ناصح برائے دیگراں ؛ ناصح خود یافتم کم در جہاں ؛

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ع

اور صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں۔ جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پھرنا

اس آیت کریمہ میں صبر اور نماز سے مدد چاہنے کی نہایت پاکیزہ تعلیم فرمائی گئی ہے اور ایسی نفیس تعلیم سوائے ربانی تعلیم کے اور کسی طرح میسر ہی نہیں آسکتی حوائج ومصائب ورد انسان پر ناگزیر ہے کسی طبقہ اور کسی رتبہ کا شخص ہو حوادث کا پیش آنا اوسکے لئے لابد ہے نہ اس سے بادشاہ مستثنےٰ ہے نہ گدا، اور ہر انسان مصیبت کے سامنے کمزور ہوتا ہے اور ضعف انسانیت اوس کی عاجزی ومجبوری کا منظر اوس کے سامنے لاتا ہے ایسی حالت میں کیا سروسامان ہو جس سے مصیبتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تیر تفنگ، توپ، بندوق تمام آلات یہاں ناکارہ ہیں مال دولت سب ہیچ ہے۔ اس عقدہ کا حل کتاب الٰہی کی اس مقدس تعلیم نے فرمایا اور مسلمانوں کو بتایا کہ صبر مصیبتوں کا اخلاقی مقابلہ ہے۔

انسان عدل عزم۔ حق پرستی پر اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور سخت سے سخت شدائد کا مقابلہ صبر کی طاقت سے کیا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ صبر کی دولت عطا فرمائے تو مصیبتوں کی افواج کو اسی طاقت سے شکست دیجا سکتی ہے صبر والا مصیبت پر غالب آجاتا ہے اور مصیبتوں کے طوفان اس کے پائیہ ثبات کو جنبش نہیں دے سکتے۔ صبر کی تین قسمیں ہیں (۱) شدت اور مصیبت پر نفس کو روکنا (۲) طاعت وعبادت کی مشقتوں میں مستقل رہنا (۳) معصیت کی طرف مائل ہونے سے طبیعت کو باز رکھنا یہ سب باتیں ہوں تو صبر کی تکمیل ہو بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہاں صبر سے روزہ مراد ہے درحقیقت روزہ صبر کا ایک فرد ہے کیونکہ اس میں شدت جوع وعطش اور نفس کو روکنا ہے اور طاعت کی مشقت میں مستقل رہنا اور معاصی سے بچنا صبر کے تمام اقسام پائے جاتے ہیں اس لئے روزہ صبر کا فرد کامل ہے اور الصبر سے اس کے فرد کامل کا مراد ہونا کچھ بعید نہیں حاجت کا علاج اس آیۂ مبارکہ میں یہ ارشاد ہوا کہ نماز سے استعانت کیجائے کیونکہ نماز عبادت بدنیہ ونفسانیہ کی جامع ہے اور اسمیں قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے حضور پرنور سید عالم، صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی امر اہم پیش آتا تو آپ نماز میں مشغول ہو جاتے نماز میں مشغول ہونے سے صادقین کی توجہ اپنے حوائج وضروریات کی طرف سے پھر جاتی ہے اور وہ استغراق عبادت میں لذت پاتے ہیں دنیا ومافیہا کی طرف اصلا التفات نہیں ہوتا او فراغ نماز کے بعد دعا مقبول ہوتی ہے اور یہ بھی ہے کہ نماز ذکر ہے اور حدیث شریف میں وارد ہوا کہ جو شخص میری یاد میں اس طرح مشغول ہو کہ اس کو اپنی حاجت مانگنے اور سوال کرنے کی فرصت نہ ملے تو میں اس کو مانگنے والوں سے زیادہ عطا فرماتا ہوں اسواسطے بوقت حاجت نماز میں مشغول ہو جانے والا بکرم الٰہی فائز المرام ہوتا ہے آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ مومنین صادقین کے سوا نماز کا ادا کرنا جسموں پر شاق اور گراں ہوتا ہے آیت مبارکہ کے اخیر جملہ میں ایمان واروں کے لئے یہ روح پرور اور ایمان افروز بشارت ہی ہے کہ انہیں آخرت میں دیدار الٰہی کی اعلیٰ ترین نعمت سے سرفراز فرمایا جاوے گا۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت ہمیں بھی میسر فرمائے آمین۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کو نعمت الٰہی کے ذکر کرنے کا حکم دیا گیا بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی بہت نعمتیں ہیں یوں تو ہر بندہ پر بیشمار نعمتیں اور رحمتیں ہر آن ہیں جن کی گنتی اور شمار ممکن نہیں اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا مگر جلیل اور عظیم نعمتیں جن کے ساتھ کسیکو ممتاز فرمایا جاوے انکی یاد رکھنا اور ذکر کرنا مامور بہ ہے اور اس کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ نعمتوں کی یاد سے اور انکا ذکر کرنے سے دل نعمت دینے والے کی طرف مائل ہوتا ہے اور بندہ میں جذبہ شکر گذاری پیدا ہوتا اور ترقی کرتا ہے اور یہ سبب اطاعت اور فرمانبرداری کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے یاد کرنے سے بندہ کو تقویٰ اور پرہیزگاری اور حق ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل پر جو نعمتیں فرمائی گئیں۔ الکیلئے منّ اور سلوی اتارا گیا۔ تلاش غذا اور محنت کاشت

وداشت سے اونہیں آزادی دیگئی۔ ابر کو انکے لئے سائبان بنایا پتھر سے انکے لئے چشمے جاری فرمائے اور بہت نعمتیں جنکا قرآن کریم میں ذکر ہے۔ اُنسے بنی اسرائیل کو فیضیاب کیا گیا۔ اگرچہ یہاں خطاب اُن بنی اسرائیل کو ہے جو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے اور مذکورہ نعمتیں اونکے آباواجداد کو ملی تھیں لیکن چونکہ آبا کے شرف وعزت سے اولاد کو شرف وعزت حاصل ہوتا ہے اس لئے اولاد پر اُن نعمتوں کا شکر لازم کیا گیا جو اُنکے باپ دادانے پائی تھیں اَلْعٰلَمِیْنَ کا استغراق حقیقی نہیں عرفی ہے مراد یہ ہے کہ میں نے تمہارے آباکو انکے زمانہ والوں پر فضیلت دی کہ انہیں علم وایمان اور عمل صالح عطا فرمایا انہیں انبیا پیدا کئے عادل بادشاہ بنائے جیسا کہ حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام کے عہد مبارک اور اس کے بعد جب تک کہ بنی اسرائیل میں تغیر نہ آیا ہوتا رہا۔ یافضل جزئی مراد ہے جو کسی اور امت کو نافی نہیں ہو سکتا اس لئے امت محمدیہ علی صاحبھا الصلوۃ والسلام کے حق میں ارشاد ہوا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ بہر حال آیت میں نعم عظیمہ کے ذکر کا حکم ہے **مسئلہ** بالیقین سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی ولادت اعظم نعم الہیہ میں سے ہے تو اس کا ذکر اور اسکی یاد قائم کرنا اور اسکے لئے محافل ترتیب دینا اعلی ترین سعادت سے ہے اس لئے مشارق ومغارب بلاد وامصار ہر اقلیم سلطنت اور ہر بر اعظم میں جہاں اسلام پہنچا ہے اور مسلمان بستے ہیں کافۂ اہل اسلام میلاد شریف کی محافل متبرکہ منعقد کرتے ہیں تمام امت اس پر عامل ہے اور اس میں دین کی شوکت اور ایمان کی ترغیب ودعوت ہے سوائے وہابیہ کی قلیل جماعت کے دنیا کا کوئی اسلامی طبقہ اس عمل خیر کا منکر نہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی۔ اور نہ کافر کے لیے کوئی سفارش مانی جائے اور نہ کچھ لیکر اسکی جان چھوڑی جائے اور نہ اسکی مدد ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار شفاعت سے محروم ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ یہ حکم خاص کفار کے حق میں ہے مومن اس سے مستثنی فرمائے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ط جہاں کہیں آیات میں شفاعت کی نفی ہے وہ سب کفار کے ساتھ خاص ہیں کیونکہ جابجا مومنین کا استثنا فرمایا گیا ہے اور انکے لئے شفاعت ثابت فرمائی گئی ہے احادیث باب شفاعت میں حد تواتر کو پہنچگئی ہیں اور اس پر تمام امت کا اجماع ہے مومنین کے حق میں شفاعت کا منکر گمراہ ہے قرآن مجید میں جابجا مقبولان بارگاہ حق کی شفاعت کا بیان آیا ہے سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وآصحابہ وبارک وسلم کا درجہ علیا سب سے بلند وبالا ہے آپ ہی فتح باب شفاعت فرمائینگے آپ مقبول الشفاعۃ ہیں اللہ تبارک وتعالی نے آپ کے راضی کرنے کا وعدہ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى البتہ احادیث میں یہ آیا ہے کہ شفاعت کے منکر شفاعت سے محروم کئے جائیں گے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ط وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ

اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی۔ کہ تم پر برا عذاب کرتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے۔ اور اسمیں تمہاری رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام تھا

اس آیت میں اُن بنی اسرائیل کو خطاب ہے جو حضور سید عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے فرعونیوں سے نجات انکے آباکو دیگئی تھی اس احسان کا اُن پر اظہار فرمایا گیا کیونکہ اونکی نجات انکی نسلوں کی بقا کا سبب ہے اور آبا کے احوال ابنا کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ یہ ہر ملک وقوم کا عرف ہے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنے مفاخر کا ذکر کرتی ہے تو کہتی ہے کہ تم گذری ہوئی صدی میں ہمارے دست بازو کا زور دیکھ چکے ہو باوجودیکہ گذری ہوئی صدی میں یہ لوگ موجود نہ تھے وہ اپنے آباواجداد کے جنگی کارناموں کو اپنا فخر قرار دیتے ہیں آل فرعون سے فرعون کے اتباع اور اُس کے دین والے مراد ہیں اور فرعون اس بادشاہ کا لقب ہے جو قوم قبط اور عمالیق میں سے مصر کا فرمانروا ہو جسطرح کسری بادشاہ فارس کو اور قیصر بادشاہ روم کو اور خاقان بادشاہ ترک کو اور نجاشی بادشاہ حبشہ کو اور تبع فرمانروائے یمن کو کہتے ہیں عمالقہ عملیق ابن لاوذ ابن ارم ابن سام ابن نوح علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں یہ لوگ ملک شام میں سکونت رکھتے تھے اُنہیں سے جو مصر کے بادشاہ ہوئے وہ فرعون کہلائے حضرت موسی علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے فرعون کا نام ولید بن صعب بن زیّان ہے یہ قبطی تھا اور اُس کی عمر چار سو برس سے زیادہ ہوئی ایک قول یہ ہے کہ یہ اصفہان کا عطار تھا قرض کی گرانباریوں سے مفلس ہو کر بحالت اضطرار شام کی طرف بھاگ گیا لیکن وہاں قیام کرنے کی کوئی سبیل نہوئی تو مصر چلا گیا مصر میں دیکھا کہ بیرون شہر تربوز بہت ارزاں ہیں ایک درہم میں ایک انبار تربوزوں کا ملجاتا ہی اور ہر شہر میں ایک تربوز ایک درم کو بکتا ہی تو اس نے خیال کیا کہ اگر تربوز کی تجارت کیجائے تو تھوڑی مدت میں بڑی دولت پیدا کر سکتا ہے جس سے اپنے تمام دیون کا بار ادا کر سکیگا یہ خیال کر کے اس نے سواد مصر سے ایک درم میں تربوزوں کا ایک انبار خریدا اور بمشقت اس کو شہر میں لایا جس چوکی پر گذرا وہاں کے ٹیکس وصول کرنے والوں نے اس سے ایک تربوز لے لیا یہانتک کہ جب شہر میں پہنچا تو بالکل ہلکا ہو گیا تھا اور صرف ایک ہی تربوز اس کے پاس رہگیا تھا جو ایک درم میں بیچدیا اب شہر میں گشت لگانے لگا تو دیکھا کہ کوئی نظام سیاست درست نہیں ہے اسی زمانہ میں ایک وبائے عظیم پھیلی تو فرعون قبرستان میں پہنچ گیا اور قبرستان کا ایجنٹ بنگیا جو شخص مردہ دفن کرنے آتا اس سے کہتا کہ میں مہتمم قبرستان ہوں جب تک پانچ درہم مجھے نہ دو مردہ دفن کرنے نہ دونگا لوگ دیتے چلے گئے اور اس کے پاس دولت جمع ہونے لگی۔ تین مہینہ میں بہت کثیر مال جمع کر لیا ایک روز کچھ لوگ مردہ دفن کرنے آئے تو فرعون نے حسب معمول اُنسے پانچ درم طلب کئے اُنہوں نے دینے سے انکار کیا اور کہا کہ تجھے اس قبرستان کا متولی کس نے بنایا ہے اور کس اختیار سے وصول کرتا ہے یہ کوئی تسکین بخش جواب نہ دے سکا وہ لوگ اس کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لیگئے بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے اور یہ منصب تجھے کسنے تفویض کیا کہنے لگا کسی نے نہیں لیکن یہ کام میں نے صرف اس لئے کیا تھا کہ مجھے پکڑ کر آپکے حضور میں حاضر کردے اور مجھے آپکے ملک وقوم کا حال عرض کرنے کا موقع ملے میں نے قبرستان کی ایجنٹی کے ذریعہ اس قدر مال فراہم کیا ہے وہ یہ حاضر ہے آپکے ملک کا انتظام درست نہیں ہے بہت سے لوگ خود ساختہ ٹیکس وصول کرنے والے بنگئے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں آپکی سلطنت ویران اور بدنام ہو رہی ہے اگر آپ مجھکو مدار المہام بنادیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں کس مستعدی ودیانتداری اور ضابطہ سے کام لیتا ہوں فرعون کی یہ تقریر اور مال کا حاضر کر دینا بادشاہ پر اثر کر گیا اور اس نے اس کو مدار المہام بنا دیا وہ لوگوں

کے ساتھ خلقِ حسن اور نیک سلوک کا برتاؤ کرتا تھا، لشکر کے انتظام درست کیے، رعیت کے احوال میں اپنے نظم و نسق کا طریقہ دکھایا۔ اسکا انصاف اور اسکی نیکی شہرۂ آفاق ہو گئی، حتیٰ کہ بادشاہِ مصر کے مرنے کے بعد اربابِ حل و عقد نے اسکو بادشاہ بنانا پسند کیا، اور اسطرح مصر کی فرمانروائی اسکے ہاتھ آئی۔ حضرتِ یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کا نام ریّان ہے، اور دونوں فرعونوں کے درمیان چار سو برس سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ اِس آیت میں آلِ فرعون سے اُسی فرعون کے متبعین مراد ہیں جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا، اور جس کا نام ولید ہے۔ حکومت کے بعد اسکی شرارت و شیطنت بڑھتی گئی، اور یہانتک حالت خراب ہوئی کہ وہ خدائی کا مدعی ہوا۔ بنی اسرائیل کے ساتھ وہ سختیاں کیں جو درندوں کے ساتھ بھی کوئی انسانی طبیعت گوارا نہیں کر سکتی۔ رحم و مروت سے اُسکا قلب آشنا ہی نہ تھا۔ اُس نے بنی اسرائیل کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور مختلف قسم کی خدمتیں اور اعمالِ شاقّہ اُن پر لازم کر دیئے تھے، جو قوی و توانا نظر آتے اُن کو اس پر مامور کیا جاتا کہ وہ پہاڑوں سے پتھروں کی لمبی لمبی چٹانیں اپنے اُوپر لاد لائیں۔ یہ کام کرتے کرتے اُن لوگوں کے ہاتھ، گردنیں، پُشت زخمی ہو جاتی تھیں۔ ایک جماعت کو کوہ کنی یعنی پہاڑ کھودنے اور پتھر اُکھاڑنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ غرض کسی کے متعلق کوئی کام تھا، کسی کے متعلق کوئی اور جو ضعیف اور کمزور لوگ تھے اور جن میں کچھ کام کرنے کی طاقت نہ تھی اُن پر ٹیکس مقرر تھے، جو روزانہ ادا کرنے پڑتے تھے، اگر کوئی شخص غروبِ آفتاب تک ٹیکس نہ ادا کر سکا، تو اُسکا ہاتھ گردن سے ملا کر ایک مہینے تک کیلیے باندھ دیا جاتا تھا۔ طرح طرح کے بے محابا مظالم اور بے رحمیاں کی جاتی تھیں۔ ایک روز فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک بہت بڑی آگ آئی، اور اُس نے مصر کا احاطہ کر کے فرعون کی قوم یعنی تمام قبطیوں کو جلا ڈالا، اور بنی اسرائیل کو کچھ بھی ضرر و نقصان نہ پہنچایا۔ اس خواب سے فرعون کو نہایت وحشت و پریشانی ہوئی، اور اس کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے اُس نے اطرافِ ملک سے مشہور مشہور کاہنوں کو بلا کر جمع کیا، اور اُن سے اپنی خواب کی تعبیر چاہی۔ کاہنوں نے اُسکی یہ تعبیر دی کہ قومِ بنی اسرائیل میں ایک فرزند پیدا ہونے والا ہے، اور وہ تیری ہلاکت اور سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا۔ یہ تعبیر معلوم کرنے کے بعد فرعون یہی تدبیر سوجھی کہ وہ بنی اسرائیل کی نسل میں کوئی لڑکا نہ چھوڑے جو لڑکا پیدا ہو اُسکو قتل کرا دے۔ چنانچہ اُس نے اِسکا بڑا اہتمام کیا، کثیر التعداد دائیاں تفتیش کے لیے مقرر کیں، جو رات دن جستجو کرتی پھرتی تھیں کہ بنی اسرائیل میں کس کس کے حمل ہے اور کہاں کہاں بچّہ پیدا ہونے والا ہے۔ حمل بھی گرائے جاتے تھے، اور بچّے پیدا ہو جاتے تھے وہ قتل کرا دیئے جاتے، یہانتک کہ بنی اسرائیل کے بارہ ہزار، اور ایک روایت میں ستّر ہزار لڑکے قتل کرڈالے گئے، اور نوّے ہزار حمل ساقط کیے گئے۔ مشیّتِ الٰہی یہ ہوئی کہ قومِ بنی اسرائیل کے عمر رسیدہ اور بوڑھے لوگ جلد جلد مرنے لگے۔ اِس سے فرعون کی قوم یعنی قبطیوں میں پریشانی پیدا ہوئی، اور رؤسائے قبط نے گھبرا کر فرعون سے شکایت کی کہ بنی اسرائیل میں موت کی گرم بازاری ہے، اور انکے عمر رسیدہ آدمی بڑی کثرت و سُرعت کے ساتھ مرتے چلے جا رہے ہیں، اور انکے بچّے تیرے حکم سے قتل کیے جاتے ہیں، تو اگر ان لوگوں کا خاتمہ ہو گیا تو ہمیں خدمتگار کہاں سے میسّر آئینگے۔ اس پر فرعون نے اپنی قوم کی تکالیف کا خیال کر کے یہ حکم دیا کہ بچّے ایک سال قتل کیے جائیں اور ایک سال چھوڑ دیئے جائیں۔ جو سال چھوڑنے کا تھا، اُس میں تو حضرتِ ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے، اور قتل کے سال میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ بَلَآءٌ امتحان و آزمائش کو کہتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آزمائش جسطرح شدّت و محنت سے ہوتی ہے، اُسی طرح نعمت و کرم سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ نعمت سے بندہ کی شکر گزاری، مِنّت پذیری، اور محنت و تکلیف سے اُسکے صبر و رضا کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ آیتِ کریمہ میں ذٰلِکُمْ وارد ہے، اسکا اشارہ اگر فرعون کے مظالم اور اسکی ستمگاریوں کی طرف ہو، تو اس صورت میں بلاء سے محنت و مصیبت مراد ہوگی۔ اور اگر ذٰلِکُمْ کا اشارہ اُن مظالم سے نجات عطا فرمانے کی طرف ہو، تو نعمت مراد ہوگی

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا پھاڑ دیا　تو تمہیں بچا لیا　اور فرعون والوں کو　تمہاری آنکھوں کے سامنے　ڈبو دیا

یہ دوسری نعمت کا بیان ہے، جس سے بنی اسرائیل سرفراز فرمائے گئے کہ اُنھیں فرعونیوں کے حد سے گزرے ہوئے ظلم و ستم سے نجات دی، اور انکے دشمن فرعون کو مع اُس کی قوم کے اُنکے سامنے غرق کر دیا۔ یہاں آلِ فرعون سے، فرعون مع اپنی قوم کے مُراد ہے، جیسے کہ آیتِ کریمہ کَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ میں حضرتِ آدم اور اولادِ آدم دونوں داخل ہیں مختصر واقعہ اسطرح ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے بنی اسرائیل کو شب کے وقت مصر سے لیکر روانہ ہوئے، صبح کو جب لوگوں نے فرعون سے کہا کہ بنی اسرائیل مصر سے بالکل ہی چلے گئے، اب وہ واپس آنیوالے نہیں، تو فرعون اُنکی جستجو میں ایک لشکرِ گراں لیکر چل پڑا، اور اُنھیں دریا کے کنارے جا پایا۔ بنی اسرائیل فرعون کے لشکر کو دیکھکر بہت گھبرائے، اور اُنھوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی، اور کہنے لگے کہ اے موسیٰ اب کیا ہو! فرعون پیچھے ہے دریا سامنے ہے، نہ بھاگنے کی کوئی جگہ ہے نہ چھپ رہنے کا کوئی موقع ہے، ہم تو بہت بیڈھب گرفتار ہوئے۔ حضرتِ موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنھیں تسکین دی، اور بحکمِ الٰہی دریا میں اپنا عصا مارا، اُسکی برکت سے عین دریا میں بارہ خشک راستے پیدا ہو گئے، پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا، بنی اسرائیل دریا سے گزرنے کے لیے اُن راستوں میں چل پڑے، لیکن اب اُنھیں یہ شکایت ہوئی کہ ہماری ہر سبط کے لیے ایک ایک جُدا جُدا راستہ تو ہے، لیکن ہمیں اپنے بھائیوں کی طرف سے پریشانی ہے، جو ان راستوں میں گزر رہے ہیں اور ہماری نگاہوں سے غائب ہیں، گو امن میں ہیں لیکن اُنکی خبر نہیں کہ وہ کس حال میں ہیں۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی، اور بحکمِ الٰہی ہوا چلی، اس سے اُن آبی دیواروں میں جالی کی مثل روشندان بنگئے اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت اُن راستوں میں ایک دوسرے کو دیکھتی اور باہم باتیں کرتی گزر گئی۔ فرعون بھی جو اُنکے تعاقب میں آ رہا تھا، دریا میں خشک راستے دیکھکر کچھ خوف و تامل کرنے کے بعد ایسی صورت پیش آئی کہ چل ہی پڑا، اور جب اُس نے گھوڑا ڈالدیا، تو لشکریوں میں سے کس کی مجال تھی کہ وہ رہ جاتا، تمام لشکر چل پڑا، اور جب یہ کُل لشکر دریا کے اندر گیا، اور ٹھیک وسط میں پہنچ گیا، اور بنی اسرائیل کنارہ پر امن و اطمینان کی جگہ پہنچ گئے، تو بحکمِ الٰہی دریا اپنی اصل حالت پر آ گیا، اور وہ تمام راستے پانی سے بھر گئے اور مثلِ سابق دریا موجیں مارنے لگا تمام فرعونی اُس میں غرق ہو گئے۔ دریا کا عرض اُس مقام پر چار فرسنگ یعنی بارہ میل تھا۔ یہ واقعہ بحرِ قلزم کا ہے جو بحرِ فارس کے کنارہ پر ہے، یا بحرِ ماورائے مصر کا، جسکو اَسَاف کہتے ہیں بنی اسرائیل لبِ دریا ستمگار فرعونیوں کے غرق ہونے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ یہ واقعہ محرم کی دسویں تاریخ رُونما ہوا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اُس دن شُکر کا روزہ رکھا۔ حضور پُرنور سید عالم خاتم المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانۂ پاک تک بھی یہود اس دن کا روزہ رکھا کرتے تھے، ہمارے آقائے نامدار سرکارِ ابد قرار سید المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اس دن کا روزہ رکھا، اور ارشاد فرمایا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی فتح کی خوشی منانے اور اسکی شکر گزاری کرنے کے ہم یہود سے زیادہ حقدار ہیں۔

اس سے کئی مسئلے معلوم ہوئے، ایک یہ کہ عاشورہ یعنی دسویں محرم کا روزہ سُنّت ہے۔ دوسرے یہ کہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر اللہ تبارک و تعالیٰ کے جو انعام و اکرام ہیں اُن کی یادگار قایم کرنا، اور اُنکا شکر بجالانا سُنّتِ رسول بھی ہے، اور سُنّتِ صحابہ بھی صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیہم وسلم۔ یہ مسئلہ بھی صاف معلوم ہو گیا کہ ایسے امور کے لیے دن کا عملاً تعیّن کرنا بھی سُنّت، اور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا معمول ہے، کیونکہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وہ روزہ کسی دوسرے دن نہ رکھا، اگر یہ تعیین ناجائز ہوتا تو حضور یا حضور کے اصحاب ضرور اسکو توڑ دیتے۔ یہ مسئلہ بھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یادگاریں اگر کفار بھی قایم کرتے ہوں، تو جب بھی اُن کو نہ چھوڑا جائے گا۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

اور جب ہم نے　موسیٰ سے　چالیس رات کا　وعدہ فرمایا　پھر اسکے پیچھے تم نے　بچھڑے کی پُوجا شروع کر دی　اور تم ظالم تھے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی کہ کہیں تم احسان مانو۔

فرعون اور اُس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسرائیل کو ہمراہ لیکر سرزمین مصر کی طرف واپس ہوئے، اور بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر کتنا عظیم احسان فرمایا، اسکا شکر واجب ہے، اور اُسکی طاعت وعبادت لازم۔ اِس پر انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ آپ بیشک سچ فرماتے ہیں۔ ہم اپنے رب کی فرمانبرداری اور ادائے عبادت کے لیے حاضر ہیں، لیکن اُسکی مرضیات کا علم تو ہو، ہمیں کوئی کتاب ملے، اُس میں احکام ہوں، ہمارے لیے دستور العمل ہو، عبادت کے طریقے ہوں، حلال وحرام کا بیان ہو، تب تو اُسکی اطاعت وفرمانبرداری کیجائے۔ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی، اور توریت عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا، اور اُسکے لیے میقات معین کیا، جسکی مدت اضافہ شامل کرکے ایک ماہ دسؔ روز تھی۔ ماہ تو ذوالقعدہ پورا اور دسؔ روز ماہِ ذوالحجہ کے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر فرماکر توریت حاصل کرنے کی غرض سے کوہِ طُور پر تشریف لے گئے۔ آپ نے وہاں چالیس شب اسطرح قیام فرمایا کہ اس عرصہ میں کسی سے بات تک نہ کی، اللہ تعالیٰ نے زبرجدی الواح میں توریت آپ پر نازل فرمائی۔ اِدھر بنی اسرائیل میں یہ حادثہ پیش آیا کہ سامری نام ان میں ایک شخص تھا زرگر، اُس نے بنی اسرائیل سے وہ زیورات لیکر جو قومِ فرعون کے اُن کے پاس تھے، اُن سے سونے کا ایک گوسالہ (بچھڑا) بنایا، اور اُسکو جواہرات سے مرصع کیا پھر قوم سے کہا کہ یہ تمہارا معبود ہے (معاذاللہ) بنی اسرائیل ایک ماہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتظار کرنے کے بعد سامری کے اغوار سے گوسالہ کی پرستش کرنے لگے، اور سوائے حضرت ہارون علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اُنکے بارہ ہزار ہمراہیوں کے تمام بنی اسرائیل نے گوسالہ کی پرستش کی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام توریت لیکر واپس تشریف لائے، تو قوم کی یہ حالت دیکھکر آپ کو نہایت رنج ہوا، اور آپ نے بعد زجر و توبیخ کے یہ فرمایا کہ اے قوم بنی اسرائیل اب تمہاری توبہ کی یہی صورت ہے کہ تم سے جن لوگوں نے گوسالہ کی پرستش نہیں کی ہے وہ لوگ پرستش کرنے والوں کو قتل کریں، اور پرستش کرنے والے برضا و تسلیم، صبر و سکون کے ساتھ قتل ہو جائیں، کوئی جزع فزع اضطراب ظاہر نہ ہونے پائے۔ وہ اس پر راضی ہو گئے، اور قتل شروع ہوا، صبح سے شام تک ستر ہزار شخص قتل ہو گئے، تب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے نہایت تضرع وزاری کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عفو کی درخواست کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ جو لوگ قتل ہو گئے وہ سارے شہید ہوئے، اور جو باقی ہیں اُنکی مغفرت فرمائی گئی، قاتل ومقتول سب جنتی ہیں۔

اس واقعہ سے چند مسائل معلوم ہوئے۔ مسئلہ (۱) شرک کرنے سے مسلمان مرتد ہو جاتا ہے۔ مسئلہ (۲) مرتد کی سزا قتل ہے، کیونکہ اللہ مالک الملک سے بغاوت کرنا قتل وخونریزی سے زیادہ شدید، اور سخت تر جرم ہے۔ اور جب قتل وخونریزی کی سزا قتل ہے، تو ارتداد کی سزا بطریق اولیٰ قتل ہونی چاہیئے۔ کیونکہ کوئی جرم رب سے بغاوت کرنے کی برابر نہیں ہو سکتا۔ گوسالہ بنا کر اُسے پوجنے میں بنی اسرائیل کے متعدد جرم تھے۔ ایک تو جاندار کی تصویر بنانا جو جرم ہے۔ دوسرے حضرت ہارون علیہ السلام کے حکم کو نہ ماننا اُنکی نافرمانی کرنا۔ تیسرے اپنے بنائے ہوئے گوسالہ کو پوجکر مشرک کرنا اور مشرک ہو جانا درحقیقت اُنکا یہ ظلم، آلِ فرعون کے مظالم سے بھی زیادہ شدید اور بدتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان سے اس قسم کے افعال ایمان لانے کے بعد سرزد ہوئے، اسلیے یہ لوگ مستحق تو اسکے تھے کہ فوراً عذاب الٰہی آتا اور انھیں فرصت ومہلت نہ دیجاتی اور دفعتہً ہلاک کر دیئے جاتے اور ان کا اُسی کفر پر خاتمہ ہو جاتا، لیکن حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام کی بدولت ایسا نہ ہوا، اور اُنھیں توبہ کا موقع دیا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی برکت ہے۔ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ میں اسی کا بیان ہے، اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں ایک نہایت لطیف اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل اور آلِ فرعون میں فرق ہے یہ کہ فرعونیوں کی استعداد باطل ہو چکی تھی اور اُن میں درستی وراہ یابی کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی، اور بنی اسرائیل کی استعداد باطل نہ ہوئی تھی، اور ان کی نسل سے صالحین اور اللہ کے نیک بندے پیدا ہونے والے تھے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اُن کی اولاد میں ہزارہا نبی اور صلح پیدا ہوئے۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور حق و باطل میں تمیز کر دینا کہ کہیں تم راہ پر آؤ اور جب موسیٰ نے

لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ

اپنی قوم سے کہا اے میری قوم تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ

تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے تو اُس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً

بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا الیقین نہ لائینگے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے پھر مرے پیچھے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو

جب بنی اسرائیل نے توبہ کی، اور کفارہ میں اپنی جانیں دیدیں، تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام انھیں گوسالہ پرستی کی عذرخواہی کیلیے حاضر لائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان میں سے ستر آدمی منتخب کرکے طور پر لے گئے، وہاں وہ کہنے لگے اے موسیٰ ہم آپ کا یقین نہ کرینگے جبتک خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں۔ اِس پر آسمان سے ایک ہولناک آواز آئی، جس کی ہیبت سے وہ مرگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بتضرع عرض کی کہ اے رب میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دونگا؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے انھیں یکے بعد دیگرے زندہ فرمایا۔ مسئلہ اس سے شانِ انبیاء علیہم السلام معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ کہنے کی شامت میں بنی اسرائیل ہلاک کیے گئے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد والوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جناب میں ترکِ ادب غضب الٰہی کا باعث ہوتا ہے اِس سے ڈرتے رہیں۔

مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقبولانِ بارگاہ کی دُعا سے مُردے زندہ فرماتا ہے۔ (خزائن العرفان)

کہتے ہیں کہ یہ پتھر وہی تھا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غسل کرنے کے لیے کپڑے اُتار کر رکھدیئے تھے اور وہ پتھر کپڑے لیکر بھاگا تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسکے پیچھے دوڑے تھے یہانتک کہ آپکا بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر گزر ہُوا، انھوں نے آپ کی نسبت کہا تھا کہ انھیں آدرہ یعنی فوطے بڑے ہونے کا یا برص کا مرض ہے۔ چونکہ آپ پردہ کا بہت اہتمام و احتیاط فرمایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انکی زبان بند کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بدن، دکھلا دیا، اور اُسی وقت حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے، اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ حکمِ الٰہی یہی تھا اور اس پتھر کو اُٹھالو، اس میں میری ایک قدرت، اور تمہارا ایک معجزہ ظاہر ہوگا۔ آپ نے اُسے اُٹھاکر اپنے توبرہ میں رکھ لیا۔ یہ واقعہ بخاری و مسلم میں مذکور ہے اس میں اختلاف ہے کہ یہ پتھر کس نوع کا تھا۔ بعض نے کہا کہ یہ سنگِ رُخام (مرمر) تھا، بعض نے کہا کہ سنگِ کذّان (ملایم) تھا۔ اس میں بارہ[۱۲] گڑھے تھے ہر گڑھے میں سے ایک شیریں چشمہ جوش زن ہوتا تھا۔ جب ہر گروہ پانی سے سیراب ہولیتا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسے اُٹھانا چاہتے، تو اُس پر عصا مارتے پانی بند ہوجاتا۔ یہ پتھر چھ لاکھ آدمیوں کو روزانہ سیراب کرتا تھا حضرت وہب اور دیگر مفسرین کا قول ہے کہ الحجر میں الف لام جنس کا ہے، یعنی کوئی خاص پتھر نہ تھا، بلکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ جس پتھر پر بھی آپ عصا مارتے اُس میں سے چشمے اُبل پڑتے۔ لیکن اول قول زیادہ موزوں ہے۔

كُلُوْا (کھاؤ) یعنی آسمانی طعام مَنّ و سلوٰی کھاؤ، وَاشْرَبُوْا اور پیو، یعنی اس پتھر کے چشموں کا پانی پیو، جو تمہیں بفضلِ الٰہی بے محنت میسر ہے۔ اگرچہ سارے رزق اللہ تعالیٰ ہی کے دیئے ہوئے ہیں، مگر اور رزقوں میں بظاہر تمہارے خیال میں تمہارے کسب کو بھی دخل ہے، لیکن یہ رزق تو تمہیں بلا تمہاری محنت و مشقت کے ملتا ہے۔

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (اور زمین میں فساد اُٹھاتے نہ پھرو) عثیٰ کے معنی سخت فساد کے ہیں۔ مُفْسِدِيْنَ۔ لَا تَعْثَوْا کا حال مؤکد ہے۔ بیضاوی کہتے ہیں کہ مفسدین کے لانے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ عثی سے مراد اکثر فساد ہی ہوتا ہے، لیکن کبھی عثی کا مدلول عام فساد میں بھی پایا جاتا ہے، مثلاً کسی ظالم سے مقابلہ کرنا درحقیقت اصلاح و درستگی کے لیے ہوتا ہے، جو فساد کی ضد ہے، جیسے حضرت خضر علیٰ نبینا و علیہ السلام کا بچّہ کو قتل کرنا، اور کشتی کو توڑنا وغیرہ۔ اور یہ بھی معنی ممکن ہیں کہ عثی سے مطلق تبذیر یعنی فضول خرچی اور بیجا اسراف مراد ہو۔ چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں عثی کا استعمال اسی معنی میں آیا ہے۔ الفاظِ حدیث یہ ہیں کہ قال لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کسریٰ وقیصر یعثیان فیما یعثیان فیہ وانت ھکذا۔ یعنی آپ نے حضور رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ! یہ دنیا کے کتّے کسریٰ اور قیصر مال کو خوب اُڑا رہے ہیں اور آپ اس فقر و فاقہ کی حالت میں ہیں۔ واللہ اعلم

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں

تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

ہمارے لیے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو

الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ

بہتر کے بدلے مانگتے ہو اچھا مصر یا کسی شہر میں اُترو وہاں تمہیں ملیگا جو تم نے مانگا اور اُن پر مقرر

عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ

کردی گئی خواری اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلا تھا اُسکا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ۧ

انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلا تھا اُن کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کے ذکر کے بعد اب بنی اسرائیل کی نالیاقتی، دون ہمتی اور نافرمانی کے چند واقعات بیان فرماتا ہے:۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى (اور جب تم نے کہا اے موسیٰ) بنی اسرائیل کی یہ ادا بھی نہایت بے ادبانہ تھی کہ پیغمبر اولوالعزم کو نام لیکر پکارا، یا نبی اللہ، یارسول اللہ، یا کلیم اللہ یا اور کوئی تعظیم کا کلمہ نہ کہا۔ (فتح العزیز) جب انبیاء علیہم السلام کا خالی نام لینا بے ادبی ہے، تو اُن کو بشر اور ایلچی کہنا کسطرح گستاخی نہ ہوگا۔ غرض انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں بے تعظیمی ناجائز ہے۔ (خزائن العرفان) لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ (ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا) ایک کھانے سے مُراد ایک قسم کا کھانا ہے، یعنی یہ اُن کی کتنی نالائقی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مَنّ و سلوٰی جیسی پاکیزہ نعمتیں اُتاریں، بنی اسرائیل نے اُن کی ناقدری کی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا فَادْعُ لَنَا الآیہ (تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لیے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز) اس پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سمجھاتے ہوئے فرمایا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ (فرمایا کیا ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو) لیکن بنی اسرائیل برابر اصرار کرتے رہے، جب وہ اس پر بھی نہ مانے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ ارشاد ہوا اِھْبِطُوْا مِصْرًا الآیہ (اچھا مصر یا کسی شہر میں اُترو تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا) مصر عربی میں شہر کو بھی کہتے ہیں کوئی شہر ہو یا خاص شہر یعنی وہ مصر جو فرعون کا شہر ہے۔ یہاں دونوں میں ہر ایک مُراد ہو سکتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں خاص شہر مصر مُراد نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسکے لیے یہ لفظ غیر منصرف ہوکر مستعمل ہوتا ہے، اور اس پر تنوین نہیں آتی، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ اور اُدْخُلُوْا مِصْرَ۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ سکونِ اوسط کی وجہ سے لفظِ ہند کی طرح اسکو منصرف پڑھنا درست ہے۔ نحو میں اس کی تصریح موجود ہے۔ علاوہ بریں حسن وغیرہ کی قرأت میں مصر بلا تنوین آیا ہے، اور بعض مصاحف حضرت عثمان اور مصحفِ حضرت اُبَیّ ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بھی ایسا ہی ہے، اسی لیے حضرت مترجم قدس سرہٗ نے ترجمہ میں دونوں احتمالوں کو اخذ فرمایا اور شہرِ معین کے احتمال کو مقدم کیا۔ (خزائن العرفان)

اب رہا ساگ اور ککڑی وغیرہ کا سوال کرنا، گو اِن چیزوں کی طلب گناہ نہ تھی، لیکن مَنّ و سلوٰی جیسی نعمتِ بے محنت چھوڑ کر اُنکی طرف مائل ہونا پست خیالی ہے۔ ہمیشہ ان لوگوں کا میلانِ طبع پستی ہی کی طرف رہا۔ اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام وغیرہ جلیل القدر بلند ہمت انبیاء علیہم السلام کے بعد بنی اسرائیل کی لئیمی و کم حوصلگی کا پورا ظہور ہوا۔ اور تسلطِ جالوت و حادثہ بُخت نصر کے بعد تو وہ بہت ہی ذلیل و خوار ہو گئے، اس کا بیان ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ میں ہے۔ (خزائن العرفان)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ (اور ان پر مقرر کردی گئی خواری و ناداری) یہود کی ذلت تو یہ کہ دنیا میں کہیں بھی انکی بے سہارا اور مستقل حکومت و سلطنت نہیں

اور ناداری یہ کہ مال موجود ہوتے ہوئے بھی حرص سے محتاج ہی رہتے ہیں۔ **فقر و محتاجی** کو مسکنہ اسلیے کہتے ہیں کہ فقر آدمی کو نچلا بٹھا دیتا ہے، چلبلا پن اور اکڑ سب جاتی رہتی ہے یہودیوں کی حالت دیکھو کہ اگرچہ یہ کیسے ہی مالدار ہوں، لیکن فقیر و گداگر معلوم ہوتے ہیں۔ اور بعض نے کہا مسکنہ سے مراد دل کا فقر اور مال کی حرص ہے۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (اور خدا کے غضب میں لوٹے) ۔ انبیاء و صلحاء کی بدولت جو رتبے انھیں حاصل ہوئے تھے اُن سے محروم ہو گئے۔ اس غضب کا باعث صرف یہی نہیں ہے کہ اُنھوں نے آسمانی غذاؤں کے بدلے ارضی پیداوار کی خواہش کی۔ یا اسی طرح کی اور خطائیں جو زمانۂ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام میں صادر ہوئیں، بلکہ عہدِ نبوت سے دُور ہونے، اور زمانہ دراز گزرنے سے انکی استعدادیں باطل ہوئیں، اور نہایت قبیح افعال، اور عظیم جرم اُن سے سرزد ہوئے۔ یہ انکی اس ذلت و خواری کے باعث ہوئے۔

بَآءُوْ کے معنی ہیں **رَجَعُوْا** یعنی "لوٹے" اس لفظ کا استعمال شر کے سوا خیر میں نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ (یہ بدلا تھا اسکا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے) جیساکہ اُنھوں نے حضرتِ زکریا، حضرتِ یحییٰ، حضرتِ شعیا علیہم السلام کو شہید کیا۔ اور یہ قتل ایسے ناحق تھے جنکی وجہ خود یہ قاتل بھی نہیں بتا سکتے۔ **مطلب** یہ کہ ان یہودیوں پر ذلت و مسکینی چپکا دی گئی ہے، اور اہانت و پستی ان پر ڈال دی گئی ہے۔ جزیہ ان سے وصول کیا گیا، مسلمانوں کے قدموں تلے انھیں ڈالا گیا، فاقہ کشی اور بھیک کی نوبت پہنچی، خدا کا غضب اور غصہ ان پر اُترا۔ یہ تمام عذاب انکے "تکبر" عناد، حق کی قبولیت سے انکار، اللہ کی آیتوں سے کفر، انبیاء اور اُنکے تابعین کی اہانت، اور انکے قتل کی بناء پر تھا۔ اس سے زیادہ بڑا کفر اور کونسا ہوگا؟ کہ اللہ کی آیتوں یعنی توریت و انجیل اور قرآن سے کفر کرتے ہیں، اور اُسکے نبیوں کو بلاوجہ قتل کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تکبر کے معنی حق کو چھپانے اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کے ہیں۔ **مالک ابن مرارہ رہاوی** رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک روز حضور کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ یارسول اللہ! میں خوبصورت آدمی ہوں، میرا دل نہیں چاہتا کہ کسی کی جوتی کا تسمہ بھی مجھ سے اچھا ہو، تو کیا یہ تکبر و سرکشی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ تکبر اور سرکشی، حق کو روکنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کا تکبر کفر و قتلِ انبیاء تک پہنچ گیا تھا، اسلیے خدا کا غضب اُن پر لازم ہو گیا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ حضرتِ **عبداللہ ابنِ مسعود** رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل ایک ایک دن میں تین تین سو نبیوں کو قتل کر ڈالتے تھے، پھر بازاروں میں جا کر اپنے لین دین میں لگتے تھے۔ (ابوداؤد وطیالسی) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اُس شخص پر ہوگا، جسے کسی نبی نے قتل کیا ہو، یا اُس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو، یا گمراہی کا امام ہو، یا تصویریں بنانے والا مصور ہو۔ واللہ اعلم

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

بے شک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ایمان لائیں اور نیک کام کریں اُن کا ثواب اُنکے رب کے پاس ہے اور نہ اُنھیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

اوپر چونکہ نافرمانیوں کے عذاب کا ذکر تھا، تو یہاں اُن میں جو لوگ نیک تھے اُنکے ثواب کا بیان ہو رہا ہے۔ نبی کی تابعداری کرنیوالوں کے لیے یہ بشارت تا قیامت ہے کہ وہ آئندہ کے خوف سے نڈر اور چھوڑی ہوئی چیزوں پر حسرت سے پاک۔ دوسری جگہ ہے **اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** ○ یعنی اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف و غم نہیں۔ اور وہ فرشتے جو مسلمان کی رُوح نکلنے کے وقت آتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ **اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ** ○ تم ڈرو نہیں، تم اُداس نہ ہو، تمہیں اُس جنت کی خوشخبری دیتے ہیں جسکا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ حضرت **سلمان** فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، میں حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے سے پہلے جن دینداروں سے ملا تھا انکی عبادت اور نماز و روزے وغیرہ کا ذکر کیا، تو یہ آیت اُتری۔ (ابنِ ابی حاتم) **ایک اور روایت** میں ہے کہ حضرت سلمانِ فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نمازی، روزہ دار، ایماندار، اور اس بات کے معتقد تھے کہ آپ مبعوث ہونیوالے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس سے بڑا رنج ہوا، وہیں یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہودیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو توریت کو مانتا ہو، اور سُنتِ موسیٰ علیہ السلام کا عامل ہو لیکن جب حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام آجائیں، تو اُنکی تابعداری کرے اور اُنکی نبوت کو برحق سمجھے۔ اگر اب بھی وہ توریت اور سُنتِ موسیٰ علیہ السلام پر جما رہا اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور تابعداری نہ کی، تو پھر بے دین ہو جائیگا۔ اسی طرح نصرانیوں میں سے ایماندار وہ ہے، جو انجیل کو کلام اللہ مانے، شریعتِ عیسوی پر عمل کرے، اور اگر اپنے زمانہ میں پیغمبرِ آخر الزماں حضور سیدِ الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پالے، تو آپ کی تابعداری اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرے۔ اگر اب بھی اُس نے انجیل کو اور اتباعِ عیسوی کو نہ چھوڑا، اور حضور کی سنتوں کو نہ اپنایا، تو ہلاک ہوگا۔ (ابنِ ابی حاتم) اسدی نے یہی روایت کی ہے، اور سعید ابنِ جبیر بھی یہی فرماتے ہیں۔ **مطلب** یہ ہے کہ ہر نبی کا تابعدار اُس کا ماننے والا ایماندار اور صالح ہے اور خدا کے یہاں نجات پانے والا، لیکن جب دوسرا نبی آیا اور اُس نے اُس سے انکار کیا، تو کافر ہو جائیگا۔ قرآنِ کریم کی ایک تو یہ آیت جو آپ کے سامنے ہے، اور دوسری وہ آیت جس میں بیان ہے **مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ** ○ یعنی جو شخص اسلام کے سوا اور دین ڈھونڈے اُس سے قبول نہ کیا جائیگا اور آخرت میں وہ نقصان اُٹھانے والا ہوگا۔ ان دونوں آیتوں میں یہی تطبیق ہے کہ کسی شخص کا کوئی عمل کو طریقہ مقبول نہیں، تاوقتیکہ وہ شریعتِ محمدیہ کے مطابق نہ ہو، مگر یہ اُسوقت ہے جبکہ آپ مبعوث ہو کر دنیا میں آ گئے۔ آپ سے پہلے جس نبی کا جو زمانہ تھا، اور جو لوگ اُس زمانہ میں تھے اُنکے لیے اُنکے زمانہ کے نبی کی تابعداری اور اُسکی شریعت کی مطابقت شرط ہے۔

لفظِ **یہود** ہوداۃ سے ماخوذ ہے، جسکے معنی مَوَدَّة اور دوستی کے ہیں۔ یا یہ ماخوذ ہے **تَهَوُّد** سے، جسکے معنی توبہ کے ہیں۔ جیسے قرآنِ کریم میں ہے **اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ**۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں "ہم اے اللہ تیری طرف توبہ کرتے ہیں"۔ پس اُنھیں ان دونوں وجہوں سے "یہود" کہا گیا ہے، توبہ کی وجہ سے اور آپس کی دوستی کی وجہ سے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ یہودا کی اولاد میں سے تھے اسلیے انھیں "یہود" کہا گیا۔ یہودا، حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ توریت پڑھتے وقت ہلتے تھے، اس بناء پر انھیں یہود یعنی حرکت کرنے والا کہا گیا ہے۔ **جب** حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ آیا، تو بنی اسرائیل پر آپ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کے فرمان کی اتباع واجب ہوئی اور ان کا نام **نصاریٰ** ہوا۔ کیونکہ انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کی نصرت یعنی تائید و مدد کی تھی۔ انھیں "انصار" بھی کہا گیا ہے۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے **مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۚ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ** ط یعنی اللہ کے دین میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا ہم ہیں۔ **بعض** کہتے ہیں یہ لوگ جہاں اُترے تھے اُس زمین کا نام ناصرہ تھا، اسلیے انھیں نصاریٰ کہا گیا۔ قتادہ اور ابنِ جریج کا یہی قول ہے۔ ابنِ عباس سے بھی یہی مروی ہے۔

نصاریٰ نصران کی جمع ہے، جیسے نشوان کی جمع نشاویٰ، اور سکران کی جمع سکاریٰ۔ اسکا مؤنث **نَصْرَانَةٌ** آتا ہے۔ اب جبکہ **خاتم النبیین** صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا زمانہ آیا، اور اب

تمام دنیا کی طرف رسول و نبی بنا کر بھیجے گئے، تو ان پر اور اُن پر، سب پر آپ کی التصدیق و اتباع واجب ہوئی، اور آپ کی اُمت کا نام مومن رکھا۔ انکے ایمان و یقین کی پختگی کی وجہ سے اور اسلیے بھی کہ ان کا ایمان تمام اگلے انبیاء پر بھی ہے اور تمام آنے والی باتوں پر بھی۔ صَابِیٔ کے معنی ایک تو بے دین اور لامذہب کئے گئے ہیں۔ اور اہلِ کتاب کے ایک فرقہ کا نام بھی یہ تھا جو زبور پڑھا کرتے تھے۔ اسی بناء پر حضرتِ امام ابو حنیفہ اور اسحاق رحمہما اللہ کا مذہب ہے کہ انکے ہاتھ کا ذبیحہ ہمارے لیے حلال ہے اور انکی عورتوں سے نکاح کرنا بھی۔ حضرتِ حسن اور حضرت حکم رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ گروہ مانند مجوسیوں کے ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ یہ لوگ فرشتوں کے پجاری تھے۔ زیاد نے جب یہ سُنا تھا کہ یہ لوگ پنجوقتہ نماز قبلہ کی جانب پڑھا کرتے ہیں، تو ارادہ کیا کہ انھیں جزیہ معاف کر دے، لیکن ساتھ ہی معلوم ہُوا کہ وہ مشرک ہیں، تو اپنے ارادہ سے باز رہے۔ ابو الزناد فرماتے ہیں، یہ لوگ عراقی ہیں کوثی کے رہنے والے، سب نبیوں کو مانتے ہیں، ہر سال میں تیس روزے رکھتے ہیں، اور یمن کی طرف مُونھ کر کے ہر دن میں پانچ نمازیں پڑھتے ہیں۔ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ لوگ جانتے ہیں لیکن کسی شریعت کے پابند نہیں اور کفّار بھی نہیں۔ عبد الرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ یہ بھی ایک مذہب ہے۔ جزیرۂ موصل میں یہ لوگ تھے لا الٰہ الا اللہ پڑھتے تھے اور کسی کتاب یا نبی کو نہیں مانتے تھے، اور نہ کوئی خاص شرع کے عامل تھے۔ مشرکین اسی بناء پر حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کو صابی کہتے تھے، یعنی لا الٰہ الا اللہ کہنے کی بناء پر۔ اُن کا دین نصرانیوں سے ملتا جلتا تھا، انکا قبلہ جنوب کی طرف تھا، یہ لوگ اپنے کو حضرتِ نوح علیہ السلام کے دین پر بتاتے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہود و مجوس کے دین کا خلط ملط یہ مذہب تھا، انکا ذبیحہ کھانا اور انکی عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع ہے، مجاہد حسن اور ابنِ ابی نجیح کا یہی فتویٰ ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں مجھے جہاں تک معلوم ہُوا ہے کہ یہ لوگ موحد تھے لیکن تاروں کی تاثیر اور نجوم کے معتقد تھے۔ ابو سعید اصطخری نے ان پر کفر کا فتویٰ دیا ہے۔ رازی فرماتے ہیں یہ ستارہ پرست لوگ تھے، کشرانیین میں سے تھے، جنکی جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے تھے حقیقتِ حال کا علم تو محض اللہ تعالیٰ کو ہے مگر بظاہر یہی قول اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ یہودی تھے نہ نصرانی نہ مجوسی نہ مشرک، بلکہ یہ لوگ فترت پر تھے، کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے، اور اسی معنی پر مشرکین اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو صابی کہا کرتے تھے، یعنی ان لوگوں نے تمام مذاہب ترک کر دیئے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ صابی وہ ہیں جنھیں کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اُونچا کیا لو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے اور اُس کے مضمون کو یاد کرو اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے۔

اِن آیتوں میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اُنکے عہد و پیماں یاد دلا رہا ہے کہ میں تم سے اپنی عبادت اور اپنے نبی کی اطاعت کا وعدہ لے چکا ہوں، اُسے پورا کرانے اور ماننے کیلیے طُور پہاڑ کو تمہارے سروں پر لا کھڑا کیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ الآیہ (اور جب ہم نے تم سے عہد لیا) کہ تم توریت مانوگے اور اُس پر عمل کروگے؟ پھر تم نے اُسکے احکام کو شاق و گراں جانکر قبول کرنے سے انکار کر دیا، باوجودیکہ تم نے بالحاح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایسی آسمانی کتاب کی استدعا کی تھی جسمیں قوانینِ شریعت و آئینِ عبادت مفصل مذکور ہوں، اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے تم سے اسکے قبول کرنے اور اُس پر عمل کرنے کا عہد لیا تھا، جب وہ کتاب عطا ہوئی، تو تم نے اُسکے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور عہد پورا نہ کیا تو وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (اور تم پر طُور کو اُونچا کیا) یعنی بنی اسرائیل کی عہد شکنی کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی طُور پہاڑ کو اُٹھا کر اُنکے سروں پر بقدرِ قامت فاصلہ پر معلق کر دیا، اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، یا تو تم عہد قبول کرو، ورنہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائیگا، اور تم کچل ڈالے جاؤ گے۔ اس میں صورۃً وفائے عہد پر اکراہ تھا، اور درحقیقت پہاڑ کا سروں پر معلق کر دینا آیتِ الٰہی اور قدرتِ حق کی برہانِ قوی ہے، اس سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ بیشک یہ رسول مظہرِ قدرتِ الٰہی ہیں۔ یہ اطمینان انکو ماننے اور عہد پورا کرنے کا اصل سبب ہے۔ (خزائن العرفان)

سدی کہتے ہیں کہ انکے سجدہ سے انکار کرنے کے باعث انکے سروں پر پہاڑ آ گیا، لیکن اسوقت یہ سب سجدہ میں گر پڑے، اور مارے ڈر کے کنکھیوں سے اُوپر کو دیکھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور پہاڑ ہٹا لیا۔ اسی وجہ سے وہ اسی سجدہ کو پسند کرتے ہیں کہ آدھا دھڑ سجدہ میں ہو، اور دوسری طرف سے اُوپر کو دیکھ رہے ہوں۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (تو اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے) یہاں فضل و رحمت سے یا توفیقِ توبہ مراد ہے یا تاخیرِ عذاب۔ (مدارک وغیرہ) ایک قول یہ ہے کہ فضلِ الٰہی و رحمتِ حق سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک مراد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اگر تمہیں خاتم المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وجودِ باجود کی دولت نہ ملتی، اور آپ کی ہدایت نصیب نہ ہوتی، تو تمہارا انجام ہلاک و خسران ہوتا۔ (خزائن العرفان)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـٕیْنَ ۝

اور بے شک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنھوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے اُن سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دُھتکارے ہوئے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝

تو ہم نے اُس بستی کا یہ واقعہ اُس کے آگے اور پیچھے والوں کے لیے عبرت کر دیا اور پرہیزگاروں کیلیے نصیحت۔

شہر ایلہ میں ستّر ہزار بنی اسرائیل تھے، انھیں حکم تھا کہ شنبہ (ہفتہ) کا دن عبادت کے لیے خاص کر دیں، اُس روز شکار نہ کریں، اور دنیاوی مشاغل ترک کر دیں۔ انکے گروہ نے یہ چال کی جمعہ کو دریا کے کنارے بہت گڑھے کھودتے، اور شنبہ کی صبح کو دریا سے اُن گڑھوں تک نالیاں بناتے، جنکے ذریعہ پانی کے ساتھ آکر مچھلیاں گڑھوں میں قید ہو جائیں۔ یکشنبہ (اتوار) کو انھیں نکالتے، اور کہتے کہ ہم مچھلی کو پانی سے شنبہ کے روز نہیں نکالتے۔ چالیس یا ستّر سال تک یہی عمل رہا۔ جب حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا عہد آیا، تو آپ نے اس سے منع کیا، اور فرمایا قید کرنا ہی شکار ہے جو شنبہ کو کرتے ہو، اس سے باز آؤ، ورنہ عذاب میں گرفتار کیے جاؤ گے۔ وہ باز نہ آئے، آپ نے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے انھیں بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا، عقل و حواس تو اُنکے باقی رہے مگر قوتِ گویائی زائل ہو گئی، بدنوں سے بدبو نکلنے لگی، اپنے اس حال پر روتے روتے تین روز میں سب ہلاک ہو گئے، انکی نسل باقی نہ رہی یہ سب ستّر ہزار کے قریب تھے۔ بنی اسرائیل کا دوسرا گروہ، جو بارہ ہزار کے قریب تھا، انھیں اس عمل سے منع کرتا رہا، جب یہ نہ مانے تو اُنھوں نے انکے اور اپنے محلوں کے درمیان دیوار بنا کر علیحدگی کر لی، ان سب نے نجات پائی۔ بنی اسرائیل کا تیسرا گروہ ساکت رہا۔ اسکے حق میں حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سامنے عکرمہ نے کہا کہ وہ مغفور ہیں، کیونکہ

امر بالمعروف فرضِ کفایہ ہے، بعض کا ادا کرنا کل کا حکم رکھتا ہے۔ انکے سکوت کی وجہ یہ تھی کہ یہ اُنکے پند پذیر ہونے سے مایوس تھے۔ عکرمہ کی یہ تقریر حضرت ابن عباس کو بہت پسند آئی اور آپ نے سُرور سے اُٹھکر اُن سے معانقہ کیا اور اُنکی پیشانی کو بوسہ دیا۔ (فتح العزیز) **مسئلہ** اس سے معلوم ہُوا کہ سُرور کا معانقہ سُنّتِ صحابہ ہے، اس کے لیے سفر سے آنا اور غیبت کے بعد ملنا شرط نہیں۔ (خزائن العرفان)

شنبہ کو سَبت اسلیے کہتے ہیں کہ "سبت" کے معنی اصل میں قطع کے ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ نے یا تو اس دن مخلوق کو قطع کیا یعنی پیدا فرمایا، اس لیے اس دن کو "سبت" کہتے ہیں۔ یا اس لیے کہ یہود کو اس دن عبادت کے سوا، دنیاوی تمام کاموں سے قطع تعلق کرنے کا حکم ہُوا تھا۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا۔ (تو ہم نے اس بستی کا یہ واقعہ اسکے آگے اور پیچھے والوں کے لیے عبرت کردیا) **نکال** کے اصل معنی منع یعنی روکنے اور باز رکھنے کے ہیں، چونکہ عبرت اس کو کہتے ہیں جو صاحبِ عبرت کے لیے گناہوں اور ناشائستہ حرکتوں سے روکنے والی ہُوا کرتی ہے۔ اسلیے اسے بھی نکال بولنے لگے، اور اسی وجہ سے قید کو بھی "نکل" بولتے ہیں کہ وہ اسیر (قیدی) کے فرار سے مانع ہے۔ **وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ**۔ (اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت) متقین سے مراد حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اُمت ہیں کہ متقی مومن لوگ ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو بولے کہ آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ

خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی کہا وہ

یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا

فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے بولے اپنے رب سے دعا کیجئے

رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ۝

ہمیں بتادے اُس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے ہے جس کی رنگت ڈہڈہاتی دیکھنے والوں کو خوشی دیتی

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لیے صاف بیان کردے وہ گائے کیسی ہے بیشک گایوں میں ہمیں شبہ پڑگیا اور اللہ چاہے تو ہم راہ پا جائیں گے

قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ

کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لیجاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے بے عیب ہے جس میں کوئی داغ

فِیْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝

نہیں۔ بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اُسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے

اس قصہ کا شروع تو اللہ تعالیٰ نے دوسرے رکوع **وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا** الآیہ سے بیان فرمایا ہے، اور یہاں اس مقام پر لبقیہ قصہ ارشاد ہوتا ہے، اس تقدیم و تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اگر قصہ کو ترتیب سے بیان فرمایا جاتا تو ممکن وجہ یہ سمجھا جاتا کہ اصل مقصود قصہ ہی بیان کرنا ہے، اسلیے آخر کو اول بیان فرمایا، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو مستقل طور پر بنی اسرائیل کا کفرانِ نعمت اور حکمِ الٰہی سے تمسخر کرنا، اور اُس میں کریدکرنا، اور حکم پہنچنے پر تعمیل نہ کرنا بیان فرمانا مقصود ہے۔

یہ قصہ اسطرح ہُوا تھا کہ بنی اسرائیل میں عاصل نامی ایک مالدار تھا، اُس کے چچازاد بھائی نے بطمعِ وراثت اُسکو قتل کرکے دوسری بستی کے دروازہ پر ڈالدیا، اور خود صبح کو اُسکے خون کا مدعی بنا۔ وہاں کے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقتِ حال ظاہر فرمائے۔ اس پر حکم ہُوا کہ ایک گائے ذبح کرکے اُسکا کوئی حصہ مقتول کے ماریں، وہ زندہ ہوکر قاتل کو بتا دیگا۔ **قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا**۔ تب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا، آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں، کیونکہ مقتول کا حال معلوم ہونے اور گائے کے ذبح میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ **قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝** اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، "خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں"۔ مطلب یہ کہ ایسا جواب جو سوال سے ربط نہ رکھے جاہلوں کا کام ہے۔ یا یہ معنیٰ ہیں کہ محاکمہ کے موقع پر استہزاء جاہلوں کا کام ہے، انبیاء کی شان اس سے برتر ہے۔ القصہ جب بنی اسرائیل نے سمجھ لیا کہ گائے کا ذبح کرنا لازم ہے، تو اُنھوں نے آپ سے اُسکے اوصاف دریافت کیے۔ **حدیث شریف** میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل بحث نہ نکالتے تو جو گائے بھی ذبح کردیتے کافی ہوجاتی۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر وہ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی وہ گائے نہ پاتے۔ **مسئلہ** اس سے معلوم ہُوا کہ ہر نیک کام میں انشاء کہنا مستحب و باعثِ برکت ہے۔ **وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝** سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے مسلسل سوالات، اور اپنی رسوائی کے اندیشہ، اور گائے کی گرانیٔ قیمت کی بنا پر وہ ذبح کا قصد نہیں رکھتے تھے، مگر جب سوالات شافی جوابوں سے ختم کردیئے گئے، تو انھیں ذبح کرنا ہی پڑا۔

غرضکہ جب اللہ تعالیٰ نے گائے کے مکمل اوصاف بیان فرما دیئے تو اُسوقت بنی اسرائیل نے کہا اب تشفی ہوئی، اور پوری شان و صفت معلوم ہوئی۔ اسکے بعد اُنھوں نے گائے کی تلاش شروع کی۔ ان اطراف میں ایسی صرف ایک گائے تھی، اُس کا حال یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک صالح شخص تھے، اُن کا ایک صغیر السن بچہ تھا، اور اُنکے پاس سوائے ایک گائے کے بچّہ کے کچھ نہ رہا تھا، اُنھوں نے اُسکی گردن پر مُہر لگا کر اللہ کے نام پر چھوڑ دیا اور بارگاہِ حق میں عرض کیا، یارب میں اس بچھیا کو اس فرزند کے لیے تیرے پاس ودیعت رکھتا ہوں، جب یہ فرزند بڑا ہو، یہ اسکے کام آئے۔ اُن کا تو انتقال ہوگیا، بچھیا جنگل میں بحفظِ الٰہی پرورش پاتی رہی، یہ لڑکا بڑا ہُوا، اور بفضلہٖ صالح و متقی ہُوا، ماں کا فرماں بردار تھا، ایک روز اُسکی والدہ نے کہا اے نورِ نظر تیرے باپ نے تیرے لیے فلاں جنگل میں خدا کے نام پر ایک بچھیا چھوڑی ہے، وہ اب جوان ہوگئی اُسکو جنگل سے لا، اور اللہ سے دعا کر کہ وہ تجھے عطا فرمائے۔ لڑکے نے گائے کو

جنگل میں دیکھا، اور والدہ کی بتائی ہوئی علامتیں اُس میں پائیں، اور اُسکو اللہ کی قسم دیکر بلایا، وہ حاضر ہوئی، جوان اُسکو والدہ کی خدمت میں لایا، والدہ نے بازار میں لیجا کر تین دینار پر فروخت کرنے کا حکم دیا اور یہ شرط کی کہ سودا ہونے پر پھر اسکی اجازت حاصل کیجائے۔ اُس زمانہ میں گائے کی قیمت ان اطراف میں تین دینار ہی تھی۔ جوان جب اُس گائے کو بازار میں لایا، تو ایک فرشتہ خریدار کی صورت میں آیا، اور اُس نے گائے کی قیمت چھ دینار لگا دی مگر اس شرط سے کہ جوان والدہ کی اجازت کا پابند نہ ہو۔ جوان نے یہ منظور نہ کیا اور والدہ سے تمام قصہ کہا۔ اُسکی والدہ نے چھ دینار قیمت منظور کرنے کی تو اجازت دی، مگر بیع میں پھر دوبارہ اپنی مرضی دریافت کرنے کی شرط کی۔ جوان پھر بازار میں آیا، اس مرتبہ فرشتہ نے بارہ دینار قیمت لگائی اور کہا کہ والدہ کی اجازت پر موقوف نہ رکھو۔ جوان نے نہ مانا اور والدہ کو اطلاع دی، وہ صاحبِ فراست، سمجھ گئی کہ یہ خریدار نہیں کوئی فرشتہ ہے جو آزمائش کے لیے آتا ہے۔ بیٹے سے کہا کہ ابکی مرتبہ اُس خریدار سے یہ کہنا کہ آپ ہمیں اس گائے کے فروخت کرنے کا حکم دیتے ہیں یا نہیں۔ لڑکے نے یہی کہا، فرشتہ نے جواب دیا کہ ابھی اسکو روکے رہو، جب بنی اسرائیل خریدنے آئیں، تو اس کی قیمت یہ مقرر کرنا کہ اس کی کھال میں سونا بھر دیا جائے۔ جوان گائے کو گھر لایا، اور جب بنی اسرائیل جستجو کرتے ہوئے اسکے مکان پر پہنچے، تو یہی قیمت طے کی، اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ضمانت پر وہ گائے بنی اسرائیل کے سپرد کی۔ **مسائل**:۔ اس واقعہ سے کئی مسئلے معلوم ہوئے۔ (۱) جو اپنے عیال کو اللہ کے سپرد کرے، اللہ تعالیٰ اُسکی ایسی عمدہ پرورش فرماتا ہے۔ (۲) جو اپنا مال اللہ کے بھروسہ پر اُس کی امانت میں دے، تو اللہ اُس میں برکت دیتا ہے۔ (۳) والدین کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ (۴) غیبی فیض قربانی و خیرات کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ (۵) راہ خدا میں نفیس مال دینا چاہیئے۔ (۶) گائے کی قربانی افضل ہے۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ

اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اُسکی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے تو ہم نے فرمایا اُس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو

كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ آيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ

اللہ یوں ہی مُردے جلائیگا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے

ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهٰرُ ۚ وَإِنَّ

تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ کرّے اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ

مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ

وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو اُن سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ

بِغٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ (اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے ایک خون کیا) یہ اس قصہ کا شروع ہے، اور اس سے پہلے جو بیان ہُوا، وہ اسکے بعد کا واقعہ ہے، اس تقدیم و تاخیر میں جو حکمت ہے وہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ **فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا** (تو ایک دوسرے پر اُسکی تہمت ڈالنے لگے) یعنی اس قضیہ کو تم میں سے ایک دوسرے کے سر دھرتا تھا، اور خود اپنے کو بری کرتا تھا۔ **وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ** ۝ (اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے) یعنی قاتل اپنے قتل کو چھپاتا تھا اور دوسروں کے سر دھرنے کی کوشش کرتا تھا۔ **فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا** (تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو) مطلب یہ کہ مقتول کے جسم سے گائے کا کوئی سا بھی ٹکڑا لیکر مس کرو۔ بیانِ کلام میں اختصار ہے، تقدیرِ عبارت یہ ہے کہ فَضَرَبَ فَحَيَّ، یعنی حسب ارشاد گائے کا ٹکڑا مقتول کے جسم سے مس کیا تو وہ زندہ ہو گیا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اُنھوں نے اس ہڈی کو لگایا تھا جو غضروف کے متصل ہے۔ بعض نے کہا دُم کی ہڈی سے لگایا تھا۔ اور بعض نے کہا زبان سے۔ اور بعض نے کہا داہنی ران لگائی تھی۔

الحاصل بنی اسرائیل نے گائے ذبح کر کے اُسکے عضو سے مُردہ کو مارا، وہ بحکم الٰہی زندہ ہُوا، اُسکے حلق سے خون کے فوارے جاری تھے، اُس نے اپنے چچازاد بھائی کو کہا کہ اس نے مجھے قتل کیا اب اُسکو بھی اقرار کرنا پڑا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس پر قصاص کا حکم فرمایا۔ اسکے بعد شرع کا حکم ہُوا کہ **مسئلہ** قاتل مقتول کی میراث سے محروم رہیگا **مسئلہ** لیکن اگر عادل نے باغی کو قتل کیا، یا کسی حملہ آور سے جان بچانے کے لیے مدافعت کی اُس میں وہ قتل ہو گیا، تو مقتول کی میراث سے محروم نہ ہوگا۔ (خزائن العرفان)

كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ آيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (اور اللہ یونہی مُردے جلائیگا، اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو) اور تم سمجھو کہ بیشک اللہ تعالیٰ مُردے زندہ کرنے پر قادر ہے، اور روزِ جزا مُردوں کو زندہ کرنا اور حساب لینا حق ہے۔ یہ خطاب یا تو اُن لوگوں سے ہے، جو اُس مقتول کے زندہ ہونے کے وقت موجود تھے یا اُن لوگوں سے خطاب ہے جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ **خلاصہ کلام** یہ کہ اے بنی اسرائیل کے نادانو! دیکھو اللہ تعالیٰ نے جسطرح اِس مُردہ کو زندہ کر دیا اسی طرح مُردوں کو زندہ کریگا، اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم اس سے سمجھ سکو کہ جسطرح وہ ایک مُردہ کے زندہ کرنے پر قادر ہے اُسی طرح وہ تمام مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقتول مُردہ کو پہلے ہی زندہ کیوں نہ کر دیا، اور اس میں شرطیں کیوں لگائیں؟ تو اسکی وجہ ظاہر ہے کہ عادتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے کہ کسی کام کو بلا کسی ظاہری سبب کے ظہور میں نہیں لاتا۔ اور ایک وجہ اور بلیغ حکمت یہ بھی ہے کہ اسطرح کرنے میں بندوں کو اپنے مولیٰ سے تقرب، اور ایک واجب ادا کرنے کا ثواب، اور ایک یتیم کا نفع ہو۔ اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ طالب کو چاہیئے کہ قُربِ الٰہی طلب کرے، اور قرب والے کو چاہیئے کہ اچھی سے اچھی شے خدا کی راہ میں خرچ کرے، اور اُسکی قیمت کشادہ دلی سے ادا کرے۔ ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک نہایت عمدہ اُونٹنی قربانی کی، جسے آپ نے تین سَو دینار (اشرفی) میں خریدا تھا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ (پھر اسکے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے) اور ایسے بڑے نشانہائے قدرت سے تم نے عبرت حاصل نہ کی۔ قساوۃ اصل میں اس موٹائی کو کہتے ہیں جو سختی و کرختگی لیے ہُوئے ہو، اور اس جگہ دلوں سے رحمت و نرمی کا نکل جانا مراد ہے۔ اور کلمہ **ثُمَّ** (پھر) یہاں بُعدِ مکانی کے لیے نہیں، بلکہ اسلیے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ انکی رقت و نرمی کے اسباب کے باوجود انکی قساوتِ قلبی کا یہ عالم ہے جو نہایت مستبعد ہے۔ مطلب یہ کہ مقتول کے زندہ کرنے اور تمام نشانیوں کے ظاہر کرنے کے بعد پھر تمہارے دل پتھر ہو گئے۔ کلبی نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد بھی بنی اسرائیل نے یہی کہا کہ ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ **فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً** (تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ کرّے) بلکہ اُن سے بھی زیادہ کرّے ہونے کے یا تو یہ معنیٰ ہیں کہ انکے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں، یا یہ کہ انکے دل اُس شے کی مثل ہیں جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو

لفظ اَشَدّ فرمانے میں غایت درجہ مبالغہ مقصود ہے، ورنہ "قساوت" کے صیغہ تفضیل "اَقسیٰ" (بہت قساوت وسختی والے) کہنا کافی ہوتا۔ چونکہ اس میں اتنا مبالغہ نہ تھا اسلیے اَشَدّ فرمایا اور لفظ اَوْ (یا، بلکہ) فرمانے میں یا تو تشبیہ میں اختیار دینے کے لیے ہے یعنی یہ مراد ہے کہ اے مخاطب تجھے اختیار ہے کہ انکے دلوں کو خواہ تو پتھر سے تشبیہ دے، یا جو پتھر سے بھی زیادہ کوئی سخت شے ہو اُس سے تشبیہ دے، دونوں صورتیں صحیح ہیں۔ اور یا تردید کے لیے ہے، یعنی جو انکے دلوں کے حالات کو پہچانتا ہو، وہ انھیں پتھر سے تشبیہ دیگا، یا جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے اُس سے۔ اور مفضل علیہ یعنی حِجارۃ کی ضمیر اسلیے راجع نہیں کی گئی کہ اس میں کسی قسم کا التباس نہ تھا خود ظاہر تھا، اور حِجارۃ (پتھر) کے ذکر فرمانے اور دوسری سخت چیزوں کو مثلاً لوہا کانسی وغیرہ کے ذکر نہ فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ پتھر کے سوا کُل چیزیں آگ میں پگھل جاتی ہیں، اور پتھر آگ میں نہیں پگھلتا۔ پھر یہ بیان فرمایا ہے کہ قساوۃ والے دل اور پتھر میں بڑا فرق ہے پتھر میں ایک طرح کی نرمی اور خیر پائی جاتی ہے، اور قلبِ قاسی میں یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ (مظہری) چنانچہ ارشاد ہے وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ (اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو اُن سے پانی نکلتا ہے) یعنی بعض پتھر تو ایسے ہیں کہ ان سے نہریں نکلتی ہیں، اور بعض ایسے ہیں کہ اُن سے سوتیں نکلتیں اور پانی جاری ہوتا ہے، جن سے خدا کی مخلوق منتفع ہوتی اور فائدہ اُٹھاتی ہے، بخلاف کفار کے دلوں کے کہ ان میں بالکل منفعت ہے ہی نہیں۔ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ (اور کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں) یعنی بعض پتھر ایسے ہیں کہ خدا کے خوف کے سبب پہاڑ سے نیچے آپڑتے ہیں مگر اے کافرو! تمہارے دل ویسے کے ویسے ہی ہیں، ان میں ذرا بھی خشوع اور نرمی نہیں ہوتی۔ پتھر جیسی کرخت شے اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں، باایں ہمہ تمہارے دل اثر پذیر نہیں۔ پتھروں میں بھی اللہ تعالیٰ نے ادراک وشعور دیا ہے، انھیں خوفِ الٰہی ہوتا ہے، وہ تسبیح کرتے ہیں اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد نہ بجالاتی ہو مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میں اُس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ ترمذی میں حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، میں سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اطرافِ مکہ میں گیا، تو جو درخت یا پہاڑ سامنے آتا تھا السلام علیك یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عرض کرتا تھا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہلِ سنّت وجماعت کا مذہب ہے کہ عقلاء کے سوا جمادات اور حیوانات میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا علم ودیعت فرمایا ہے، جسے اُس صاحبِ علم کے سوا کوئی اور نہیں جانتا، اسی لیے ان تمام جمادات وحیوانات میں صلوٰۃ بھی ہے اور تسبیح وخوفِ الٰہی بھی موجود ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (کوئی شے ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وحمد نہ بجالاتی ہو) اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَالطَّيْرُ صٰۗفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (دیکھو پرندے کیسے صف بستہ ہیں ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے)۔ نیز علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کوہ شبیر پر جلوہ افروز تھے اور کفار حضور کی جستجو وتلاش میں سرگرداں پھر رہے تھے کہ پہاڑ نے عرض کیا یا نبی اللہ آپ مجھ پر سے اُتر جائیے، مجھے خوف ہے کہ کفار آپ کو پکڑ لیں، اور مجھے اسکے سبب اللہ تعالیٰ عذاب کرے۔ اور کوہ حرا نے عرض کیا یارسول اللہ آپ یہاں تشریف لے آئیے اور میرے پاس آجائیے۔ حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی، وہ فرماتے ہیں کہ آپ کو اُحد پہاڑ نظر پڑا، تو آپ نے فرمایا یہ وہ پہاڑ ہے جو ہمکو دوست ومحبوب رکھتا ہے، اور ہم بھی اسے دوست ومحبوب رکھتے ہیں۔ حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ ہمیں حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی پھر نماز پڑھا کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا کہ ایک وقت کا واقعہ ہے کہ ایک شخص ایک گائے ہانکے لیے جاتا تھا، جب چلتے چلتے تھک گیا تو اُس پر سوار ہوگیا، اور اُسے مارا، گائے بول پڑی ہم سواری کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہم تو زراعت میں کام آنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ لوگ حیرت انگیز واقعہ دیکھکر کہنے لگے سُبْحَانَ اللّٰه! گائے بھی باتیں کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور ابوبکر وعمر اس قصہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص اپنی بکریوں میں تھا کہ اچانک ایک بھیڑیے نے ایک بکری کو دبوچ لیا، وہ ابھی پوری طرح اُسکے قابو میں نہ آئی تھی کہ مالک جا پہنچا اور اُسے چھڑا لیا۔ بھیڑیا بول اُٹھا اب تو نے چھڑا لیا، مگر جس دن درندوں ہی کی نوبت ہوگی، اُسوقت ان کا کون حامی ومددگار ہوگا؟ نہ اُس دن ہمارے سوا کوئی انکا چرواہا ہوگا۔ لوگوں نے سُنکر کہا سبحان اللہ! بھیڑیا بھی باتیں کرتا ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ میں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اس قصہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کوہِ حرا پر تشریف فرما تھے، اور حضرتِ ابوبکر وعمر، عثمان وعلی، طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی حاضر تھے کہ ایک پتھر کو جنبش ہوئی۔ حضور نے فرمایا ٹھہر جا تجھ پر سوائے ایک نبی یا صدیق یا شہید کے اور کوئی نہیں۔ نیز امام مسلم نے حضرتِ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر تیار ہونے سے قبل آپ مسجد کے ایک ستون سے جو کھجور کی لکڑی کا تھا تکیہ اور سہارا فرماتے تھے، جب منبر تیار ہوگیا اور آپ اُس پر جلوہ افروز ہوئے، تو وہ ستون بیقرار ہوکر مثل اُونٹنی کے رونے لگا، حتیٰ کہ اُس کی آواز مسجد والوں نے سُنی۔ جب اُسکی یہ آہ وزاری رہی، تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر سے نیچے تشریف لائے اور اُسے گلے سے لگایا۔ وہ آپ کے گلے لگاتے ہی بالکل خاموش ہوگیا ان تمام حدیثوں سے یہ ثابت ہوگیا کہ جمادات میں بھی علم اور حیات ہے۔ علامہ بغوی کہتے ہیں کہ مجاہد نے فرمایا، جو پتھر بھی اُوپر سے نیچے آتا ہے، وہ اللہ کے ڈر سے نیچے آتا ہے وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں)۔ اس کلمہ میں کفار کو دھمکی ہے کہ ان کا کوئی عمل علمِ الٰہی سے باہر نہیں ہے، وہ ان کے تمام کوتکوں کا محاسبہ فرما کر ضرور سزا دے گا۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ

تو اے مسلمانو کیا تمہیں طمع ہے کہ یہودی تمہارا یقین لائینگے اور اُن میں کا تو ایک گروہ وہ تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر

يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

سمجھنے کے بعد اُسے دانستہ بدل دیتے

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ برحق سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو باخبر فرما رہا ہے کہ یہ قوم یہود بڑی بدنصیب ہے۔ انھوں نے تو بڑی بڑی نشانیوں اور عبرتناک سزاؤں کے بعد بھی ایمان کو قبول نہیں کیا تھا، تو اب یہ بدنصیب آپ کے دامنِ رحمت میں کسطرح آسکتے ہیں۔ انھوں نے تو اپنے دل پتھر جیسے سخت بنا رکھے ہیں۔ یہ لوگ تو کلامِ الٰہی میں بھی تحریف کرنے سے باز نہیں رہے، جیسے انھوں نے توریت میں تحریف کی اور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت بدل ڈالی۔ اور یہ سب کچھ انجان پنے میں نہیں ہوا، بلکہ جان بوجھ کر دانستہ اور قصد وارادہ سے تغیر وتبدل کیا۔ اسے وہ خوب جانتے تھے کہ یہ تحریف وتبدیل سراسر خدا پر بہتان اور کذبِ خالص ہے۔ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے حسب حکمِ خداوندی ستّر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کے مقام موعود کیلیے منتخب فرما کر انھیں وہاں لے گئے، تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سُنا۔ پھر جب وہاں سے واپس آئے، تو جو انمیں سچے تھے انھوں نے تو جسطرح سُنا تھا اُسی طرح قوم کو پہنچا دیا، اور جنکے دلوں میں فساد تھا، انھوں نے آکر یہ کہا کہ ہم نے تو یہ سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ "اگر تم ان احکام کے کرنے کی طاقت رکھتے ہو تو کرو، اور اگر نہ چاہو تو نہ کرو"۔ یہی تحریف تھی، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ کلامِ الٰہی حق ہے، اور اس پر عمل کرنے کا لازمی حکم دیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی رُو سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اِن یہود کے آباء و اجداد کا ایک گروہ

ایسا گزرا ہے جنھوں نے کلام الٰہی سن سنا کر دانستہ تحریف کی ہے۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ

اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا مسلمانوں

اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا

سے بیان کیے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہی پر حجت لائیں کیا تمہیں عقل نہیں کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ

یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ۝

چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

یہ آیت اُن یہودیوں کی شان میں نازل ہوئی جو سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں تھے۔ حضرتِ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا یہودی منافق جب صحابۂ کرام سے ملتے، تو کہتے کہ جس پر تم ایمان لائے اُس پر ہم بھی لائے، تم حق پر ہو، اور تمہارے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سچے ہیں، اُنکا قول حق ہے، ہم اُنکی نعت و صفت اپنی کتاب توریت میں پاتے ہیں۔ ان لوگوں پر رؤساءِ یہود ملامت کرتے تھے۔ اسکا بیان وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ میں ہے۔ (خازن)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ حق پوشی اور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوصاف کا چھپانا اور کمالات کا انکار کرنا یہود کا طریقہ ہے۔ آجکل کے بہت سے گمراہوں کی یہی عادت ہے۔ (خزائن العرفان)

وَ مِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ۝

اور اُن میں کچھ اَن پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور وہ نرے گمان میں ہیں

"کتاب" سے مراد توریت ہے، اور اَمَانِیّ امنیہ کی جمع ہے، اور اسکے معنی زبانی پڑھنے کے ہیں۔ حضرتِ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ کتاب کو نہیں جانتے، مگر صرف زبانی پڑھ لینا بغیر معنی سمجھے۔ (خازن) بعض مفسرین نے یہ معنی بھی بیان کیے ہیں کہ اَمَانِیّ سے وہ جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں مراد ہیں، جو یہودیوں نے اپنے علماء سے سنکر بے تحقیق مان لی تھیں۔ (خزائن العرفان) وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (اور وہ نرے گمان میں ہیں) مطلب یہ کہ یہ لوگ اپنے گمان کی تقلید کرتے ہیں، حقیقت کا علم انھیں خاک نہیں۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ۗ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا

تو خرابی ہے اُن کے لیے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہدیں یہ خدا کے پاس سے ہے کہ اسکے عوض

بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ۝

تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے اُنکے لیے اُن کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی اُن کے لیے اس کمائی سے

لفظ "ویل" کے معنی حسرت و ہلاکت اور خرابی کے ہیں۔ زجاج نے کہا کہ ویل ایک کلمہ ہے کہ جو شخص کسی ہلاکت میں پڑے وہ اسے کہا کرتا ہے۔ حضرتِ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ویل کے معنی شدتِ عذاب کے ہیں۔ اور سعید ابن مسیّب فرماتے ہیں کہ ویل جہنم میں ایک وادی ہے، اگر اس میں جہنم کے پہاڑ بھی چلائے جائیں تو وہ بھی ریت ہو جائیں یا شدتِ حرارت سے بالکل پگھل کر پانی کی طرح بہہ جائیں۔ علامہ بغوی نے حضرتِ ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، ویل جہنم میں ایک وادی ہے کہ کافر اُس میں چالیس برس اُترتا چلا جائے گا تب بھی اُسکی تہ تک نہ پہنچ سکے گا۔ اور صعود جہنم کی آگ کا ایک پہاڑ ہے کہ کافر اُس پر ستر برس تک چڑھایا جائیگا پھر وہاں سے اتنے ہی برس تک گرایا جائیگا۔

شانِ نزول: جب سیدِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینۂ طیبہ تشریف فرما ہوئے، تو علماءِ توریت و رؤساءِ یہود کو قوی اندیشہ ہوگیا کہ انکی روزی جاتی رہیگی، اور سرداری مٹ جائیگی، کیونکہ توریت میں حضور کا حلیہ اور اوصاف مذکور ہیں، جب لوگ حضور کو اسکے مطابق پائینگے، فوراً ایمان لے آئینگے اور اپنے علماء و رؤساء کو چھوڑ دینگے۔ اس اندیشہ سے اُنھوں نے توریت میں تحریف و تغیر کر ڈالی، اور حلیہ شریف بدل دیا۔ مثلاً توریت میں آپ کے اوصاف یہ لکھے تھے کہ آپ خوبرو ہیں، بال خوبصورت، آنکھیں سُرمگیں، قد میانہ ہے۔ اس کو مٹا کر اُنھوں نے یہ بنایا کہ وہ دراز قامت ہیں، آنکھیں نجی نیلی، بال اُلجھے ہیں۔ یہی عوام کو سُناتے، یہی کتابِ الٰہی کا مضمون بتاتے، اور سمجھتے کہ جب حضور کو اسکے خلاف پائینگے، تو آپ پر ایمان نہ لائینگے، ہمارے گرویدہ رہینگے، اور ہماری کمائی میں فرق نہ آئیگا۔ (خزائن العرفان)

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ

اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرما دو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز اپنا

اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ

عہد خلاف نہ کرے گا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہاں جو گناہ کمائے اور اُس کی خطا اسے

بِهٖ خَطِیْٓــٴَـتُهٗ فَاُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

گھیر لے وہ دوزخ والوں میں ہے انھیں ہمیشہ اُس میں رہنا اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۠ ع ۹ ۱۱ ۹

وہ جنت والے ہیں انھیں ہمیشہ اُس میں رہنا

اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ (گنتی کے دن)۔ **شانِ نزول**:۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ یہود کہتے تھے کہ وہ دوزخ میں ہرگز داخل نہ ہونگے، مگر صرف
اتنی مدّت کے لیے جتنے عرصے انکے آباء و اجداد نے گوسالہ پوجا تھا، اور وہ چالیس روز ہیں، اسکے بعد وہ عذاب سے چھوٹ جائینگے، اس پر یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔ (خزائن العرفان)
حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ دنیا کی کُل مدّت سات ہزار سال ہے ہر ہزار سال کے بدلے ایک دن ہمیں عذاب ہوگا،
تو صرف سات دن ہمیں جہنم میں رہنا پڑیگا۔ اسکی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض کا یہ بھی قول ہے کہ یہودیوں کو یہ دھوکہ یوں لگا کہ وہ کہتے تھے کہ توریت میں ہے جہنم کے
دونوں طرف زقوم کے درخت تک چالیس سال کا راستہ ہے، تو وہ کہتے تھے کہ اس مدّت کے بعد عذاب اُٹھ جائینگے۔ ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے حضور سیدِ عالم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے آکر کہا کہ چالیس دن تک تو ہم جہنم میں رہینگے، پھر دوسرے لوگ ہماری جگہ آجائینگے، یعنی آپ کی اُمّت۔ حضور نے اُنکے سروں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا
نہیں! بلکہ تم ہی تم ہمیشہ جہنم میں پڑے رہوگے۔ (ابنِ کثیر) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ فتحِ خیبر کے بعد حضور کی خدمت میں بطور ہدیہ پکا ہوا بکری کا گوشت
جو زہر آلود تھا پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا یہاں کے یہودیوں کو جمع کرلو۔ پھر اُن سے دریافت فرمایا، تمہارا باپ کون ہے؟ اُنھوں نے کہا فلاں! آپ نے فرمایا جھوٹے ہو
بلکہ تمہارا باپ فلاں ہے۔ اُنھوں کہا بجا ارشاد فرمایا، وہی ہمارا باپ ہے۔ آپ نے فرمایا دیکھو اب میں کچھ اور پوچھتا ہوں سچ سچ بتانا۔ اُنھوں نے کہا اے ابوالقاسم
(صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جھوٹ بھی کہینگے تو آپ کے سامنے نہ چل سکے گا ہم تو آزما چکے ہیں۔ آپ نے فرمایا، بتاؤ جہنمی کون لوگ ہیں؟ اُنھوں نے کہا کچھ دن تو ہم ہیں، پھر آپ کی اُمّت۔
آپ نے فرمایا، دُور ہو ہرگز نہیں۔ پھر فرمایا، اچھا بتلاؤ اس گوشت میں تم نے زہر ملایا ہے؟ اُنھوں نے کہا، ہاں حضور! فرمایا، کیوں؟ کہا اگر آپ سچے ہیں، تو یہ زہر آپ کو ہرگز
ضرر نہ دیگا، اور اگر آپ جھوٹے ہیں، تو ہم آپ سے نجات حاصل کرلینگے۔ (مسندِ احمد۔ بخاری۔ نسائی)
مطلب یہ کہ جب یہودیوں نے چند دن جہنم میں اپنے اور اسکے بعد دوسروں کو جہنم میں جانے کا ذکر کیا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ
اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ (اے محبوب تم فرمادو کیا خدا سے تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے (اگر کوئی عہد لے رکھا ہے) جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کریگا) کیونکہ عہد خلافی کذب ہے، اور کذب بڑا عیب ہے
اور عیب اللہ تعالیٰ پر محال۔ لہٰذا اُسکا کذب تو ممکن نہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے تم سے صرف چالیس روز کے عذاب کے بعد چھوڑ دینے کا وعدہ ہی نہیں فرمایا، تو تمہارا یہ قول باطل ہوا۔
اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں) اور محض اپنے ظن وگمان سے یا دانستہ طور پر اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشتے ہو۔
یہ تو علماءِ یہود کا احکامِ الٰہی میں تحریف وتبدیل کا حال تھا، لیکن عیسائیوں نے تو ان سے بھی بڑھ کر کذب وافترا باندھا کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا (معاذ اللہ) تین دن
دوزخ میں رہنا تمام بدکاریوں کے لیے کفّارہ ہوگیا۔ حالانکہ خدا کا کوئی حکم کسی کتابِ الٰہی میں ایسا نہیں ہے بلکہ انجیل میں بھی اعمال کو نجات کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ متی ۷: ۲۲-۲۳
میں معجزات دکھانے والوں کو مسیح کہتے ہیں۔ "اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ" اس سے پتہ چلا کہ بدکاروں کے لیے نجات نہیں۔
بَلٰى (ہاں کیوں نہیں) یعنی یہود نے جو لاف زنی کی تھی کہ ہم کو جہنم کی آگ صرف چند دنوں لگے گی، اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ
خَطِيْٓــــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (جو گناہ کمائے اور اُس کی خطا اُسے گھیر لے تو وہ دوزخ والوں میں ہے انھیں ہمیشہ اُس میں رہنا) اس آیت میں گناہ
سے شرک وکفر مراد ہے، اور احاطہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ نجات کی تمام راہیں بند ہوجائیں اور کفر وشرک ہی پر اُسکو موت آئے، کیونکہ مومن خواہ کیسا بھی گناہگار ہو، گناہوں سے
گھرا ہوا نہیں ہوتا، اسلیے کہ ایمان جو اعظم اطاعت ہے اُس کے ساتھ ہے۔ (خزائن العرفان) كَسَبَ کے لغوی معنی نفع حاصل کرنے کے ہیں، اور سَيِّئَةً کے معنی بُرائی کے ہیں
یعنی ہر وہ چیز جس سے انسان کو غم والم پہنچے، خواہ امورِ دینیہ میں سے ہو، یا امورِ دنیاویہ میں سے۔ خواہ وہ حالت نفس کے متعلق ہو، یا بدن کے یا خارجی کے، جیسے مال وجاہ کا جاتا رہنا۔
سَيِّئَةً سُوْء سے مشتق ہے، یہ لفظ حَسَنَةً یعنی بھلائی کی ضد ہے۔ پھر ہر سیئہ اور حسنہ دو قسم پر ہیں۔ ایک یہ کہ جو حسبِ اقتضاءِ شریعت وعقل ہو۔ یہی یہاں مطلوب ومراد ہے
اور دوسری وہ جو باعتبار موافقتِ طبیعت ہو۔ جو چیز موافقِ طبیعت ہو، اُس پر لفظِ حسنہ اور جو چیز مکروہ وگراں ہو، اُس پر لفظ سیئہ کا استعمال کردیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ
دونوں لفظ بکثرت بولے گئے ہیں۔ لہٰذا لفظ كَسَبَ کے ساتھ سَيِّئَةً کا استعمال بطور استہزاء ہے، کیونکہ گناہ تو سراسر نقصان کی شے ہے، نفع کی اس میں کونسی بات ہے
جیسے کہدیا جاتا ہے کہ "تم کیوں آگ کھا رہے ہو" مطلب یہ ہوتا ہے کہ کیوں ایسے کام کر رہے ہو جس سے آگ میں جاؤ، جیسے آیت فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (انھیں دردناک
عذاب کی خوشخبری دو) میں ہے، اس جگہ بشارت کا لفظ بطور استہزاء ہے۔
خَطِيْٓــــَٔةً خطا سے مشتق ہے، جسکے اصل معنی العدول عن الجهة یعنی ٹھیک سمت سے ایک طرف ہوجانا۔ اور یہ کئی طرح پر ہے، اول یہ کہ کسی فعلِ مستحسن کے غیر کا قصد وارادہ کرے
اور پھر وہ اُسکو عمل میں لے آئے، تو یہ خطاءِ تام ہے، اس پر مؤاخذہ ہوتا ہے۔ لیکن جو ارادہ کیا وہ اُسکے خلاف بلاقصد واقع ہوجائے، وہ خطا ہے۔ یہ شریعت میں معاف ہے، چنانچہ ارشاد ہے
رُفِعَ عَنْ اُمَّتِيْ الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ میری اُمّت سے خطا وبھول چوک اٹھالی گئی ہے۔ یا یہ کہ مَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَاَ فَلَهٗ اَجْرٌ جس نے اجتہاد کیا پھر اُسکا اجتہاد غلط ہوجائے تو وہ ایک اجر کا
مستحق ہے۔ اور آیتِ کریمہ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (ہم سے بھول ہوئی یا خطا سرزد ہوئی) میں یہی خطا مراد ہے۔ امام راغب نے سَيِّئَةً اور خَطِيْٓــــَٔةً میں یہ فرق کیا ہے کہ خطیئۃ
کا لفظ اکثر اس امر پر بولا جاتا ہے جو فی نفسہٖ مقصود والیہ نہیں ہوتا۔ اب وَاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــــَٔتُهٗ (اور اُسکی خطا اسے گھیرے) کا مطلب یہ ہوا کہ اُسکے گناہ اُسکے ہر جانب وطرف سے
اُسے گھیر لے اور وہ مثل محاط بھاگ کے ہوجائے کہ کوئی جانب ایسی نہ رہے جو گناہوں سے خالی ہو۔ جب یہ معنی قرار پائے تو یہ مضمون کفار پر ہی صادق آسکتا ہے۔ لیکن جسکے دل میں ذرّہ بھر بھی
ایمان ہے اُس پر صادق نہیں آسکتا، کیونکہ ہر جانب اور ہر حصّہ کو گناہ محیط نہیں ہوئے، بلکہ جس جگہ ایمان ہے وہ حصہ سالم ہے۔ اسی بناء پر حضرت ابنِ عباس، ضحاک، ابوالعالیہ
ربیع اور دیگر علماءِ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اس آیت میں خطیئۃ سے مراد وہ شرک ہے جس پر آدمی مر جائے۔ اس معنی کے موافق معتزلہ اور خوارج نے اس آیت سے یہ
نکالا کہ کبیرہ گناہ کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیگا، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ آیت مرتکبِ کبیرہ پر صادق ہی نہیں آتی۔ لیکن گناہ کبیرہ کا مرتکب خطرہ کی حالت میں ضرور رہتا ہے
چنانچہ مسندِ امام احمد میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہوں کو حقیر نہ سمجھا کرو، وہ جمع ہو کر انسان کی ہلاکت کا سبب بنجاتے ہیں، دیکھتے نہیں ہو کہ اگر کوئی آدمی
ایک ایک لکڑی لے آئیں تو انبار لگ جاتا ہے، پھر اگر اُس میں آگ لگائی جائے تو بڑی بڑی چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں انھیں ہمیشہ اُس میں رہنا)
اِس آیت میں یہودیوں اور کفار کو خبردار کیا جارہا ہے کہ تم اپنی بداعمالیوں اور کفر وشرک کی وجہ سے جسطرح ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہوگے، اسی طرح وہ مومنین جو اللہ تعالیٰ اور اُسکے
رسول پر ایمان لائے اور سنّت کے مطابق عمل کیے وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہینگے۔ اُنھیں ابدی راحتیں اور دائمی نعمتیں ملینگی۔ اللہ تبارک وتعالےٰ کے عذاب و
ثواب دونوں پائیدار اور دائمی ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کیساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ

اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قایم رکھو اور زکوٰۃ دو پھر تم پھر گئے

اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

مگر تم میں کے تھوڑے اور تم رُو گردان ہو

اس آیت اور اسکے بعد والی آیتوں میں بنی اسرائیل کو جو احکام دیئے گئے تھے، اور اُن سے جن چیزوں پر عہد لیا گیا تھا اُن کا بیان اور اُنکی عہد شکنی کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو، اور نہ صرف بنی اسرائیل بلکہ تمام مخلوق کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ توحید کو مانیں، (اور خدا کے سوا کسی دوسرے کی پرستش و عبادت نہ کریں)، چنانچہ بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں)۔ یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ تمام مخلوق کے لیے تھا چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہے مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (اے محبوب آپ سے پہلے ہم نے ہر رسول کو یہی وحی فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو) اور فرمایا وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (بیشک ہمنے ہر اُمت کے رسول کو اسی لیے مبعوث فرمایا کہ اللہ کی عبادت کریں اور طاغوت یعنی باطل سے بچیں) کیونکہ تمام حقوق میں سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سب سے اہم اور بڑا حق یہی ہے کہ اُسی کی پوجا کیجائے اور اُس کے سوا کی پرستش سے بچا جائے۔ اسکے بعد ارشاد ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو) اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم فرمانیکے بعد والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت بہت ضروری ہے۔ والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ایسی کوئی بات نہ کہے اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اُنھیں ایذا ہو، اور اپنے بدن و مال سے اُنکی خدمت میں دریغ نہ کرے، جب اُنھیں ضرورت ہو تو اُنکے پاس حاضر رہے۔

مسئلہ اگر والدین اپنی خدمت کے لیے نوافل چھوڑنے کا حکم دیں، تو چھوڑ دے، انکی خدمت نفل سے افضل ہے۔ مسئلہ واجبات والدین کے حکم سے ترک نہیں کیے جا سکتے۔ والدین کے احسان کے طریقے جو احادیث سے ثابت ہیں، یہ ہیں کہ تہِ دل سے انکے ساتھ محبت رکھے، رفتار و گفتار میں، نشست و برخاست میں ادب لازم جانے، ان کی شان میں تعظیم کے الفاظ کہے، اُنکے راضی کرنے کی سعی کرتا رہے، اپنے نفیس مال کو ان سے نہ بچائے، اُنکے مرنے کے بعد اُنکی وصیتیں جاری کرے، اُنکے لیے فاتحہ، صدقات، تلاوتِ قرآن سے ایصالِ ثواب کرے، اللہ تعالیٰ سے اُنکی مغفرت کی دعا کرے، ہفتہ وار اُنکی قبر کی زیارت کرے۔ (فتح العزیز) والدین کے ساتھ بھلائی کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر وہ گناہوں کے عادی ہوں، یا کسی بدمذہبی میں گرفتار ہوں، تو اُنکو بنرمی صلاح و تقویٰ اور عقیدۂ حقّہ کی طرف لانے کی کوشش کرتا رہے۔ (خازن و خزائن العرفان)

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے بعد حقوق العباد میں، چونکہ ماں باپ کے حقوق بلند ہیں، اسلیے پہلے اُنکا حق بیان فرمایا گیا۔ دوسری آیت میں ہے اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ (میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا احسان مانو۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا، نماز کو وقت پر ادا کرنا۔ پھر عرض کیا اسکے بعد؟ فرمایا ماں، باپ کے ساتھ سلوک و احسان کرنا۔ پھر پوچھا اسکے بعد؟ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ کسی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم میں کس کے ساتھ سلوک اور بھلائی کروں؟ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ۔ پوچھا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنی ماں کے ساتھ پوچھا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنے باپ کے ساتھ پھر اور قریب والوں کے ساتھ، پھر اور قریب والوں کے ساتھ۔ اسکے بعد آیت میں ارشاد ہے وَذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ط (اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو) اچھی بات سے مُراد، نیکیوں کی ترغیب اور بدیوں سے روکنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں حق اور سچی بات کہو، اگر کوئی دریافت کرے تو حضور کے کمالات و اوصاف سچائی کے ساتھ بیان کرو، آپ کی خوبیاں نہ چھپاؤ۔ (خزائن العرفان) حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ نیک بات لوگوں کو بتاتے رہو، اور بُری باتوں سے اُنھیں روکتے رہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپس کے برتاؤ میں نرم بات بولو۔ یا یہ کہ سچی گواہی دو۔ یا یہ کہ ایسی بات کہو جس سے ثواب ملے۔ ان سب اقوال میں کوئی منافات نہیں، سب کا مقصود یہی کہ نیکی کی ترغیب دو اور بدی سے اُنھیں بچاؤ۔ احسان اور حُسنٌ یہ دونوں لفظ ہم معنی ہیں، یعنی ہر وہ شے جو خوش کرے اور جسکی طرف رغبت کیجائے خواہ از روئے عقل یا از روئے خواہش و حس۔ قرآنِ کریم میں اسکا استعمال اُس پر ہے جو عقل کی رُو سے اچھا لگے۔ اور اس آیت میں حُسْن سے مُراد کلمۂ حسنہ اچھی بات کہنا ہے۔

ذِی الْقُرْبٰی (رشتہ دار) قُرب کئی لحاظ سے ہوتا ہے، یا تو نسب کے لحاظ سے جیسے اس آیت میں ہے۔ اب یہ نسب بھی یا تو باپ سے یا ماں کے لحاظ سے ہوگا۔ یا قربتِ مکان و زمانہ کے لحاظ سے ہوتی ہے، جیسے مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ یعنی نزدیکوں میں سے ہے۔ یا رعایت یعنی نگہداشت کے لحاظ سے ہوتی ہے، جیسے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (اللہ کی رحمت یعنی نگہداشت و حفاظت احسان کرنے والوں کے قریب ہے) یا قدرت کے لحاظ سے ہوتی ہے، جیسے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں) (مفردات راغب)۔ اَلْیَتٰمٰی، یتیم کی جمع ہے، اور یُتْم کے معنی انقطاع یعنی کٹ جانے کے ہیں۔ اور انسانوں میں یتیم وہ ہے جو بلوغ سے پہلے باپ سے منقطع ہو گیا ہو۔ یعنی اسکا باپ مر گیا ہو۔ اور ہر منفرد و یکتا کو بھی یتیم کہدیا جاتا ہے جیسے درۃ یتیمہ۔ (مفردات راغب)

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (اور نماز قایم رکھو اور زکوٰۃ دو) یعنی بنی اسرائیل سے توحید الٰہی اور احسان والدین اور حُسنِ سلوکِ اعزّہ و اقربا، اور یتامی کے بعد اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ کا بھی ان سے عہد لیا تھا، لیکن ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ (پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے) یعنی اے بنی اسرائیل تم نے اس عہد کا لحاظ و پاس نہ کیا اور تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے جو ایمان لے آئے، مثل حضرت عبداللہ بن سلام اور اُنکے اصحاب کے کہ اُنھوں نے تو عہد پورا کیا، حکمِ ربّانی اطاعت میں سر جھکا دیا اور حلقہ بگوش اسلام بنگئے، اور باقی سب سرگرداں ہو گئے۔ شروع رکوع سے بنی اسرائیل کو بطور غیبت یعنی غائب کے صیغوں سے خطاب فرمایا گیا، اور ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ سے صیغۂ خطاب یعنی حاضر سے مخاطب فرمایا گیا، یہ بطریق صنعتِ التفات ہے۔ مطلب یہ کہ حاضر و غائب یعنی جو زمانۂ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اہلِ کتاب موجود ہیں وہ، اور جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں سب کے لیے بطور تغلیب خطاب ہے۔ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (اور تم روگرداں ہو) یعنی تمہاری قوم کی عادت ہی اعراض کرنا اور عہد سے پھر جانا ہے۔

تَوَلّٰی کا اصل ولی ہے، جسکے معنی قرب کے ہیں، اور جب اسکا صلہ عَنْ سے ہو خواہ وہ لفظاً ہو یا تقدیراً جیسے یہاں ہے، تو اسکے معنی اعراض اور ترکِ قرب کے ہوتے ہیں اور مُعْرِضُوْنَ اعراض سے ہے جو عرض سے مشتق ہے، اور عرض طول کے خلاف ہے، اور عرض کا اطلاق غیر اجسام میں بھی ہوتا ہے جیسے فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ (حم ۴۱-۵۰)

اور اعراض عنہ کے معنی ہیں "اُس سے پھر گیا"۔ اور تولّی اور اعراض میں فرق کیا گیا ہے۔ تولّی یہ ہے کہ جدھر سے آیا تھا اُسی طرف لوٹ گیا۔ اور اعراض کے معنی یہ ہیں کہ اس راستہ کو چھوڑ کر اسکی چوڑائی میں چلا گیا۔ گویا نہ صرف یہ کہ حق سے پیٹھ پھیری، بلکہ باطل کو اختیار کرلیا ہے۔ (مفرداتِ راغب)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ
اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالنا پھر تم نے اسکا اقرار کیا

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ
اور تم گواہ ہو پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے اور اپنے میں سے ایک گروہ کو اُنکے وطن سے

دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ
نکالتے ہو اُن پر مدد دیتے ہو (اُنکے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں اور اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلا دیکر چھڑا لیتے ہو

عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ
اور اُنکا نکالنا تم پر حرام ہے تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ سے انکار کرتے ہو تو جو تم میں ایسا کرے اُس کا بدلا

مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ
کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائینگے اور اللہ

بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ
تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی مول لی تو اُن پر سے

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ ع ١٠
نہ عذاب ہلکا ہو اور نہ اُن کی مدد کی جائے

شانِ نزول:۔ توریت میں بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں، وطن سے نہ نکالیں، اور جو بنی اسرائیل کسی کی قید میں ہو، اُسکو مال دے کر چھڑالیں، اس عہد پر اُنھوں نے اقرار بھی کیا، اپنے نفس پر شاہد بھی ہوئے، لیکن قایم نہ رہے اور اس سے پھر گئے۔ **صورتِ واقعہ** یہ ہے کہ نواحِ مدینہ میں یہود کے دو فرقے بنی قریظہ اور بنی نضیر سکونت رکھتے تھے، اور مدینہ شریف میں دو فرقے اَوس وخزرج رہتے تھے۔ بنی قریظہ اَوس کے حلیف تھے، اور بنی نضیر خزرج کے، یعنی ہر ایک قبیلہ نے اپنے حلیف کے ساتھ قسما قسمی کی تھی کہ اگر ہم میں سے کسی پر کوئی حملہ آور ہو، تو دوسرا اُسکی مدد کریگا۔ اَوس اور خزرج باہم جنگ کرتے تھے، بنی قریظہ اَوس کی، اور بنی نضیر خزرج کی مدد کے لیے آتے تھے، اور حلیف کے ساتھ ہو کر آپس میں ایک دوسرے پر تلوار چلاتے تھے، بنی قریظہ بنی نضیر کو اور وہ بنی قریظہ کو قتل کرتے تھے، اور اُنکے گھر ویران کر دیتے تھے، اُنھیں اُنکے ساکن سے نکال دیتے تھے، لیکن جب اُنکی قوم کے لوگوں کو اُنکے حلیف قید کرتے تھے، تو وہ اُنکو مال دیکر چھڑا لیتے تھے۔ مثلاً اگر بنی نضیر کا کوئی شخص اَوس کے ہاتھ میں گرفتار ہوتا تو بنی قریظہ اَوس کو مالی معاوضہ دیکر اُسے چھڑا لیتے باوجودیکہ اگر وہی شخص لڑائی کے وقت اُنکے موقع پر آجاتا، تو اُسکے قتل میں ہرگز دریغ نکرتے۔ اس فعل پر ملامت کیجاتی ہے کہ جب تم نے اپنوں کی خونریزی نکرنے اُنکو بستیوں سے نہ نکالنے، اُنکے اسیروں کو چھڑانیکا عہد کیا تھا، تو اسکے کیا معنی کہ قتل واخراج میں تو درگزر نہ کرو، اور گرفتار ہو جائیں، تو چھڑاتے پھرو۔ عہد میں سے کچھ ماننا اور کچھ نہ ماننا کیا معنی رکھتا ہے؟ جب تم قتل واخراج سے باز نہ رہے، تو تم نے عہد شکنی کی، اور حرام کے مرتکب ہوئے، اور اسکو حلال جانکر کافر ہو گئے۔ **مسئلہ** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ظلم وحرام پر امداد کرنا بھی حرام ہے۔ **مسئلہ** یہ بھی معلوم ہوا کہ حرام قطعی کو حلال جاننا کفر ہے۔ **مسئلہ** یہ بھی معلوم ہوا کہ کتابِ الٰہی کے ایک حکم کا نہ ماننا بھی ساری کتاب کا نہ ماننا اور کفر ہے۔ **فائدہ**:۔ اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ جب احکامِ الٰہی میں سے بعض کا ماننا بعض کا نہ ماننا کفر ہوا، تو یہود کا حضرت سید انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا انکار کرنے کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو ماننا کفر سے نہیں بچا سکتا۔ دنیا میں تو یہ رسوائی ہوئی کہ بنی قریظہ ۳ ہجری میں مارے گئے۔ ایک روز میں اُنکے سات سو آدمی قتل کیے گئے تھے، اور بنی نضیر اس سے پہلے جلاوطن کر دیئے گئے۔ حلیفوں کی خاطر عہدِ الٰہی کی مخالفت کا یہ وبال تھا۔ **مسئلہ** اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی طرفداری میں دین کی مخالفت کرنا علاوہ اُخروی عذاب کے دُنیا میں بھی ذلت اور رُسوائی کا باعث ہوتا ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں)۔ اس میں جیسی نافرمانوں کے لیے وعیدِ شدید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے افعال سے بیخبر نہیں ہے تمہاری نافرمانیوں پر عذابِ شدید فرمائیگا، ایسے ہی اس آیت میں مومنین وصالحین کے لیے مژدہ ہے کہ اُنھیں اعمالِ حسنہ کی بہترین جزا ملے گی۔ (تفسیر کبیر)

تَظٰهَرُوْنَ۔ تظاہر بابِ تفاعل سے ہے، جسکے معنی باہم ایک دوسرے کو مدد کرنا ہیں۔ اور ظہر بمعنی پشت کمر سے مشتق ہے، گویا ایک دوسرے کو اسطرح مدد کرتے ہیں جیسے اپنی پشت سے پشت جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ **اِثْم**۔ اس کی جمع آثام ہے، اسکے معنی گناہ کے ہیں، یعنی ایسے کام کرنا جس سے ثواب کے حصول میں تاخیر ہو۔ اسکے معنی حدیث میں یہ ہیں کہ مَاحَاكَ فِىْ نَفْسِكَ جو تمہارے نفسوں میں اثر انداز ہو۔ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ النَّاسُ عَلَيْهِ اور تم اسے برا جانو کہ لوگ اس سے باخبر ہوں۔ **عُدْوَان** عدو سے ہے، جسکے معنی تجاوز یعنی زیادتی کرنا ہے۔ یہ تجاوز اگر دل سے ہو، تو اسکو عداوت یا معاودت کہتے ہیں، اور اگر چلنے میں ہو، تو اسکو عَدْوٌ یعنی تیز رفتاری کہتے ہیں، اور اگر معاملہ میں میانہ روی اور اعتدال مدِ نظر نہ رکھنے میں ہو، تو اسکو عدوان کہتے ہیں۔ اِثم اور عدوان میں فرق یہ ہے کہ اثم یعنی گناہ وہ فعل ہے جو اپنی ذات پر اثر انداز ہو، اور عدوان وہ گناہ وزیادتی ہے جو دوسروں پر ظلم کرے۔ پس اُن کا فعل حکمِ الٰہی کی مخالفت کی وجہ سے اثم گناہ ہے، اور اپنے بھائیوں پر ظلم کرنے کی وجہ سے عدوان ہے **اُسٰرٰى** (قیدی) اسیر کی جمع ہے۔ اسر کے معنی زنجیر سے باندھنا ہیں، اصطلاح میں ہر وہ شخص جو پکڑا جائے خواہ اُسے زنجیر سے باندھا جائے یا نہیں وہ اسیر ہے۔ **تُفٰدُوْا** فدا یا فدی سے مشتق ہے، معنی یہ کہ انسان کو جو مصیبت پہنچے اُسے دور کرنے کے بدلے میں خرچ کرنا ہے۔ **قیامۃ**، قَامَ يَقُوْمُ کا مصدر قیامًا ہے، پھر "ہا" کے اضافہ سے قیامۃ بن گیا۔ اسکے معنی ہیں انسان کا ایکدم کھڑا ہو جانا۔ اسکے اچانک واقع ہونے کے لیے ہائے تنبیہ داخل کی گئی۔ (مفرداتِ راغب)

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ

اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اسکے بعد پے درپے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں اور

اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ

پاک روح سے اسکی مدد کی تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ لیکر آئے جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو اُن (انبیاء) میں ایک

وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ شہید کرتے ہو

اس آیتِ کریمہ میں بنی اسرائیل کے عناد و تکبر اور اُنکی خواہش پرستی کا بیان ہو رہا ہے کہ توریت کی تحریف و تبدیل کی، اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد انہی کی شریعت پر جو انبیاء و رُسُل علیہم السلام تشریف لائے انھوں نے اُنکی مخالفت کی۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ (اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی)۔ اس کتاب سے توریت مراد ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے تمام عہد مذکور تھے، سب سے عہد یہ تھے کہ ہر زمانہ کے پیغمبروں کی اطاعت کرنا، اُن پر ایمان لانا، اُنکی تعظیم و توقیر کرنا۔ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ (اور اسکے بعد پے درپے رسول بھیجے)۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام تک متواتر انبیاء آتے رہے، اُنکی تعداد چار ہزار بیان کی گئی ہے، یہ سب حضرات شریعتِ موسوی کے محافظ اور اُسکے احکام جاری کرنے والے تھے، چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد نبوت کسی کو نہیں مل سکتی، اسلیے شریعتِ محمدیہ کی حفاظت و اشاعت کی خدمت ربانی علماء اور مجددینِ ملت کو عطا ہوئی۔ (خزائن العرفان) وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ (اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں)۔ ان نشانیوں سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات مراد ہیں، جیسے مُردے زندہ کرنا، اندھے اور برص والے کو اچھا کرنا، پرند پیدا کرنا، غیب کی خبریں دینا وغیرہ (خزائن العرفان)۔ یا بَیِّنٰت (کھلی نشانیاں) سے انجیل مراد ہے۔ یعنی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب انجیل عطا فرمائی، جس میں بعض احکام توریت کے خلاف بھی تھے، اسی لیے اُنکو اسکے ساتھ مذکورہ معجزات بھی عطا فرمائے۔ (ابن کثیر)۔ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (اور پاک روح سے اُسکی مدد کی)۔ روح القدس سے حضرتِ جبریل علیہ السلام مراد ہیں کہ وہ روحانی ہیں، وحی لاتے ہیں، جس سے قلوب کی حیات ہے۔ وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہنے پر مامور تھے۔ آپ ۳۳ سال کی عمر شریف میں آسمان پر اُٹھا لیے گئے، اُسوقت تک حضرتِ جبریل علیہ السلام سفر و حضر میں کبھی آپ سے جدا نہ ہوئے۔ تائید روح القدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جلیل فضیلت ہے۔ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ میں حضور کے بعض امتیوں کو بھی تائید روح القدس میسر ہوئی۔ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت حسّان رضی اللہ تعالیٰ کے لیے منبر بچھایا جاتا، وہ نعت شریف پڑھتے، حضور اُنکے لیے فرماتے اَللّٰھُمَّ اَیِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (خزائن)

اس آیت میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو تائید روح القدس حاصل ہونے کی اطلاع دینے سے مطلب یہ ہے کہ اے یہود! پھر بھی تمہاری سرکشی میں فرق نہ آیا، اور تکذیب و تکبر اور حد میں بڑھ گئے۔ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ (تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ (حکم) لیکر آئے، جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور گروہ کو شہید کرتے ہو)۔ یہود پیغمبروں کے احکام اپنی خواہشوں کے خلاف پاکر انھیں جھٹلاتے اور موقع پاتے تو قتل کر ڈالتے تھے، جیسے کہ انھوں نے حضرت شعیا اور زکریا علیہما السلام اور بہت سے انبیاء کو شہید کیا۔ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بھی درپے رہے، کبھی آپ پر جادو کیا، کبھی زہر دیا، طرح طرح کے فریب بارادۂ قتل کیے۔ (خزائن العرفان)

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝

اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں، بلکہ اللہ نے اُن پر لعنت کی اُن کے کفر کے سبب، تو اُن میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں

یہودی بڑی بدنصیب قوم ہے۔ اس قوم نے کبھی ٹھنڈے دل سے احکام الٰہیہ پر غور ہی نہیں کیا۔ جب بھی انکے کانوں میں حق کی آواز پہنچی انھوں نے تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کیا، اور حلمِ الٰہی سے انحراف و عدول کیا۔ جسطرح انھوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور اُنکے بعد بیشمار انبیاء و مرسلین کے ساتھ گستاخیاں اور بےادبیاں کیں، اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو نارواسلوک کیا، اُسی طرح انھوں نے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ روش برقرار رکھی۔ جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسلام و توحید کی طرف دعوت دی، تو انھوں نے قسم قسم کی بدگوئیاں کیں، اور کوئی حربہ ایسا نہ چھوڑا جس سے مسلمانوں اور حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دل آزاری اور تمسخر نہ کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے بعض بدگویوں کو قتل کر کے انکی نادانی و جہالت کا پردہ چاک فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں) یہود نے یہ استہزاءً کہا تھا، انکی مراد یہ تھی کہ حضور کی ہدایت کو انکے دلوں تک راہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسکا رد فرمایا کہ بےدین جھوٹے ہیں، قلوب اللہ تعالیٰ نے فطرت پر پیدا فرمائے، ان میں قبولِ حق کی لیاقت رکھی، انکے کفر کی شامت ہے کہ انھوں نے سیدِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف کرکے بعد انکار کیا، اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی، اسکا اثر ہے کہ قبول کی نعمت سے محروم ہوگئے۔ (خزائن العرفان)۔ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝ (بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی انکے کفر کے سبب، تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں)۔ یہی مضمون دوسری جگہ ارشاد ہوا بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا یعنی بلکہ اُن پر اللہ نے اُنکے کفر کے سبب چھاپ لگادی، تو وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے۔

تھوڑا ایمان لانے کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان میں سے بہت کم لوگ ایماندار ہیں، اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ ایکا ایمان بہت کم ہے، یعنی قیامت، ثواب و عذاب وغیرہ کے کم قائل ہیں، اور یہ کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے اور توریت کو خدا کی کتاب بھی مانتے ہیں، مگر اس نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مان کر اپنا ایمان پورا اور مکمل نہیں کرتے بلکہ آپ کے ساتھ کفر کرکے اس تھوڑے ایمان کو بھی غارت اور برباد کر دیتے ہیں۔ اور تیسرے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سرے سے ہی بے ایمان ہیں، گویا وہ ایمان رکھتے ہی نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ یہودیوں کا قبولِ حق سے انحراف اس بناء پر نہیں ہے کہ وہ مثلِ جمادات ہیں، جنہیں اصلاً نرمی و لینت نہیں ہے، اور نہ یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی انکے دلوں کی صلاحیت کو پلٹ دیا ہے، جسکی وجہ سے وہ عدم قبولِ حق پر مجبور ہیں، بلکہ یہ حالت اُنکے کفر کی وجہ سے ہے، کیونکہ کفر نہایت درجہ ظلمت و تاریکی ہے۔ جب اُنھوں نے کسی پیغمبر کا انکار کیا، یا اُنکے کسی معجزے اور حکمِ الٰہی پر چیں بجبیں ہوئے، تو اس انکار و سرکشی کی بناء پر دل پر سیاہی آگئی۔ جب پھر دوبارہ کوئی نبی یا معجزہ یا حکمِ الٰہی آیا، تو اس پر انکار سے دل میں قساوت اور تاریکی و ظلمت بڑھتی چلی گئی، یہانتک کہ وہ تاریکی غلظت و کثافت کی حد تک پہنچ گئی، جیسے کہ موسم سرما میں سرد ہواؤں سے پانی جمنے لگتا ہے، جب بار بار ہوائے سرد اس پر چلتی رہے، تو وہ سخت مانند پتھر کے ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انکے دلوں کی کیفیت ہوگئی کہ بار بار حکمِ الٰہی سننے اور اُس سے کفر کرنے سے انکے دل سخت ہوگئے کہ اب وہ بالکل تاثیر قبول نہیں کرتے

چونکہ ان کا کفر اختیاری عمل ہے، اور جسکا لازمی نتیجہ رحمتِ حق سے دوری ہے، تو وہ مستحقِ لعنتِ الٰہی بنیگے۔ یہ مضمون اُس حدیث میں بصراحت مذکور ہے جسے بروایت حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابنِ شیبہ، ابنِ ابی الدنیا اور ابنِ جریر نے بیان فرمایا۔ ترجمہ حدیث یہ ہے کہ دلوں کی چار کیفیتیں، ایک قلبِ اغلف، یہ کافر کا دل ہے، دوسرا قلبِ اجرد، جو مثلِ قندیل ہو یہ مومن کا دل ہے، تیسرا قلبِ منکوس، یعنی کھوٹا دل، یہ منافق کا دل ہے کہ پہچانتا ہے پھر انکار کرتا ہے۔ چوتھا قلبِ مصفح، جسمیں ایمان ونفاق ہو، مثالِ نفاق کی جو دل میں ہو، وہ مثل ناسور کے ہے کہ ہمہ وقت ہر جانب اُس سے پیپ وخون بہتا رہتا ہے، ان دونوں طرفوں سے جو طرف بھی غالب ہوتی ہے، وہ دوسرے کو دبا دیتی ہے۔ اور حاکم نے بسندِ صحیح حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ ایمان کی وجہ سے دل میں سفیدی اور نورانی چمک پیدا ہوتی ہے، جسقدر ایمان مستحکم ہوتا جاتا ہے، اُسی قدر اُس میں نورانیت بڑھتی جاتی ہے، پس جب ایمان کامل ومستحکم ہو جاتا ہے تو پورا دل سفید ونورانی ہو جاتا ہے (اسی طرح) نفاق دل میں ابتداءً تھوڑی سی سیاہی اور تاریکی لاتا ہے، اور جسقدر نفاق بڑھتا جاتا ہے دل کی سیاہی پھیلتی جاتی ہے، اور جب نفاق جڑ پکڑ لیتا ہے، اور کامل منافق بنجاتا ہے، تو تمام دل سیاہ ہو جاتا ہے، قسم بخدا اگر تم مومن ومسلم کا دل چیروگے، تو اُسے سفید ومنور پاؤگے، اور اگر منافق کا دل چیروگے، تو اُسے سیاہ وتاریک پاؤگے۔ اب یہودیوں کے دل کی سیاہی اور تاریک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اپنے خودساختہ نظریات کی بنا پر اپنے دین میں باطل تعصب اور حق پوشی کرتے ہیں، یہ ہے کہ انھوں نے حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دیدہ ودانستہ، اور حقیقت کو جانتے بوجھتے بغاوت وسرکشی اختیار کی اور طریقِ عناد کو قبول کیا، یہ اگلی آیت ہے:۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ

اور جب اُنکے پاس اللہ کی وہ کتاب (قرآن) آئی جو اُنکے ساتھ والی کتاب (توریت) کی تصدیق فرماتی ہے اور اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے

كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

تھے تو جب تشریف لایا اُنکے پاس وہ جانا پہچانا اُس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر

اللہ تعالیٰ قوم یہود کی اُس حالت کو بیان فرماتا ہے جو حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل انکی تھی وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (اور جب اُنکے پاس اللہ کی وہ کتاب (یعنی قرآن) آئی) جس کی فصاحت وبلاغت کے آگے بڑے بڑے فصحاء وبلغاءِ عرب عاجز ہو گئے، اور بوقت تحدی ومعارضہ گونگے اور بے زبان بنگئے، جسکے دلائل وبراہینِ قاطعہ نے سب کے چھکے چھڑا دیئے، اور انھوں نے جان لیا کہ یہ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ کی جانب سے ہی یہ کتاب ہے، اور یہ کہ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (جو اُنکے ساتھ والی کتاب (توریت) کی تصدیق فرماتی ہے) کہ کسطرح قرآن، کتاب توریت میں مذکور حضور سید عالم خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت اور حضور کے اوصاف کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ یہودی وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے) یعنی سید انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کریم کے نزول سے قبل یہود اپنی حاجات کے لیے حضور کے نام پاک کے وسیلہ سے دعا کرتے اور کامیاب ہوتے تھے، اور اسطرح دعا کرتے تھے:۔ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ عَلَيْنَا وَانْصُرْنَا بِالنَّبِيِّ الْاُمِّيِّ۔ یارب ہمیں نبی اُمّی کے صدقہ میں فتح ونصرت عطا فرما۔ مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ مقبولانِ حق کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور سے قبل جہان میں حضور کی تشریف آوری کا شہرہ تھا، اُسوقت بھی حضور کے وسیلہ سے خلق کی حاجت روائی ہوتی تھی۔ (خزائن العرفان)۔ گویا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کو یہ یہودی اور تمام انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنا ناصر ومددگار جانتے تھے، اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اس نبی آخر الزماں کا نامِ نامی ہزیمتِ کفّار اور ادیانِ باطلہ پر غلبہ ونصرت کے لیے لشکرِ جرّار کے قائم مقام ہے۔ ابونعیم، بیہقی اور حاکم نے باسنادِ صحیحہ اور بطرقِ متعددہ یہ روایت کی ہے کہ مدینہ منورہ اور خیبر کے یہودی جب عرب کے بت پرستوں یعنی بنی اسد اور بنی غطفان اور جہینہ وعذرہ وغیرہ قبائل سے جنگ کرتے تھے، تو مغلوب ہو جاتے اور شکست کھا جاتے تھے، مجبور ہو کر وہ اپنے علماء واحبار کی طرف رجوع ہوتے تھے، تب وہ علماء واحبار انکو یہ دعا تلقین کرتے، اور ہر لشکری کو اسکے پڑھنے کی تاکید کرتے، جب وہ اس پر عمل کرتے، تب وہ غالب وفاتح ہو جاتے، اور مغلوب وہزیمت خوردہ نہ ہوتے، وہ دعا یہ ہے:۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ اَحْمَدَ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ وَعَدْتَّنَا اَنْ تُخْرِجَهٗ لَنَا فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَبِكِتَابِكَ الَّذِيْ تُنَزِّلُ عَلَيْهِ اٰخِرَ مَا يُنَزِّلُ اَنْ تَنْصُرَنَا عَلٰى اَعْدَآئِنَا۔ یعنی اے ہمارے رب ہم بوسیلہ اُس احمد نبی اُمّی کے جسکا تونے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اُسے آخر زمانہ میں ہمارے لیے ظاہر فرمائیگا، اور بطفیل انکی اُس کتاب کے جسے اُس نبی آخر الزماں پر تمام کتابوں کے بعد نازل فرمائیگا ہمیں ہمارے دشمنوں پر نصرت وفتح عطا فرما۔ اسی طرح جب مشرکینِ عرب ان یہودیوں سے جھگڑا کرتے اور وہ انکے ساتھ بدسلوکی اور دشمنی کا برتاؤ کرتے، تو یہودی اُن سے کہا کرتے کہ بہت جلد نبی آخر الزماں کا زمانہ آنیوالا ہے، وہ ہماری تصدیق فرمائینگے، پھر ہم اُنکے ساتھ ہو کر تمہیں اسطرح قتل وہلاک کر ڈالینگے، جیسے عاد وثمود اور ارم برباد وہلاک کیے گئے۔ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا (تو جب وہ تشریف لایا اُنکے پاس وہ جانا پہچانا) یعنی جب وہ نبی آخر الزماں تشریف لے آئے جنکے اوصاف وکمال کے وہ پہلے ہی خوب واقف تھے، اور آپ کی شکل وصورت، جائے ولادت خصائل وشمائل، اور وہ واقعات جو مدینہ منورہ میں تشریف لانے سے قبل مکہ مکرمہ میں تیرہ سالہ دورِ نبوت میں پیش آئے تھے، انھیں بھی وہ خوب جانتے تھے کہ یہ وہی نبی برحق ہے جسکا تذکرہ انکی کتاب توریت میں مذکور ہے، اور ہو بہو یہ ان پیشینگوئیوں کے مطابق ہے۔ اسی طرح وہ کتاب یعنی قرآن جو آپ پر نازل ہوئی اعجازِ لفظی ومعنوی اور حسنِ بلاغت وفصاحت، حکمت وموعظت کے اعتبار سے علیٰ وجہ الکمال بے مثل وبے نظیر ہے، اور بالکل ایسا ہی کلام ہے جس کی توریت میں توصیف فرمائی گئی ہے۔ جب حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ پر وہ کتاب نازل ہوئی تو كَفَرُوْا بِهٖ (اُس سے منکر ہو بیٹھے)۔ یہود کا یہ انکار، عناد وحسد اور حُبِّ ریاست کی وجہ سے تھا، ورنہ دل میں معترف تھے، اور یقین رکھتے تھے کہ یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں، جسکا تذکرہ انکے پاس کی کتابوں میں مذکور ہے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (تو اللہ کی لعنت منکروں پر) جسطرح گزشتہ آیت میں وہ کفر وانکار کی وجہ سے رحمتِ الٰہی سے دوری، اور لعنتِ خداوندی کے مستحق بنے تھے، اب بھی وہ اس کفر وانکار کی وجہ سے لعنتِ خداوندی کے سزاوار بنے۔ کیونکہ وہ دانستہ حق پوشی کرتے ہیں، بغاوت وعناد اور حسد کی وجہ سے صریح حق کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ انبیاءِ سابقین علیہم السلام اور کتابِ توریت نے جو اُن سے عہد ومیثاق لیے تھے اُسکا ایفاء اُن پر لازم وواجب تھا، اور انھیں چاہیے تھا کہ وہ پوری کوشش وسعی سے اس دینِ حق یعنی اسلام، اور اس نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نصرت واعانت کرتے، مگر بجائے اس کے انھوں نے حاسد رہ کر کی تمرد وسرکشی اور بغض وعناد کا مظاہرہ کیا۔ ان کی یہ حرکت اُس بے عقل غلام کی سی ہے جو بعوض مال کے گروی تھا، لیکن غلام نے بجائے اسکے کہ مال ادا کرکے خلاصی اور رستگاری حاصل کرتا، اُس نے سرے سے مال کے عوض گروی ہونے، اور اس رہن میں دستاویز و وثیقہ سے ہی انکار کردیا اور مرتہن کو جھٹلانے لگا کہ اسکا دعویٰ اور تمسک غلط اور جھوٹ ہے۔

اسی طرح ان یہودیوں نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے دین کا انکار کرکے اپنے عہود ومواثیق سے انحراف کیا، حالانکہ اُن پر ایفائے عہد واجب تھا۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ

کس بُرے مولوں انھوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اُتارے سے منکر ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے

يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

وحی اُتارے　　تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کے لیے ذلت کا عذاب ہے

مطلب یہ کہ یہود نے کس بُرے مولوں (داموں) اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اُتارے (قرآن) سے منکر ہو گئے۔ یعنی آدمی کو اپنی جان کی خلاصی کے لیے وہی کرنا چاہیے جس سے رہائی کی اُمید ہو۔ یہود نے یہ بُرا کیا کہ اللہ کے نبی اور اُسکی کتاب کے منکر ہو گئے، محض اس جلن کی وجہ سے کہ "اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی اُتارے" یہود کی خواہش تھی کہ ختمِ نبوّت کا منصب بنی اسرائیل ہی سے کسی کو ملتا۔ جب دیکھا کہ وہ محروم رہے اور بنی اسمٰعیل نوازے گئے، تو حسد سے منکر ہو گئے۔ مسئلہ اس سے معلوم ہُوا کہ حسد حرام اور محرومیوں کا باعث ہے۔ (خزائن العرفان) تو اب یہ یہودی غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے، یعنی انواع واقسام کے عذابوں کے سزاوار ہوئے، کیونکہ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (اور کافروں کے لیے ذلّت کا عذاب ہے)۔ اس سے معلوم ہُوا کہ ذلّت واہانت والا عذاب کفّار کے ساتھ خاص ہے، مومنین کو گناہوں کی وجہ سے عذاب ہُوا بھی، تو ذلّت واہانت کے ساتھ نہ ہوگا (بلکہ جسطرح سونے سے مَیل کچیل صاف کرنے کیلیے بھٹی میں رکھا جاتا ہے، اُسی طرح مسلمان کو گناہوں کی آلودگیوں سے مصفّٰی کرنے کے لیے ایک مدّتِ خاص تک عذاب ہوگا، بالآخر اُنکی نجات ہوگی) اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اللہ کے لیے عزت ہے اور اُسکے رسول اور مسلمانوں کے لیے عزت ہے۔) (خزائن العرفان)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ

اور جب اُن سے کہا جائے کہ اللہ کے اُتارے پر ایمان لاؤ　تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اُترا اُس پر ایمان لاتے ہیں　اور باقی سے منکر ہوتے ہیں　حالانکہ وہ

هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

حق ہے اُن کے پاس والے کی تصدیق فرماتا ہوا　تم فرماؤ کہ پھر اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا　اگر تمہیں اپنی کتاب پر ایمان تھا

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○

اور بیشک تمہارے پاس موسیٰ کھُلی نشانیاں لیکر تشریف لایا　پھر تم نے اسکے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا　اور تم ظالم تھے

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (اور جب اُن سے کہا جائے کہ اللہ کے اُتارے پر ایمان لاؤ) یعنی قرآنِ پاک اور تمام وہ کتابیں اور صحائف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے سب پر ایمان لاؤ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا (تو کہتے وہ جو ہم پر اُترا اُس پر ایمان لاتے ہیں) اس سے اُنکی مُراد توریت ہے۔ وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ (اور باقی سے مُنکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اُنکے پاس والی کی تصدیق فرماتا ہُوا) یعنی توریت پر ایمان لانے کا دعویٰ غلط ہے، چونکہ قرآنِ پاک جو توریت کا مصدّق ہے اُسکا انکار توریت کا انکار ہو گیا۔ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (تم فرماؤ کہ پہلے اگلے انبیاء کو کیوں شہید کیا اگر تمہیں اپنی کتاب (توریت) پر ایمان تھا)۔ اس میں بھی اُنکی تکذیب ہے کہ اگر توریت پر تم ایمان رکھتے، تو انبیاء علیہم السلام کو ہرگز شہید نہ کرتے۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (اور بیشک تمہارے پاس موسیٰ کھُلی نشانیاں لیکر تشریف لائے پھر تم نے اسکے بعد (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طُور پر تشریف لیجانے کے بعد) بچھڑے کو معبود بنایا) وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○ (اور تم ظالم تھے)۔ اس میں بھی اُنکی تکذیب ہے کہ شریعتِ موسوی کو ماننے کا دعویٰ جھوٹا ہے، اگر تم مانتے تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے عصاء اور یدِ بیضاء وغیرہ کھلی نشانیوں کے دیکھنے کے بعد گوسالہ پرستی نہ کرتے (خزائن العرفان)۔ مفہومِ کلام یہ ہے کہ جب ان یہود ونصاریٰ سے قرآن پر اور نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کہا جاتا ہے، تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمیں توریت وانجیل پر ایمان رکھنا کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس دعوے میں بھی جھوٹے ہیں، کیونکہ قرآن تو ان کتابوں کا سچّا بتانے والا ہے اور خود انکی کتابوں میں بھی حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصدیق موجود ہے، اور وہ لوگ آپ کو خوب اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں، جیسے کہ فرمایا اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ یعنی اہلِ کتاب آپ کو اسطرح پہچانتے ہیں جسطرح کوئی اپنی اولاد کو پہچانتا ہو۔ پس آپ کے انکار سے توریت وانجیل پر بھی ایمان نہ رہا۔ اس حجت کو قایم کرکے اب دوسری طرح حجت قایم کیجاتی ہے کہ اچھا توریت وانجیل پر تو تمہارا ایمان ہے پھر اگلے انبیاء جو انکی تصدیق اور تابعداری کرتے ہوئے نئی شریعت اور نئی کتاب بغیر آئے تم نے اُنھیں کیوں قتل کیا؟ معلوم ہُوا کہ تمہارا ایمان نہ تو اس کتاب پر ہے نہ اُس کتاب پر، تم محض خواہش کے بندے، نفس کے غلام اپنی رائے اور قیاس کے ماتحت ہو۔ پھر فرمایا کہ اچھا موسیٰ علیہ السلام سے تو تم نے بڑے معجزات دیکھے، طوفان، ٹڈیاں، جُوئیں، مینڈک، خُون وغیرہ انکی بددعا سے بطور معجزہ کے ظاہر ہوئے، لکڑی کا سانپ بن جایا کرنا، ہاتھ کا روشن چاند بن جایا کرنا، دریا کو چیر دینا اور پانی کو پتھر کی طرح بنا دینا، بادلوں کا سایہ کرنا، منّ وسلویٰ اُتارنا، پتھر سے نہریں جاری کرنا وغیرہ تمام بڑے بڑے معجزات جو اُنکی نبوّت کی اور خدا کی توحید کی روشن دلیلیں تھیں، سب کچھ اپنی آنکھوں دیکھے، لیکن اُدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طُور پہاڑ پر گئے، اِدھر تم نے بچھڑے کو خدا بنا لیا، اب بتاؤ کہ خود توریت پر، اور خود حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر بھی تمہارا ایمان کہاں رہا؟ کیا یہ بدکاریاں تمہیں ظالم کہلوانے والی نہیں؟ مِنْۢ بَعْدِهٖ سے مُراد موسیٰ علیہ السلام کے طُور پر جانے کے بعد ہے، جیسے اور جگہ ہے وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى الآیہ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طُور پر جانے کے بعد آپ کی قوم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اور اپنی جانوں پر اس گوسالہ پرستی سے صریح ظلم کیا، جسکا احساس بعد میں خود اُنھیں بھی ہُوا، جیسے فرمایا وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ الآیہ یعنی جب اُنھیں ہوش آیا، نادم ہوئے اور اپنی گمراہی کو محسوس کرنے لگے، اُسوقت کہا کہ خدایا اگر تو ہم پر رحم نہ کریگا اور ہماری خطا نہ بخشے گا، تو ہم زیاں کار ہو جائینگے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا　لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے　اور سنو　بولے ہم نے سُنا　اور نہ مانا

وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

اور اُنکے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا اُن کے کفر کے سبب　تم فرما دو کیا بُرا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو

اللہ تعالیٰ اِن آیات میں بنی اسرائیل کی خطائیں، مخالفتیں، سرکشیاں اور حق سے اُنکی روگردانی کا بطریقِ زجر وتوبیخ پھر بیان فرما رہا ہے، تاکہ موجودہ زمانہ کے بنی اسرائیل

اپنے آباء واجداد کی غلطیوں اور سرکشیوں میں اُنکی پیروی کرنے سے باز آجائیں، اور راہِ حق، صراطِ مستقیم، اور نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بجان و دل تصدیق کر کے ایمان لائیں۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ (اور یاد کرو جب ہم نے تم سے یعنی بنی اسرائیل سے پیمان لیا) کہ توریت کے احکام پر عمل کریں، مگر انھوں نے جب توریت کو [illegible] ہے، تو وہ ان پر شاق اور [illegible] گزرے، انھوں نے اپنا عہد فراموش کر کے اُسکے احکام پر عمل کرنے میں حیلے بہانے تلاش کرنے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر زجر و توبیخ کے لیے پہاڑ کو اُنکے سروں پر لا کھڑا کیا۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (اور طُور کو تمہارے سروں پر بلند کیا) تاکہ وہ پہاڑ گرنے کے خوف سے اپنے عہد سے نہ پھریں۔ جب پہاڑ کو اپنے سروں پر معلق دیکھا، اُسوقت حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک کے ذریعہ ربِ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا (لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو) یعنی اپنی پوری قوت وطاقت سے توریت کے اُن احکامِ الٰہیہ کو جو تمہاری طبیعتوں پر شاق ہیں اور جن پر عمل گراں معلوم ہوتا ہے مضبوطی سے پکڑو، اور اس میں جو احکام ہیں انھیں گوشِ ہوش سے سنو، تاکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکمِ امر و نہی فوت نہ ہو جائے اور تمہارے حافظہ سے رہ نہ جائے۔ قَالُوْا (بولے) یعنی موجودہ زمانہ کے بنی اسرائیل کے آباء و اجداد نے جنکے سروں پر وہ طُور پہاڑ معلق ہوا تھا، ڈر اور خوف سے کہا سَمِعْنَا (ہم نے سنا)۔ یعنی ہم نے توریت کے احکام سُنے وَعَصَیْنَا (اور نہ مانا) یعنی ہم گنہگار ہیں، ہمنے توریت کے احکام کی نافرمانی کی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک پہاڑ کے گرنے کا خوف اُن پر مسلط ہے، اور یہ حالت اُن پر برقرار ہے، اسوقت احکامِ شاقّہ کا قبول کرنا کارگر نہ ہوگا، وہ محض ڈر اور خوف سے چار و ناچار حرفِ اطاعت زبان سے بول رہے ہیں، اور جب یہ خوف ان سے دُور ہو جائے گا اور پہاڑ سروں پر سے ہٹ جائیگا، اور طبائع انسانی اپنی اصلی حالت وکیفیت پر آجائینگی، تو لامحالہ صدورِ گناہ ہوگا۔ ایسی حالت میں اس کلمہ کے بولنے کا سبب انتہائی خوف و ڈر کی وجہ سے ہے، ورنہ دراصل انکے دلوں میں اور انکے جوہرِ نفس میں صورت پرستی کی محبت محکم و مضبوط ہو گئی۔ چنانچہ اس حالت کا اظہار اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِهِمْ (اور انکے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا انکے کفر کے سبب)۔ یعنی شراب جسطرح لبشرعت تمام سارے جسم اور ہر رگ و پے میں سرایت کر جاتی اور دوڑنے لگتی ہے، اسی طرح گوسالہ پرستی کی محبت انکے دلوں میں رچ بس گئی ہے، اور یہ تمام چیزیں ابتدائً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنکے حق میں نہ آئی تھیں کہ وہ معذور و مجبور گردانے جاتے، جسطرح کہ حیوانات اور جانور ہوتے ہیں کہ انکی حرکتیں قابلِ مواخذہ نہیں ہوتی ہیں، بلکہ اِن بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی محبت انکے اپنے کفر و عناد کی وجہ سے ہے۔ جب انھوں نے پہلی بار خدا کی آیتوں کا انکار کیا، اور پیغمبرِ وقت کی پیروی واطاعت سے انحراف و عدول کیا، اور اُنکو نہ مانا تو انکے دلوں میں ایک زنگ پیدا ہو گیا پھر جب بار دگر اسی طرح کی حرکتیں کیں، تو وہ زنگ اور زیادہ ہو گیا، یہانتک کہ رفتہ رفتہ دلوں کا حجاب بڑھ کر غلیظ ہو گیا، اور ہدایت کے اثر کو قبول و نفوذ میں مانع اور روک بن گیا اس حالت کو یوں سمجھو کہ کسی نے کوئی غذائے مخالف و مضاد پہلی مرتبہ کھائی، جسکے سبب اُسکی آنکھوں پر معمولی سی باریک جھلّی آگئی اور بینائی ہلکی ہو گئی، پھر اُس نے بارِ دیگر بدپرہیزی کی، اور بار بار یوں ہی بدپرہیزی کرتا رہا یہانتک کہ اُسکی بینائی پر موٹی جھلّی چھاگئی، اور وہ بینائی سے محروم ہو گیا اور پورا پورا اندھا ہو گیا۔ یہی حال ان بنی اسرائیل کے سرکشوں کا ہے کہ بار بار کے کفر نے انکے دلوں پر ہدایت کے اثر کو قبول کرنے میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اب انکا یہ دعویٰ کہ نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (جو ہم پر نازل ہوا یعنی توریت، اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور اُسکے ماسوا سے کفر کرتے ہیں) غلط ہے، کیونکہ اپنی کتاب توریت پر ایمان رکھنے پر انحصار بھی صحیح نہیں ہے، اسلیے کہ اُنھوں نے نزولِ توریت کے بعد بھی گوسالہ پرستی کی محبت انکے دلوں میں سرایت کر گئی تھی، اور اسکے احکام کو قبول کرنے میں نافرمانی و سرکشی کا اظہار کیا تھا، اور اس کتاب توریت کے ساتھ بھی انھوں نے کفری کلمات بولے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ بطور سرزنش و طعن ارشاد فرماتا ہے قُلْ (اے محبوب تم ان سے فرماؤ) بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِهٖٓ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (کیا برا حکم دیتا ہے تمکو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو؟) اس میں بھی انکے دعوئے ایمان کی تکذیب ہے کہ عین وقتِ نزولِ توریت تم نے کفر اختیار کیا، اور گوسالہ پرستی کی محبت تمہارے دلوں میں سما گئی تھی۔ لہٰذا اب تمہارا یہ دعویٰ کرنا کہ جو ہم پر نازل ہوا اُس پر ایمان رکھتے ہیں سراسر غلط اور جھوٹ ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

تم فرماؤ اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لیے ہو تو بھلا موت کی آرزو تو کرو

اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝

اگر سچے ہو اور ہرگز کبھی اسکی آرزو نہ کرینگے اُن بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے، اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا ۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ

اور بیشک تم ضرور انھیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں سے ایک کو تمنا ہے کہ کہیں ہزار برس جیے

اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ ۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝ ع

اور وہ اُسے عذاب سے دُور نہ کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ اُن کے کوتک دیکھ رہا ہے۔

یہود کے باطل دعاوی میں سے ایک یہ دعویٰ بھی تھا کہ جنت خاص اِن ہی کے لیے ہے، اسکا رد فرمایا جاتا ہے کہ اگر تمہارے زعم میں جنت تمہارے لیے خاص ہے۔ اور آخرت کی طرف سے تمہیں اطمینان ہے اعمال کی حاجت نہیں، تو جنتی نعمتوں کے مقابلہ میں دُنیوی مصائب کیوں برداشت کرتے ہو، موت کی تمنا کرو کہ تمہارے دعوے کی بناء پر تمہارے لیے باعثِ راحت ہے۔ اگر تم نے موت کی تمنا نہ کی، تو یہ تمہارے لیے کذب کی دلیل ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ موت کی تمنا کرتے، تو سب ہلاک ہو جاتے، اور روئے زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا۔ اور دوسری آیت میں فرمانِ الٰہی کہ وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (اور ہرگز کبھی اسکی آرزو نہ کرینگے) یہ غیب کی خبر اور معجزہ ہے کہ یہود باوجود نہایت ضد اور شدید مخالفت کے بھی تمنائے موت کا لفظ زبان پر نہ لا سکے۔ (خزائن العرفان)

یہود کا موت کی آرزو نہ کرنا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ (اُن بداعمالیوں کے سبب جو آگے کر چکے ہیں) جیسے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور قرآن کیساتھ کفر، اور توریت کی تحریف وغیرہ۔ یہود خوب جانتے تھے کہ انکے یہ کرتوت، اور یہ بداعمالیاں نہایت شنیع ہیں، آخرت میں انکی نہایت سخت و شدید سزا ملنی ہے، لہٰذا جو دن بھی دنیا میں گزریں غنیمت ہیں، ورنہ آخرت کا عذاب تو انتہائی دردناک ہے، اسی خوف سے وہ موت کی آرزو نہیں کرتے تھے۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ (اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو) کہ وہ اپنے کرتوت اور بداعمالیوں میں کس عذاب و سزا کے مستحق ہیں۔ مسئلہ موت کی محبت اور لقائے پروردگار کا شوق

مسئلہ موت کی محبت، اور لقاءِ پروردگار کا شوق اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا طریقہ ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر نماز کے بعد دعا فرماتے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ وَوَفَاۃً بِبَلَدِ رَسُوْلِکَ (یارب مجھے اپنی راہ میں شہادت اور اپنے رسول کے شہر میں وفات نصیب فرما) بالعموم تمام صحابہ کبار، اور بالخصوص شہداء بدر و احد اور اصحاب بیعتِ رضوان موت فی سبیل اللہ کی محبت رکھتے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکر کفار کے سردار رستم بن فرخ زاد کے پاس جو خط بھیجا تھا اُس میں تحریر فرمایا تھا اِنَّ مَعِیَ قَوْمًا یُّحِبُّوْنَ الْمَوْتَ کَمَا یُحِبُّ الْاَعَاجِمُ الْخَمْرَ یعنی میرے ساتھ ایسی قوم ہے جو موت کو اتنا محبوب رکھتی ہے جتنا عجمی شراب کو۔ اس میں لطیف اشارہ تھا کہ شراب کی ناقص مستی کو محبتِ دنیا کے دیوانے پسند کرتے ہیں، اور اہل اللہ موت کو محبوبِ حقیقی کے وصال کا ذریعہ سمجھ کر محبوب جانتے ہیں۔ فی الجملہ اہلِ ایمان آخرت کی رغبت رکھتے ہیں، اور اگر طولِ حیات کی تمنا بھی کریں، تو وہ اسلیے ہوتی ہے کہ نیکیاں کرنے کے لیے کچھ اور عرصہ ملجائے، جس سے آخرت کے لیے ذخیرہ سعادت زیادہ کرسکیں۔ اگر گزشتہ ایام میں گناہ ہوئے ہیں، تو اُن سے توبہ و استغفار کرلیں۔ مسئلہ صحاح کی حدیث میں ہے کہ کوئی دُنیوی مصیبت سے پریشان ہو کر موت کی تمنا نہ کرے، اور درحقیقت حوادثِ دنیا سے تنگ آکر موت کی دعا کرنا صبر و رضاء و تسلیم و توکل کے خلاف و ناجائز ہے۔ (خزائن العرفان)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ان یہودیوں کو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانی پیغام دیا کہ اگر تم سچے ہو، تو مقابلہ میں آؤ ہم تم مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہم میں سے جھوٹے کو ہلاک کردے، لیکن ساتھ ہی پیشینگوئی بھی کردی کہ یہ لوگ ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہونگے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ یہ لوگ مقابلہ پر نہ آئے، اسلیے کہ وہ دل سے حضور کو اور آسمانی کتاب قرآن کو سچا جانتے تھے۔ اگر یہ لوگ اس اعلان کے ماتحت مقابلہ میں نکلتے، تو سب کے سب ہلاک ہوجاتے، روئے زمین پر ایک یہودی باقی نہ رہتا۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے کہ اگر یہودی مقابلہ پر آتے اور جھوٹے کے لیے موت طلب کرتے، تو سب کے سب مرجاتے اور اپنی جگہ جہنم میں دیکھ لیتے۔ اسی طرح جو نصرانی آپ کے پاس آئے تھے وہ بھی اگر مباہلہ کے لیے تیار ہوتے، تو وہ لوٹ کر اپنے اہل و عیال اور مال و دولت کا نام و نشان بھی نہ پاتے۔ (مسند احمد) سورہ جمعہ میں بھی اسی طرح کی دعوت انھیں دی گئی ہے۔ آیت قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا آخر تک پڑھیئے، ان کا یہ دعویٰ تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ہم تو اللہ کی اولاد اور اسکے پیارے ہیں۔ یہ کہا کرتے تھے کہ لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی۔ جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ ہی جائینگے۔ اسلیے انھیں کہا گیا کہ آؤ اسکا فیصلہ اسطرح کرلیں کہ دونوں فریق میدان میں نکل کر خدا سے دعا کریں کہ ہم میں سے جھوٹے کو ہلاک کروالے۔ لیکن چونکہ اس جماعت کو اپنے جھوٹ کا علم تھا، یہ اسکے لیے تیار نہ ہوئے، اور انکا کذب سب پر کھل گیا۔ اسی طرح جب نجران کے نصرانی حضور کے پاس آئے، بحث مباحثہ ہوچکا، تو ان سے بھی یہی کہا گیا تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ الآیہ آؤ ہم تم دونوں اپنی اپنی اولادوں بیویوں کو لیکر نکلیں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ جھوٹوں پر اپنی لعنت نازل فرمائے۔ لیکن وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہرگز اس نبی سے مباہلہ نہ کرو، ورنہ فوراً برباد ہوجاؤ گے۔ چنانچہ مباہلہ سے انکار کردیا، اور جھک کر صلح کرلی اور دب کر جزیہ دینا منظور کرلیا۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اُنکے ساتھ امین بنا کر بھیجدیا۔ اسی طرح مشرکین عرب سے بھی کہا گیا قُلْ مَنْ كَانَ فِی الضَّلٰلَةِ فَلْیَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا یعنی ہم میں سے جو گمراہ ہو اللہ تعالیٰ اُس کی گمراہی بڑھادے۔ اس اعلان کے سنتے ہی یہود ٹھنڈے پڑ گئے اور تمام لوگوں پر انکا جھوٹ کھل گیا، اور وہ پیشینگوئی بھی سچی ثابت ہوئی کہ یہ لوگ ہرگز طلب موت نہیں کرینگے۔ اس مباہلہ کا نام اصطلاح میں تمنّی رکھا گیا، کیونکہ ہر فریق باطل پرست کی موت کی آرزو کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ تو مشرکین سے بھی زیادہ طول عمر کے خواہاں ہیں، کیونکہ ان کفار کے لیے دنیا جنت ہے، اور انکی تمنا اور کوشش ہے کہ یہاں زیادہ رہیں۔ خواجہ حسن البصری فرماتے ہیں کہ منافق کو حیاتِ دُنیوی کی حرص کافر سے بھی زیادہ ہوتی ہے، یہ یہودی تو ایک ایک ہزار سال کی عمریں چاہتے ہیں، حالانکہ یہ لمبی عمر بھی انھیں عذابوں سے نجات نہیں دے سکتی چونکہ کفار کو تو آخرت پر یقین ہی نہیں ہوتا، اور انھیں تھا۔ پھر انکی سیاہ کاریاں بھی سامنے تھیں، اسلیے موت سے بہت زیادہ ڈرتے تھے، لیکن ابلیس کی برابر بھی عمر پالیں تو کیا ہوا، عذاب سے تو نہیں بچ سکتے۔ اللہ تعالیٰ انکے عمل سے بے خبر نہیں، تمام بندوں کے تمام بھلے برے اعمال کو وہ بخوبی جانتا ہے، اور ویسا ہی بدلہ دے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

مشرکین کا ایک گروہ مجوسی ہے، وہ آپس میں تحیت و سلام کے موقع پر کہتے ہیں زِہْ ہزار سال یعنی ہزار برس جیو۔ مطلب یہ ہے کہ مجوسی مشرک ہزار برس جینے کی تمنا رکھتے ہیں، یہودی اُن سے بھی بڑھ گئے کہ انھیں حرصِ زندگانی سب سے زیادہ ہے۔ (خزائن العرفان)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ

تم فرمادو جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اُس (جبریل) نے تو تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اُتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا

وَهُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَ

اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُسکے رسولوں اور جبریل اور

مِیْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ۝

میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا

شانِ نزول: یہود کے عالم عبد اللہ بن صوریا نے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا، آپ کے پاس آسمان سے کون فرشتہ آتا ہے؟ فرمایا جبریل۔ ابن صوریا نے کہا، وہ ہمارا دشمن ہے، عذاب، شدت اور خسف اُتارتا ہے، کئی مرتبہ ہم سے عداوت کرچکا ہے۔ اگر آپ کے پاس میکائیل آتے تو ہم آپ پر ایمان لے آتے۔ (خزائن العرفان) اس پر یہ آیت اُتری جس میں بتایا گیا کہ جبریل علیہ السلام دشمن کیسے ہوسکتے ہیں، وہ تو وہی کرتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ انھیں حکم فرماتا ہے، حضرت جبریل کو کسی سے عداوت نہیں، جو بالارادہ کسی کو تکلیف پہنچائیں، تمہارے ہی کرتوت و افعال ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ غضب فرماتا اور بطور سزا و تنبیہ عذاب نازل کرتا ہے، جسے حضرت جبریل علیہ السلام بحکم الٰہی لاتے ہیں۔ حضرت جبریل یا اور کوئی فرشتہ ہرگز شمہ بھر کسی کو وانستہ اذیت نہیں پہنچا سکتے۔ غور کرو یہی تو وہ جبریل علیہ السلام ہیں جو ہمارے محبوب آپ کے سینۂ مبارک پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن لائے جو اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا اور مسلمانوں کو ہدایت و بشارت دیتا ہے تو یہود کی عداوت جبریل کے ساتھ بے معنی ہے، بلکہ انھیں اگر انصاف ہوتا، تو وہ جبریل امین سے محبت کرتے اور اُنکے شکرگزار ہوتے کہ وہ ایسی کتاب لائے جس سے انکی کتابوں کی تصدیق ہوتی ہے، اور وَبُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ فرمانے میں یہود کا رد ہے کہ اب تو جبریل ہدایت و بشارت لا رہے ہیں، پھر بھی تم عداوت سے باز نہیں آتے۔ (خزائن العرفان) لہٰذا جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اُسکے فرشتوں اور اُس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا، تو اللہ دشمن ہے کافروں کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء و ملائکہ کی عداوت کفر اور غضبِ الٰہی کا سبب ہے، اور محبوبانِ حق سے دشمنی خدا سے دشمنی کرنا ہے۔ (خزائن العرفان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں، یہودیوں کی ایک جماعت رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آئی، اور کہا کہ ہم آپ سے چند سوال کرتے ہیں

جنکے صحیح جواب نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا، اگر آپ سچے نبی ہیں تو انکے جوابات دیجئے؟ آپ نے فرمایا بہتر ہے، جو چاہو پوچھو، مگر عہد کرو کہ اگر میں ٹھیک ٹھیک جواب دونگا تو تم میری نبوت کا اقرار کروگے اور میری فرمانبرداری میں لگ جاؤگے؟ انھوں نے اسکا وعدہ کیا اور عہد دیا۔ آپ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح خدا کی شہادت کیساتھ اُن سے پختہ وعدہ لیکر اُنھیں سوال کرنے کی اجازت دی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے تو یہ بتایئے کہ توریت نازل ہونے سے پہلے حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنے نفس پر کس چیز کو حرام کیا تھا؟ آپ نے فرمایا سنو! جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کی بیماری میں سخت بیمار ہوئے، تو نذر مانی کہ اگر خدا مجھے اس مرض سے شفا دیگا، تو میں اپنی سب سے زیادہ مرغوب چیز کھانے کی، اور سب سے زیادہ محبوب چیز پینے کی چھوڑ دونگا، جب تندرست ہوگئے، تو اونٹ کا گوشت کھانا، اور اونٹنی کا دودھ پینا جو آپ کے پسند خاطر تھا چھوڑ دیا۔ تمہیں خدا کی قسم! جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت اُتاری، بتاؤ یہ سچ ہے؟ اُن سب نے قسم کھاکر کہا کہ ہاں حضور سچ ہے، بجا ارشاد ہوا۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ عورت، مرد کے پانی کی کیا کیفیت ہے، اور کیوں کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی؟ آپ نے فرمایا سنو! مرد کا پانی گاڑھا اور سفید ہوتا ہے، اور عورت کا پانی پتلا اور زردی مائل ہوتا ہے جونسا غالب آجائے اُسی کے مطابق پیدائش ہوتی ہے اور شبیہ بھی۔ جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر آجائے تو حکم خداوندی سے اولاد نرینہ ہوتی ہے۔ اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر آجائے، تو حکم خداوندی سے اولاد لڑکی ہوتی ہے۔ تمہیں خدا کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، سچ بتاؤ میرا جواب صحیح ہے؟ سب نے قسم کھاکر اقبال کیا کہ بیشک آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ آپ نے اِن دونوں باتوں پر خدا کو گواہ کیا۔ انھوں نے کہا اچھا اب یہ فرمایئے کہ توریت میں جس نبی اُمّی کی خبر ہے، اُسکی خاص نشانی کیا ہے، اور اُسکے پاس کونسا فرشتہ وحی لیکر آتا ہے؟ آپ نے فرمایا اُسکی خاص نشانی یہ ہے کہ اُسکی آنکھیں جب سوئی ہوئی ہوں، تو اُسوقت میں اُسکا دل جاگتا رہتا ہے۔ تمہیں اُس رب کی قسم! جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی، بتاؤ تو میں نے ٹھیک جواب دیا؟ سب نے قسم کھاکر کہا کہ آپ نے بالکل صحیح جواب دیا، اب ہمارے اس سوال کی دوسری شق کا جواب بھی عنایت فرمادیجئے، اس پر بحث کا خاتمہ ہے۔ آپ نے فرمایا میرا ولی جبریل ہے، وہی میرے پاس وحی لاتا ہے، اور وہی تمام انبیاءِ کرام کے پاس پیغام باری لاتا رہا۔ سچ کہو، اور قسم کھاکر کہو کہ میرا یہ جواب بھی درست ہے؟ انھوں نے قسم کھاکر کہا کہ جواب تو درست ہے، لیکن چونکہ جبریل ہمارا دشمن ہے، وہ سختی اور خونریزی وغیرہ لیکر آتا رہتا ہے، اسلیے ہم اُسکی نہیں مانینگے، نہ آپ کی مانینگے۔ ہاں اگر آپ کے پاس حضرت میکائیل وحی لیکر آتے جو رحمت، بارش، پیداوار وغیرہ لیکر آتے ہیں، جو ہمارے دوست ہیں، تو ہم آپ کی تابعداری اور تصدیق کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے یہ بھی سوال کیا تھا کہ رعد کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اُنھیں اِدھر اُدھر لیجاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ گرج کی آواز کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اُسی فرشتہ کی آواز ہے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد وغیرہ، صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے، اُسوقت حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باغ میں تھے اور یہودیت پر قایم تھے، آپ نے جب یہ خبر سنی تو حضور کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ حضور تین باتیں پوچھتا ہوں، جن کا جواب نبیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہ فرمایئے کہ قیامت کی سب سے پہلی شرط کیا ہے؟ اور جنتیوں پہلا کھانا کیا ہے؟ اور کونسی چیز بچہ کو کبھی ماں کی طرف کھینچتی ہے اور کبھی باپ کی طرف۔ آپ نے فرمایا ان تینوں سوالوں کے جواب ابھی ابھی جبریل نے مجھے بتلائے ہیں، سنو! حضرت عبداللہ نے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے، آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا پہلی نشانی قیامت کی ایک آگ ہے، جو لوگوں کے پیچھے لگےگی اور انہیں مشرق سے مغرب کی طرف اکٹھا کردیگی، اور جنتیوں کی پہلی غذا مچھلی کی کلیجی کی زیادتی ہے۔ اور جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت کرجاتا ہے، تو لڑکا پیدا ہوتا ہے، اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر سبقت لیجاتا ہے تو لڑکی ہوتی ہے۔ یہ جواب سنتے ہی حضرت عبداللہ مسلمان ہوگئے اور پکار اٹھے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ پھر کہنے لگے، حضور یہودی بڑے بیوقوف لوگ ہیں اگر انھیں پہلے سے میرا اسلام لانا معلوم ہوجائیگا تو وہ مجھے برا بھلا کہنے لگینگے، آپ پہلے انھیں ذرا قائل معقول تو کیجئے۔ آپ کے پاس جب یہودی آئے تو آپ نے اُن سے پوچھا کہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسے شخص ہیں؟ کہا بڑے بزرگ اور باخبر آدمی ہیں، بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں، وہ تو ہمارے سردار ہیں اور سرداروں کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا اگر وہ مسلمان ہوجائیں پھر تو تمھیں اسلام کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوگا؟ وہ کہنے لگے اعوذ باللہ اعوذ باللہ وہ مسلمان ہی کیوں ہونے لگے۔ حضرت عبداللہ جو اب تک چھپے ہوئے تھے باہر آگئے اور زور سے کلمہ پڑھنے لگے۔ بس یہ سارے کے سارے شور مچانے لگے کہ یہ خود بھی برا ہے اور اسکے باپ دادے بھی برے تھے، یہ بڑے نیچے درجہ کا آدمی ہے، اور خاندانی کمینہ ہے حضرت عبداللہ نے عرض کیا، حضور اسی چیز کا مجھے ڈر تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جبر۔ میک۔ اسراف کے معنی عبد یعنی بندہ کے ہیں اور ایل کے معنی اللّٰه کے ہیں، تو جبریل وغیرہ کے معنی عبداللہ کے ہوئے۔ بعض لوگوں نے اسکے خلاف معنی بھی کیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایل کے معنی عبد کے ہیں اور ان سے پہلے کے الفاظ خدا کے نام ہیں، جیسے عربی میں عبداللہ، عبدالرحمن، عبدالملک، عبدالقدوس، عبدالسلام، عبدالکافی، عبدالجلیل وغیرہ۔ لفظ عبد ہر جگہ باقی رہا اور خدا کے نام بدلتے رہے، اسی طرح ایل ہر جگہ باقی ہے اور خدا کے اسماء حسنہ بدلتے رہتے ہیں۔ غیر عربی زبان میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے، اور مضاف بعد میں۔ اسی قاعدہ کے مطابق ان ناموں میں بھی ہے، جیسے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل وغیرہ۔

اب مفسرین کی دوسری جماعت کی دلیل سنیئے جو لکھتے ہیں کہ یہ گفتگو جناب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی۔ شعبی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روحاء میں آئے اُسوقت آپ نے فرمایا میں یہودیوں کے مجمع کبھی کبھی چلا جایا کرتا اور یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کسطرح قرآن توریت کو اور توریت قرآن کو سچا رہی ہے۔ یہودی بھی مجھ سے محبت ظاہر کرنے لگے، اور اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی، ایک دن میں اُن سے باتیں کر رہا تھا جو راستہ سے حضور گزرے، انھوں نے مجھ سے کہا تمہارے نبی وہ جارہے ہیں۔ میں نے کہا خبر میں جاتا ہوں لیکن یہ تو بتلاؤ تمہیں اللہ واحد کی قسم! خدا کے حق یاد کرو، اور خدا کی نعمتوں پر نظر رکھ کر خدا کی کتاب تم میں موجود ہونے کا خیال رکھ کر اُسی رب کی قسم کھاکر کہو کہ کیا تم حضور کو رسول نہیں مانتے؟ اب سب خاموش ہوگئے، اُنکے بڑے عالم نے جو اُن سب میں علم میں بھی کامل تھا اور سب کا سردار بھی تھا، اُن سے کہا، اتنی سخت قسم اس نے دی ہے کیوں تم صاف اور سچا جواب نہیں دیتے؟ انھوں نے کہا حضرت آپ ہی ہمارے بڑے ہیں، آپ ہی جواب دیجئے۔ اُس لاٹ پادری نے کہا، سنئے جناب! آپ نے زبردست قسم دی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہم دل سے جانتے ہیں کہ حضور خدا کے سچے رسول ہیں۔ میں نے کہا افسوس جب جانتے ہو، تو مانتے کیوں نہیں ہو؟ کہا صرف اسوجہ سے کہ اُن کے پاس وحی آسمانی لیکر آنیوالے جبریل ہیں، وہ نہایت سختی، تنگی، شدت عذاب اور تکلیف کے فرشتے ہیں، ہم اُنکے اور وہ ہمارے دشمن ہیں۔ اگر وحی لیکر حضرت میکائیل آتے جو رحمت و رافت، تخفیف و راحت والے فرشتے ہیں تو ہمیں ماننے بھی تامل نہ ہوتا۔ میں نے کہا اچھا بتلاؤ تو ان دونوں کی خدا کے نزدیک کیا کچھ قدر و منزلت ہے؟ انھوں نے کہا، ایک تو جناب باری کے داہنے بازو ہے، اور دوسرا بائیں طرف۔ میں نے کہا اللہ قسم جسکے سوا کوئی اور معبود نہیں، جو اِن میں سے کسی کا دشمن ہو، خدا بھی اُسکا دشمن ہے، اور دوسرا فرشتہ بھی۔ جبریل کے دشمن سے میکائیل دوستی نہیں رکھ سکتے، اور میکائیل کا دشمن جبریل کا دوست نہیں ہوسکتا، نہ ان میں سے کسی کا دشمن، خدا کا دوست ہوسکتا ہے، نہ ان دونوں میں سے کوئی بے اجازت باری تعالیٰ کے زمین پر آسکتا ہے، نہ کوئی کام کرسکتا ہے۔ واللہ مجھے نہ تم سے لالچ ہے نہ خوف ہے، سنو! جو شخص اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو، اُسکے فرشتوں اُسکے رسولوں، اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو، تو ایسے کافر کا خدا بھی دشمن ہے۔ اتنا کہہ کر میں چلا آیا، حضور کے پاس پہنچا، تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا، اے ابن خطاب! مجھ پر تازہ وحی نازل ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا، حضور سنائیے! آپ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ میں نے کہا حضور پر میرے ماں باپ قربان، یہی باتیں ابھی ابھی یہودیوں سے میری ہورہی تھیں میں تو چاہتا ہی تھا، بلکہ اسی لیے حاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ کو خبر کروں، مگر میرے آنے سے پہلے لطیف و خبیر، سننے دیکھنے والے خدا نے آپ کو خبر پہنچا دی۔ ملاحظہ ہو ابن ابی حاتم وغیرہ۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام خدا کے امین فرشتے ہیں، اللہ کے حکم سے آپ کے دل میں خدا کی وحی پہنچانے پر مقرر ہیں، وہ فرشتوں میں سے خدا کے رسول ہیں، کسی ایک رسول سے عداوت رکھنے والا سب رسولوں سے عداوت رکھنے والا ہے، جیسے ایک رسول پر ایمان سب رسولوں پر ایمان لانے کا نام ہے، اور رسول کے ساتھ کفر تمام نبیوں کے ساتھ کفر کرنے کے برابر ہے۔ خود خدا تعالیٰ بعض رسولوں کے نہ ماننے والوں کو کافر بتاتا ہے، فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ الآیہ یعنی جو لوگ اللہ کے ساتھ اور اُسکے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں، اور اللہ اور اُسکے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے (دوسری آیت کے آخر تک) پس ان آیتوں میں صراحتًا اُن لوگوں کو کافر کہا جو کسی رسول کو نہ مانیں، اسی طرح جبریل کا دشمن اللہ کا دشمن ہے، کیونکہ وہ اپنی مرضی نہیں آتے۔ قرآن فرماتا ہے وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّکَ ط فرماتا ہے وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ الآیہ یعنی ہم اللہ کے حکم کے سوا نہیں اُترتے، یہ نازل کیا ہوا رب العالمین کا ہے جسے لیکر روح الامین آتے ہیں اور آپ کے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ لوگوں کو ہوشیار کریں۔ صحیح بخاری کی حدیثِ قدسی میں ہے میرے دوستوں سے دشمنی کرنے والا مجھ سے لڑائی کا اعلان کرنے والا ہے۔

قرآنِ کریم کی یہ بھی ایک صفت ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کے تمام ربانی کلام کی تصدیق کرتا ہے، اور ایمانداروں کے دلوں کی ہدایت اور اُنکے لیے جنت کی خوشخبری دیتا ہے، جیسے فرمایا ھُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھُدًی وَّشِفَآءٌ فرمایا وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یعنی یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت وشفاء ہے + رسولوں میں انسانی رسول اور ملکی رسول سب شامل ہیں، جیسے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے اپنے رسول چھانٹ لیتا ہے + جبریل اور میکائیل بھی فرشتوں میں سے ہیں، لیکن انکا خاصۃً نام لیا تاکہ مسئلہ بالکل صاف ہو جائے، اور یہودی جان لیں کہ ان میں سے ایک کا دشمن، دوسرے کا دشمن ہے، بلکہ خدا بھی اُسکا دشمن ہے۔ حضرت میکائیل بھی کبھی کبھی انبیاء کے پاس آتے رہے ہیں، جیسے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ شروع شروع میں تھے لیکن اس کام پر مقرر حضرت جبریل ہیں، جیسے حضرت میکائیل روئیدگی اور بارش وغیرہ، اور جیسے حضرت اسرافیل صُور پھونکنے پر۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رات کو جب جاگتے تب یہ دعا پڑھتے اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَائِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِکَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ اِھْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ اِنَّکَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ اے اللہ اے جبریل ومیکائیل واسرافیل کے رب، اے زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے چھپے کھلے کے جاننے والے اپنے بندوں کے اختلاف کا فیصلہ تو ہی کرتا ہے، خدایا اختلافی امور میں اپنے حکم سے حق کی طرف میری رہبری کر، تو جسے چاہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

حضرت عبد العزیز بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں فرشتوں میں حضرت جبریل کا نام خادم اللہ ہے، ابو سلیمان دارانی یہ سُنکر بہت ہی خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ ایک روایت میری روایتوں کے ایک دفتر سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ جبریل ومیکائیل کے لفظ میں بہت ساری لغت اور مختلف قرأت ہیں، جنکے بیان کی مناسب جگہ کتب لغت ہیں۔

آیت کے خاتمہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ بھی اُن لوگوں کا دشمن ہے، بلکہ فرمایا اللہ کافروں کا دشمن ہے، اس میں ایسے لوگوں کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔ ایسے عربی میں مضمر کی جگہ مُظہر کہتے ہیں، اور کلامِ عرب میں اکثر اسکی مثالیں شعروں میں پائی جاتی ہیں، گویا یوں کہا جاتا ہے کہ جس نے اللہ کے دوست سے دشمنی کی، اُس نے اللہ سے دشمنی کی، اور جو اللہ کا دشمن اللہ بھی اُسکا دشمن، اور جسکا دشمن خود خدا ہو جائے، تو اُسکے کفر وبربادی میں کیا شبہ رہ گیا؟ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے دوستوں سے دشمنی رکھنے والے کو میں اعلانِ جنگ دیتا ہوں۔ اور حدیث میں ہے میں اپنے دوستوں کا بدلہ لے لیا کرتا ہوں۔ اور حدیث میں جسکا دشمن میں ہو جاؤں وہ برباد ہو کر ہی رہتا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَکْفُرُ بِھَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝

اور بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اُتاریں اور اُنکے منکر نہ ہونگے مگر فاسق لوگ

یہ آیت ابنِ صوریا یہودی کے بارے میں نازل ہوئی، جس نے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہ لائے جسے ہم پہچانتے اور نہ آپ پر کوئی واضح آیت نازل ہوئی جسکا ہم اتباع کرتے۔ (خزائن العرفان) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیشک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اُتاریں، اب ان آیتوں کے وہی منکر ہیں جو فاسق اور بد اعمال ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمنے تو ایسی ایسی نشانیاں نازل فرمائی ہیں جو آپ کی نبوّت کی صریح دلیل ہیں، یہودیوں کی مخصوص معلومات کا ذخیرہ، انکی کتابوں کی پوشیدہ باتیں، انکی تحریف وتبدیلِ احکام وغیرہ سب ہم نے اپنی معجز نما کتاب قرآن کریم میں واضح طور پر بیان فرما دیئے ہیں جنھیں سُنکر ہر زندہ ضمیر آپ کی تصدیق کی طرف مجبور ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ یہودیوں کو انکا اپنا بغض وحسد انھیں رد کر دے، ورنہ ہر شخص جان سکتا ہے کہ ایک اُمّی شخص سے ایسا پاکیزہ، خوبیوں والا اور حکمتوں سے لبریز کلام بن نہیں سکتا۔ اسکے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ یہودیوں کا بغض وحسد اور اُن کی عہد شکنی کا بیان فرماتا ہے۔

اَوَکُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا نَّبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ ط بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں اُن میں کا ایک فریق اُسے پھینک دیتا ہے۔ بلکہ اُن میں بہتیروں کو ایمان نہیں۔

یہ آیتِ کریمہ مالک بن سیف یہودی کے جواب میں نازل ہوئی، جب حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہود کو اللہ تعالیٰ کے وہ عہد یاد دلائے جو حضور پر ایمان لانے کے متعلق کیے تھے، تو ابنِ سیف نے عہد ہی کا انکار کر دیا۔ (خزائن العرفان)۔ چونکہ یہودیوں نے اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اُسکے رسولوں نے ہم سے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور اُنکی نصرت ومدد کرنے کی بابت کوئی عہد لیا گیا ہو، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو اِن لوگوں کی عادت ہی ہے کہ عہد کیا اور توڑا، بلکہ اِن میں کے اکثر لوگ ایمان سے ہی بالکل خالی ہیں۔

نَبَذَ کے معنی پھینکدینا ہے، چونکہ ان لوگوں نے کتاب اللہ اور اُسکے عہد ومیثاق کو اسطرح چھوڑ رکھا تھا کہ گویا پھینکدیا تھا، اسلیے انکی مذمت میں یہی لفظ لایا گیا۔ دوسری جگہ صاف بیان ہے کہ انکی کتابوں میں حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکرِ مبارک موجود تھا، فرمایا یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ یعنی یہ لوگ اپنی کتاب توریت وانجیل میں حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکرِ مبارک لکھا ہوا پاتے ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا

اور جب اُنکے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول اُنکی کتابوں کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں سے ایک گروہ نے

الْکِتٰبَ ۙ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

اللہ کی کتاب اپنے پیٹھ کے پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے

مطلب یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منصبِ رسالت کے ساتھ تبلیغِ احکامِ الٰہی اور رُشد و ہدایت کی راہیں بتلانے کیلئے تشریف لائے، باوجودیکہ آپ توریت و زبور وغیرہ کی تصدیق فرماتے تھے، اور خود ان کتابوں میں بھی حضور کی تشریف آوری کی بشارت اور آپ کے اوصاف و احوال کا بیان تھا، اسلیے حضور کی تشریف آوری اور آپ کا وجودِ مبارک ہی ان کتابوں کی تصدیق ہے، تو حال اس کا مقتضی تھا کہ حضور کی آمد پر اہلِ کتاب کا ایمان اپنی کتابوں کے ساتھ اور زیادہ پختہ ہوتا، مگر اسکے برعکس انھوں نے کفر کیا۔ تو ان کتاب والوں کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنی پیٹھ پیچھے پھینکدی۔ سُدّی کا قول ہے کہ جب حضور کی تشریف آوری ہوئی، تو یہود نے توریت سے مقابلہ کرکے توریت و قرآن کو مطابق پایا، تو توریت کو بھی چھوڑ دیا، اور اس قرآنِ کریم کے ساتھ بھی بے التفاتی کی۔ سفیان ابن عیینہ کا قول ہے کہ یہود نے توریت کو حریر و دیباکے ریشمی غلافوں میں زر وسیم کے ساتھ مطلّا و مزیّن کرکے رکھ لیا، اور اُسکے احکام کو نہ مانا۔ اب ان کا یہ عالم ہے کہ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے، کیونکہ اُنھوں نے اپنے بغض و حسد اور عداوت کی بناء پر کتابِ الٰہی کو پس پُشت ڈال رکھا ہے، اُسکے احکام و اوامر پر عمل شاق اور گراں گزرتا ہے، ہدایت ملے تو کیسے ملے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے چار فرقے تھے، ایک توریت پر ایمان لایا، اور اُس نے اُسکے حقوق کو بھی ادا کیا، یہ مومنین اہلِ کتاب ہیں، انکی تعداد تھوڑی ہے اور اَکْثَرُھُمْ سے ان کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرا فرقہ جس نے بالاعلان توریت کے عہد توڑے، اُسکی حدود سے باہر ہوئے، سرکشی کی نَبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ میں انکا بیان ہے۔ تیسرا فرقہ وہ ہے جس نے عہد شکنی کا اعلان تو نہ کیا، لیکن اپنی جہالت سے عہد شکنی کرتے رہے، ان کا ذکر بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ میں ہے۔ چوتھے فرقہ نے ظاہری طور پر تو عہد مانے اور باطن میں بغاوت و عناد سے مخالفت کرتے رہے، یہ تصنع سے جاہل بنتے تھے کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ میں ان پر دلالت ہے۔ (خزائن العرفان)

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ ج وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا

اور اُسکے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنتِ سلیمان کے زمانہ میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے

یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ق وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ط وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ

لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں اور وہ (جادو) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے

حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ط فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ط وَمَا

جبتک یوں نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو۔ تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اُس کی عورت میں اور

ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ ط وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ

اُس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو اُنھیں نقصان دیگا نفع نہ دے گا اور بیشک ضرور اُنھیں معلوم ہے

اشْتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ قف وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِہٖٓ اَنْفُسَھُمْ ط لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ○ وَلَوْ

کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اُس کا کچھ حصہ نہیں اور بیشک کیا بُری چیز ہے وہ جسکے بدلے اُنھوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح اُنھیں علم ہوتا اور اگر

اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَۃٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ ط لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ○ ع ۱۲

وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح اُنھیں علم ہوتا۔

شانِ نزول:۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل جادو سیکھنے میں مشغول ہوئے، تو آپ نے اُنکو اس سے روکا، اور اُن کی کتابیں لیکر اپنی کُرسی کے نیچے دفن کر دیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد شیاطین نے وہ کتابیں نکلوا کر لوگوں سے کہا کہ سلیمان علیہ السلام اسی کے زور سے سلطنت کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے صلحاء و علماء نے تو اسکا انکار کیا، لیکن اُنکے جُہّال جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم بتا کر اُسکے سیکھنے پر ٹوٹ پڑے، انبیاء کی کتابیں چھوڑ دیں، اور حضرت سلیمان علیہ السلام پر ملامت شروع کی، سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ تک اسی حال پر رہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت میں یہ آیت نازل فرمائی وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ (اور سلیمان نے کفر نہ کیا) کیونکہ وہ نبی ہیں، اور انبیاء کفر سے قطعاً معصوم ہوتے ہیں، انکی طرف سحر (جادو) کی نسبت باطل و غلط ہے، کیونکہ سحر کا کفریات سے خارج ہونا نادر ہے۔ (خزائن العرفان) وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا (ہاں شیطان کافر ہوئے) جنھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادوگری کی جھوٹی تہمت لگائی۔ یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ق (شیطان ہی لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں) وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ط وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ط (اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُترا، اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے جبتک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو) یعنی جادو سیکھ کر، اور اُس پر عمل و اعتقاد کرکے، اور اُسکو مباح جان کر کافر نہ بن، یہ جادو فرمانبردار و نافرمان کے درمیان امتیاز اور آزمائش کے لیے نازل ہوا، جو اسکو سیکھ کر اس پر عمل کرے کافر ہو جائیگا، بشرطیکہ اُس جادو میں منافیِ ایمان کلمات و افعال ہوں، اور جو اس سے بچے نہ سیکھے، یا سیکھے اور اُس پر عمل نہ کرے، اور اُسکے کفریات کا معتقد نہ ہو، وہ مومن رہیگا۔ یہی امام منصور ماتریدی کا قول ہے۔ مسئلہ جو سحر کفر ہے، اُسکا عامل اگر مرد ہو، قتل کر دیا جائے گا۔ مسئلہ جو سحر کفر نہیں، مگر اُس سے جانیں ہلاک کیجاتی ہیں، اُسکا عامل قطّاعِ طریق (راہ زن) کے حکم میں ہے، مرد ہو یا عورت۔ مسئلہ جادوگر کی توبہ قبول ہے۔ (مدارک۔ خزائن العرفان)

حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی، جب آپ بیت الخلاء جاتے تو اپنی بیوی حضرت جرادہ کو دے جاتے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا وقت آیا، اُسوقت ایک شیطان جن، آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی جو دیدی گئی، اُس نے پہن لی اور تختِ سلیمانی پر بیٹھ گیا، تمامِ جنّات وغیرہ حاضرِ خدمت ہو گئے، حکومت کرنے لگا۔ اِدھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی، تو جواب ملا تُو جھوٹا ہے، انگوٹھی تو حضرت سلیمان لے گئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ اِن دنوں میں شیاطین نے جادو کی اور نجوم کی اور کہانت کی اور شعر و اشعار کی اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرتِ سلیمان علیہ السلام کی کُرسی کے نیچے دفن کرنی شروع کر دیں۔ آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہو گیا، آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے اور جن و انس، وحوش و طیور پر حکومت فرمائی

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب عمرِ طبعی کو پہنچکر رحلت فرمائی، تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خزانہ اور وہ کتابیں جنکے ذریعہ سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے، اُن کی کرسی کے نیچے مدفون ہیں۔ چونکہ جنات اُس کرسی کے پاس نہیں جاسکتے تھے، اسلیے انسانوں نے اُسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں۔ بس اُن کا چرچا ہوگیا، اور ہر شخص کہنے لگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز یہی تھا، بلکہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت سے بھی انکاری ہوگئے، اور (معاذ اللہ) آپ کو جادوگر کہنے لگے۔ حضورِ اکرم سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس بات کی عقدہ کشائی فرمائی، اور فرمانِ باری عزوجل نازل ہُوا کہ جادوگری کا یہ کفر تو شیاطین کا پھیلایا ہُوا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے بری الذمہ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک شخص آیا، آپ نے دریافت فرمایا کہاں سے آئے ہو؟ اُس نے کہا عراق سے فرمایا عراق کے کس شہر سے؟ اُس نے کہا کوفہ سے۔ پوچھا وہاں کیا خبریں ہیں؟ اُس نے کہا وہاں یہ باتیں ہورہی ہیں کہ حضرتِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انتقال نہیں فرماگئے، بلکہ زندہ روپوش ہوگئے ہیں، اور عنقریب تشریف لانے والے ہیں۔ آپ کانپ اٹھے اور فرمانے لگے، اگر ایسا ہوتا تو ہم اُنکی میراث تقسیم نہ کرتے، اور اُنکی ازواج اپنا دوسرا نکاح نہ کرتیں۔ سنو! شیاطین آسمانی باتیں چرالایا کرتے تھے، اور اُن میں اپنی باتیں ملاکر لوگوں میں پھیلایا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ تمام کتابیں جمع کرکے اپنی کرسی کے نیچے دفن کردیں۔ آپ کی رحلت کے بعد جنات نے وہ پھر نکال لیں، وہی کتابیں عراقیوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور انہی کتابوں کی باتیں وہ بیان کرتے اور پھیلاتے رہتے ہیں، اسی کا ذکر اس آیت وَاتَّبَعُوْا الآیہ میں ہے۔ اُس زمانہ میں یہ بھی مشہور ہوگیا تھا کہ شیاطین علمِ غیب جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُن کتابوں کو صندوق میں بھرکر دفن کردینے کے بعد یہ حکم جاری کردیا کہ جو اِن کتابوں کا حال بتائیگا، اُسکی گردن ماردی جائے گی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جنات نے اُن کتابوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی رحلت کے بعد آپ کی کرسی کے نیچے دفن کردیا تھا، اور اُنکے شروع صفحہ پر لکھ دیا تھا کہ یہ علمی خزانہ آصف بن برخیا کا جمع کیا ہُوا ہے، جو حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے وزیرِ اعظم، مشیرِ خاص اور دلی دوست تھے۔ یہودیوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی نہ تھے بلکہ جادوگر تھے (معاذ اللہ)۔ اس بناء پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، اور اللہ کے سچے نبی نے ایک سچے نبی کی براءت کی، اور یہودیوں کے اس عقیدہ کا ابطال کیا۔ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام نبیوں کے زُمرہ میں سنکر بہت بدکتے تھے، اسلیے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا بیان کردیا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تمام موذی جانوروں سے عہد لیا تھا، جب اُنہیں وہ عہد یاد کرایا جاتا تھا تو وہ ستاتے نہ تھے۔ پھر لوگوں نے اپنی طرف سے عبارتیں بناکر جادو کی قسم کے تعتر منتر بناکر ان سب کو آپ کی طرف منسوب کردیا، جن کا بطلان اِن آیاتِ کریمہ میں ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصری علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ جادو حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے بھی تھا، اور یہ بالکل سچ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہیں، اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگروں کا ہونا قرآنِ کریم سے ثابت ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہونا بھی قرآنِ کریم سے ظاہر ہے۔ حضرت داؤد اور جالوت کے قصہ میں ہے مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی، بلکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی پہلے حضرت صالح علیہ السلام کو اُنکی قوم نے کہا تھا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ یعنی تم جادو کیے گئے لوگوں میں سے ہو۔ پھر فرماتا ہے وَمَآ اُنْزِلَ الآیہ بعض تو کہتے ہیں یہاں پر مَا نافیہ ہے، یعنی انکار کے معنی میں ہے، اور اسکا عطف مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر ہے۔ یہودیوں کے اِس دوسرے اعتقاد کی کہ جادو فرشتوں پر نازل ہُوا ہے اِس آیت میں تردید ہے۔ ہاروت و ماروت لفظِ شیاطین کا بدل ہے، تثنیہ پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے اِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ میں، یا اسلیے جمع کیا گیا کہ اُن کے ماننے والوں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے، اور اُن کا نام اُنکی زیادہ سرکشی کی وجہ سے کھول دیا گیا ہے۔ قرطبی تو کہتے ہیں کہ یہی ٹھیک مطلب اس آیت کا ہے، اسکے سوا کسی اور معنی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہیے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جادو خدا کا نازل کیا ہُوا نہیں۔ ربیع بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ان پر کوئی جادو نہیں اُترا۔ اس بناء پر آیت کا ترجمہ اسطرح پر ہوگا کہ ان یہودیوں نے اُس چیز کی تابعداری کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، نہ اللہ تعالیٰ نے جادو کو اُن دونوں فرشتوں پر اُتارا ہے (جیسا اے یہودیو تمہارا خیال جبریل و میکائیل کی طرف ہے) بلکہ یہ کفر شیطانوں کا ہے، جو بابل میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے، اور اُنکے سردار جو آدمی تھے جنکا نام ہاروت و ماروت تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ اسے اسطرح پڑھتے تھے وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلِكَيْنِ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ، یعنی داؤد و سلیمان (علیہما السلام) دونوں بادشاہوں پر بھی جادو نہیں اُتارا گیا۔ یا یہ کہ وہ اس سے روکتے تھے کیونکہ یہ کفر ہے۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ نے اسکا زبردست رد کیا ہے، وہ فرماتے ہیں مَا معنی میں اَلَّذِیْ کے ہے اور ہاروت و ماروت دو فرشتے ہیں جنھیں خدا نے زمین کی طرف اُتارا ہے، اور اپنے بندوں کی آزمائش اور امتحان کے لیے اُنھیں جادو کی تعلیم کی اجازت دی ہے، لہٰذا ہاروت و ماروت اس فرمانِ باری کو بجالارہے ہیں۔ ایک غریب قول یہ بھی ہے کہ یہ جنوں کے دو قبیلے ہیں۔ مَلِكَيْنِ یعنی دو بادشاہوں کی قرأت پر اِنْزَال خلق کے معنی میں ہوگا، جیسے فرمایا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ اور فرمایا وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ اور کہا وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا یعنی تمہارے ہم نے آٹھ قسم کے چوپائے پیدا کیے، لوہا بنایا، آسمان سے روزیاں اُتاریں، حدیث میں ہے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ دَآءً الخ یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی بیماریاں پیدا کی ہیں اُن سب کے علاج بھی پیدا کیے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ بھلائی بُرائی کا نازل کرنیوالا اللہ ہے، یہاں سب جگہ اِنْزَال خلق یعنی پیدائش کے معنی میں ہے۔ اِيْجَاء یعنی لانے اور اُتارنے کے معنی میں نہیں، اسی طرح اس آیت میں بھی۔ اکثر سلف کا مذہب یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ مضمون بسط و طول کے ساتھ ہے، جو ابھی بیان ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔ کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ فرشتے تو معصوم ہیں وہ گناہ کرتے ہی نہیں، چہ جائیکہ لوگوں کو جادو سکھائیں جو کفر ہے، اسلیے کہ یہ دونوں بھی عام فرشتوں میں سے خاص ہو جائینگے، جیسا کہ ابلیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ناری ہے اور فرشتوں کے ساتھ تھا۔ حضرتِ علی حضرت ابن مسعود حضرت ابنِ عباس حضرت ابنِ عمر حضرت کعب احبار حضرت سدی حضرت کلبی علیہم الرحمۃ والرضوان یہی فرماتے ہیں۔ اب اُس حدیث کو سنیے! حضورِ اکرم سیدِ عالم دانائے غیوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اُتارا، اور اُنکی اولاد پھیلی، اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی، تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کسقدر بدلوگ ہیں کیسے نافرمان اور سرکش ہیں۔ ہم اگر انکی جگہ ہوتے تو ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرلو، میں اُن میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں، اور اُنھیں زمین پر بھیجتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ہاروت و ماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن میں انسانی طبیعت پیدا فرمائی، اور اُن سے کہا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں انبیاء کی معرفت اپنے حکم احکام پہنچاتا ہوں، لیکن تم سے بلاواسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، شراب نہ پینا۔ اب یہ دونوں زمین پر آئے، اور زُہرہ کو انکی آزمائش کیلیے حسین و شکیل عورت کی صورت میں انکے پاس بھیجا، جسے دیکھ کر یہ مفتون ہوگئے، اور اُس سے زنا کرنا چاہا، اُس نے کہا اگر تم شرک کرو (تو میں منظور کرتی ہوں)۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہوسکے گا۔ وہ چلی گئی، پھر آئی اور کہنے لگی، اچھا اس بچہ کو قتل کرڈالو تو مجھے تمہاری خواہش کو پورا کرنے میں تامل نہ ہوگا اُنھوں نے اسے بھی نہ مانا۔ وہ پھر آئی اور کہا، اچھا یہ شراب پی لو، اُنھوں نے اِسے ہلکا گناہ تصور کرتے ہوئے شراب پی لی۔ اب نشہ میں مست ہوکر زنا بھی کیا، اور اُس بچہ کو بھی قتل کرڈالا۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو زُہرہ نے کہا، جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے، وہ سب تم نے کرڈالے، یہ نادم ہوئے۔ اُنھیں اختیار دیا گیا کہ یا تو دنیا کے عذاب کو اختیار کرو، یا عذابِ آخرت کو۔ اُنھوں نے دنیا کے عذاب کو پسند کیا۔ صحیح ابن حبان، مسند احمد ابن مردویہ ابن جریر عبدالرزاق میں یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ مسند احمد کی یہ روایت غریب ہے، اس میں ایک راوی موسیٰ ابن جبیر انصاری سلمی حذر کو ابن ابی حاتم نے مستور الحال لکھا ہے۔ ابنِ مردویہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک رات کو اثناءِ سفر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضرت نافع رحمۃ اللہ سے دریافت فرمایا کیا زُہرہ تارا نکلا؟ اُنھوں نے کہا، نہیں۔ دو تین مرتبہ کے سوال کے بعد کہا، اب زُہرہ طلوع ہُوا تو

فرمانے لگے، اسے نہ خوشی ہو نہ بھلائی ملے۔ حضرتِ نافع رحمۃ اللہ نے کہا حضرت! ایک ستارہ جو حکمِ خدا سے طلوع و غروب ہوتا ہے آپ اُسے بُرا کہتے ہیں؟ فرمایا، سنو! میں وہی کہتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے سُنا۔ پھر اسکے بعد مذکورہ بالا حدیث باختلافِ الفاظ سُنائی۔ لیکن یہ بھی غریب ہے، حضرتِ کعب والی روایت مرفوع سے زیادہ صحیح موقوف ہے اور ممکن ہے کہ وہ بنی اسرائیلی روایت ہو، واللہ اعلم۔ صحابہ اور تابعین سے بھی اس قسم کی روایتیں بہت کچھ منقول ہیں۔ بعض میں ہے کہ زُہرہ ایک عورت تھی، اُس نے اِن فرشتوں سے یہ شرط کی تھی کہ تم مجھے وہ دعا سکھادو جسے پڑھ کر تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو، اُنھوں نے سکھادی، یہ پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی، اور وہاں تارے کی شکل میں بنادی گئی۔ بعض مرفوع روایتوں میں بھی یہ ہے لیکن وہ منکر اور غیر صحیح ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو فرشتے صرف ایمان والوں کی بخشش کی دعا مانگتے تھے، لیکن اسکے بعد تمام اہلِ زمین کے لیے دعا شروع کردی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جب اِن دونوں فرشتوں سے یہ نافرمانیاں سرزد ہوئیں، تب اور فرشتوں نے اقرار کرلیا کہ بنی آدم جو اللہ تعالیٰ سے دُور ہیں، اور بے دیکھے ایمان لاتے ہیں، اُن سے ایسی خطاؤں کا سرزد ہوجانا کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں۔ ان دونوں فرشتوں سے کہا گیا کہ اب یا تو دنیا کا عذاب پسند کرلو، یا آخرت کے عذابوں کے لیے تیار ہوجاؤ۔ دونوں نے آپس میں مشورہ کرکے دنیا کے عذاب کو اختیار کیا، کیونکہ یہ فنا ہوجانیوالا ہے اور آخرت کے عذاب دائمی ہیں۔ چنانچہ اُنھیں بابل میں عذاب ہو رہا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اُنھیں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے تھے اُن میں قتل سے اور مالِ حرام سے ممانعت بھی تھی، اور یہ حکم بھی تھا کہ حکم عدل کے ساتھ کریں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ یہ تین فرشتے تھے، لیکن ایک نے آزمائش سے انکار کردیا اور واپس چلا گیا، پھر دو کی آزمائش ہوئی۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، یہاں بابل سے مُراد بابلِ دنباوند ہے، اس عورت کا نام عربی میں زُہرہ تھا، اور بنطی زبان میں اسکا نام بیذخت تھا، اور فارسی میں اناہید تھا۔ یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی۔ جب اُنھوں نے اس سے بُرائی کا ارادہ کیا، تو اس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو جب منظور ہے اُنھوں نے ایسا ہی کیا، پھر اُس نے کہا مجھے یہ بھی بتادو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو، اور کیا پڑھ کر اُترتے ہو؟ اُنھوں نے یہ بھی بتادیا۔ چنانچہ وہ اُسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی، لیکن اُترنے کا وظیفہ بھول گئی، اور وہیں ستارہ کی صورت میں مسخ کردی گئی۔ حضرتِ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جب کبھی زُہرہ ستارہ کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے۔ اب ان فرشتوں نے آسمان پر جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے، سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے۔ حضرتِ مجاہد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ شروع شروع چند روز تک تو یہ فرشتے ثابت قدم رہے، صبح سے شام تک عدل کے ساتھ حکم دیتے رہتے، شام کو آسمان پر چڑھ جاتے، پھر زُہرہ کو دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ زُہرہ ستارہ کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔

الغرض ہاروت و ماروت کا یہ قصہ تابعین میں سے بھی اکثر لوگوں نے بیان کیا ہے، جیسے مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل بن حیان وغیرہ وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، اور متقدمین اور متاخرین مفسروں نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اسے وارد کیا ہے، لیکن اسکا زیادہ تر دارومدار بنی اسرائیل کی کتابوں پر رہا ہے، کوئی صحیح مرفوع متصل حدیث حضور اکرم سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس باب میں ثابت نہیں، اور نہ قرآنِ کریم میں اسقدر بسط و تفصیل ہے۔ پس ہمارا ایمان ہے کہ جسقدر قرآن میں ہے صحیح اور درست ہے اور حقیقتِ حال کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ (قرآنِ کریم کے ظاہری الفاظ مسند احمد ابن حبان، بیہقی وغیرہ کی مرفوع حدیث، حضرتِ علی، حضرتِ ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وغیرہ کی موقوف روایات تابعین وغیرہ کی تفاسیر وغیرہ مل ملاکر اس واقعہ کی بہت کچھ تقویت ہوجاتی ہے۔ نہ اس میں کوئی محالِ عقلی ہے، نہ اس میں کسی اصولِ اسلامی کا خلاف ہے۔ پھر ظاہر سے ہٹا کر بیجا تکلفات اٹھانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہجاتی واللہ اعلم)۔ (فتح البیان)

ابن جریر میں ایک غریب اثر اور عجیب واقعہ ہے اُسے بھی سُنیئے۔ حضرتِ اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ دومۃ الجندل کی ایک عورت حضور کے پردہ فرمانے کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد آپ کی تلاش میں آئی، اور آپ کے پردہ فرمانے کی خبر سُنکر بیچین ہوکر رونے پیٹنے لگی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس بیقراری کا آخر سبب کیا ہے؟ تو اُس نے کہا کہ مجھ میں اور میرے شوہر میں ہمیشہ ناچاقی رہا کرتی تھی، ایک مرتبہ وہ مجھے چھوڑ کر لاپتہ کہیں چلا گیا، ایک بڑھیا سے میں نے یہ سب ذکر کیا، اُس نے کہا جو میں کہوں وہ کر، وہ خود بخود تیرے پاس چلا آئیگا۔ میں تیار ہوگئی، وہ رات کے وقت دو کتے لیکر میرے پاس آئی، ایک پر وہ خود سوار ہوئی، دوسرے پر میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونو بابل پہنچ گئیں۔ میں نے دیکھا دو شخص ادھر لٹکے ہوئے ہیں اور لوہے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُس عورت نے مجھ سے کہا انکے پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں جادو سیکھنے آئی ہوں۔ میں نے اُن سے کہا، اُنھوں نے کہا، سُن! ہم تو آزمائش میں ہیں، تو جادو نہ سیکھ اسکا سیکھنا کفر ہے۔ میں نے کہا میں تو سیکھوں گی، اُنھوں نے کہا، اچھا پھر جا اور اُس تنور میں پیشاب کرکے چلی آ۔ میں گئی، ارادہ کیا، لیکن کچھ دہشت سی طاری ہوگئی میں واپس چلی آئی، اور کہا میں فارغ ہوآئی۔ اُنھوں نے پوچھا کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں۔ اُنھوں نے کہا، تو غلط کہتی ہے، ابھی تک کچھ نہیں بگڑا، تیرا ایمان سلامت ہے اب بھی لوٹ جا اور کفر نہ کر۔ میں نے کہا مجھے تو جادو سیکھنا ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا، جا اور اُس تنور میں پیشاب کر آ۔ میں پھر گئی، لیکن اب کی مرتبہ بھی ہمت نہ ہوئی، اور واپس چلی آئی۔ پھر اسی طرح سوال و جواب ہوئے۔ میں تیسری مرتبہ پھر تنور کے پاس گئی، اور دل کڑا کرکے پیشاب کرنے کو بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑے سوار مُونھ پر نقاب ڈالے نکلا، اور آسمان پر چڑھ گیا۔ میں واپس چلی آئی، اُن سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے کہا، ہاں اب کی مرتبہ تو سچ کہتی ہے، وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ میں سے نکل گیا اب چلی جا۔ میں آئی اور اُس بڑھیا سے کہا کہ اُنھوں نے تو مجھے کچھ بھی نہیں سکھایا۔ اُس نے کہا بس تجھے سب کچھ آگیا، اب تو جو کہے گی ہوجائے گا۔ میں نے آزمائش کے لیے ایک دانہ گیہوں کا لیا، اُسے زمین پر ڈال کر کہا، اُگ جا۔ وہ فوراً اُگ گیا۔ میں نے کہا، تجھ میں بال پیدا ہوجائے۔ چنانچہ ہوگئی۔ میں نے کہا سوکھ جا۔ وہ بال سوکھ گئی میں نے کہا الگ الگ دانہ دانہ ہوجا۔ وہ بھی ہوگیا۔ پھر میں نے کہا سوکھ جا، تو سوکھ گیا۔ پھر میں نے کہا آٹا بن جا، تو آٹا بن گیا۔ میں نے کہا، روٹی پک جا، تو روٹی پک گئی۔ یہ دیکھتے ہی میرا دل نادم ہونے لگا، اور مجھے اپنے بے ایمان ہونے کا صدمہ ہونے لگا۔ اے اُم المومنین! خدا کی قسم نہ میں نے اُس جادو سے کوئی کام لیا، اور نہ کسی پر کیا۔ میں یونہی روتی پیٹتی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ حضور سے عرض کروں، لیکن افسوس بدقسمتی سے آپ کو بھی نہ پایا! اب میں کیا کروں؟ اتنا کہہ کر پھر اُس نے آہ و بکا اور بَین شروع کی، اور اسقدر روئی کہ ہر ایک کو اُس پر ترس آنے لگا، صحابہ کرام بھی متحیر تھے کہ اسے کیا فتویٰ دیں۔ آخر بعض صحابہ نے کہا کہ اب سوائے اسکے اور کیا ہوسکتا ہے کہ تم اس فعل کو نہ کرو، توبہ و استغفار کرو، اور اپنے ماں باپ کی خدمت و اطاعت کرتی رہو۔ یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرتے تھے کہ چھوٹی سی بات بتانے میں بھی تامل ہوتا تھا۔ آج ہم بڑی سے بڑی بات بھی اٹکل اور قیاس و رائے سے گھڑ گھڑا کر بتانے میں بالکل نہیں رُکتے، اس کی اسناد بالکل صحیح ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ عین چیز جادو کے زور سے پلٹ جاتی ہے، اور بعض کہتے ہیں نہیں صرف دیکھنے والے کو ایسا خیال پڑتا ہے، اصل چیز جیسی ہوتی ہے ویسی ہی رہتی ہے، جیسے کہ قرآنِ کریم میں ہے سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ الآیہ یعنی اُنھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کردیا۔ اور فرمایا یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰی ○ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف خیال ڈالا جاتا تھا کہ گویا وہ سانپ وغیرہ انکے جادو کے زور سے چل پھر رہے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں لفظِ بابل سے مراد بابلِ عراق ہے، بابلِ دنباوند نہیں۔

ابنِ ابی حاتم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرتِ علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بابل کی زمین پر جارہے تھے، عصر کی نماز کا وقت آگیا، لیکن آپ نے وہاں نماز ادا نہ فرمائی، بلکہ اُس زمین کی سرحد سے نکل جانے کے بعد نماز پڑھی۔ اور فرمایا میرے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے روک دیا ہے، اور بابل کی زمین پر بھی نماز پڑھنے سے ممانعت فرمائی ہے، یہ زمین ملعون ہے۔ ابوداؤد میں بھی یہ حدیث مروی ہے، اور امام ابوداؤد نے اس پر کوئی کلام نہیں کیا، اور جس حدیث کو حضرتِ امام ابوداؤد اپنی کتاب میں لائیں

اور اسکی سند پر خاموشی اختیار کریں تو وہ حدیث امام ابوداؤد کے نزدیک حسن ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بابل کی سرزمین پر نماز مکروہ ہے، جیسے کہ ثمودیوں کی سرزمین کی بابت حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں کی منزلوں میں نہ جاؤ، اگر اتفاقاً جانا پڑے تو خوفِ خدا سے روتے ہوئے جاؤ۔

ہیئت دان لوگوں کا قول ہے کہ بابل کی دوری بحرِ غربی اوقیانوس سے ستّر درجہ لمبی اور وسطِ زمین سے جنوب کی جانب بخطِ استواء تینتیس ۳۳ درجہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کو خیر و شر، کفر و ایمان کا علم عطا فرمایا ہے، اسلیے ہر ایک کفر کی طرف جھکنے والے کو نصیحت کرتے ہیں اور ہر طرح سے روکتے ہیں، جب نہیں مانتا، تو وہ اُسے کہہ دیتے ہیں، اُسکا نورِ ایمان جاتا رہتا ہے، ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور جادو آجاتا ہے، شیطان اُسکا رفیق کار بنجاتا ہے۔ ایمان کے نکل جانے کے بعد غضب خدا اُسکے رونگٹے رونگٹے میں گھس جاتا ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ سوائے کافر کے اور کوئی جادو سیکھنے کی جُرأت نہیں کرتا۔

فتنہ کے معنی یہاں پر بلا، و آزمائش اور امتحان کے ہیں۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا قول قرآن کریم مذکور ہے اِنْ ھِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جادو سیکھنا کفر ہے۔ حدیث میں بھی ہے، جو شخص کسی کاہن یا جادوگر کے پاس جائے اور اُسکی بات کو سچ سمجھے اُس نے حضورِ اکرم سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل شدہ وحی کے ساتھ کفر کیا۔ (بزار) یہ حدیث صحیح ہے اور اسکی تائید میں اور حدیثیں بھی آئی ہیں۔ پھر فرمایا کہ لوگ ہاروت و ماروت سے جادو سیکھتے ہیں جس سے بُرے کام کرتے ہیں، عورت مرد کی محبت اور موافقت کو بغض اور مخالفت سے بدل دیتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ شیطان اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے، پھر اپنے لشکروں کو بہکانے کے لیے بھیجتا ہے، سب سے زیادہ مرتبہ والا اُسکے نزدیک وہ ہے، جو فتنہ میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ جب یہ واپس آتے ہیں تو اپنے بدترین کاموں کی روداد سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں کو اسطرح بے راہ کر دیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شخص سے یہ گناہ کرایا۔ شیطان اُن سے کہتا ہے، یہ کچھ نہیں معمولی کام ہے، یہانتک کہ ایک آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کے اور اُسکی بیوی کے درمیان جھگڑا ڈالدیا یہاں تک کہ جدائی ہو گئی، شیطان اُسے گلے لگالیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے بڑا کام کیا، اسے پاس بٹھا لیتا ہے اور اُسکا مرتبہ بڑھا دیتا ہے۔ پس جادوگر بھی اپنے جادو سے وہ کام کرتا ہے جس سے میاں بیوی میں جدائی ہو جائے، مثلاً اُس کی شکل و صورت اُسے بُری معلوم ہونے لگے یا اُس کی عادات و اطوار سے جو غیر شرعی نہ ہوں یہ نفرت کرنے لگے، یا دل میں عداوت آجائے وغیرہ وغیرہ، رفتہ رفتہ یہ باتیں بڑھتی جائیں اور آپس میں مفارقت ہو جائے۔

مَرْءٌ کہتے ہیں اس کا مذکر، مؤنث اور تثنیہ تو ہے جمع نہیں بنتا۔ پھر فرمایا یہ کسی کو بھی بغیر خدا کی مرضی کے ایذا نہیں پہنچا سکتے یعنی انکے اپنے بس کی بات نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر، اور اُسکے ارادہ کے ماتحت یہ نقصان بھی پہنچاتا ہے، اگر خدا نہ چاہے تو اسکا جادو محض بے اثر، اور بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جادو اسی شخص کو نقصان دیتا ہے جو اُسے حاصل کرے اور اس میں داخل ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے، وہ سیکھتے ہیں جو اُنکے لیے سراسر نقصان دِہ ہے جس میں کوئی نفع نہیں، اور یہ یہودی جانتے ہیں کہ رسول کی تابعداری چھوڑ کر جادو کے پیچھے لگنے والوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، نہ انکی کوئی قدر و وقعت عند اللہ ہے، نہ وہ دیندار سمجھے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا اگر یہ اس کام کی بُرائی کو محسوس کرتے، اور ایمان و تقویٰ برتتے، تو یقیناً انکے لیے بہت ہی بہتر تھا، مگر یہ بے علم لوگ ہیں۔ یہی اور جگہ بھی فرمایا کہ اہلِ علم نے کہا تم پر افسوس ہے، اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ثواب ایمانداروں اور نیک اعمال والوں کے لیے بہت ہی بہتر ہے، لیکن اُسے صبر کرنے والے ہی پا سکتے ہیں۔ اس آیت سے بزرگانِ دین نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ جادوگر کافر ہے، کیونکہ آیت میں وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا فرمایا ہے۔ حضرت امام احمد اور سلف کی ایک جماعت بھی جادو سیکھنے والے کو کافر کہتی ہے۔ بعض کافر تو نہیں کہتے، لیکن فرماتے ہیں کہ جادوگر کی حد (سزا) یہ ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔ بجالہ ابن عبید کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک فرمان میں لکھا تھا کہ ہر ایک جادوگر مرد و عورت کو قتل کر دو۔ چنانچہ ہم نے تین جادوگروں کی گردنیں ماریں۔ صحیح بخاری شریف میں ہے کہ اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر آن کی ایک لونڈی نے جادو کیا، جس پر اُسے قتل کیا گیا۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں تین صحابیوں سے جادوگر کے قتل کا فتویٰ ثابت ہے۔ ترمذی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں جادوگر کی حد تلوار سے قتل کر دینا ہے۔ اس حدیث کے ایک راوی اسمٰعیل بن مسلم ضعیف ہیں۔ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ غالباً یہ حدیث موقوف ہے، لیکن طبرانی میں ایک دوسری سند سے بھی یہ حدیث مرفوع مروی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ ولید بن عقبہ کے پاس ایک جادوگر تھا جو اپنے کرتب بادشاہ کو دکھایا کرتا تھا، بظاہر ایک شخص کا سر کاٹ لیتا پھر آواز دیتا تو سر جڑ جاتا اور وہ موجود ہو جاتا۔ مہاجرین صحابہ میں سے ایک بزرگ صحابی نے یہ دیکھا، اور دوسرے دن تلوار باندھے ہوئے آئے۔ جب ساحر نے اپنا کھیل شروع کیا، آپ نے اپنی تلوار سے خود اُسکی گردن اُڑا دی، اور فرمایا لے اب اگر سچا ہے، تو خود جی اُٹھ۔ پھر قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ کر لوگوں کو سُنائی:۔ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ٥ کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟ چونکہ اُن بزرگ صحابی نے ولید کی اجازت اُسکے قتل میں نہیں لی تھی، اسلیے بادشاہ نے ناراض ہو کر اُنھیں پھر چھوڑ دیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان، اور اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حکم اُسوقت ہے جب جادو شرکیہ الفاظ سے ہو۔ معتزلہ جادو کے وجود کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں جادو کوئی چیز نہیں بلکہ بعض لوگ تو بعض دفعہ اتنا بڑھ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ جو جادو کا وجود مانتا ہو، وہ کافر ہے۔ لیکن اہلسنت جادو کے وجود کے قائل ہیں، یہ مانتے ہیں کہ جادوگر اپنے جادو کے کرتب سے ہوا پر اُڑ سکتے ہیں، اور انسان کو بظاہر گدھا، اور گدھے کو بظاہر انسان بناڈالتے ہیں، مگر کلمات اور منتر تنتر کے وقت ان چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ آسمان اور تاروں کو تاثیر پیدا کرنے والا اہلِ سُنّت نہیں مانتے۔ فلسفے اور نجوم والے اور بیدین لوگ تو آسمان اور تاروں کو ہی اثر پیدا کرنے والا جانتے ہیں۔ اہلِ سُنّت کی ایک دلیل تو آیت وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ ہے، اور دوسری دلیل خود حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جادو کیا جانا، اور آپ پر اُسکا اثر ہونا ہے۔ تیسرے اُس عورت کا واقعہ جسے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان فرمایا ہے، جو اُوپر ابھی گذرا ہے، اور بھی بیسیوں ایسے ہی واقعات ہیں۔ رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جادو کا حاصل کرنا بُرا نہیں، محققین کا یہی قول ہے اسلیے کہ وہ بھی ایک علم ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥ یعنی علم والے اور بے علم برابر نہیں ہوتے۔ اور اسلیے بھی کہ یہ معلوم ہوگا تو اس سے معجزے اور جادو میں فرق پوری طرح ہو جائیگا۔ اور معجزہ کا علم واجب ہے اور وہ موقوف ہے جادو کے سیکھنے پر جس سے فرق معلوم ہو، پس جادو کا سیکھنا بھی واجب ہوا۔ رازی کا یہ قول سرتاپا غلط ہے، اگر عقلاً وہ اُسے بُرا نہ بتائیں، تو معتزلہ موجود ہیں جو عقلاً بھی اسکی بُرائی کے قائل ہیں۔ اور اگر شرعاً بُرا نہ بتاتے ہوں، تو قرآن کریم کی یہ آیت شرعی بُرائی بتانے کے لیے کافی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے جو شخص کسی جادوگر یا کاہن کے پاس جائے، وہ کافر ہوا۔ سُنن میں حدیث ہے کہ جس نے گرہ دی، اور اُس میں پھونکا، اُس نے جادو کیا پس رازی کا یہ قول غلط ہے۔ اُن کا یہ کہنا کہ محققین کا یہی قول ہے، یہ بھی ٹھیک نہیں۔ آخر اُن محققین کے ایسے قول کہاں ہیں؟ ائمۂ اسلام میں سے کس نے یہ کہا ہے؟ پھر ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ الآیہ کی آیت کو پیش کرنا بھی نری جُرأت ہے، کیونکہ آیت میں علم سے مُراد دینی علم ہے۔ آیت میں شرعی علم والے علماء کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ پھر اُن کا یہ قول کہ اسی سے معجزہ کا علم حاصل ہوتا ہے، یہ تو بالکل واہی، محض غلط اور فاسد ہے، اسلیے کہ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن پاک ہے، جو باطل سے سراسر محفوظ ہے، لیکن اسکا معجزہ جاننا، جادو جاننے پر موقوف نہیں۔ وہ لوگ جنھیں جادو سے دُور کا بھی تعلق نہیں، وہ بھی اسے معجزہ مان گئے۔ صحابۂ کرام تابعین عظام ائمۂ مسلمین، بلکہ عام مسلمان بھی اسے معجزہ مانتے ہیں، حالانکہ ان تمام میں سے کبھی ایک بھی جادو جاننا تو کیا، جادو کے پاس تک نہیں پھٹکا، نہ سیکھا، نہ سکھایا، نہ کیا، نہ کرایا، بلکہ ان سب کاموں کو کفر کہتے رہے۔ پھر یہ دعویٰ کرنا کہ معجزہ کا جاننا واجب، اور جادو اور معجزہ کا فرق جادو کے جاننے پر موقوف، لہٰذا جادو کا سیکھنا واجب۔ یہ کسقدر مہمل دعویٰ ہے۔ اب جادو کی قسمیں سُنئے جنھیں ابو عبداللہ رازی نے

بیان کیا ہے۔ (۱) ایک جادو تو ستارہ پرست فرقہ کا ہے، وہ سات سیّارہ ستاروں کی نسبت عقیدہ رکھتے ہیں کہ بھلائی بُرائی انہی کے باعث ہوتی ہے، اسلیے انکی طرف خطاب کرکے مقررہ الفاظ پڑھا کرتے ہیں، اور انہی کی پرستش کرتے ہیں، اسی قوم میں حضرتِ ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور انھیں ہدایت فرمائی۔ رازی نے اس فن میں ایک خاص کتاب تصنیف کی ہے جسکا نام اَلسِّرُّ الْمَکْتُوْمُ فِیْ مُخَاطَبَۃِ الشَّمْسِ وَالنُّجُوْمِ وَالسَّاعَۃ رکھا ہے، ملاحظہ ہو ابنِ خلکان وغیرہ۔ بعض تو کہتے ہیں کہ پھر اس سے توبہ کرلی ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ صرف معلوم کرانے کے لیے اور اپنے اس علم کو ظاہر کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی تھی، نہ کہ اُن کا اعتقاد بھی یہی ہو، جو سراسر کفر ہے۔ اس کتاب میں اُن لوگوں کے طور طریقے لکھے ہیں۔ (۲) دوسرا جادو قوی النفس اور قوتِ واہمہ والے لوگوں کا ہے۔ وہم اور خیال کو بڑا اثر ہوتا ہے، دیکھیے اگر ایک تنگ پُل زمین پر رکھدیا جائے، تو اُس پر انسان بآسانی چلا جائیگا، لیکن یہی تنگ پُل اگر کسی دریا پر ہو، تو نہیں گزر سکے گا، اسلیے کہ اُسوقت خیال ہوتا ہے کہ اب گرا اب گرا، تو واہمہ کی کمزوری کے باعث جتنی جگہ پر زمین کے اوپر چل پھر سکتا تھا، اُتنی جگہ پر ایسے ڈر کے وقت نہیں چل سکتا۔ حکیموں اور طبیبوں نے بھی مرعوف شخص کو سُرخ چیزوں کے دیکھنے سے روک دیا ہے، اور مرگی والوں کو زیادہ روشنی والی اور تیز حرکت کرنے والی چیزوں کے دیکھنے سے منع کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ قوتِ واہمہ کا ایک خاص اثر طبیعت پر پڑتا ہے۔ عقلمند لوگوں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ نظر لگتی ہے، صحیح حدیث میں بھی آیا ہے کہ نظر کا لگنا حق ہے، اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت کرنے والی ہوتی، تو نظر ہوتی۔ اب اگر نفس قوی ہے، تو ظاہری سہاروں اور ظاہری کاموں کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر اتنا قوی نہیں، تو پھر اُن آلات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ جسقدر نفس کی قوت بڑھتی جائیگی وہ روحانیت میں ترقی کرتا جائیگا، اور تاثیر میں بڑھتا جائیگا، اور جسقدر یہ قوت کم ہوتی جائیگی، اُسی قدر یہ گھٹتا جائیگا۔ یہ بات کبھی غذا کی کمی، لوگوں کے میل جول کے ترک وغیرہ سے بھی حاصل ہو جاتی ہے کبھی تو اُسے حاصل کرکے انسان نیکی کے کام شریعت کے مطابق اس سے لیتا ہے، اس حال کو شریعت کی اصطلاح میں کرامت کہتے ہیں جادو نہیں کہتے۔ اور کبھی اس حال سے باطل میں اور خلافِ شرع کاموں میں مدد لیتا ہے اور دین سے دُور پڑ جاتا ہے، ایسے لوگوں کے یہ خلافِ عادت کاموں سے کسی کو دھوکا کھاکر اُنھیں ولی نہ سمجھ لینا چاہیئے، کیونکہ شریعت کے خلاف چلنے والا ولی اللہ نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ صحیح حدیثوں میں دجّال کی بابت کیا کچھ آیا ہے؟ وہ کیسے کیسے خلافِ عادت کام کرکے دکھائیگا، لیکن انکی وجہ سے وہ خدا کا ولی نہیں، بلکہ وہ ملعون ومطرود ہے۔ (۳) تیسری قسم کا جادو جنّات وغیرہ زمین والوں کی روحوں سے امداد و اعانت طلب کرنے کا ہے۔ معتزلہ اور فلاسفر اسکے قائل نہیں۔ ان روحوں سے بعض مخصوص الفاظ اور اعمال سے تعلق پیدا کرتے ہیں، اسے سحر بالعزائم اور تسخیر بھی کہتے ہیں۔ (۴) چوتھی قسم خیالات کا بدل دینا، آنکھوں پر اندھیر ڈال دینا اور شعبدہ بازی کرنا ہے، جس سے حقیقت کے خلاف کچھ کا کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ شعبدہ باز پہلے ایک کام شروع کرتا ہے، جب لوگ دلچسپی کے ساتھ اُسطرف نظریں جما دیتے ہیں، اور اُس کی باتوں کی طرف متوجہ ہوکر ہمہ تن اس میں مصروف ہو جاتے ہیں، وہ پھرتی سے ایک دوسرا کام کر ڈالتا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے اور اُسے دیکھ کر وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم کا تھا، اسی لیے قرآنِ کریم میں ہے سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ الآیہ لوگوں کی آنکھوں پر جادو کردیا اور دلوں میں ڈر بٹھا دیا۔ دوسری جگہ ہے یُخَیَّلُ اِلَیْہِ موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں وہ سب لکڑیاں اور رسیاں سانپ بنکر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہ تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (۵) پانچویں قسم بعض چیزوں کی ترکیب دیکر کوئی عجیب کام اُس سے لینا مثلاً گھوڑے کی شکل بنادی اور اُس پر ایک سوار بناکر بٹھا دیا، اُسکے ہاتھ میں ایک بانسری ہے، جہاں ایک ساعت گزری اور اُس بانسری میں سے آواز نکلی۔ حالانکہ کوئی اُسے نہیں چھیڑتا۔ اسی طرح انسانی صورت اِس کاریگری سے بنائی کہ گویا اصلی انسان ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے۔ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم میں سے تھا کہ وہ بنائے ہوئے سانپ وغیرہ زیبق (پارہ) کے باعث زندہ حرکت کرنے والے دکھائی دیتے تھے۔ گھڑی، گھنٹے اور چھوٹی چھوٹی چیزیں جن سے بڑی بڑی وزنی چیزیں کھچ آتی ہیں، سب اسی قسم میں داخل ہیں حقیقت میں اسے جادو ہی نہ کہنا چاہیئے، کیونکہ یہ تو ایک ترکیب اور کاریگری ہے جسکے اسباب بالکل ظاہر ہیں، جو انھیں جانتا ہو وہ ان کلوں سے کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح کا وہ حیلہ بھی ہے کہ جو بیت المقدس کے نصرانی کرتے تھے کہ پوشیدگی سے گرجے کی قندیلیں روشن کردیں اور اُسے گرجے کی کرامت مشہور کردی اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف جھکا لیا۔ بعض کرامیہ صوفیہ کا بھی خیال ہے کہ اگر ترغیب وترہیب کی حدیثیں گھڑلی جائیں اور لوگوں کو عبادت کی طرف مائل کیا جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن یہ بڑی غلطی ہے، حضور اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے، وہ اپنی جگہ جہنم میں مقرر کرلے۔ اور فرمایا میری حدیثیں بیان کرتے رہو، لیکن مجھ پر جھوٹ نہ باندھو، مجھ پر جھوٹ بولنے والا قطعاً جہنمی ہے۔ ایک نصرانی پادری نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک پرند کا چھوٹا سا بچہ جسے اُڑنے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں، ایک گھونسلے میں بیٹھا ہے جب وہ اپنی ضعیف اور پست آواز نکالتا ہے، تو اور پرندے اُسے سُنکر رحم کھاکر زیتون کے پھل لالاکر اُسکے گھونسلے میں رکھ جاتے ہیں۔ اُس پادری نے اسی صورت کا ایک پرندہ کسی چیز کا بنایا، اور نیچے سے اُسے کھوکھلا رکھا، اور ایک سوراخ اُسکی چونچ کی طرف رکھا جس سے ہوا اُس کے اندر گھستی تھی، پھر جب نکلتی تھی، تو اُسی طرح کی آواز اُس سے پیدا ہوتی تھی، اُسے لاکر اپنے گرجے میں ہوا کے رُخ پر رکھ دیا، چھت میں ایک چھوٹا سا سوراخ کردیا، تاکہ ہوا اُس سے جائے۔ اب جب ہوا چلتی، اور اُسکی آواز نکلتی، تو اُس قسم کے پرندے جمع ہو جاتے اور زیتون کے پھل لالاکر رکھ جاتے۔ اُس پادری نے لوگوں میں شہرت دینی شروع کی کہ اس گرجے میں یہ کرامت ہے، یہاں ایک بزرگ کا مزار ہے اور یہ کرامت اُنہی کی ہے، لوگوں نے بھی جب اپنی آنکھ سے یہ اَن ہونی عجیب بات دیکھی تو معتقد ہوگئے اور وہاں نذر و نیاز چڑھانا شروع کردیا، اور یہ کرامت دُور دُور تک مشہور ہوگئی۔ حالانکہ نہ کوئی کرامت تھی نہ معجزہ صرف ایک پوشیدہ فن تھا، جسے اُس ملعون شخص نے پیٹ بھرنے کے لیے پوشیدہ طور پر کر رکھا تھا، اور وہ لعنتی فرقہ اُس پر ریجھا ہوا تھا۔ (۶) چھٹی قسم جادو کی بعض دواؤں کے مخفی خواص معلوم کرکے اُنھیں کام میں لانا، اور یہ ظاہر ہے کہ دواؤں میں عجیب عجیب خاصیتیں ہیں۔ مقناطیس ہی کو دیکھیئے کہ لوہا کسطرح اُسکی طرف کھنچ جاتا ہے۔ اکثر مکّار صوفی، فقیر و درویش انہی حیلہ سازیوں کو کرامت کے طور پر لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اُنھیں اپنا گرویدہ و مرید بناتے پھرتے ہیں۔ (۷) ساتویں قسم انسان کے دل پر ایک خاص قسم کا اثر ڈال کر اُس سے جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے مثلاً اُس سے کہدیا کہ مجھے اسمِ اعظم یاد ہے یا جنّات میرے قبضہ میں ہیں۔ اب اگر مدِمقابل کمزور دل کا اور کچے کانوں کا اور پلپلے عقیدہ والا ہے، تو اسے سچ سمجھ لیگا، اور اُسکی طرف سے ایک قسم کا خوف و ڈر، ہیبت و رعب اُسکے دل پر بیٹھ جائیگا، جو حواس کو ضعیف بنادیگا۔ اب اُسوقت وہ جو چاہیگا کر لیگا، اور اُسکا کمزور دل اُسے عجیب عجیب باتیں دکھاتا جائیگا۔ اسی کو متبلہ کہتے ہیں، اور یہ اکثر کم عقل لوگوں پر ہو جایا کرتا ہے، اور علمِ فراست سے کامل عقل والا، اور کم عقل والا انسان معلوم ہو سکتا ہے، اور اس حرکت کا کرنے والا اپنا یہ فعل قیافہ سے کم عقل شخص معلوم کرکے ہی کرتا ہے۔ (۸) آٹھویں قسم چُغلی کرنا، جھوٹ سچ ملاکر کسی کے دل میں اپنا گھر کرلینا، اور خفیہ چالوں سے اُسے اپنا گرویدہ کرلینا۔ یہ چغلخوری اگر لوگوں کو بھڑکانے، بدکانے، اور اُنکے درمیان عداوت و دشمنی ڈلانے کے لیے ہو، تو شرعاً حرام ہے، جب اصلاح کے طور پر اور آپس میں ایک دوسرے مسلمان کو ملانے کے لیے کوئی ایسی ظاہر بات کہدیجائے جس سے یہ اُس سے اور وہ اِس سے خوش ہو جائے یا کوئی آنے والی مصیبت مسلمانوں پر سے ٹل جائے، یا کفّار کی قوت زائل ہو جائے اُن میں بددلی پھیل جائے اور مخالفت و پھوٹ پڑجائے، تو یہ جائز ہے، جیسے حدیث میں ہے کہ وہ شخص جھوٹا نہیں جو بھلائی کے لیے اِدھر اُدھر لیجاتا ہے، اور جیسے حدیث میں ہے کہ لڑائی مکر کا نام ہے، اور جیسے حضرتِ نعیم بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگِ احزاب کے موقع پر کفّارِ عرب اور کفّارِ یہود کے درمیان کچھ اِدھر اُدھر کی بالائی باتیں کہہ کر جدائی ڈلوادی تھی اور اُنھیں مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ یہ کام بڑے عالی دماغ زیرک اور معاملہ فہم شخص کا ہے۔ یہ یاد رہے کہ امام رازی نے جادو کی جو یہ آٹھ قسمیں کی ہیں یہ صرف باعتبار لفظ کے ہیں، کیونکہ عربی زبان میں سحر یعنی جادو ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو بہت لطیف اور باریک ہو، اور ظاہر بیں انسان کی نگاہوں سے اُسکے اسباب پوشیدہ رہ جائیں۔ اسی واسطے ایک حدیث میں ہے کہ بعض بیان بھی جادو ہوتا ہے۔ اور اسی لیے صبح کے اول وقت کو سحور کہتے ہیں کہ وہ مخفی ہوتا ہے۔ اور اُس رگ کو بھی سحر کہتے ہیں جو غذا کی جگہ ہے، ابوجہل نے بدر والے دن یہی کہا تھا کہ اسکی سحر یعنی رگِ طعام مارے خوف کے پھول گئی۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، میرے سحر و نحر کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واصل حق ہوئے، نحر سے مراد سینہ اور سحر سے مراد رگ غذا قرآن کریم میں بھی ہے سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ یعنی لوگوں کی نگاہوں سے اپنا کام مخفی کر کے انجام دیا۔ ابو عبداللہ قرطبی کہتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ جادو ہے اور مانتے ہیں کہ جب اللہ کو منظور ہوتا ہے تو وہ جادو کے وقت جو چاہتا ہے کر دیتا ہے، گو معتزلہ اور ابو اسحاق اسفرائینی شافعی اسکے قائل نہیں۔ اور جادو کبھی ہاتھ کی چالاکی سے بھی ہوتا ہے، اور کبھی ڈوروں دھاگوں سے بھی، کبھی اللہ کا نام پڑھ کر دم کرنے سے اس میں بھی ایک خاص اثر ہوتا ہے، کبھی شیاطین کا نام لیکر شیطانی کاموں سے بھی لوگ کرتے ہیں، کبھی دواؤں وغیرہ کے ذریعے سے حضور کے اس فرمان کے کہ بعض بیان جادو ہوتے ہیں، دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ بطور تعریف کے آپ نے فرمایا ہو، اور ممکن ہے کہ بطور مذمت کے یہ ارشاد ہوا ہو کہ وہ اپنی غلط بات اسطرح بیان کرتا ہے کہ سچ معلوم ہوتی ہے، جیسے ایک اور حدیث میں ہے کہ کبھی تم میرے پاس مقدمہ لیکر آتے ہو، تو ایک اپنی چرب زبانی سے اپنے غلط دعوے کو صحیح ثابت کر دیتا ہے الخ ۔ وزیر ابو المظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "الاشراف علی مذاہب الاشراف" میں سحر کے باب میں کہا ہے کہ اجماع ہے کہ جادو کی حقیقت ہے، لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کے قائل نہیں۔ جادو کے سیکھنے والے اور اُسے استعمال میں لانے والے کو امام ابو حنیفہ امام مالک امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ تو کافر بتاتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعض شاگردوں کا قول ہے کہ اگر جادو کو بچاؤ کے لیے سیکھے تو کافر نہیں ہوتا، ہاں جو اسکا اعتقاد رکھے اور اُسے نفع دینے والا سمجھے وہ کافر ہے۔ اور اسی طرح جو یہ خیال کرے کہ شیاطین یہ کام کرتے ہیں اور اتنی قدرت رکھتے ہیں، وہ بھی کافر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جادوگر سے دریافت کیا جائے اگر وہ بابل والوں کا سا عقیدہ رکھتا ہو، اور سات سیارہ ستاروں کو تاثیر پیدا کرنے والا جانتا ہو، تب تو کافر ہے، اگر یہ نہ ہو پھر اگر جادو کو جائز جانتا ہو، تو بھی کافر ہے۔ امام مالک اور امام احمد کا قول یہ بھی ہے کہ جب جادوگر نے جادو کیا اور جادو کو استعمال میں لایا وہیں اُسے قتل کر دیا جائے۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ جبتک بار بار نہ کرے یا کسی شخص معین کے بارے میں خود اقرار نہ کرے تب تک قتل نہ کیا جائے۔ تینوں امام فرماتے ہیں کہ اسکا قتل بوجہ حد کے ہے، مگر امام شافعی کا بیان ہے کہ بوجہ قصاص کے ہے۔ امام مالک امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ اور ایک مشہور قول میں امام احمد کا فرمان ہے کہ جادوگر سے توبہ بھی نہ کرائی جائے، اسکی توبہ سے اُس پر سے حد نہیں مٹے گی۔ اور امام شافعی کا قول ہے کہ اُس کی توبہ مقبول ہوگی۔ ایک قول امام احمد رحمۃ اللہ کا بھی ایک روایت میں یہ ہے کہ اہل کتاب کا جادوگر بھی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک قتل کر دیا جائیگا، لیکن تینوں اور اماموں کا مذہب اسکے برخلاف ہے۔ لبید ابن اعصم یہودی نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور آپ نے اُسکے قتل کرنے کو نہیں فرمایا۔ اگر کوئی مسلمان عورت جادوگرنی ہو، تو اُسکے بارے میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اُسے قید کر دیا جائے، اور تینوں امام کہتے ہیں کہ اُسے بھی مرد کی طرح قتل کر دیا جائے واللہ تعالیٰ اعلم۔ حضرت زہری کا قول ہے کہ مسلمان جادوگر قتل کر دیا جائے اور مشرک قتل نہ کیا جائے۔ امام مالک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ذمّی جادوگر کے جادو سے کوئی مر جائے، تو ذمّی کو بھی قتل کر دینا چاہیئے۔ یہ بھی آپ سے مروی ہے کہ پہلے تو اُس سے کہا جائے کہ تو توبہ کر، اگر وہ توبہ کر لے اور اسلام قبول کرے تو خیر، ورنہ قتل کر دیا جائے۔ اور یہ بھی آپ سے مروی ہے کہ اگرچہ اسلام قبول کر لے تاہم قتل کر دیا جائے۔ اُس جادوگر کو جسکے جادو میں شرکیہ الفاظ ہوں چاروں امام وغیرہ کافر کہتے ہیں، کیونکہ قرآن کریم میں ہے فَلَا تَکْفُرْ۔ امام مالک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اُس پر غلبہ پالیا جائے پھر وہ توبہ کرے، تو توبہ قبول نہیں، جیسے زندیق۔ ہاں اس سے پہلے اگر توبہ کر لے تو قبول ہوگی، اگر اسکے جادو سے کوئی مر گیا، پھر تو بہر صورت قتل کیا جائیگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ کہے میں نے مار ڈالنے کے لیے اس پر جادو نہیں کیا تھا، تو قتل خطا کی دیت (جرمانہ) لے لیا جائے۔

جادوگر سے اُسکے جادو کو اُتروانے کی حضرت سعید بن مسیب علیہ الرحمۃ والرضوان نے اجازت دی ہے، جیسے صحیح بخاری شریف میں ہے۔ عامر شعبی بھی اس میں کوئی حرج نہیں بتلاتے، لیکن خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسے مکروہ بتاتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا تھا کہ آپ کیوں جادو کھلواتے نہیں؟ تو آپ نے فرمایا مجھے تو میرے رب تبارک وتعالیٰ نے شفاء دیدی اور میں لوگوں پر بُرائی کھلوانے سے ڈرتا ہوں۔

عمل:۔ حضرت وہب فرماتے ہیں کہ بیری کے سات پتے لیکر سل بٹے پر کوٹ لیے جائیں اور پانی ملا لیا جائے پھر آیۃ الکرسی پڑھ کر اُس پر دم کر دی جائے، اور جس پر جادو کیا گیا ہے اُسے اس پانی میں سے تین گھونٹ پلا دیا جائے اور باقی پانی سے غسل کرا دیا جائے انشاء اللہ تعالیٰ جادو کا اثر جاتا رہے گا، یہ عمل خصوصیت سے اُس شخص کیلیے بہت ہی مفید ہے جو اپنی بیوی سے روک دیا ہو۔ **دیگر:**۔ جادو کو دور کرنے اور اُس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے سب سے اعلیٰ چیز قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ کی سورتیں ہیں حدیث شریف میں ہے کہ ان جیسا کوئی تعویذ نہیں۔ اسی طرح آیت الکرسی بھی شیطان کو دفع کرنے میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

اے ایمان والو راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شانِ نزول:۔ جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کو کچھ تعلیم و تلقین فرماتے، تو وہ کبھی کبھی درمیان میں عرض کرتے رَاعِنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔ اسکے معنی تھے یارسول اللہ ہمارے حال کی رعایت فرمائیے، یعنی کلامِ اقدس کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیجیئے۔ یہود کی لغت میں یہ کلمہ سوءِ ادب کے معنی رکھتا تھا، انھوں نے اس نیت سے کہنا شروع کیا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہود کی اصطلاح سے واقف تھے، آپ نے ایک روز یہ کلمہ انکی زبان سے سنکر فرمایا، اے دشمنانِ خدا تم پر اللہ کی لعنت، اگر میں نے اب کسی کی زبان سے یہ کلمہ سنا، تو اُس کی گردن مار دونگا۔ یہود نے کہا ہم پر تو آپ برہم ہوتے ہیں، مسلمان بھی تو یہی کہتے ہیں۔ اِس پر آپ رنجیدہ ہو کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے ہی تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی، جس میں رَاعِنَا کہنے کی ممانعت فرما دی گئی، اور اس معنی کا دوسرا لفظ اُنْظُرْنَا کہنے کا حکم ہُوا۔ **مسئلہ** اس سے معلوم ہُوا کہ انبیاء علیہم السلام کی تعظیم و توقیر اور اُنکی جناب میں کلماتِ ادب عرض کرنا فرض ہے، اور جس کلمہ میں ترکِ ادب کا شائبہ بھی ہو، وہ زبان پر لانا ممنوع ہے۔ (خزائن العرفان) وَاسْمَعُوْا (اور پہلے ہی سے بغور سنو) سے حکم دیدیا کہ تم ہمہ تن گوش ہو جاؤ، تاکہ یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے کہ "حضور توجہ فرمائیں" کیونکہ دربارِ نبوت کا یہی ادب ہے۔ **مسئلہ** دربارِ انبیاء علیہم السلام میں آدمی کو ادب کے اعلیٰ مراتب کا لحاظ لازم ہے۔ (خزائن العرفان) اور وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (اور کافروں کیلیے دردناک عذاب ہے) میں اشارہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جناب میں بے ادبی کفر ہے۔ (خزائن العرفان)

خلاصہ مطلب آیۂ کریمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو کافروں کی بول چال، اور اُن کے کاموں کی مشابہت سے روک رہا ہے۔ یہودی بعض الفاظ زبان دبا کر بولتے تھے اور مطلب بُرا لیتے تھے، جب انھیں یہ کہنا ہوتا کہ ہماری سُنئے، تو کہتے تھے رَاعِنَا اور مُراد اس سے رعونت اور سرکشی لیتے تھے، جیسے اور جگہ بیان ہے مِنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا الایۃ یعنی یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو باتوں کو اصلیت سے ہٹا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں ہم سُنتے ہیں، لیکن مانتے نہیں، اپنی زبانوں کو موڑ توڑ کر دین میں طعنہ زنی کیلیے رَاعِنَا کہتے ہیں، اگر یہ کہتے کہ ہم نے سُنا اور مانا ہماری بات سُنئے اور ہماری طرف توجہ کیجیے، تو یہ اُنکے لیے بہتر اور مناسب ہوتا، لیکن اُنکے کفر کی وجہ سے خدا نے انھیں اپنی رحمت سے دور ڈالدیا ہے، ان میں ایمان بہت ہی کم ہے۔ حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب یہ لوگ سلام کرتے ہیں، تو اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ کہتے ہیں، اور سام کے معنی موت کے ہیں، تو تم انکے جواب میں وَعَلَیْکُمْ کہا کرو۔ ہماری دعا اُنکے حق میں قبول ہوگی، اور اُن کی بددعا ہمارے حق میں قبول نہیں ہوگی۔ الغرض قول و فعل میں اُن سے مشابہت کرنا منع ہے یہ مسند احمد کی حدیث میں ہے،

میں قیامت کے قریب تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں، میری روزی حق تعالیٰ نے میرے نیزے کے نیچے رکھی ہے، ذلّت اور پستی اُسکے لیے ہے جو میرے احکام کا خلاف کرے، اور جو شخص کسی (غیر مسلم) قوم سے مشابہت کرے وہ اُنہی میں سے ہے۔" ابوداؤد میں بھی یہ پچھلا حصہ مروی ہے۔ اس آیت اور حدیث سے ثابت ہُوا کہ کفّار کے اقوال و افعال، لباس، عید اور عبادت میں اُن کی مشابہت کرنا، جو ہمارے لیے مشروع اور مقرر نہیں سخت منع ہے، اور اس پر شریعت میں عذاب کی دھمکی، اور سخت ڈراوا، اور حُرمت ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم قرآنِ کریم میں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سُنو، تو کان لگا دو، اور دل سے متوجہ ہو جایا کرو، یا تو کسی بُرائی سے ممانعت ہوگی یا نیکی کی طرف رغبت۔ حضرت خیثمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ توریت میں بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یٰاَیُّهَا الْمَسَاکِیْنَ فرمایا ہے، لیکن اُمّتِ محمدی کو یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے معزز خطاب سے یاد فرمایا ہے۔ رَاعِنَا کے معنی ہماری طرف کان لگانے کے ہیں جیسے عَاطِنَا۔ حضرتِ مجاہد فرماتے ہیں کہ اسکے معنی خلاف کے ہیں، یعنی خلاف نہ کہا کرو۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری سُنئے اور ہم آپ کی۔ انصار نے بھی یہی لفظ حضور کے سامنے بولنا شروع کر دیا تھا، جس سے قرآنِ پاک نے انھیں روک دیا۔ حضرتِ حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں رَاعِنٌ کہتے ہیں مذاق کی بات کو، یعنی تم حضور کی باتوں اور اسلام سے مذاق نہ کیا کرو۔ ابوصخر کہتے ہیں کہ جب حضور تشریف لیجانے لگتے، تو جنھیں کوئی بات کہنی ہوتی، تو وہ کہتے اپنا کان اِدھر کیجیے، اللہ تعالیٰ نے اس بے ادبی کے کلمہ سے روک دیا، اور اپنے محبوب نبی کی عزت کرنی تعلیم فرمائی۔ سدّی کہتے ہیں کہ رفاعہ بن یزید یہودی حضور سے باتیں کرتے ہوئے یہ لفظ کہا کرتا تھا، مسلمانوں نے بھی یہ خیال کر کے یہ لفظ ادب کا ہے یہی بولنا شروع کر دیا، جس پر انھیں روک دیا گیا، جیسے سورۃ النساء میں بھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کلمہ کو خدا نے بُرا جانا اور اس کے استعمال سے مسلمانوں کو روک دیا۔ (تفسیر ابنِ کثیر)

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝

وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اُترے تمہارے رب کے پاس سے اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

شانِ نزول:۔ یہود کی ایک جماعت مسلمانوں سے دوستی و خیرخواہی کا اظہار کرتی تھی، اُن کی تکذیب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ کفار خیرخواہی کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ (وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی اُترے تمہارے رب کے پاس سے) یعنی کفار اہلِ کتاب اور مشرکین (مکّہ وغیرہ) دونوں مسلمانوں سے بغض و حسد رکھتے ہیں، اور اس رنج میں ہیں کہ انکے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبوت و وحی عطا ہوئی، اور مسلمانوں کو یہ نعمتِ عظمیٰ ملی۔ (خازن وغیرہ) کیونکہ یہ کفار اسکی تو طاقت و قدرت نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے جو تم پر رحمت و فضل ہُوا ہے اُسے وہ روک سکیں، اور حق تعالیٰ کو اس افضال سے منع کر سکیں، مجبوراً لاچاری میں قصد کرتے ہیں کہ وہ تمہاری بے لیاقتی کو لوگوں میں ظاہر کریں۔ اس اثبات کی وجہ محض تمسخر و استہزا اور وہم میں مبتلا و پریشان کرنا تھا۔ ایسا کرنے والے در اصل یہودی تھے، لیکن انکی ایسی باتوں کو دل و جان سے سُننے اور قبول کرنے والے کفار مشرکینِ مکّہ بھی ہوگئے تھے، اسلیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو خبردار و تنبیہ فرمائی۔ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے)۔ یعنی نبوت عطا فرما کر وحیِ ربّانی سے سرفراز کرتا ہے اور اس رحمت و بزرگی کے منصب کی عطا میں سیم و زر، جاہ و جلال ملحوظ نہیں ہے، یہ خدا کی وہبی عطا ہے، جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (اور اللہ بڑا صاحب فضل ہے) اور اُسکا تفضل ایسا کامل ہے کہ اُسکے نزدیک منصب عطا فرمانا، اور اُس منصب کی لیاقت مرحمت فرمانا برابر ہے۔ اور اگر یہودی مسلمانوں کی تشویشِ خاطر کے لیے دل میں شبہ ڈالیں اور نزولِ وحی میں وسوسہ پیدا کریں، تو پریشان نہ ہونا چاہیے، چونکہ یہودی کہتے تھے کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو ایک شے کا امر فرماتے ہیں، پھر اُسی بات سے منع کرتے ہیں، اور اسکے خلاف کا حکم کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کہتے ہیں اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ اس وسوسہ کو دُور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مابعد والی آیت نازل فرمائی۔ وَدّ کے معنی لغت میں کسی شے تمنّا آمیز محبت کرنا ہے، اسی واسطے اس لفظ کا استعمال تمنّا اور محبت دونوں میں الگ الگ بھی آیا ہے، اور خَیْر سے مراد وحی ہے، اور رحمۃ سے مراد نزولِ وحی اور عطائے نبوّت ہے، اور فضل کے معنی بغیر کسی سبب و وجہ کے ابتداءً ہی کسی کیساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کے ہیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلا دیں تو اُس سے بہتر یا اُس جیسی لے آئیں گے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ۝

کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی نہ مددگار۔

شانِ نزول:۔ قرآنِ کریم نے شرائعِ سابقہ اور کُتبِ قدیمہ کو منسوخ فرمایا، تو کفار کو بہت توحّش ہُوا، اور اُنھوں نے اس پر طعن کیے، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور بتایا گیا کہ منسوخ بھی اللہ کی طرف سے، اور ناسخ بھی۔ دونوں عین حکمت ہیں، اور ناسخ کبھی منسوخ سے زیادہ سہل و انفع ہوتا ہے۔ قدرتِ الٰہی پر یقین رکھنے والے کو اسمیں جائے تردد نہیں۔ کائنات میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دن سے رات کو، گرما سے سرما کو، جوانی سے بچپن کو، بیماری سے تندرستی کو، بہار سے خزاں کو منسوخ فرماتا ہے۔ یہ نسخ و تبدیل اُس کی قدرت کے دلائل ہیں، تو ایک آیت اور ایک حکم کے منسوخ ہونے میں کیا تعجب۔ نسخ درحقیقت حکمِ سابق کی مدت کا بیان ہوتا ہے کہ وہ حکم اس مدت کیلیے تھا اور عین حکمت تھا۔ کفار کی نافہمی کہ نسخ پر اعتراض کرتے ہیں، اور اہلِ کتاب کا اعتراض انکے معتقدات کے لحاظ سے بھی غلط ہے، انھیں حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت کے احکام کی منسوخیت تسلیم کرنا پڑے گی، یہ ماننا ہی پڑیگا کہ شنبہ کے روز دنیوی کام اُن سے پہلے حرام نہ تھے اُن پر حرام ہوئے۔ یہ اقرار ناگزیر ہوگا کہ توریت میں حضرتِ نوح علیہ السلام کی اُمّت کے لیے چوپائے حلال ہونا بیان کیا گیا، اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام پر بہت سے حرام کر دیئے گئے۔ اِن امور کے ہوتے ہوئے نسخ کا انکار کسطرح ممکن ہے۔ مسئلہ جسطرح آیت دوسری آیت سے منسوخ ہوتی ہے اُسی طرح حدیثِ متواتر سے بھی ہوتی ہے۔ مسئلہ نسخ کبھی صرف تلاوت کا ہوتا ہے، کبھی صرف حکم کا، کبھی تلاوت و حکم دونوں کا۔ بیہقی نے ابوامامہ سے روایت کی کہ ایک انصاری صحابی شب کو تہجد کے لیے اُٹھے اور سورۂ فاتحہ کے بعد جو سورۃ ہمیشہ پڑھا کرتے تھے، اُسکو پڑھنا چاہا، لیکن وہ بالکل یاد نہ آئی، اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے، صبح کو دوسرے صحابہ سے اس کا ذکر کیا، اُن حضرات نے فرمایا ہمارا ابھی یہی حال ہے، وہ سورۃ ہمیں بھی یاد تھی، اور اب ہمارے حافظہ میں بھی نہ رہی۔ سب نے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ کی خدمت میں یہ

واقعہ عرض کیا۔ حضور نے فرمایا آج شب وہ سورۃ اُٹھالی گئی۔ اُسکے حکم وتلاوت دونوں منسوخ ہوئے، جن کاغذوں پر وہ لکھی گئی تھی اُن پر نقش تک باقی نہ رہے۔ (خزائن العرفان)

نسخ کے ۲ دو معنی آتے ہیں، ایک نقل وتحویل یعنی بدل دینے کے لنسخ الکتاب (کتاب کا لکھنا) بھی اس سے ماخوذ ہے، اور دوسرے معنی رفع اور ازالہ یعنی اُٹھالینے اور علیحدہ کردینے کے ہیں۔ چنانچہ مقولہ ہے کہ نسخت الشمس الظل (آفتاب نے سایہ کو علیحدہ علیحدہ کردیا) اس آیتِ کریمہ میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ کتاب اللہ میں نسخ چند وجوہ میں آیا ہے، ایک تو کسی آیت کی تلاوت کی انتہائے مدت بیان فرماکر اُسکے حکم کو اپنے حال پر قایم وبرقرار رکھنا، جیسے آیتِ رجم کہ اُس کا حکم تو باقی ہے لیکن تلاوت منسوخ ہوگئی۔ یا حکم کی انتہائے مدت بیان کرکے اُس کی تلاوت وقرأت کو اپنے حال پر قایم وبرقرار رکھا جائے، جیسے اقارب کے لیے وصیت کرنے کی آیت، اور وہ آیت جس میں وفات کی عدت ایک سال ہے کہ انکی تلاوت وقرأت تو برقرار ہے لیکن احکام منسوخ ہیں۔ یا تلاوت اور حکم دونوں کی غایتِ مدت بیان کرکے دونوں کو منسوخ فرمادیا جائے، جیساکہ بیہقی کی روایتِ مذکورہ گزرچکی۔ نیز یہ بات واضح رہنا چاہیئے کہ جس آیت کا حکم منسوخ ہو، اُس کی ۲ دو قسمیں ہیں، ایک وہ کہ اس حکم منسوخ کی جگہ دوسرا حکم قایم ہو، جیسے اپنے قریبی رشتہ داروں کو وصیت کرنا میراث سے منسوخ ہوگیا، اور ایک سال عدتِ وفات کا حکم چار ماہ دس روز سے منسوخ ہُوا۔ اور دوسری قسم وہ ہے کہ دوسرا حکم قایم مقام نہ ہو، جیسے کہ عورتوں کا امتحان کہ ابتداء میں تھا بعد میں منسوخ ہوگیا۔ اور نسخ اوامر ونواہی میں ہوتا ہے اخبار میں نہیں ہوتا۔

مفہوم آیت یہ ہے کہ مخلوق ہیر پھیر کرنے والا، پیدائش اور حکم اختیار رکھنے والا ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے، جسطرح جسے چاہتا ہے بناتا ہے، جسے چاہے نیک بختی دے، جسے چاہے بدبختی دے، جسے چاہے تندرستی دے، جسے چاہے بیماری دے، جسے چاہے توفیق دے، جسے چاہے بے نصیب کردے، بندوں میں جو حکم چاہے جاری کرے، جسے چاہے حلال کرے جسے چاہے حرام فرمادے، جسے چاہے رخصت دے، جسے چاہے روک دے۔ وہ حاکم مطلق ہے جو چاہے احکام جاری فرمائے کوئی اُسکے حکموں کو رد نہیں کرسکتا جو چاہے کرے کوئی اُس سے بازپرس نہیں کرسکتا، وہ بندوں کو آزماتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کے کیسے تابعدار ہیں۔ کسی چیز کا کسی مصلحت کی وجہ سے حکم دیا، پھر مصلحت کی وجہ سے ہی اُس حکم کو ہٹادیا، اب آزمائش ہوجاتی ہے، نیک لوگ تو اُسوقت بھی اطاعت پر کمربستہ تھے اور اب بھی ہیں، لیکن بدباطن لوگ باتیں بناتے ہیں اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں، حالانکہ تمام مخلوق کو اپنے خالق کی تمام باتیں ماننی چاہئیں، اور ہر حال میں رسول کی پیروی کرنی چاہیئے، اور جو وہ کہے اُسے دل سے سچا ماننا چاہیئے جو حکم دے بجالانا چاہیئے، جس سے روکے رُک جانا چاہیئے اس مقام میں بھی یہودیوں کا زبردست رد ہے، اور اُنکے کفر کا بیان ہے کہ وہ نسخ کے قائل نہ تھے۔ بعض تو کہتے تھے کہ اس میں محالِ عقلی لازم آتا ہے، اور بعض محال نقلی بھی مانتے تھے اس آیت میں گو خطاب فخرِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے، مگر در اصل یہ کلام یہودیوں کو سُنانا ہے، جو انجیل کو اور قرآن کو اسوجہ سے نہیں مانتے تھے کہ ان میں بعض احکام توریت کے منسوخ ہوگئے تھے، اور اسی وجہ سے اِن نبیوں کی نبوت کے بھی منکر ہوگئے تھے، اور صرف عناد وتکبر کی بناء پر، ورنہ عقلاً نسخ محال نہیں، اسلیے کہ جسطرح وہ اپنے کاموں میں بااختیار ہے اُسی طرح حکموں میں بھی بااختیار ہے، جو چاہے اور جب چاہے پیدا کرے، جسے چاہے اور جسطرح چاہے اور جسوقت چاہے رکھے۔ اسی طرح جو چاہے اور جسوقت چاہے حکم دے، اُس حاکموں کے حاکم کا حاکم کون؟ اسی طرح نقلاً بھی یہ ثابت شدہ امر ہے، اگلی کتابوں اور پہلی شریعتوں میں موجود ہے، اور خود یہودیوں کو انکا اقرار ہے، لیکن پھر بھی قرآن اور نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ کہکر نہیں مانتے کہ اس سے خدا کے کلام میں نسخ لازم آتا ہے اور وہ محال ہے۔ بعض لوگ جو اسکے جواب میں لفظی بحثوں میں پڑجاتے ہیں، وہ یاد رکھیں کہ اس سے دلالت نہیں بدلتی، اور مقصود وہی ہے۔ حضورِ اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشارت یہ لوگ اپنی کتابوں میں پاتے تھے، آپ کی تابعداری کا حکم بھی دیکھتے تھے، یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کی شریعت کے مطابق جو عمل نہ ہو وہ مقبول نہیں، یہ اور بات ہے کہ کوئی کہے وہ اگلی شریعتیں صرف آپ کے تشریف لانے تک ہی تھیں، اسلیے یہ شریعت اُنکی ناسخ نہیں، یا یہ کہے کہ ناسخ ہے۔ بہرصورت حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تابعداری بغیر کوئی چارہ نہیں، اسلیے کہ آپ آخری کتاب کو خدا کے پاس سے ابھی ابھی لیکر آتے ہیں۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسخ کے جواز کو بیان فرماکر اس ملعون گروہِ یہود کا رد کیا۔ سورۂ آلِ عمران میں بھی جسکے شروع میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے، نسخ کے واقع ہونے کا ذکر موجود ہے۔

سلمان کُل کے کُل متفق ہیں کہ احکام باری تعالیٰ میں نسخ کا ہونا جائز ہے، بلکہ واقع بھی ہے، اور اسی پر پروردگار کی حکمتِ بالغہ ہے۔ ابو مسلم اصبہانی مفسر نے لکھا ہے کہ قرآن میں نسخ واقع نہیں ہوتا، لیکن اسکا یہ قول ضعیف اور مردود اور محض غلط اور جھوٹ ہے۔ جہاں جہاں نسخ قرآن میں موجود ہے اسکے جواب میں گو بہت کچھ محنت اُٹھائی ہے لیکن محض بے سُود ہیں۔ دیکھیے پہلے اُس عورت کی عدت جسکا خاوند مرجائے ایک سال تھی، لیکن پھر چار مہینے دس دن ہوئی، اور دونوں آیتیں قرآنِ پاک میں موجود ہیں۔ قبلہ پہلے بیت المقدس تھا، پھر کعبۃ اللہ ہُوا، دوسری آیت صاف اور پہلا حکم بھی ضمناً مذکور ہے۔ پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ ایک ایک مسلمان دس دس کافروں سے لڑے اور اُن کے مقابلہ سے نہ ہٹے، لیکن پھر یہ حکم منسوخ ہوکر دو دو کے مقابلہ میں صبر کرنے کا حکم ہُوا، اور دونوں آیتیں کلام میں موجود ہیں۔ پہلے حکم تھا کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دیدیا کرو، لیکن پھر یہ حکم منسوخ ہُوا، اور دونوں آیتیں قرآنِ حکیم میں موجود ہیں۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ

کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے ہوا تھا　　اور جو ایمان کے بدلے کفر لے

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

وہ ٹھیک راستہ بہک گیا۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو روکتا ہے کہ کسی واقعہ سے پہلے میرے نبی سے فضول سوال نہ کیا کرو، یہ کثرتِ سوال کی عادت بہت بُری ہے جیسے اور جگہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ الآیہ ایمان والو، اُن چیزوں کا سوال نہ کیا کرو جو اگر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بُرا لگے گا، اور تم قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ میں ایسی پوچھ گچھ جاری رکھوگے تو یہ چیزیں ظاہر کردی جائینگی، کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے اُس کی نسبت سوال کرنے میں خوف ہے کہ کہیں اس سوال کی وجہ سے وہ حرام نہ ہوجائے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جو اُس چیز کے بارے میں سوال کرے جو حرام نہ تھی، پھر اُسکے سوال سے حرام ہوگئی۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال ہُوا کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے تو کیا کرے؟ اگر لوگوں کو خبر کرے تو یہ بھی بڑی بے شرمی کی بات ہے، اور اگر چُپ ہوجائے تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ حضور کو یہ سوال بہت بُرا معلوم ہُوا، آخر اسی شخص پر ایسا واقعہ پیش آیا اور لعان کا حکم نازل ہُوا۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فضول بکواس سے، اور مال کو ضائع کرنے سے، اور زیادہ پوچھ گچھ سے منع فرمایا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے میں جبتک کچھ نہ کہوں تم بھی نہ پوچھو، تم سے اگلے لوگوں کو اسی بدخصلت نے ہلاک کردیا کہ وہ بکثرت سوال کیا کرتے تھے، اور نبیوں پر اختلاف کرتے تھے، جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی طاقت کے مطابق بجالاؤ، اور اگر منع کردوں تو رُک جایا کرو۔ یہ آپ نے اُسوقت فرمایا تھا کہ جب لوگوں کو خبر دی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، تو کسی نے کہا "حضور ہر سال"؟ آپ خاموش ہوگئے۔ اُس نے پھر پوچھا، آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے تیسری بار پھر یہی سوال کیا، آپ نے فرمایا ہر سال نہیں، لیکن اگر میں ہاں کہدیتا تو ہر سال فرض ہوجاتا اور پھر تم کبھی بھی اس حکم بجا نہ لاسکتے۔ پھر آپ نے

مندرجہ بالا فرمان ارشاد فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جب ہمیں آپ سے سوال کرنے سے روک دیا گیا، تو ہم حضور سے پوچھنے میں ہیبت کھاتے تھے، چاہتے تھے کہ کوئی بادیہ نشین ناواقف شخص آجائے وہ پوچھے، تو ہم بھی سُن لیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کوئی سوال حضور سے کرنا چاہتا تھا تو سال سال بھر گزر جاتا تھا کہ مارے ہیبت کے پوچھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، ہم تو خواہش رکھتے تھے کہ کوئی اعرابی آئے اور حضور سے سوال کر بیٹھے پھر ہم بھی سُن لیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اصحابِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بہتر کوئی جماعت نہیں، انھوں نے حضور سے صرف بارہ ہی مسئلے دریافت کیے، جو سب سوال مع جواب کے قرآنِ پاک میں مذکور ہیں، جیسے شراب وغیرہ کا سوال، حُرمت والے مہینوں کی بابت سوال، یتیموں کی بابت سوال وغیرہ وغیرہ۔

یہاں پر اَمْ یا تو بَلْ کے معنیٰ میں ہے، یا اپنے اصلی معنیٰ میں ہے، یعنی سوال کے بارے میں جو یہاں پر انکاری ہے۔ یہ حکم مومن کافر سب کو ہے، کیونکہ حضور کی رسالت سب کی طرف تھی۔ قرآنِ پاک میں اور جگہ ہے یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اہلِ کتاب آپ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر کوئی آسمانی کتاب اُتاریں، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اِس سے بھی بڑا سوال کیا تھا کہ خدا کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں، جس ظلم کی وجہ سے اُنھیں ایک کرخت آواز سے ہلاک کر دیا۔ رافع بن حریملہ اور وہب ابن یزید نے کہا تھا کہ یارسول اللہ کوئی آسمانی کتاب ہم پر نازل کیجئے جسے ہم پڑھیں، اور ہمارے شہروں میں دریا جاری کر دیں تو ہم آپ کو مان لیں، اِس پر یہ آیت اُتری۔ ابو العالیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور سے کہا یارسول اللہ کاش کہ ہمارے گناہوں کا کفّارہ بھی اُسی طرح ہو جاتا جسطرح بنی اسرائیل کے گناہوں کا تھا، آپ نے یہ سُنتے ہی تین دفعہ جنابِ باری میں عرض کی کہ "نہیں! خدایا یہ نہیں! ہم یہ نہیں چاہتے" پھر فرمایا سنو! بنی اسرائیل میں سے جہاں کوئی گناہ کرتا، اُسکے دروازہ پر قدرتاً لکھا ہوا پایا جاتا، اور ساتھ ہی اُسکا کفّارہ بھی لکھا ہوا ہوتا تھا، اب یا تو دنیا کی رُسوائی کو منظور کرکے کفارہ ادا کر دے اور اپنے پوشیدہ گناہوں کو ظاہر کرے، یا کفّارہ نہ دے اور آخرت کی رُسوائی منظور کرے، لیکن تم سے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا٥ یعنی جس سے کوئی بُرا کام ہو جائے یا وہ اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے پھر استغفار کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت بڑا بخشش اور مہربانی کرنیوالا پائیگا۔ اسی طرح ایک نماز دوسری نماز تک گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، پھر جمعہ دوسرے جمعہ تک کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ سنو! جو شخص بُرائی کا ارادہ کرے لیکن بُرائی نہ کرے، تو بُرائی لکھی نہیں جاتی، اور اگر کر گزرے تو ایک ہی بُرائی لکھی جاتی ہے، اور اگر بھلائی کا ارادہ کرے، پھر گو نہ کرے لیکن بھلائی لکھ لی جاتی ہے، اور اگر کر بھی لے تو دس بھلائیاں لکھی جاتی ہیں۔ اب بتاؤ تم اچھے رہے یا بنی اسرائیل؟ نہیں تم بنی اسرائیل سے بہت ہی اچھے ہو، باوجود اتنے کرم اور رحم کے پھر بھی کوئی ہلاک ہو، تو سمجھو کہ یہ خود ہلاک ہونیوالا ہی تھا۔ اِس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کفارِ قریش نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر صفا پہاڑ سونے کا ہو جائے تو ہم ایمان لاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا، لیکن پھر مائدہ (آسمانی دسترخوان) مانگنے والوں کا جو انجام ہُوا، وہی تمہارا بھی ہوگا۔ اس پر وہ انکاری ہوگئے اور اپنے سوال کو چھوڑ دیا۔ مُراد یہ ہے کہ تکبر، عناد، سرکشی کے ساتھ نبیوں سے سوال کرنا نہایت مذموم حرکت ہے ــــ جو کفر کو ایمان کے بدلے مول لے، اور آسانی کو سختی سے بدلے، وہ سیدھی راہ سے ہٹ کر جہالت و ضلالت میں گِر جاتا ہے اسی طرح غیر ضروری سوال کرنا بھی، جیسے اور جگہ ہے اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا الآیہ کیا تم اُنھیں نہیں دیکھتے جو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلتے ہیں اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہونگے اور وہ بڑی بُری قرار گاہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَدَّ كَثِیْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ

بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے

بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝

کہ حق اُن پر خوب ظاہر ہو چکا ہے تو تم چھوڑو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شانِ نزول:۔ جنگِ اُحد کے بعد یہود کی جماعت نے حضرت حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا کہ تم حق پر ہوتے تو تمہیں شکست نہ ہوتی، تم ہمارے دین کی طرف واپس آجاؤ۔ حضرت عمار نے فرمایا تمہارے نزدیک عہد شکنی کیسی ہے؟ انھوں نے کہا نہایت بُری۔ آپ نے فرمایا میں نے عہد کیا ہے کہ زندگی کے آخر لمحہ تک سیدِ عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہ پھروں گا اور کفر نہ اختیار کرونگا، اور حضرت حذیفہ نے فرمایا میں راضی ہُوا اللہ کے رب ہونے، محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رسول ہونے، اسلام کے دین ہونے، قرآن کے ایمان ہونے، کعبہ کے قبلہ ہونے، مومنین کے بھائی ہونے سے۔ پھر یہ دونوں صاحب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو واقعہ کی خبر دی، حضور نے فرمایا تم نے بہتر کیا اور فلاح پائی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اسلام کی حقانیت جاننے کے بعد یہود کا مسلمانوں کے کفر و ارتداد کی تمنا کرنا، اور یہ چاہنا کہ وہ ایمان سے محروم ہو جائیں حسداً تھا، حسد بڑا ہی عیب ہے۔ **مسئلہ** حدیث شریف میں ہے سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا حسد سے بچو وہ نیکیوں کو اسطرح کھاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو۔ **مسئلہ** حسد حرام ہے۔ **مسئلہ** اگر کوئی شخص اپنے مال و دولت یا اثر و وجاہت سے گمراہی و بیدینی پھیلاتا ہو، تو اُسکے فتنہ سے محفوظ رہنے کے لیے اُسکے زوالِ نعمت کی تمنا، حسد میں داخل نہیں، اور حرام بھی نہیں۔ (خزائن)

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۝

اور نماز قایم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لیے جو بھلائی آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے یہاں پاؤگے بیشک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ مومنین کو یہود سے درگزر کا حکم دینے کے بعد انھیں اپنے اصلاحِ نفس کی طرف متوجہ فرماتا ہے۔ (خزائن العرفان) چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (اور نماز قایم رکھو) اسلیے کہ یہ بدنی عبادت ہے، جو بدن پر شاق معلوم ہوتی ہے، قیامِ نماز کے ذریعہ نفس زیر ہوتا ہے وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (اور زکوٰۃ دو) کیونکہ زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اور مال کا زیادہ خرچ کرنا بدنی مشقت سے زیادہ نفس پر شاق اور گراں گزرتا ہے، اور اگر اس پر بھی تمہیں قناعت نہ ہو، اور بڑھ کر ریاضت و مجاہدہ کی خواہش ہو تو نفلی نمازیں اور صدقات و خیرات کی زیادتی کو اختیار کرو، کیونکہ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ (اور اپنی جانوں کے لیے جو بھلائی آگے بھیجو گے) تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (اُسے اللہ کے یہاں پاؤگے) اور اسکا اجر و ثواب خدا کے حضور تم ضرور پاؤگے، اگرچہ یہ بیدین اہلِ کتاب تمہارے عملوں کو ضایع اور رائیگاں جانیں لیکن اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (بیشک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے) اور تمہاری نیک نیتی اور ذوق و شوق جانتا ہے، وہ اُسی کے موافق تمہیں اجر و جزاء عطا فرمائے گا۔

ضمناً اس آیتِ کریمہ سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب مسلمانوں کو کوئی دینی یا دنیوی تکلیف و پریشانی پہنچے تو اُنھیں سزاوار ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و انابت کریں، زیادہ سے زیادہ نماز قایم کریں اور صدقات و خیرات کی کثرت کریں۔ اس سے انکو طمانیتِ قلب اور سکون و راحت میسر آجائیگا۔ دوسری جگہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ یعنی صبر و نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے نصرت و اعانت کی خواستگاری کرو ــــ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ معاذ اللہ اُسوقت لوگ نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی میں تساہل و

غفلت برتتے تھے، اور احکام دینی کی بجا آوری میں سُستی کرتے تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حالت میں دین پر عمل کرنے میں خوب ذوق وشوق کا اظہار کرنا چاہیئے۔

حسد کی مذمت

مذکورہ دونوں آیتوں سے حسد کی بُرائی اور اُسکی شناعت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حسد ہی کی بناء پر کافر ہونا اور دوسروں کو گمراہ کرنا پایا جاتا ہے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب یعنی حسد نیکیوں کو ایسی کھاجاتی ہے جسطرح آگ لکڑیوں کو کھاجاتی ہے اور حدیثِ پاک میں یہ بھی آیا ہے کہ بعض آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ صحابہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا، یارسول اللہ ایسے بدبخت کون لوگ ہیں جو اللہ کی نعمتوں کے دشمن ہیں؟ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کو خوشحال دیکھ کر ناخوش ہوتے ہیں اور حسد کرتے ہیں۔

یہ خصلتِ ناشائستہ اہلِ علم حضرات میں بکثرت پائی جاتی ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کی قدر کو خوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔ جب یہ لوگ کسی ایسی نعمت کو دیکھتے ہیں جو اُن میں نہیں ہوتی، اور دوسروں میں موجود ہوتی ہے، تو انھیں بہت رنج واذیت ہوتی ہے اور اُنکی طبائع حسد کرنے لگتی ہیں۔ اسی بناء پر اہلِ تجربہ عقلاء کا قول ہے کہ چھ گروہ میں سے بیشمار لوگ دوزخ میں جائینگے۔ (۱) امیر لوگ اپنے ظلم کے سبب (۲) عرب (شہری) لوگ تعصب وحمیت کے سبب (۳) دیہاتی لوگ تکبر وغرور کے سبب (۴) تاجر لوگ خیانت کے سبب (۵) بدوی اور صحرائی لوگ جہالت کے سبب (۶) اہلِ علم حسد کے سبب۔ چونکہ یہ خصلتیں ان چھ گروہ کے لوگوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اُن کو اصلاح اسباب وکتاب کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

حکایت:- حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی معراجِ روحانی میں ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص زیرِ سایۂ عرشِ الٰہی ہے، اور اُس پر تجلیاتِ الٰہی کی بارش ہو رہی ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا، خدایا یہ شخص کون ہے، اور کس بناء پر اس قرب واختصاص کا مستحق ہوا ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، اے موسیٰ میں اسکا نام تو نہیں بتاتا، مگر اس کے وہ تین عمل جنکی قبولیت کی بناء پر اس اعزاز واکرام کا وہ مستحق ہوا ہے بتاتا ہوں۔ اسکا پہلا عمل تو یہ تھا کہ یہ کسی نعمت پر جو اسے حاصل نہ تھی، دوسرے کے پاس دیکھ کر حسد نہیں کرتا تھا اور دوسرا عمل یہ کہ یہ اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کرتا تھا۔ تیسرا یہ کہ یہ غیبت اور چغلخوری نہیں کرتا تھا۔ (عزیزی)

عبد اللہ بن عون سے مروی ہے کہ وہ فضل بن مہلب کی محفل میں پہنچے، جسوقت کہ وہ صوبہ واسط کا صوبہ دار تھا، تو انھوں نے اُسے نصیحت فرمائی کہ اے فضل بن مہلب گوشِ ہوش سے سُن اور گرہ میں باندھ لے، تو کبھی تکبر نہ کرنا، کیونکہ تکبر ایسا گناہِ عظیم ہے کہ جہان میں سب سے پہلے شیطان نے کیا، اور وہ اسی گناہ کی پاداش میں ہمیشہ کیلیے ملعون ورانده درگاہ ہوا، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ؕ یعنی تمام کے تمام فرشتوں نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا تکبر کیا اور کافروں میں ہوگیا۔ اور حضرتِ عبد اللہ بن عون دوسری نصیحت میں فرماتے ہیں کہ حرص وطمع نہ کرنا، یہ بہت بڑا گناہ ہے، اور حسد سے بھی دُور رہنا، کیونکہ حسد ہی کی وجہ سے قابیل نے ہابیل کو مار اتھا۔ (عزیزی)

حسد کے چار درجے ہیں، اول یہ کہ دوسرے میں موجود نعمت کے بارے میں خواہش کرے کہ وہ اُس سے زائل ہوجائے، خواہ وہ نعمت اُسے ملے یا نہ ملے۔ یہ درجہ حسد کے سب درجوں میں بدتر ہے، اور کسی مسلمان صالح کے حق میں اسطرح کا حسد کرنا نہایت مذموم وکبیرہ ہے، اور کافر وفاسق کے حق میں مباح ہے۔ کیونکہ اُس پر کفر وگناہ کا وبال سب نعمتوں پر فائق ہے۔ دوسرا درجہ یہ کہ دوسرے میں موجود نعمت کے لیے خواہش کرے کہ یہ اس سے زائل ہو کر مجھے ملجائے، ایسا حسد بھی مسلمان کے حق میں حرام ہے۔ تیسرا درجہ یہ کہ دوسرے میں موجود نعمت کا اُس سے زوال تو نہ چاہے لیکن چونکہ وہ شخص عاجز ہے کہ وہ نعمت حاصل نہیں، مگر وہ یہ تمنا کرے کہ کاش یہ نعمت اُسے حاصل نہ ہوتی کہ اُسے مجھ پر تفوق نہ ہوتا۔ اور چوتھا درجہ یہ ہے کہ وہ آرزو کرے کہ جیسی نعمت اسکے پاس ہے بغیر اس سے زائل ہوئے کاش مجھے بھی میسّر آجائے، تو یہ جائز ہے۔ اسی کا دوسرا نام غبطہ اور تنافس ہے۔ بلاشبہ ایسا حسد، دین کی باتوں میں کرنا چاہیئے، مثلاً ایمان، نماز، طاعت وعبادت، صداقت، خیرات، تعلیم وتعلّم اور ارشاد وہدایت وغیرہ۔ بلکہ بعض وقت واجب بھی ہوجاتا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ؕ یعنی دین کے اچھے امور میں سبقت کی خواہش کرنی چاہیئے۔ اور بخاری ومسلم کی حدیث میں بھی وارد ہے کہ لاحسد الا فی اثنین رجل اتاه الله مالاً فانفقه فی سبیل الله الحدیث۔ یعنی صرف اُن دو شخصوں کے بارے میں حسد حرام نہیں ہے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ مال دے، اور وہ خدا کی راہ میں خرچ کرے، اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم سے نوازا، اُس پر وہ خود بھی عمل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔

اسبابِ حسد

علماءِ کرام فرماتے ہیں کہ غور وتفحص کے بعد معلوم ہوا کہ سات چیزیں حسد کے اسباب میں ہیں۔ اول سبب عداوت ہے، کیونکہ یہ انسان کی خصلت ہے کہ جب اُسے کسی سے تکلیف وگزند پہنچتی ہے، تو وہ اُس کا دشمن ہوجاتا ہے اور اُسکے دل میں کینہ بیٹھ جاتا ہے، اور وہ ہمہ وقت اس فکر میں رہتا ہے کہ اُس سے بدلہ لیکر دل کو سکون دوں، مگر وہ اپنی بے بسی کی بناء پر عاجز رہتا ہے اور بدلہ لینے کی قدرت نہیں پاتا، بالآخر وہ آرزو مند ہوجاتا ہے کہ اس پر کوئی ایسی مار پڑے کہ جان ومال سب تلف ہوجائے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے ایسے حاسدوں کے بارے میں فرمایا اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا ؕ یعنی اگر تمکو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو یہ ناخوش ہوتے ہیں اور انھیں بُرا لگتا ہے، اور اگر تمہیں کوئی بُرائی پہنچتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔ یہی حسد جنگ وجدال اور تنازع وفساد کا موجب بن جاتا ہے۔ اور دوسرا سبب تکبّر وبڑائی ہے کہ وہ ہمسروں کا منصب اور بلند مرتبہ دیکھ نہیں سکتا، اور وہ خواہش کرتا ہے کہ اس سے یہ منصب ومرتبہ جاتا رہے، تاکہ وہ اور میں برابر ہوجاؤں، اسی حسد کی وجہ سے کفار کہتے تھے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ؕ یعنی یہ قرآن مکہ وطائف کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہ اُتارا گیا۔ اور تیسرا سبب یہ ہے کہ چونکہ انسان کی جبلت ہے کہ لوگ اُسکے زیادہ سے زیادہ تابع فرمان اور خادم ہوں، اور یہ بات اسکے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی کہ دوسرے اسکے محتاج ہوں اسلیے لامحالہ وہ اسکا خواستگار ہوگا کہ دوسروں سے وہ نعمت جاتی رہے۔ چنانچہ کفار مسلمانوں کے بارے میں کہتے تھے اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا الاٰیہ یعنی یہ ہیں وہ مسلمان جن پر ہماری موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا۔ چوتھا سبب تعجب ہے، یعنی کسی انسان کو صاحبِ نعمت دیکھ کر تعجب کرے، کیونکہ وہ گمان رکھتا ہے کہ وہ اس نعمت کی نہ لیاقت رکھتا ہے اور نہ اہلیت۔ اسلیے وہ اس سے زوالِ نعمت کی خواہش رکھتا ہے، تاکہ اُس کا تعجب جاتا رہے، جیسے کہ کفار نبیوں کے بارے میں یہ خیال رکھتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تم میں سے ایک آدمی پر تمہارے رب کی جانب سے تمہارے لیے نصیحت آئے تاکہ وہ تمہیں غضبِ الٰہی سے ڈرائے۔ پانچواں سبب یہ ہے کہ دوسرے شخص کی نعمت یا کمال دیکھ کر خیال کرے کہ اپنے مقصود ومطلب کے حصول میں یہ حارج وقاصر ہے، تو وہ اس غرض سے چاہے کہ یہ مرتبہ ونعمت وکمال اُس سے دُور ہو جائے، جیسے ہر ہم پیشہ وصاحبِ ہنر وغیرہ۔ چھٹا سبب یہ ہے کہ ریاست وشوکت کی محبت مقتضی ہے کہ دوسروں کی ریاست وشوکت جاتی رہے، اور طبیعت میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے کمال میں بے نظیر ہو، اور کوئی دوسرا اپنے برابر نہ ہوسکے، لیکن یہ بات اسے کبھی میسر نہیں ہوتی ہے، بلکہ سب سے فائق وبرتر ہونا، اور کمالات میں بے مثل بے ہمسر ہونا، یہ صرف خاصہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ ساتواں سبب کم ظرفی اور نفس کی فرومائیگی، اور بغایت درجہ بخل کا ہونا ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا فیضان دیکھ کر رنجیدہ وملول ہوتا ہے، اور دوسروں کی فلاکت وبے بسی سے بالطبع خوش ہوتا ہے۔ اسبابِ حسد کے درجات میں یہ درجہ غایت درجہ بدتر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے حسد سے پناہ میں رکھے۔ جسوقت کسی میں متعدد اسبابِ مذکورہ یکجا جمع ہوجائیں، تو حسد کی شناعت اتنی ہی بڑھ جائیگی۔

چنانچہ یہودیوں کے گروہ میں حضورِ اکرم سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے صحابۂ کرام کے ساتھ حسد کی متعدد قسمیں جاگزیں ہوگئی تھیں، اسی بناء پر اُنکی طبیعتوں میں

حسد خوب محکم و مضبوط ہوگیا تھا۔ چنانچہ آیتِ مذکورہ میں لفظ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ کا اشارہ اسی طرف ہے۔

حسد کا علاج حسد ایک عالمگیر مرض ہے، جو روحانی و باطنی ہے۔ اس مرضِ روحانی سے بہت ہی کم لوگ محفوظ رہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے ما منا احدٌ الاو یحسد وما منا احدٌ الا و ینظر یعنی کوئی شخص حسد سے بچا ہوا ہی نہیں ہے، اور نہ کوئی شخص دیکھنے اور نظر پڑنے سے بچا ہوا ہے۔ لہٰذا اس مرضِ روحانی کا علاج دو چیزوں میں ہے، ایک علم دوسرا عمل۔ لیکن علم کی دو قسمیں ہیں، ایک اجمالی دوسرا تفصیلی۔ اجمالی یہ ہے کہ ہر چیز کو یہ جانے کہ یہ بات تقدیرِ الٰہی سے ہے۔ اور اس عقیدہ کو اپنے دل میں حاضر و محکم رکھے کہ ماشاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن، یعنی جو اللہ تعالیٰ چاہے ہو جاتا ہے، اور جسے وہ نہ چاہے ہرگز نہیں ہوتا۔ اور یہ بات خوب سمجھ لے کہ کسی کے ناخوش ہونے اور برا جاننے سے تقدیر نہیں ٹل سکتی، جس کی تقدیر میں خوش حالی اور نعمتوں کا حصول ہے، وہ ضرور ہو کر رہے گا، دوسرا شخص چاہے خوش ہو یا ناخوش۔ علم تفصیلی یہ ہے کہ حسد کو ایسا سمجھے کہ "گویا ایمان کی آنکھ میں تنکہ یا خاک جا پڑے" جسطرح آنکھ میں تنکہ یا خاک پڑنے سے آنکھ میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح حسد کرنے سے حکمِ الٰہی سے ناخوشی، اور قضا و قدر سے نارضامندی لازم آتی ہے۔ اور یہ کہ اپنے ہم جنسوں اور بھائیوں کی بدخواہی کرنی پڑتی ہے۔ اور حاسد کو ہمہ وقت کا رنج اور ہمیشہ حواس و وسواس کا "تکدر" حاصل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات حاسد کی مقدور و طاقت میں ہے ہی نہیں کہ وہ کسی شخص کو کچھ بھی ضرر و نقصان پہنچا سکے، نہ دین میں نہ دنیا میں۔ بلکہ اسکے برعکس حاسد کے لیے دنیا میں بھی نقصان و ضرر ہے کہ حسد کے باعث اسکی نعمت اس سے جاتی رہے گی، اور آخرت میں بھی اسکے لیے نقصان و ضرر کا موجب ہے کہ حاسد ظالم ہے اور محسود مظلوم، اور قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دلائی جائینگی۔ اور عمل کے ذریعہ حسد کا علاج اسطرح پر ہے کہ حاسد محسود کے حق میں ایسے افعال کرے جو مقتضائے حسد کے خلاف ہو۔ مثلاً اگر کسی کی بدگوئی باعثِ حسد ہے، تو حاسد کو چاہیئے کہ اسکے آگے تواضع و فروتنی سے پیش آئے۔ اس حیلہ سے محسود کی محبت اسکے دل میں پیدا ہو جائے گی، اور حسد خود بخود زائل ہو جائیگا۔ لیکن یہ بات جان لینی چاہیئے کہ محسود کی طرف سے جو دلی نفرت از روئے طبائع بشری بے اختیاری حاصل ہوتی ہے جس میں انسان کا کوئی قبضہ و اختیار نہیں ہوتا، تو اس نفرت کے اوپر اُس سے مواخذہ نہ ہوگا، بشرطیکہ قلبی نفرت کے تابع ہو کر کوئی عملی مظاہرہ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا البتہ ایسی قلبی نفرت کو بھی برا جانکر اسکے دفعیہ کی کوشش کرے۔ (عزیزی)

چونکہ مذکورہ دونوں آیتوں میں اکثر اہلِ کتاب چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو انکے اپنے دینِ اسلام سے پھیر کر اس سے منحرف بنادیں، اسی بنا پر وہ نسخِ آیات میں شبہ ڈال لیتے، اور واہی اعتراضات کر کے دل میں وسوسہ پیدا کرتے رہتے تھے، اسلیے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اُس دلیل کو بیان فرماتا ہے، جو انھوں نے اپنے نزدیک ٹھہرا رکھی تھی، فرماتا ہے:-

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

اور اہلِ کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائیگا مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو یہ انکی خیال بندیاں ہیں تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو

بَلٰى ۗ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ

ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کیلیے اور وہ نیکوکار ہے تو اسکا نیگ اسکے رب کے پاس ہے اور انھیں نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم اور یہودی بولے

لَیْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ

نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح جاہلوں نے اُن کی سی

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝

بات کہی تو اللہ قیامت کے دن اُن میں فیصلہ کر دے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں۔

اور اہلِ کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائیگا، مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو، یعنی یہود کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی داخل ہونگے، اور نصرانی کہتے ہیں کہ فقط نصرانی۔ اور یہ مسلمانوں کو دین سے منحرف کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ جیسے نسخ وغیرہ کے لچر شبہات انھوں نے اس اُمید پر پیش کیے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے دین میں کچھ تردد ہو جائے۔ اسی طرح انکو جنت سے مایوس کر کے اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آخر پارہ میں انکا یہ مقولہ مذکور ہے وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (یعنی وہ کہتے ہیں کہ تم یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تو ہدایت پر آجاؤ گے) اللہ تعالیٰ انکے اس خیالِ باطل کا رد فرماتا ہے کہ "یہ انکی خیال بندیاں ہیں" تم فرماؤ لاؤ دلیل اگر سچے ہو"۔ **مسئلہ** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نفی کے مدعی کو بھی دلیل لانا ضروری ہے، بغیر اس کے دعویٰ باطل و نامسموع ہوگا۔ (خزائن العرفان)

مطلب یہ کہ اہلِ کتاب کا پہلا گروہ یہود کہتا تھا کہ جنت میں وہی شخص داخل ہوگا جو یہودی ہو، اور انکے اعتقاد و عمل کے مطابق اس کا طریقہ ہو۔ **ہُوْد** اصل میں ہائد کی جمع ہے اور ہائد کے لغوی معنی توبہ کرنے والے کے ہیں، جیسا کہ سورۂ اعراف میں واقع ہوا کہ اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ (ہم تیری طرف توبہ کرتے ہیں) چونکہ یہودی توبہ کرنے میں بہت دشوار تر قوم تھی، اور بڑی مشکل سے توبہ کی طرف راغب ہوئے تھے، جبکہ گئو سالہ پرستی کے بدلہ میں اپنی جانوں کو ہلاک کیا تھا اس وجہ سے یہ لقب انکو دیا گیا۔

اور نصرانی کہتے تھے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جبتک وہ نصرانی نہ ہو، اور ان کے اعتقاد و عمل کے مطابق اس کا طریقہ نہ ہو۔ یہ اہلِ کتاب کا دوسرا گروہ ہے۔ **نصاریٰ**، نصران کی جمع ہے، اور نصران و ناصر کے معنی مدد کرنے والے کے ہیں۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انکے حواریوں نے اُن سے عہد کیا تھا کہ ہم ہمیشہ آپ کیساتھ رہینگے اور نصرت و مدد میں پیش پیش رہینگے، اس بنا پر انکا یہ لقب پڑ گیا۔ چونکہ ہر ایک اہلِ کتاب میں سے یہی کہتا تھا کہ صرف اور صرف ہم ہی جنت میں جائینگے، اور کوئی دوسرا نہ جاسکے گا۔ انکے اس خیالِ باطل کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ یعنی یہ انکی من مانی آرزوئیں ہیں، جن پر انکے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل و برہان نہیں ہے۔ اَمَانِی سے مراد شہواتِ باطلہ ہیں، اور یہ اُمْنِیَّة کی جمع ہے، جو تمنی سے مشتق ہے۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ انکے بے سروپا باطل دعوے کی تعجیز میں ارشاد فرماتا ہے هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ، یعنی اے محبوب سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان سے فرما دیجیے کہ اے اہلِ کتاب اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم ہی جنت میں جاؤ گے، تو اس دعوے کی دلیل لیکر آؤ۔ کیونکہ کسی آئندہ امر پر بلا دلیلِ صحیح دعویٰ کرنا لغو اور باطل اور غیر مسلّم ہے۔ یا یہ کہ تمہیں اگر اس میں شک و تردد ہے کہ اہلِ اسلام جنت میں نہ جائینگے، صرف یہودی و نصرانی ہی جنت میں جائینگے، تو اس نفی پر اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے، تو اپنی صداقت میں اُس ربانی دلیل کو پیش کرو۔ ورنہ ظاہر بات ہے کہ تم اس دعوے میں سراسر جھوٹے ہو اور یہ دعویٰ تمہارا من گھڑت ہے، جس پر کوئی دلیل ابتک نہ تم قائم کرسکے ہو، اور نہ آئندہ قائم کرسکو گے۔ بھلا محض جھوٹے اور باطل دعوے پر کون سلیم العقل انسان ہے کہ کان دھر سکے یہ تو اس قسم کے اوہام و خیالات ہیں کہ کوئی فاتر العقل شخص تنہائی میں بیٹھ کر خیالاتِ باطلہ، اور بے سروپا آرزوئیں دل میں باندھ کر خود بخود خوش ہو۔ پھر اگر یہ لوگ اپنی اس حماقت کی راہ کو اور اپنی ان باطل آرزوؤں کو بطریق مذہب و اعتقاد آپ کے حضور پیش کرنے کی جرأت کریں، تو آپ ان سے دلیل طلب فرمائیں، انکی اپنی دروغگوئی اور کذب بیانی خود ان پر واضح ہو جائے گی۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ لیعنی ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا مُونھ جھکایا اللہ کے لیے، اور وہ نیکوکار ہے، خواہ وہ کسی زمانہ اور کسی نسل سے اور کسی قوم سے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے نبی کی زبان سے احکامِ الٰہی اور اُسکے فرمان سُننے، پھر وہ اُن کو اپنے سر اور آنکھوں پر رکھے، اور بیدین قوم کی روش اختیار نہ کرے، اور خودساختہ طریق اور اپنی آراء کو دین میں دخل نہ دے۔ اور اس پر مزید یہ کہ وَهُوَ مُحْسِنٌ وہ نیکوکار بھی ہو، مرتکب افعالِ شنیعہ اور اعمالِ قبیحہ کا نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرے کہ گویا اُسے دیکھ رہا ہے، تو فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اُسکے لیے اُس کا اجر و ثواب جو اُس نے اعمالِ خیر کیے، بہشت و رضوانِ الٰہی، قرب و اختصاص کی صورت میں اُسکے رب کے پاس ہے اُسکے اعمال و اطاعت کے موافق وہ اجر و ثواب کا ضرور مستحق ہے، اگرچہ مخالف بدینوں کے نزدیک وہ مستحقِ اجر نہ ہو، اور اُسکے اعمال حبط و رائیگاں ہوں، مگر وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ اُنھیں اس قسم کی مخالفتوں کا دنیا میں کچھ ڈر نہیں۔ خواہ وہ مخالفین اُنکے اعمالِ خیر کو کتنا ہی بے فائدہ تصور کریں، وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ اور نہ اُنھیں آخرت میں کچھ غم ہوگا۔ اور مخالفوں کی طعن و تشنیع اُنھیں غمزدہ نہ کرے گی۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ کہ جنت کے فقط وہی مالک ہیں بالکل غلط ہے، کیونکہ دخولِ جنت مرتب ہے عقیدۂ صحیحہ و عملِ صالح پر، اور یہ اُنھیں میسر نہیں۔ (خزائن العرفان)

کسی ایک دین والوں کے لیے دخولِ جنت کا انحصار اُسوقت متحقق ہو سکتا ہے جبکہ اُس دین کے سوا تمام ادیان قیامت تک منسوخ ہوں، اور کوئی دین اس دین کے سوا قیامت تک موجود نہ ہوتا۔ چونکہ یہودیت اور نصرانیت میں یہ دونوں باتیں متحقق نہیں، لہٰذا دخولِ جنت کا انحصار ان میں سے کسی کے ساتھ بھی صحیح نہیں ــــ اس مقام پر یہ بھی جان لینا چاہیے کہ ثبوتِ اجر و ثواب اور دفعِ خوف و حزن کے لیے دو شرطیں ذکر فرمائی ہیں۔ اول اسلام لوجہ اللہ، دوم احسان۔ اکثر مفسرین اسلام لوجہ اللہ سے تصحیحِ عقائد مراد لیتے ہیں، اور احسان سے اصلاحِ عمل اور نیک کردار مراد لیا ہے۔ اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں اسلام سے مراد اسلامِ عام کے علاوہ ہے، کیونکہ اسلامِ عام کے معنی کلمۂ طیبہ کی تصدیق و اقرار کے ساتھ قیامِ نماز، ادائے زکوٰۃ و روزہ اور حج ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ الاسلام ان تشهد ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله وتقيم الصلوة وتؤتى الزكوة وتحج البيت ان استطعت اليه سبيلا وتصوم رمضان اور جو اسلام اس آیتِ کریمہ میں مذکور ہے، اُسکے معنی خاص ہیں۔ اور اس اسلامِ خاص کی حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنے اعضاء و قُویٰ کے ساتھ تمام حالات و اوقات میں یقین کامل رکھے اور کامل مطیع و فرمانبردار احکامِ الٰہی رہے۔ اسی اسلام کی درخواست حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اس آیتِ کریمہ میں کی ہے کہ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی جب اُنکے پروردگار نے اُن سے فرمایا کمل فرمانبردار ہو، تو عرض کیا کہ میں پروردگارِ عالم کا فرمانبردار ہوا۔ اور اسی معنیِ خاص کی طرف اس حدیث شریف میں بھی اشارہ ہے کہ المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده۔ یعنی مسلمان وہی ہے کہ جسکی زبان و ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اسلام لوجہ اللہ میں معنیِ خاص مراد اسلیے لینا ضروری کہ وجہ سے مراد ذات کے لیے جاتے ہیں، اگرچہ تعبیرِ ذات کے ــ کبھی گردن، کبھی سر اور کبھی دیگر اعضاء کے ساتھ کیجاتی ہے، لیکن وجہ کے معنی چونکہ چہرہ کے ہیں اور اس میں ایسی خصوصیت ہے، جو دیگر اعضاء میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ کہ چہرہ تمام اعضاء میں سب سے زیادہ مشرف و مکرم ہے، اور یہی حواسِ ظاہری و باطنی کا مبدء اور فکر و تخیل کا مقام اور قوائے مدرکہ و محرکہ کا منشاء ہے۔ اور تمام عبادتوں میں افضل عبادت چونکہ سجدہ ہے، اور حصولِ سجدہ اسی چہرہ کے ساتھ وابستہ ہے، اسلیے وَجْه (چہرہ) ہی تمام اعضاء میں ذات کا خلیفہ اور قائم مقام ہے۔ جب انسان نے اپنا چہرہ انقیاد و اطاعت میں جھکا دیا، تو گویا اُس نے اپنے تمام اعضاء سے فرمانبرداری کا اظہار کر دیا۔ اسلام کے اس معنیِ خاص کا مرتبہ اُسوقت تک حاصل نہیں ہوتا جبتک مسلمان اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل و اعتماد نہ کرے، اور اپنی امید و خوف، محبت و نفرت کو اللہ تعالیٰ کے زیرِ تابع فرمان نہ کرے۔

اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں جو "احسان" کا تذکرہ ہے، وہ اُس احسان کے علاوہ ہے جو مشہور ہے۔ اس احسان کی حقیقت یہ ہے کہ جس کا ذکر حدیثِ جبریل علیہ السلام میں ہے کہ فرمایا الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔ یعنی احسان اور نیکوکاری یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو، گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، اور اگر ایسی کیفیت تم میں نہ ہو تو یوں سمجھو کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ آدابِ احسان میں ان تین باتوں کا لحاظ ضروری ہے، اول یہ کہ نیت میں خلل نہ ہو، یعنی اُس میں اصلاً نفسانیت کا دخل نہ ہو، دوم یہ کہ عمل کی ادائیگی میں کمی و بیشی کا خلل نہ ہو، یعنی جسطرح وہ عمل مشروع ہے اُسی کے مطابق وہ عمل بجا لایا جائے، اور آدابِ مسنونہ و مشروطہ کی مکمل رعایت برتی جائے، اور سوم یہ کہ ادائیگیِ عمل کے بعد کوئی ایسا عمل نہ کرے جو گناہ و معصیت کا ہو، جس سے اس عمل کا یا تو اجر و ثواب کم ہو جائے، یا سرے سے وہ عمل ہی ضائع ہو جائے۔ ان تینوں آداب کا جس نے لحاظ رکھا، بلاشبہ وہ اجر و ثواب کا عند اللہ مستحق و سزاوار ہوگا، جسکا اُس نے اس عمل پر دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اور یقیناً خوف و غم اور عدمِ قبولیت کا خدشہ جاتا رہے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں یہ اشارہ ہے کہ اس زمانہ کے یہود و نصاریٰ کا حال ہرگز جنتیوں کے احوال کے مطابق نہیں ہے، کیونکہ یہ نہ اسلام لوجہ اللہ رکھتے ہیں، اور نہ ناسخِ احکامِ الٰہی کو مانتے ہیں، اور نہ نبی زمانہ سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہیں، اور نہ احسان کے موافق اُنکے اعمال ہی ہیں۔ چونکہ اُنھوں نے اپنی طرف سے نئے نئے حکم اختراع کر رکھے ہیں، اور جو شریعت اللہ کی طرف سے مقرر ہے، وہ اسکو بدل چکے ہیں، جبتک وہ اس حال پر ہیں، دخولِ جنت کی توقع خیالِ خام ہے۔ اور یہ بات تو بہت ہی بعید ہے کہ خاص یہی لوگ جنت کے مالک ہونگے، اور دوسرے ہرگز جنت میں نہ جاسکیں گے، البتہ اگر یہ اپنا طریقہ بدل ڈالیں، اور احکامِ الٰہی کے بالکل فرمانبردار ہو جائیں، اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شریعتِ مطہرہ کے مکمل تابع ہو کر نیک عمل و اطوار اختیار کر لیں، تو ضرور اجر و ثواب کے لائق ہونگے۔ اور اہلِ کتاب کا جھوٹا دعویٰ بلا طلبِ دلیل و حجت کے کسطرح مسموع و مقبول ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کو جھوٹا اور کاذب گردانتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے:۔

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ لیعنی اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں۔ مطلب یہ کہ نصاریٰ کے دین میں اصلاً رشد و ہدایت نہیں ہے، وہ سراسر گمراہی پر ہیں، نہ اعتقاد ہی درست ہے، اور نہ عمل ہی صحیح ہے۔ یہودی یہ اسلیے کہتے تھے کہ وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ خدا کا رسول و نبی مانتے تھے، اور نہ انجیل کو خدا کی کتاب سمجھتے تھے۔

وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ لیعنی اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں۔ مطلب یہ کہ نصاریٰ یہودیوں کے بارے میں کہتے تھے کہ یہودیوں کے پاس نہ دینِ الٰہی ہے، اور نہ اُس کی ہدایت۔ نصاریٰ یہ اسلیے کہتے کہ وہ خیال رکھتے تھے کہ توریت اور اُسکے احکام، حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے اور اُن پر انجیل اُترنے سے منسوخ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اگر دونوں گروہ کے قول کو سچا تسلیم کرایا جائے، تو اس صورت میں تمام اہلِ کتاب ساقط الاعتبار ہوتے ہیں، اور دونوں کتابوں میں سے کوئی کتاب اقتداء کے لائق نہیں رہتی۔ اور اگر ایک گروہ کے قول کو معتبر، اور دوسرے کے قول کو لغو اور ساقط ٹھہرایا جائے، تو ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ کیونکہ دونوں ہی گروہ اپنی اپنی کتاب کے علم میں برابر ہیں، اور کسی کو دوسرے پر ترجیح کی صورت نہیں۔ وَّهُمْ حالانکہ وہ لوگ خواہ یہودی ہوں یا نصاریٰ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کتاب پڑھتے ہیں۔ اور باوجود علم کے اُنھوں نے ایسی جاہلانہ گفتگو کی، حالانکہ انجیل جسکو نصاریٰ مانتے ہیں، اُس میں توریت اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق ہے۔ ایسی توریت جسکو یہودی مانتے ہیں، اُس میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور اُنکے تمام احکام کی تصدیق ہے، جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئے۔ (خزائن العرفان)

غرضکہ اگر کوئی یہ چاہے کہ محض اہلِ کتاب کے قول سے حق اور باطل میں امتیاز کرے، تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہے، بلکہ اگر دونوں کے قول کو معتبر مانیں، تو دونوں مذہب ہی باطل ہو جائینگے۔ یہودیوں کا مذہب نصاریٰ کے قول اور اُنکے دلائل سے، اور نصاریٰ کا مذہب یہودیوں کے قول اور اُنکے دلائل سے۔ اسی لیے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیتِ کریمہ کی جسوقت تلاوت فرمائی، تو فرمایا صَدَقُوْا وَاللّٰهِ یعنی خدا کی قسم یہ دونوں گروہ سچے ہیں، یعنی دونوں ہی دین و ہدایت پر قائم نہیں ہیں، بلکہ دینِ حق اور ہدایتِ الٰہی ان کے سوا ہی ہے، اور وہ دین اسلام ہے۔ (عزیزی) بہرحال اس تکاذب و تفاسق سے دونوں ہی گروہ ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں، بلکہ اگر غور و تأمل کیا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ جہلائے عرب اور مشرکینِ مکہ سے

اہلِ کتاب کو کسی طرح کی نسبت نہیں تھی، اسلیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اسی طرح جاہلوں نے انکی سی بات کہی۔ یعنی علماءِ اہلِ کتاب کی طرح اُن جاہلوں نے جو نہ علم رکھتے تھے نہ کتاب، جیسے بُت پرست (مشرکینِ مکّہ وغیرہ) آتش پرست وغیرہ، انھوں نے ہر ایک دین والے کی تکذیب شروع کی، اور کہا کہ وہ کچھ نہیں۔ انہی جاہلوں میں سے مشرکینِ عرب بھی ہیں، جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اور آپ کے دین کی شان میں ایسے ہی کلمات کہے۔ (خزائن العرفان)

مطلب یہ کہ جہلائے عرب مشرکینِ مکّہ وغیرہ پہلے ہی حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اور آپ کے دینِ حق کا انکار کرتے تھے، باوجودیکہ نہ انھیں علم تھا اور نہ وہ اہلِ کتاب تھے۔ اب تو عویداران علم وکتاب بھی ویسی ہی جاہلانہ باتیں کرنے لگے ہیں، حالانکہ اُن میں سے ہر ایک خوب جانتا ہے کہ اہلِ کتاب ہیں ایک دوسرے میں کچھ مسائل واحکام سچے بھی ہیں، جن پر وہ عمل بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ یہودی جانتے ہیں کہ نصاریٰ کے بعض معتقدات ویسے ہی ہیں جیسے کہ انبیاءِ سابقین علیہم السلام کے تھے، اور توریت کے بعض احکام بھی مانتے اور بجالاتے ہیں۔ اسکے باوجود وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نصاریٰ بالکل جھوٹے ہیں، اور یہی حال نصاریٰ کا ہے کہ وہ یہودیوں کو جانتے سمجھتے پھر انھیں بالکل جھوٹا کہتے ہیں۔ جب اہلِ کتاب کے علماء کا یہ حال ہے، تو جہلاء کی تکذیب تو جہالت پر مبنی ہے۔ علماء کی جاہلانہ باتیں اور تکذیب وتفسیق بلاشبہ جاہلوں سے فائق ہے۔ لہٰذا دونوں گروہ اپنے نزدیک بھی ایک دوسرے کو لاشئے محض قرار دینے میں جھوٹے ہیں، اور دونوں کا قول بھی باہم جھٹلانے میں ساقط الاعتبار ہے، اور دونوں فریق کی یہ باہمی تکذیب محض تعصب کی وجہ سے سرزد ہوئی، چونکہ آیتِ کریمہ کا شانِ نزول بتلا رہا ہے کہ

شانِ نزول: نجران کے نصاریٰ کا وفد سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، تو علماءِ یہود آئے اور دونوں میں مناظرہ شروع ہوگیا، آوازیں بلند ہوئیں، شور مچا، یہود نے کہا کہ نصاریٰ کا دین کچھ نہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ اسی طرح نصاریٰ نے یہود سے کہا کہ تمہارا دین کچھ نہیں، اور توریت وحضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اس باب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (خزائن العرفان) کیونکہ علماءِ یہود ونصاریٰ کو باہمی تعصب نے ہی ایک دوسرے کی تکذیب پر برانگیختہ کیا، حالانکہ تعصب جاہلوں اور بے فہموں کا کام ہے اسی لیے جب علماء تعصب کرنے لگتے ہیں، تو پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتے ہیں، اور ایسے عالموں کا قول قابلِ سند نہیں رہتا۔ لہٰذا جب اہلِ کتاب کے یہ دونوں گروہ بسبب کمالِ تعصب یا بسبب بیہودہ گوئی کے جاہلوں کے ہم رنگ ہوگئے۔ اور جاہل پہلے ہی سے بے دلیل وبُرہان ہیں، تو انکے طریق میں حق وباطل کا امتیاز محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تو اللہ قیامت کے دن اِن میں فیصلہ کر دیگا۔ اور ان دونوں گروہ، اور جہلاءِ عرب، مشرکینِ مکّہ کے درمیان قطعی حکم دیدیگا اور انکے جرم وگناہ کے مطابق انھیں سزا دیگا فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ جس بات میں جھگڑ رہے ہیں۔ اور دنیا میں آج یہ باہم تکذیب کے علاوہ اسلام کا بھی انکار کر رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتا دیا، یہ لوگ جھوٹے اور ساقط الاعتبار ہیں، اور ان کی کوئی بات لائقِ اعتنا نہیں، اور دخولِ جنّت میں انحصار کا دعویٰ باطل ہے انبیاء کی تعلیمات کی پیروی اور احکامِ الٰہی کی بجاآوری میں ہی نجات مضمر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ

اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے اُن میں نام خدا لیے جانے سے اور اُنکی ویرانی میں کوشش کرے اُن کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں

اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

مگر ڈرتے ہوئے اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور اُن کے لیے آخرت میں بڑا عذاب

شانِ نزول: یہ آیت بیت المقدّس کی بے حرمتی کے متعلق نازل ہوئی، جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ روم کے نصرانیوں نے بنی اسرائیل پر فوج کشی کی، اُنکے مردانِ کار آزما کو قتل کیا ذُرّیت کو قید کیا، توریت کو جلایا، بیت المقدس ویران کیا، اُس میں نجاستیں ڈالیں، خنزیر ذبح کیے معاذاللہ۔ بیت المقدس خلافتِ فاروقی تک اسی ویرانی میں رہا۔ آپ کے عہدِ مبارک میں مسلمانوں نے اسکو بناء کیا۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ آیت مشرکینِ مکّہ کے حق میں نازل ہوئی، جنھوں نے ابتدائے اسلام میں حضورِ اکرم سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اور آپ کے اصحاب کو کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکا تھا، اور جنگِ حُدیبیہ کے وقت اس میں نماز وحج سے منع کیا تھا، فرماتا ہے" اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں کو روکے اُن میں نام خدا لیے جانے سے"۔ نامِ خدا یعنی ذکر، نماز وخطبہ، تسبیح ووعظ، نعت شریف، سب کو شامل ہے، اور ذکر اللہ کو منع کرنا ہر جگہ بُرا ہے، خاصکر مسجدوں میں، جو اسی کام کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ **مسئلہ** جو شخص مسجد کو ذکر ونماز سے معطل کردے، وہ مسجد کا ویران کرنے والا بہت بڑا ظالم ہے۔

وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا، اور اُن کی ویرانی میں کوشش کرے۔ **مسئلہ** مسجد کی ویرانی جیسے ذکر ونماز کے روکنے سے ہوتی ہے، ایسے ہی اُس کی عمارت کے نقصان پہنچانے اور بے حرمتی کرنے سے بھی۔ (خزائن العرفان)

مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ انکو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے۔ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ، اُنکے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ دنیا میں اُنھیں یہ رسوائی پہنچی کہ قتل کیے گئے، گرفتار ہوئے، جلاوطن کیے گئے۔ خلافتِ فاروقی وعثمانی میں ملکِ شام اُنکے قبضہ سے نکل گیا، بیت المقدس سے ذلت کیساتھ نکالے گئے۔ (خزائن العرفان)

وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ اور اُنکے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ کہ اپنے کفر وظلم کی وجہ سے ہمیشہ کی آگ میں رہینگے۔

تفسیری اقوال حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا کے تحت رقم فرماتے ہیں کہ مسجدوں کو ویران وخراب کرنے میں یہود ومشرکین وغیرہ کی حرکتیں تعصب کے بنا پر تھیں کہ وہ نہ چاہتے تھے کہ مخالفین اُنکی مسجدوں میں آکر عبادت کریں۔ لہٰذا جو ایسا تعصب برتے اُس میں کئی طرح کے ظلم پائے گئے۔ اول یہ کہ ظلم کے انواع بہت ہیں۔ (۱) ظلم مالی (۲) ظلم عرضی (۳) ظلم جانی۔ مراتبِ ظلم میں اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ کسی کے گھر کو کوئی غصب کرے۔ اسلیے کہ گھر کے غصب میں ظلم ونہب کی سب نوعیں شامل ہیں۔ دوم یہ کہ کسی کی شے کا غصب بھی کئی طرح پر ہوتا ہے (۱) غصب عین شے کا ہوتا ہے، یا (۲) غصب شے کے منافع کا۔ اس میں اعلیٰ مراتبِ غصب یہ ہے کہ جو مقام ذکر ہو اُس میں اُسے نہ ہونے دے۔ تیسرے یہ کہ بعد غصبِ شے، غاصب کا اُس میں تصرف کئی طرح سے ہوتا ہے، کبھی ملکیت کا دعویٰ ہوتا ہے، اور کبھی عوض کا۔ اور جب شے کو اس کی اپنی اصل سے بدل دیا، یا خراب کر دیا، تو یہ ظلم کا کامل درجہ ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اپنے خالق ومنعم کے ساتھ ظلم کرے۔ جبکہ ان لوگوں نے اپنے خالق کے ساتھ ظلم کیا، اور اُسکے گھر کو غصب کر لیا، اور وہاں اُس کا ذکر ونام لینے کی بندش کردی، اور اُسے خراب وگرایا، تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، ایسا ظلم اہلِ کتاب میں سے پہلے نصاریٰ سے سرزد ہوا کہ جسوقت یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شہید کرنے کی فکر میں ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو آسمان پر اُٹھا لیا، اور نصاریٰ بارادۂ انتقام طیطوس رومی کے پاس پہنچے، اُسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معتقد بنا کر شام پر چڑھا لائے، اور یہودیوں کو قتل کرایا، اور ان یہودیوں کی دشمنی میں ہی بیت المقدس کو خراب کیا، اور اُسے نجاست اور خس وخاشاک سے بھر دیا (العیاذ باللہ) باوجودیکہ بیت المقدس حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا تعمیر کردہ تھا، اور تمام انبیاءِ بنی اسرائیل کی عبادت گاہ تھا، اور ہمیشہ اس میں ذکرِ الٰہی ہوتا تھا۔ اور توریت کو جہاں پایا جلا دیا۔ اسکے بعد جانبِ شرق، جائے ولادتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی عبادت گاہ بنا لیا۔ اور غلبۂ اسلام تک بیت المقدس خراب حال رہا۔ حضرت سیدنا امیر المومنین فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُسے فتح فرما کر بذاتِ خود اور صحابۂ کرام نے مل کر

اس مسجد کو بجاستوں سے پاک کرکے پانی سے صاف کیا، اور خوشبوؤں سے معطّر کیا، اور مقامِ عبادت و ذکرِ الٰہی بنایا - اور ایسا ہی ظلم مکّہ کے جاہلوں سے سرزد ہوا کہ انھوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو کعبۃ اللہ مسجدِ حرام میں آنے اور نماز و ذکر کرنے سے روکا - بلکہ اگر کسی مسلمان کو اُس میں نماز پڑھتے، ذکر کرتے دیکھتے، تو اُسے مارتے، گالیاں دیتے تھے - (عزیزی)

پھر حضورِ اکرم اور صحابۂ کرام کو مکّہ سے ہجرت کرائی، جنگِ حدیبیہ کے موقع پر حج و عمرہ سے بھی روک دیا - امام ابنِ جریر کا یہ قول کہ مکّہ والے بیت اللہ کی ویرانی میں کوشاں نہ تھے، اسکا جواب یہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کو وہاں سے روک دینے، اور مکّہ سے نکالدینے، اور بیت اللہ میں بُت بٹھادینے سے بڑھ کر اُسکی ویرانی کیا ہو سکتی ہے ؟ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے کہ وَھُمْ یَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ، یہ لوگ مسجدِ حرام سے روکتے ہیں - اور فرمایا مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا الآیہ مشرکوں سے اللہ کی مسجدیں آباد نہیں ہو سکتیں" جو اپنے کفر کے خود گواہ ہیں، جنکے اعمال غارت ہیں، اور جو ہمیشہ کے لیے جہنمی ہیں، اُن سے مسجد کی آبادی کیسے ہو سکتی ہے - مسجدوں کی آبادی اُن لوگوں سے ہوتی ہے، جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والے، اور نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ کے پابند ہیں، یہی لوگ راہِ راست پر ہیں - ایک اور جگہ ارشادِ باری ہے ھُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الآیہ یعنی یہ کفار ایسے لوگ ہیں، جو تمہیں مسجدِ حرام سے روکتے ہیں - ان لوگوں نے کفر بھی کیا اور مسجدِ حرام سے بھی روکا، اور قربانگاہ تک قربانی کے جانوروں کو جانے بھی نہ دیا - اگر ہمیں اُن مومن مردوں اور عورتوں کا خیال نہ ہوتا، جو اپنی ضعیفی اور کم قوتی کے باعث مکّہ سے نہیں نکل سکے جنھیں تم جانتے بھی نہیں، تو ہم تمہیں اُن سے لڑکر اُنکے غارت کر دینے کا حکم دیدیتے، لیکن یہ بے گناہ مسلمان نہ پس جائیں، اسلیے ہم نے سر دست یہ حکم نہیں دیا - لیکن اگر یہ کفار اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے، تو وہ وقت دُور نہیں جب ان پر ہمارے دردناک عذاب برس پڑیں - لہٰذا جب وہ مسلمان ہستیاں جن سے مسجدوں کی آبادی حقیقی معنی میں ہے وہ ہی روک دیئے گئے، تو مسجدوں کے اُجاڑنے میں کونسی کمی رہ گئی - مسجدوں کی آبادی صرف ظاہری رنگ و روغن سے نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ذکر اللہ ہونا، اس میں شریعت کا قائم رہنا انھیں شرک اور ظاہری میل کچیل سے پاک رکھنا، یہی انکی حقیقی آبادی ہے - (ابنِ کثیر)

لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ دنیا میں اُنکے لیے رسوائی ہے" کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ دنیا کی رُسوائی سے مُراد امام مہدی کے زمانہ کی رُسوائی بھی ہے، اور جزیہ کی ادائیگی بھی - حدیث شریف میں ایک دعا وارد ہوئی کہ اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَۃِ - اے خدا تو ہمارے کاموں کا انجام بہتر فرما، اور دنیا کی رُسوائی اور آخرت کے عذاب سے ہمیں نجات دے - (ابنِ کثیر)

وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر مُونھ کرو تو اُدھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے بیشک اللہ وسعت والا علم والا ہے

شانِ نزول :- صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ایک اندھیری رات سفر میں تھے، جہتِ قبلہ معلوم نہ ہو سکی، ہر ایک شخص نے جس طرف اُسکا دل جما نماز پڑھی، صبح کو سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حال عرض کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی - **مسئلہ** اس سے معلوم ہوا کہ جہت معلوم نہ ہو سکے، تو جسطرف دل جمے کہ یہ قبلہ ہے، اُسی طرف مُونھ کرکے نماز پڑھے -

اس آیت کی شانِ نزول میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اُس مسافر کے حق میں نازل ہوئی جو سواری پر نوافل ادا کرے، اُسکی سواری جسطرف متوجہ ہو جائے اُسطرف اُسکی نماز درست ہے - بخاری و مسلم کی احادیث سے یہ ثابت ہے - ایک قول یہ ہے کہ جب تحویلِ قبلہ کا حکم دیا گیا، تو یہود نے مسلمانوں پر طعنہ زنی کی، اُنکے رد میں یہ آیت نازل ہوئی، بتایا گیا کہ مشرق و مغرب سب اللہ کا ہے جسطرف چاہے قبلہ معیّن فرمائے، کسی کو اعتراض کا کیا حق - (خازن) ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت دعا کے حق میں وارد ہوئی، حضور سے دریافت کیا گیا کہ کسطرف مُونھ کرکے دعا کیجائے ؟ اسکے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی - ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت حق گریز و فرار میں ہے، اور اَیْنَمَا تُوَلُّوْا کا خطاب اُن لوگوں کو ہے جو ذکرِ الٰہی سے روکتے اور مسجدوں کی ویرانی میں سعی کرتے ہیں کہ وہ دنیا کی رُسوائی اور عذابِ آخرت سے کہیں بھاگ نہیں سکتے، کیونکہ مشرق و مغرب سب اللہ کا ہے، جہاں بھاگینگے وہ گرفت فرمائیگا - اس تقدیر پر وَجْہُ اللّٰہِ کے معنی خدا کا قرب و حضور ہے - (فتح)

ایک قول یہ بھی ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اگر کفار خانۂ کعبہ میں نماز سے منع کریں، تو تمہارے لیے تمام زمین مسجد بنادی گئی ہے، جہاں سے چاہو قبلہ کی طرف مُونھ کرکے نماز پڑھو - (خزائن العرفان)

مطلب یہ کہ وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ "اور اللہ ہی کا ہے پورب اور پچھم" - یعنی ساری زمین مشرق اور مغرب اُسی کی مِلک اور مخلوق ہیں، اور تمام مخلوقات اُسکے وجود کے مظاہر اور اُسکے نور کے جلوہ گاہ ہیں، اور وہی آسمان و زمین کا نور، اور تمام چیزوں کا تھامنے والا ہے، اسلیے وہ کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں - اور قبلہ کا مسئلہ، تعبّدی ہے اور تکلیف بقدرِ وسعت ہوا کرتی ہے اسلیے اے مسلمانو! اگر تم فرائض میں بسبب کسی خوف و دشمن، یا قبلہ نامعلوم ہونے کے باعث قبلہ کی طرف مُونھ کرنے پر قادر نہ ہو، یا قبلہ کے بارے میں تم نے تحرّی (دل جمنے کی سعی) کی، اور اُسمیں غلطی ہوئی، یا نوافل میں سواری سے اُترنے میں تم اپنا حرج سمجھو، کیونکہ نوافل میں فرائض سے زیادہ سہولت رکھی گئی ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ تو تم جدھر مُونھ کرو وجہ اللہ ہے - یعنی وہی جہتِ قبلہ ہے - حسن، مجاہد، قتادہ اور مقاتل نے وَجْہُ اللّٰہِ کی تفسیر جہتِ قبلہ کی ہے - اور بعض مفسرین نے کہا کہ وہی جہت، اللہ کی رضا ہے - اور بعض مفسرین نے کہا کہ یہ آیت متشابہات سے ہے جیسا کہ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ اور آیتِ کریمہ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ وغیرہ متشابہات ہیں - ابنِ جریر نے مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب آیتِ کریمہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ "مجھ سے دعا مانگو قبول فرماؤنگا" نازل ہوئی، تو اہلِ عرب نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کس طرف ہے، کہاں ہے ؟ کہ دعا کریں، اسکے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی - اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ بیشک اللہ وسعت والا یعنی اللہ تعالیٰ اپنے نور سے تمام اشیاءِ مشارق و مغارب کو محیط ہے، اور احاطہ کسی خاص کیفیت پر نہیں، اور نہ اُسکی حقیقت دریافت ہو سکتی ہے - امام ربانی مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ "حقیقت الصلوٰۃ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس وسعت سے مُراد ذاتی وسعت بلا کیفیت ہے اور اسکی کُنہ مدرک نہیں ہو سکتی - (مظہری) عَلِیْمٌ "علم والا ہے" - یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے عذر اور اُنکی مصلحتوں، اور اُنکی نیتوں کو خوب جانتا ہے - اگرچہ اُسکا حضور ہر مقام میں تمہاری فہم میں نہیں آسکتا، مگر تمہیں اتنا معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر مکان میں ہر چیز اُسی کے تحتِ علم ہے، اور قبولِ عبادت اور اجابتِ دعا کے لیے اُس کا احاطۂ علمی ازبس کافی ہے -

ابحاثِ لطیفہ اس مقام پر چند لطیف و عجیب بحثیں ہیں - اول بحث یہ کہ مذکورہ دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مسجد کو ذکر و نماز سے معطل کرے، اور ظاہر و باطنی ویرانی کرے، وہ بڑا ظالم ہے، حالانکہ اہلِ شرع کے اجماع سے ثابت ہے کہ کفر و شرک تمام گناہوں سے بڑا گناہ، اور تمام ظلموں سے بڑا ظلم ہے، جیسا کہ آیتِ کریمہ میں ہے اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ "بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے" تو ان میں وجہ تطبیق کیا ہے ؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ اعتبارات مختلف ہیں، ایک اعتبار سے مشرک و کافر بڑے ظالم ہیں، اور دوسرے اعتبار سے مسجد کو خراب و ویران کرنے والے بڑے ظالم ہیں - مطلب یہ کہ مشرک و کافر اسلیے بڑے ظالم ہیں کہ انھوں نے اپنی جانوں کو ابدی ہلاکت میں گرفتار کرکے اللہ تعالیٰ کے حقوق و واجبات کا اتلاف کیا ہے - اور مسجد کو ویران و خراب کرنیوالے اس لیے بڑے ظالم ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو عبادت جیسی سعادتِ سرمدی سے روکا، اور معرفتِ معبود معدوم کرنے میں سعی کی - کافر و مشرک اگرچہ معرفتِ توحید و نبوّت نہیں رکھتے لیکن وہ معرفتِ معبود میں مانع نہیں ہیں، اور نہ وہ دوسروں کو اس سعادت سے محروم کرتے ہیں - لہٰذا دونوں اپنی اپنی حالت و اعتبار کے لحاظ سے بڑے ظالم ہیں - چونکہ اسمِ تفضیل میں بوجہ من الوجود زیادتی کافی ہوتی ہے، نہ کہ من کل الوجہ زیادتی - دوسری بحث یہ کہ جو شخص ذکرِ الٰہی سے منع کرے، دین اور شعارِ شرع کے قیام سے لوگوں کو کسی وجہ سے روکے، وہ اس وعیدِ شدید میں داخل ہے - اسلیے ہر مسلمان کو اس میں احتیاط لازم، اور اسکے مقدمات و دواعی، اور اسباب و قرینہ، خواہ بعید ہوں یا قریب، ہر ایک سے احتراز کرے -

وجہ نسبت مسجد کی خدا کی طرف تیسری بحث مسجد کی اضافت خدا کی طرف ہے - یہ اسلیے کہ مسجد کی اضافت خدا کی طرف کرنے میں اُسکی تعظیم و شرافت ہے - اگر یہ نہ ہو تو مسجدیں، تو انسانوں کی بنائی ہوئی اور ائمہ و خطباء اور مؤذنوں کی جائے رہائش ہے - اور اگر یہ کہیں کہ حقیقت میں مسجدیں خدا کی مِلک ہیں، تو اس میں مسجدوں کی کیا خصوصیت، سارا جہان، اور ساری مخلوق ہی خدا کی مملوک ہے

جیسا کہ فرمایا وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ، مشرق و مغرب خدا کی ہی ملک ہیں۔ لہٰذا مسجدوں کی خدا کی طرف نسبت، محض شرافت و تعظیم کے لیے ہی ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کو بیت اللہ، اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقۃ اللہ فرمایا گیا۔

مسجد کی اضافت میں تعظیم و شرافت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی ملکیت کے اعتبار سے سارا جہان ہی خدا کی ملکیت میں یکساں ہے، مگر امکنہ متبرکہ اور مقاماتِ مقدسہ، چونکہ ابتدائی ملکیت کے ساتھ ملکیتِ ثانیہ سے بھی اضافت حاصل ہو گئی، اسلیے اس میں تعظیم و شرافت پیدا ہو گئی۔ اسلیے کہ ان امکنہ متبرکہ کو پہلے انسانوں کی ملکیت میں داخل کیا، پھر انسانوں نے حصولِ ملکیت کے بعد اللہ کے ہی حکم سے رضا اور رغبت کے ساتھ حسبۃً للہ اپنی ملکیت سے نکال کر اُس کی عبادت و ذکر کے لیے وقف کر دیا، جیسے کہ قربانی کے جانور وغیرہ۔ اس بنا پر ان مقامات کو نسبت اور خیر و برکت کے ایک قسم کا امتیاز حاصل ہو گیا، اور دوسرے مقامات کی بہ نسبت ان میں خدا کی طرف نسبت و اضافت زیادہ متحقق ہو گئی۔ اسی لیے ان امکنہ متبرکہ کو تشبیہاً بیوت اللہ اور خانۂ خدا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے حدیث شریف میں وارد ہے کہ احب البلاد الی اللہ مساجدھا و ابغض البلاد الی اللہ اسواقھا "اللہ کے نزدیک شہر و آبادی میں سب سے محبوب جگہ اُنکی مسجدیں ہیں، اور ان میں سب سے بدتر جگہ اُنکے بازار ہیں" کیونکہ مسجدوں میں جانے سے خدا کی یاد ہوتی ہے، اور دل خدا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بازار میں جانے سے چونکہ وہ یادِ الٰہی سے روکتی، اور دنیاوی باتوں کی طرف راغب کرتی ہے، اور طرح طرح کی نفسانی خواہشیں، کھانے پینے، خریدنے فروخت کرنے، اور نامحرم عورت و مرد اور لڑکوں کو دیکھنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، اسلیے وہ بدترین جگہ فرمایا گیا۔

چوتھی بحث یہ ہے کہ ان آیتوں میں جو مسجد کی ویرانی و خرابی کی سعی کرنے والوں کی مذمت بتائی گئی ہے، وہ مسجدوں کو آباد کرنے والوں اور انکی صفتِ عدل و ایمان کے اثبات کے مقابلہ میں ہے چنانچہ ارشادِ باری ہے اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ "بلاشبہ وہی لوگ جو اللہ پر ایمان لائے ہیں مسجدوں کی بنا اور اُسکی آبادی کے موجب ہیں"۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں ہے کہ اذا رأیتم الرجل یتعاھد المسجد فاشھدوا لہ بالایمان، یعنی جب تم دیکھو کہ کوئی شخص مسجد کی خبرگیری کرتا ہے، اور بار بار وہاں حاضر ہو کر یادِ الٰہی بجا لاتا ہے تو تم اسکے ایماندار ہونے کی گواہی دو۔

پانچویں بحث یہ کہ شریعتِ مطہرہ میں تعظیمِ مسجد کے سلسلہ میں جو احکام وارد ہیں، وہ کئی قسم کے ہیں، ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اُنکی ادائیگی اور بجا آوری میں کوتاہی اور دریغ نہ کرے، تاکہ وہ مسجد کو خراب و ویران کرنیوالوں میں شمار نہ ہو۔ اول یہ کہ تاریکی میں پیادہ پا چل کر ادائیگی فرض کیلیے مسجد میں حاضر ہو، چونکہ حدیث میں ہے کہ تاریکی کے وقت مسجد میں جانا گناہوں کے کفارہ کا سبب ہے۔ اور ایک اور حدیث میں ہے کہ جو اپنے گھر میں خوب اچھی طرح پاکیزگی اور طہارت کرکے محض ادائیگی فرض کے لیے مسجد میں جائے، تو اُسکے ہر ہر قدم پر بہشت کے درجات حاصل ہوتے، اور اُسکے گناہ محو ہوتے جاتے ہیں۔ دوم یہ کہ مسجد کو گرد اور کوڑے، اور تھوک و مکروہاتِ طبع سے، اور نجاساتِ شرعیہ سے پاک و صاف رکھے، اور مسجد کو روشن و منور اور معطر رکھے، اور صاف و ستھرے فرش سے آراستہ رکھے۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ مسجد کے فرش کو خس و خاشاک سے صاف کرنا، اور جاروب کشی کرنا، یہ جنت کی حوروں کا مہر ہے۔ سوم یہ کہ جب مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کرے۔ صحاحِ ستہ میں ابی قتادہ کی حدیث ہے کہ اذا دخل احدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل ان یجلس "جب تم میں سے کوئی مسجد میں (با طہارت غیر مکروہ وقت میں) داخل ہو، تو بیٹھنے سے پہلے دوگانہ (تحیۃ المسجد) پڑھے اور اگر اس سے پہلے فرض و سنت ادا کر لیے، تو اب تحیۃ المسجد ساقط ہو گئی۔ چہارم یہ کہ مسجد میں جب داخل ہو تو پہلے اپنا داہنا پاؤں داخل کرے، اور جب نکلے تو پہلے اپنا بایاں پاؤں نکالے۔ اور سیدتنا خاتونِ جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا علیہا و علی ابیہا و سلم فرماتی ہیں کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ پڑھے صلی اللہ علی سیدنا محمد و سلم رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک اور مسجد سے نکلتے وقت یہ پڑھے صلی اللہ علی سیدنا محمد و سلم رب اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب فضلک۔ پنجم یہ کہ نماز یا جماعت کے انتظار میں مسجد میں بیٹھنا عبادت ہے۔ اسی طرح بعد ادائے نماز ذکر و تہلیل و تسبیح و وعظ و نعت خوانی وغیرہ کے لیے بیٹھنا بھی عبادت ہے۔ حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ ادائے نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنے والے کیلیے فرشتے یہ دعا کرتے رہتے ہیں اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ "اے خدا اسے بخشدے اور اس پر رحمت فرما"۔ اور یہ اُسوقت تک دعا مانگتے رہتے ہیں کہ جبتک مصلی کا وضو نہ ٹوٹے۔ ششم یہ کہ مسجد میں کوئی دنیاوی کام خرید و فروخت، معاملات و گفتگو وغیرہ نہ کرے، بلکہ بہ ہیئتِ نماز کے ساتھ قبلہ رو ہو کر صف بستہ بیٹھیں، اور ذکر و اذکار میں مشغول رہیں۔ اور مستحب یہ ہے کہ مسجد میں گم شدہ چیز کو باوازِ بلند تلاش نہ کرے۔ اور یہ کہ بچوں، پاگلوں، دیوانوں کو مسجد میں نہ آنے دیں، اور ہتھیار لیکر مسجد میں نہ آئیں، جنگ و جدال، چیخ و پکار، اژدحام و بلوہ، دنیاوی باتیں، اور سوال کرنا حرام ہے، اندرونِ مسجد سائل کو نہ دینا چاہیئے تاکہ انھیں عادت نہ پڑے۔ گانا بجانا، کھیلنا، کودنا حرام ہے، ایسے اشعار جس میں توحید و نعت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہو، اور وعظ و نصیحت، درست ہے، چونکہ یہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔ اور بغیر ضرورت مسجد میں سونا مکروہ ہے، البتہ معتکف کے لیے جائز ہے۔ کچا لہسن و پیاز کھا کر، اور حقہ کی بو منھ میں لیکر، بغیر مسواک کیے مسجد میں جانا ناجائز ہے۔ (عزیزی) مزید مسائل و احکام و آداب، کتبِ فقہیہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اور بولے خدا نے اپنے لیے اولاد رکھی پاکی ہے اُسے بلکہ اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسکے حضور گردن ڈالے ہیں۔ نیا پیدا کرنیوالا آسمانوں اور زمین کا

وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝

اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اُس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

شانِ نزول: یہود نے حضرتِ عزیر علیہ السلام کو، اور نصاریٰ نے حضرتِ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا، اور مشرکینِ عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتایا، اُنکے رد میں یہ آیت نازل ہوئی، فرمایا سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے اِس سے کہ اُسکے اولاد ہو، اُسکی طرف اولاد کی نسبت کرنا اُسکو عیب لگانا اور بے ادبی ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابنِ آدم نے مجھے گالی دی میرے لیے اولاد بتائی، میں اولاد اور بیوی سے پاک ہوں۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بلکہ اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور مملوک ہونا اولاد ہونے کے منافی جب تمام جہان اُس کا مملوک ہے، تو کوئی اولاد کیسے ہو سکتا ہے۔ **مسئلہ** اگر کوئی اپنی اولاد کا مالک ہو جائے، تو وہ اُسی وقت آزاد ہو جائے گی۔ (خزائن العرفان)

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ، سب اُسکے حضور گردن ڈالے (اطاعت گزار) ہیں۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا، جس نے بغیر کسی مثالِ سابق کے اشیاء کو عدم سے وجود عطا فرمایا۔ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ، اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اُس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اور کائنات اُسکے ارادہ فرماتے ہی وجود میں آجاتی ہے (خزائن)

كُنْ فَیَكُوْنُ پر علماء کی چند بحثیں ہیں، **اول** یہ کہ معدوم کو خطاب کرنا تو جائز نہیں (بلکہ متصور بھی نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے یہ لفظِ کُن کیوں اور کیسے فرمایا؟ بعض علماء نے تو اسکا جواب یہ دیا ہے کہ اُس شے کا وجود چونکہ معدوم تھا (جو کہ علمِ الٰہی میں تھا) اسلیے وہ گویا ابھی موجود ہو گئی، اور خطاب صحیح ہو گیا۔ اور ابنِ انباری نے کہا ہے کہ یَقُوْلُ لَهٗ کے معنی یہ ہیں کہ اُسکے پیدا کرنے کیلیے یوں فرماتا ہے یہ مطلب نہیں کہ خود اُس شے معدوم کو فرماتا ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ حقیقتاً یہ مراد نہیں کہ کسی شے کو امر فرمایا ہو، اور اُس نے امتثالِ امر کیا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی یہ ایک مثال دی ہے کہ جسطرح کوئی آمر کسی مامور کو کہے اور وہ فوراً اطاعت میں کمربستہ ہو جائے، اسی طرح ہم جب چاہتے ہیں کسی شے کو پیدا فرما دیتے ہیں۔ **دوسری بحث** یہ ہے کہ ابنِ عامر نے چونکہ فَیَكُوْنَ میں جمہور کے خلاف نصب پڑھا ہے، اُنکے نصب پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جوابِ امر ہے اور فا کے بعد اَنْ مقدر ہے۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اَنْ کے مقدر ہونے کی شرط یہ ہے فا کا ماقبل مابعد کا سبب ہو، اسطرح پر لازم آتا ہے کہ ممکن کے لیے دو کون (موجود ہونا) ہوں۔ اس کا جواب اسطرح دیا گیا ہے کہ کونِ اول مجازاً وجوب اسطرح پر مراد ہے کہ مُسبّب کا سبب پر اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ ممکن جبتک حدِ وجوب میں نہیں آتا، موجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا کُن کا حاصل یہ ہونا چاہیے کہ وجوب اس شے کا موجود ہو۔ صاحبِ تفسیر **مظہری** فرماتے ہیں کہ اسکا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اول کُون سے مراد اس دار العمل یعنی دنیا میں مسبّب ہونا ہے، اور دوسرے کُون سے دار الجزاء یعنی آخرت میں مسبّب ہونا مراد ہو۔ لیکن اس تقدیر پر یہ آیت مکلفین کے ساتھ خاص ہوگی، حالانکہ طرزِ کلام

عموم کا مقتضی ہے۔ اور عمدہ جواب یہ ہے کہ اول کُنْ سے مراد اس شے کا وجود علمی کے ساتھ مرتبۂ اعیانِ ثابتہ میں موجود ہونا ہے، اور دوسرے کُنْ سے اس شے کا خارج میں بوجودِ ظلی موجود ہونا ہے صوفیائے کرام رحمہم اللہ نے اسی طرح فرمایا ہے، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اعیانِ ثابتہ کا مرتبہ بحدوثِ زمانی حادث ہے۔ اس تفسیر پر یہ آیت "توحیدِ شہودی" پر دال ہے، جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے فرمایا "توحیدِ وجودی" پر دلالت نہیں کرتی، جیسا کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ ممکنات نے خارج میں وجود کی بو تک نہیں سونگھی۔ واللہ اعلم۔ تیسری بحث یہ کہ یَکُوْنُ کا نصب جو اِنْ مقدر کی وجہ سے ہے چاہتا ہے کہ صیغۂ امر اپنے معنی میں ہو، کیونکہ اِنْ تو امرِ حقیقی کے بعد ہی مقدر ہوتا ہے، اور حالانکہ یہاں امر اپنے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ مراد جلد حاصل ہو جانے کی مثال ہے پھر نصب کس طرح متصور ہو سکتا ہے۔ اسکا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ نصب ظاہر لفظ کے اعتبار سے ہے نہ کہ معنی کے اعتبار سے، اور ظاہر صیغہ، صیغۂ امر ہے۔ (مظہری)

ان ابحاث میں سب کا مطلب یہی ہے کہ اِدھر خدا کا ارادہ کسی چیز کی تخلیق کا ہوا، اور اُس نے کہا "ہو جا" وہ اُسی آن ہو جاتی ہے، اُسکے ارادہ سے مراد جدا نہیں۔ غرضکہ مندرجہ بالا آیت میں عیسائیوں کو نہایت لطیف اشارہ سے یہ بھی سمجھایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی کُنْ کے کہنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسری جگہ صاف فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ؕ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام جیسی ہے، جنھیں مٹی سے پیدا کر کے فرمایا "ہو جا" وہ ہو گئے۔ واللہ اعلم

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ مِّثْلَ قَوْلِہِمْ ؕ تَشَابَہَتْ

اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمیں کوئی نشانی ملے ان سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات اِنکے اُنکے دل

قُلُوْبُہُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝

ایک سے ہیں بیشک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لیے

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ "اور جاہل بولے"، یعنی اہلِ کتاب یا مشرکین لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ "اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا"۔ یعنی بے واسطہ خود کیوں نہیں کلام فرماتا جیسا کہ ملائکہ اور انبیاء سے کلام فرماتا ہے۔ یہ ان کا کمال تکبر اور نہایت سرکشی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو انبیاء و ملائکہ کے برابر سمجھا۔ **شانِ نزول**:۔ رافع بن خزیمہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو اللہ سے فرمائیے، وہ ہم سے کلام کرے ہم خود سنیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ **مطلب** یہ کہ اللہ ہم سے اسطرح باتیں کرتا جسطرح فرشتوں سے کرتا ہے یا جسطرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا، تو حاجتِ رسول کی ہی نہ ہوتی یا اللہ ہم سے فرمادے کہ یہ ہمارا رسول ہے۔ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَۃٌ "یا ہمیں کوئی نشانی ملے"۔ یہ اُن آیات کا عناداً انکار ہے، جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ گویا کہ وہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت سے عناداً انکار کر رہے تھے۔ از راہِ تکبر براہِ راست خدا سے ہمکلام ہونے کا مطالبہ کرنے لگے، اگر یہ نہ ہو تو کوئی ایسی علامت و نشانی آجائے جس سے لاچار ہو کر حقیقت معلوم کرنے کی توجہ کرنی پڑے، مثلاً مکہ کی زمین جو بے آب و گیاہ ہے، اُس میں چشمے جاری ہو کر یکدم اُسے سرسبز و شاداب کر دے، یا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر گرے، یا فرشتے پرے باندھ کر صف بستہ ہمارے سامنے نمودار ہوں، یا آپ کے لیے سونے چاندی کا محل ظاہر ہو جائے، یا آپ آسمان پر جا کر ایک دفعہ ہی کتاب اپنے ہمراہ لا کر ہمیں دیں، اور اُس کتاب کو لاتا ہوا ہم آپ کو دیکھیں پھر ہم اُس کتاب کو پڑھیں۔ غرضکہ انکی ساری کج بحثی کا مطلب انکی نادانی و بے علمی تھی، وہ نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا رتبہ کتنا عظیم ہے، وہ تو ابھی تک اس کے پہلے درجہ، یعنی ایماندار ہونے سے بھی محروم ہیں، ایمان بھی انہیں حاصل نہیں، اور ہمکلامی کا مرتبہ تو ملائکہ و انبیاء کے ساتھ مختص ہے، انہیں کہاں میسر ہے۔ خدا کے ساتھ ہمکلامی کی فرمائش کرنا، گویا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو انبیاء یا فرشتہ بنا دے۔ ایسی فرمائش ان نادانوں سے مستبعد نہیں کیونکہ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ مِّثْلَ قَوْلِہِمْ "اس سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات"۔ یعنی ان سے پہلے لوگوں نے بھی اپنے اپنے نبیوں کے ساتھ ایسی ہی باتیں بنائی ہیں، اِن میں اور اِنکے متقدمین کی جہالت میں سرِ مو فرق نہیں ہے، چنانچہ ان سے پہلے کفار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں کہا اَرِنَا اللّٰہَ جَہْرَۃً وَاجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰـہًا کَمَا لَہُمْ اٰلِـہَۃٌ یعنی بالمشافہ ہمیں خدا کو دکھایئے اور ہمارے لیے ویسا ہی معبود بنایئے جیسا انکے لیے ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا ہَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ "کیا تمہارا رب استطاعت رکھتا ہے کہ وہ آسمان سے ہم پر دسترخوان اتارے"؟ اسی قسم کی باتیں اور نبیوں سے بھی کہی گئی ہیں ان میں اور اُن میں باعتبارِ زمان و مکان، قوتِ جسم اور طولِ عمر میں بہت اختلاف ہے، لیکن تَشَابَہَتْ قُلُوْبُہُمْ "انکے اور اُنکے دل ایک سے ہیں"، کوری و نابینائی اور کفر و قساوت میں۔ اس میں نبی کریم اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تسکینِ خاطر فرمائی گئی ہے کہ آپ انکی سرکشی اور معاندانہ انکار سے رنجیدہ نہ ہوں پچھلے کفار بھی انبیاء کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے۔ (خزائن العرفان) جسطرح پچھلے کفار کے دلوں میں شبہات واہیہ بعد انبیاء کے معجزات کا انکار ہوتا تھا اس زمانہ کے کفار کے دلوں میں بھی واقع ہوتے ہیں۔ لہٰذا خدا سے ہمکلامی کی فرمائش، اِن میں اور اُن میں مشابہت صریح جہل و نادانی ہے، اسکے جواب کی طرف توجہ کی حاجت ہی نہیں۔ رہی کسی آیت و معجزہ کی فرمائش، تو ہم جواب میں فرماتے ہیں کہ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ "بیشک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لیے"۔ یعنی آیاتِ قرآنیہ و معجزاتِ باہرات، انصاف والے کو سیدِ عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین دلانے کے لیے کافی ہیں، مگر جو طالبِ یقین نہ ہو، وہ دلائل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ (خزائن العرفان) رہے وہ لوگ جو تعصب و عناد میں مشغول ہیں، اور تعجیز کا ارادہ کرتے ہیں، اگر وہ غور و تامل سے کام لیں، تو اُن پر واضح ہو جائیگا کہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی صداقت کیلیے جن معجزات کی ضرورت ہوتی ہے وہ حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دستِ اقدس سے ظہور پذیر ہو چکے ہیں، اور ہو رہے ہیں۔ مثلاً شق القمر، رجعِ آفتاب، شجر و حجر کا سلام و اطاعت، گریۂ استنِ حنانہ، سنگریزوں کا کلمہ پڑھنا، جانوروں کا انگشتِ شہادت سے پانی کا چشمہ بہنا، لعابِ دہن سے دُکھتی آنکھ کا تندرست ہونا، کٹے ہوئے بازو کا جڑ جانا، کھاری کنوئیں کا شیریں بنجانا وغیرہ بیشمار آپ کے معجزاتِ باہرات ہیں۔ اب رہا تعجیز سے ولاچاری سے ایمان کی طرف آنا، تو ایسا ایمان تو کسی وقت بھی قابلِ قبول نہیں۔ ایمان صحیح وہی ہے جو اپنے اختیار سے ہو، اضطرار و لاچاری کے ساتھ نہ ہو۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات و علامات میں یہ شرط ہے کہ وہ قابلِ انذار و تبشیر ہوں۔ اور یہ بات حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خوب روشن طریقہ پر ظاہر ہو چکی ہے، اب ان سے انکار محض کور باطنی، التعصب و ہٹ دھرمی ہی کی بنا پر ہے۔ (ملخصاً عزیزی) غرضکہ ہم نے یقین والوں کے لیے اپنی آیتیں بیان کر دیں، جن سے رسول کی التصدیق عیاں ہے، کسی اور چیز کی طلب کی حاجت باقی نہیں رہی۔ یہی نشانیاں ایمان لانے کے لیے کافی ہیں، البتہ جنکے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو انھیں کسی آیت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْہِمْ الآیہ جن پر تمہارے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے (اور اُنکے دلوں پر مہر لگ چکی ہے) وہ ایمان نہ لائینگے، گو اُنکے پاس تمام آیتیں آجائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ۝

بیشک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کفار کے تعصب و عناد اور وضوحِ حق کے بعد انکار و انحراف پر حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تسکینِ خاطر فرماتا ہے، ارشاد ہوتا ہے (اے محبوب!) بیشک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری اور ڈر سناتا، اور تم سے دوزخ والوں کا سوال نہ ہوگا، کہ وہ کیوں ایمان نہ لائے، اسلیے کہ آپ نے اپنا فرضِ تبلیغ پورے طور پر ادا فرما دیا۔

مطلب یہ کہ اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اِن بدنصیب کفار کے بارے میں آپ سے کوئی سوال نہ ہوگا، کیونکہ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ الآیہ آپ پر تو صرف تبلیغِ رسالت ہے اور ان کا حساب و کتاب ہمارے ذمہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا فَذَکِّرْ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ؕ لَسْتَ عَلَیْہِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۝ آپ انہیں نصیحت فرمایئے، کیونکہ آپ صرف نصیحت پہنچانے والے ہیں ان پر آپ

کوتوال نہیں ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ الآیہ "ہم جانتے ہیں جو یہ مونہوں سے کہتے ہیں، تم ان پر جبر کرنیوالے نہیں ہو، تم صرف قرآن کی نصیحتیں انھیں سُنادو جو قیامت سے ڈرتے ہیں"۔ اس مضمون کی بکثرت آیات ہیں۔

بعض مفسرین اِس آیت کی تفسیر میں اختلافِ قرأت کے بموجب بعض اقوال بھی ذکر کرتے ہیں، لیکن وہ تمام اقوال درجۂ اعتبار تک نہیں پہنچتے۔ چنانچہ بعض نے کہا کہ یہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے والدین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی، حالانکہ وہ سب ضعاف یا مؤول ہیں، ان سے استناد درست نہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ نے متعدد رسائل لکھے ہیں، جن میں اُن کا ایمان و اسلام ثابت کیا ہے۔ فقیر جامع تفسیرات عفرلہٗ نے اُن میں سے ایک رسالہ "مسالک الحنفاء لآباء المصطفٰی" کا ترجمہ کر کے ترجمہ و عربی دونوں یکجا شائع کر دیئے ہیں، طلب کر کے ملاحظہ کیجئے

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ

اور ہرگز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہونگے جبتک تم اُنکے دین کی پیروی نہ کرو تم فرمادو اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے اور (اے سُننے والے کسے باشد) اگر تو اُنکی خواہشوں کا

بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ

پیرو ہوا بعد اسکے کہ تجھے علم آچکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار جنھیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہیئے تلاوت کرتے ہیں

اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ

وہی اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اُس کے منکر ہوں تو وہی زیاں کار ہیں اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا،

عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ○ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ

اور وہ جو میں نے اُس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی اور ڈرو اُس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا بدلا نہ ہوگی اور نہ اُس کو کچھ لیکر چھوڑیں

وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے اور نہ اُنکی مدد ہو

ان یہود و نصاریٰ کے کفر و عناد، اور اُنکے بیہودہ شبہات اور باطل مطالبات پر جو حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کبیدگی اور آزردہ دلی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ آپ کی تسکینِ خاطر کے سلسلہ میں مزید فرماتا ہے کہ اے محبوب تم کیوں آزردہ خاطر ہوتے ہو، اور رنج و ملال کی مشقت کیوں جھیلتے ہو، ہرگز تم سے یہود و نصاریٰ راضی نہ ہونگے، جب تک تم اُنکے دین کی پیروی نہ کرو، اور یہ ناممکن، کیونکہ وہ باطل پر ہیں۔ (خزائن العرفان)

ملت وہ طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے واسطے اپنے انبیاء کی زبانی مقرر فرمایا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب نے حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے صلح کی درخواست کی تھی کہ اگر آپ ہمیں مہلت دینگے، تو ہم ایمان لے آئینگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ثعلبی نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ جب حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اہلِ کتاب کے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے، تو مدینہ کے یہود، اور نجران کے نصاریٰ اس امید میں تھے کہ آپ ہم میں ملجائینگے، جب کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا، تو ناامید ہو گئے اور اسکے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ اس تفسیر کی رُو سے گویا حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اہلِ کتاب کے ایمان لانے سے ناامیدی دلائی گئی، اور بتایا گیا کہ اِن کا ارادہ تو یہ ہو رہا ہے کہ آپ انکے دین کا اتباع کریں پھر یہ آپ کے دین کا کیسے اتباع کرینگے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اہلِ کتاب نے صراحت سے زبان سے ایسا کہا بھی ہو، چنانچہ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتا ہے قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى "تم فرمادو اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے" اور وہی قابلِ اتباع ہے، اور اُسکے سوا ہر ایک راہ باطل و ضلالت ہے، صرف اسلام ہی دینِ حق ہے" اور جبکی طرف وہ بلاتے ہیں وہ حق نہیں۔ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ "اور اے سُننے والے کسے باشد اگر تو اُن کی خواہشوں کا پیرو ہوا بعد اسکے کہ تجھے علم آچکا ہے اور دینِ اسلام کا صحیح و حق ہونا تجھے معلوم ہو چکا ہے، تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار"۔ یہ خطاب امتِ محمدیہ (مسلمانوں) کو ہے کہ جب تم نے جان لیا کہ سیدِ انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمہارے پاس حق و ہدایت لائے تو تم ہرگز کفار کی خواہشوں کا اتباع نہ کرنا، اگر ایسا کیا تو تمہیں کوئی عذابِ الٰہی سے بچانیوالا نہیں۔ (خازن و خزائن)

اہلِ کتاب کے خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ دو قسم کے گروہ ہیں، ایک گروہ تو وہ جنکے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ "جنھیں ہم نے کتاب دی ہے"، یعنی ایک گروہ وہ ہے جنھیں ہم نے کتاب دی، اور حقیقت میں کتاب کی قدر و منزلت وہی جانتے ہیں، وہ اُسکے معنی کو سمجھتے ہیں، وہ لوگ ایسے ہیں کہ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ "وہ جیسی چاہیئے اُسکی تلاوت کرتے ہیں"۔ یعنی کتابِ الٰہی پڑھتے اور بغیر تحریفِ لفظی یا معنوی اُسکے حروف و نکات کی محافظت کرتے، اور محکمات و متشابہات کی تصدیق کرتے، اور اُسکے احکام کی پیروی کرتے ہیں، چنانچہ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ "وہی اُس پر ایمان رکھتے ہیں"۔ اہلِ کتاب کا یہی گروہ ایمان و اسلام سے مشرف ہوتا ہے، اور حضور کے حق و ہدایت کا پیرو کار بنتا ہے، اور جو علم و ہدایت حضور پر نازل فرمایا ہے اُسکی تصدیق کرتا ہے، اور آپ کے معجزات انذار و تبشیر کو حق جانتا ہے۔ اور اہلِ کتاب کا وہ دوسرا گروہ جو تعصب و عناد سے کام لیتا ہے، اُسکے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ "اور جو اسکے منکر ہوں تو وہی زیاں کار ہیں"۔

شانِ نزول:- حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت اہلِ سفینہ کے باب میں نازل ہوئی جو جعفر بن ابی طالب کے ساتھ حاضر بارگاہِ رسالت ہوئے تھے، اُن کی تعداد چالیس تھی یا بتیس ۳۲، بتیس اہلِ حبشہ اور آٹھ شامی راہب، ان میں بحیرا راہب بھی تھے۔ معنیٰ یہ ہیں کہ در حقیقت توریت پر ایمان لانے والے وہی ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں اور بغیر تحریف و تبدیل پڑھتے ہیں، اور اسکے معنی سمجھتے اور مانتے ہیں، اور اُس میں حضور سیدِ کائنات محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت و صفت دیکھ کر حضور پر ایمان لاتے ہیں، اور جو حضور کے منکر ہوتے ہیں، وہ توریت پر ایمان نہیں رکھتے۔ (خزائن العرفان)

شروع پارے میں جسطرح اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو مخاطب فرمایا تھا، اب مسلسل اُن کی حالتوں کے بیان کے بعد کلام کو ختم بھی اسی مضمون پر فرماتا ہے، تاکہ وصایائے مذکورہ سابقہ میں مزید نصیحت ہو جائے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ تمام قصہ کا مقصود و نچوڑ یہی ہے، چونکہ قاعدہ ہے کہ اول مطلوب کو بطریقِ دعویٰ بیان کیا کرتے ہیں، اور پھر اُس کی دلیل اُسکے بعد، پھر اُسی دعوے کو بطریقِ نتیجہ کے ذکر کرتے ہیں۔ (مظہری) چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الآیات "اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اُس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی، اور ڈرو اُس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہوگی، اور نہ اُسکو کچھ لیکر چھوڑیں، اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے، اور نہ اُنکی مدد ہو"۔ اسمیں یہود کا رد ہے جو کہتے تھے ہمارے باپ دادا بزرگ گزرے ہیں ہمیں شفاعت کر کے چھڑا لینگے، اُنھیں مایوس کیا جاتا ہے کہ شفاعت کافر کے لیے نہیں۔ (خزائن العرفان)

اس کے بعد کی متعدد آیات میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ فرمایا جاتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ

اور جب ابراہیم کو اُسکے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا، تو اُس نے وہ پوری کر دکھائیں۔ فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں عرض کی اور میری اولاد سے

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ○

فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

اولادِ حضرتِ یعقوب علیہ السلام یعنی بنی اسرائیل کے تذکرہ کے بعد، اب بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے جدِّ اعلیٰ شیخ الانبیاء سیدنا ابراہیم کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اہلِ عرب بالعموم بنی اسمٰعیل تھے، اور مدینہ طیبہ میں کچھ قبائل اور شام و فلسطین وغیرہ میں زیادہ تر بنی اسرائیل تھے۔ جسطرح بنی اسرائیل نے بیشمار انبیاء علیہم السلام کے ساتھ زیادتیاں اور اُنکی سرکشیاں کی تھیں، اور اُنکی تعلیماتِ الٰہیہ میں تحریف و تبدیل کر کے من مانی شریعت گھڑ رکھی تھی، اسی طرح اہلِ عرب بنی اسمٰعیل نے بھی ملّتِ ابراہیمی کا دعویٰ کرتے ہوئے تعلیمات سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کو بدل ڈالا تھا۔ بت پرستی اور کفر و شرک عام ہو گیا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کر کے جہاں بنی اسرائیل کی سرزنش فرماتا ہے، وہاں بنی اسمٰعیل کو نصیحت کرتا ہے کہ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحیدِ باری تعالیٰ پر ایسا اذعان اور یقینِ کامل تھا، اور اُنکی تعلیمات و ارشادات کسطرح شرک و کفر کو ملیامیٹ کرنے والے تھے، اور آج تم ملّتِ ابراہیمی کا دعویٰ کرتے ہوئے کتنے کفر و شرک میں مبتلا ہو۔

"حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سرزمین اھواز میں بمقام سوس ہوئی۔ پھر آپ کے والد آپ کو بابل ملکِ نمرود میں لے آئے۔ یہود و نصاریٰ و مشرکینِ عرب سب آپ کے فضل و شرف کے معترف، اور آپ کی نسل میں ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے وہ حالات بیان فرمائے، جن سے سب پر اسلام کا قبول کرنا لازم ہو جاتا ہے، کیونکہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ پر واجب کیں وہ اسلام کے خصائص میں سے ہیں۔ (خزائن العرفان) چنانچہ ارشاد باری ہے:-

"اور جب ابراہیم کو اُس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا" خدائی آزمائش یہ ہے کہ بندہ پر کوئی پابندی لازم فرما کر دوسروں پر اُسکے کھرے کھوٹے ہونیکا اظہار کر دے۔ "تو اُس نے پوری کر دکھائیں" یہ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام پر آزمائش کے لیے واجب کی تھیں، اُن میں مفسرین کے چند قول ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ وہ مناسکِ حج ہیں، اور مجاہد نے کہا اِس سے وہ دس چیزیں مراد ہیں جو اگلی آیات میں مذکور ہیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ وہ دس چیزیں یہ ہیں (۱) مونچھیں کتروانا (۲) کُلّی کرنا (۳) ناک میں صفائی کے لیے پانی استعمال کرنا (۴) مسواک کرنا (۵) سر میں مانگ نکالنا (۶) ناخن ترشوانا (۷) بغل کے بال دور کرنا (۸) موئے زیرِ ناف کی صفائی (۹) ختنہ (۱۰) پانی سے استنجا کرنا۔ یہ سب چیزیں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام پر واجب تھیں، اور ہم پر ان میں سے بعض واجب ہیں اور بعض سنّت۔ (خزائن العرفان) عکرمہ نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہم سے ایک قول یہ نقل کیا کہ باتوں سے مراد تیس خصلتیں ہیں، اور وہ سب اسلام کے شرائع ہیں، کسی نے سوائے ابراہیم علیہ السلام کے (ازمنہ سابقہ میں) انھیں نہیں کیا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے انکی آزمائش میں پورا اُترنے کو اسطرح تعبیر فرمایا وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ، یہ وہ ابراہیم ہیں جنھوں نے آزمائش کی باتوں کو پورا کر دکھایا۔ وہ تیس خصلتیں یہ ہیں، جن میں سے دس سورۂ براءت میں ہیں۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ یعنی یہ لوگ توبہ کرنیوالے، عبادت گزار، ثنا کرنیوالے، اللہ کی راہ میں سفر کرنیوالے، رکوع و سجدہ کرنے والے، نیک کام کی نصیحت کرنیوالے، اور برے کام سے منع کرنیوالے، اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے، اور مسلمانوں کو خوشخبری دینے والے ہیں۔

اور دس خصلتیں سورۂ احزاب میں ہیں۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ الآیہ یعنی بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور ایمان والے اور ایمان والیاں، اور فرمانبردار اور فرمانبرداریں، اور سچے اور سچیاں، اور صبر والے اور صبر والیاں، اور عاجزی کرنیوالے اور عاجزی کرنیوالیاں اور خیرات کرنیوالے اور خیرات کرنیوالیاں، اور روزے والے اور روزے والیاں، اور اپنی پارسائی پر نگاہ رکھنے والے اور نگاہ رکھنے والیاں، اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے اور یاد کرنیوالیاں ان سب کے لیے اللہ نے بخشش اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے۔

اور دس خصلتیں سورۂ مؤمنون اور سألَ سائلٌ میں ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الآیات یعنی بیشک مراد کو پہنچے ایمان والے جو اپنی نماز میں گڑگڑاتے (خاشع) ہیں، اور وہ جو کسی بیہودہ بات کی طرف التفات نہیں کرتے، اور وہ کہ زکوٰۃ دینے کا کام کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیبیوں یا شرعی باندیوں پر جو اُنکے ہاتھ کی ملک ہیں کہ ان پر کوئی ملامت نہیں تو جو اِن دو کے سوا کچھ اور چاہے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں، اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں، یہی لوگ وارث ہیں کہ فردوس (جنّت) کی میراث پائینگے وہ اُس میں ہمیشہ رہینگے۔ (پ ۱۴)۔ اور سألَ سائلٌ کی آیات یہ ہیں، اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ الآیات یعنی جو اپنی نماز کے پابند ہیں، اور وہ جنکے مال میں ایک معلوم حق ہے اُسکے لیے جو مانگے اور جو مانگ بھی نہ سکے تو محروم رہے، اور وہ جو انصاف کا دن سچ جانتے ہیں، اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈر رہے ہیں بیشک اُنکے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں، اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیبیوں یا اپنے ہاتھ کے مال کنیزوں سے کہ اُن پر کچھ ملامت نہیں، جو اِن دو کے سوا اور چاہے وہی حد سے بڑھنے والے ہیں، اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں، اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم ہیں۔ (پ ۲۹ ع ۷)۔

اور حسن نے فرمایا کلمات سے مراد وہ سات چیزیں ہیں جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے آزمائش فرمائی تھی۔ ستارے، چاند، سورج، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انکو خوب بنظرِ غور و فکر دیکھ کر معلوم کیا کہ پروردگار ہمیشہ رہنے والا ہے، اِنکی طرح ڈھلنے اور غروب ہونے والا نہیں۔ اور چوتھے اُس آگ سے آزمائش فرمائی، جس میں نمرود نے آپ کو ڈالا تھا، اور آپ نے صبر و تحمل اور حلم کا مظاہرہ فرمایا تھا، پانچویں ہجرت، چھٹے ذبح فرزند، ساتویں ختنہ کرنے سے جانچا، ان سب پر آپ نے صبر کیا۔ اور سعید بن جبیر رضی اللہ فرماتے ہیں کہ کلمات سے مراد سیدنا ابراہیم اور سیدنا اسمٰعیل کی دعا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا الآیہ ہے۔ جبکہ انھوں نے تعمیر بیت اللہ کے وقت مناجات کی تھی۔ اور یمان بن رباب نے فرمایا کہ کلمات سے مراد ابراہیم علیہ السلام کا وہ مناظرہ ہے جو قوم سے ہوا تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے آیتِ کریمہ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ الآیہ میں بیان فرمایا۔ صاحبِ تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ کلمات سے مراد تمام اوامر و نواہی ہیں جن میں وہ تیس فضائل جو پہلے مذکور ہوئے، وہ بھی اور دس اور سات جو بعد میں مسطور ہوئے سب شامل ہیں۔ (مظہری)

چند روایات

انسانوں میں سب سے پہلے جنکے بال سفید ہوئے، وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جب آپ نے بالوں میں سفیدی کو ملاحظہ فرمایا، تو عرض کیا، خدایا یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا یہ وقار ہے عرض کیا رَبِّ زِدْنِىْ وِقَارًا، اے خدا میرے وقار میں زیادتی فرما۔ اور سب سے پہلے جس نے ازار (تہبند) سی کر پہنا، اور اُسکا نام "سروال" رکھا، وہ آپ ہی ہیں۔ مسند وکیع میں ہے اوحی اللہ تعالیٰ الی ابراھیم انک اکرم اھل الارض علی فاذا سجدت فلا تری الارض عورتک فاتخذ سروالا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم کو وحی فرمائی، روئے زمین پر میرے نزدیک سب سے بڑھ کر صاحبِ کرامت ہو کہ تم جب سجدہ کرتے ہو، تو زمین تمہاری شرمگاہ کو نہیں دیکھتی لہٰذا سروال کو لازم سمجھو۔" اور دیلمی نے بروایت اَنس رضی اللہ عنہ نقل کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا، اول وہ شخص جس نے حنّا اور وسمہ کا خضاب کیا، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور ابنِ ابی شیبہ نے بیان کیا کہ سب سے پہلے جس نے خطبہ منبر پر پڑھا، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں بزار و طبرانی بروایت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میں اپنے لیے منبر بناؤں، تو کیا مضائقہ ہے جبکہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے لیے منبر بنایا تھا، اور اگر میں عصا اپنے ہاتھ میں لوں، تو کیا حرج ہے جبکہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے لیا ہے۔ ابنِ عساکر بروایت جابر وغیرہ نقل کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے راہِ خدا میں جہاد کیا، وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں، اور جس نے پہلی مرتبہ لشکر کو لڑائی میں تعبیہ کیا اور میمنہ و میسرہ اور قلب قرار دیا، وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ابن ابی سعید نے روایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو مال و خدام میں بہت وسعت دی تھی۔ سب سے پہلے جس نے ثرید بنایا، آپ ہی ہیں۔ اور دیلمی نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نقل کی، فرمایا جس نے سب سے پہلے شیر مال پکایا، اور اُس سے مہمانوں کی تواضع کی، وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ خطیب بروایت تمیم داری، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا اظہارِ دوستی و محبت کے لیے جس نے سب سے پہلے معانقہ کیا، وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ سے قبل تحیت و تعظیم کے لیے سجدہ کی رسم تھی، آپ نے معانقہ کا اجراء فرمایا، اور اسلام نے اس میں مصافحہ کا بھی اضافہ فرمایا۔

غرضکہ ممکناتِ بشریہ سے آپ میں قوتِ علمیہ، نظریہ اور فکریہ کے لحاظ سے بہمہ وجوہ کمال حاصل تھا، اور قوتِ عملیہ اور خلقیہ و حالیہ کے اعتبار سے بھی آپ میں کمال مرتبت موجود تھی، اور بدنی طہارت و ستھرائی، اور فطرتِ روح کی صفائی، اور قبولِ استعداد لطائف سرّیہ و خفیہ کے لحاظ سے بھی آپ میں بکمال صلاحیت و لیاقت موجود تھی۔ انہی خصائل و فضائل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (عزیزی) اور آپ نے خدا کی تمام آزمائشوں میں ثباتِ قدمی دکھادی، تو قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا (امام) بنانے والا ہوں۔ وَاِذِ ابۡتَلٰۤی۔ قَالَ کا ظرف ہے اور اگر اِذِ ابۡتَلٰۤی کو اُذۡکُرۡ (یاد کرو) محذوف کا متعلق مانا جائے، تو قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ کو کلام مستقل اور جواب، سوالِ مقدر کا کہا جائے گا، گویا سائل سوال کرتا ہے کہ جب وقت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں پوری طرح ادا کردیا، تو پھر اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اِنِّیۡ جَاعِلُكَ الخ فرمایا۔ یا یہ کہا جائے کہ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ ابتلاء کا بیان ہے، تو اس صورت میں کَلِمٰت سے مراد امامت اور بیت اللہ کو پاک کرکے اُسکی بنیادوں کو اٹھانا اور اسلام وغیرہ مسائل ہیں جو آگے آیات میں مذکور ہیں۔ اور جَاعِلُ اسم جعل سے مشتق ہے، جسکے لیے دو مفعولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور امامت سے مراد اس مقام پر نبوت ہے، یا عام معنیٰ پیشوائی کے مراد لیے جائیں، یعنی جسکی اقتدار کیجائے، اور جس کی طاعت واجب ہو۔ اور سلطنت و امامت بمعنیٰ خاص مراد نہیں ہے جسے امامیہ مذہب والوں نے اختراع کیا ہے۔ اس معنی میں "امامت" شریعت اور لغت میں کہیں استعمال میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو امامتِ عامہ عطا فرمائی تھی، حتّٰی کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم ناطق آیا اِتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا، ملتِ ابراہیمی کی یکسو ہوکر پیروی کرو۔ (مظہری) حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو یہ امامت و پیشوائی مرحمت فرمائی گئی معیارِ حق تھا جسکی پیروی آپ کے بعد والوں کے لیے تمام لوگوں پر علی الاطلاق لازم تھی۔ گویا آپ کی امامت و پیشوائی مطلق تھی۔ ہر امر میں آپ کی پیروی و متابعت کافۂ انام پر واجب تھی، اور آپ کی اقتداء و اتباع لوگوں کے لیے دلیلِ حقانیت، اور آپ سے انحراف و اختلاف دلیلِ گمراہی و ضلالت اور علامتِ بطلان تھی، یہ امامتِ مطلقہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا خاصّہ ہے چنانچہ خاتمیتِ خواصِ افضل الانبیاء والمرسلین حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ اسی بناء پر ہر وہ نبی و رسول، اور ہر وہ حق و ہدایت جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے بعد ظہور پذیر ہوئی، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی تبعیت و اقتدار کے ساتھ مقرون و مشتمل تھی۔ یہود و نصاریٰ اور صابئین و اہلِ عرب سب کے سب آپ کی تعظیم اور آپ کی اتباع میں کوشاں رہتے تھے۔ اور آپ کے افعال و اقوال کو قانونِ کلّی کے طور پر شریعت و دین کا جزو جانتے تھے۔ اگرچہ بعض نبیوں پر جزئیات بمقتضائے مصلحت و ضرورت متغیر الحکم ہوئے، مگر قانونِ کلّی آپ کے ہی دین کا ہمیشہ رہا، اور آپ کا دین سب اہلِ حق کے لیے بطورِ قاعدۂ عامہ کلیہ کے طور پر قایم رہا۔ یہی فرق ملّتِ ابراہیمی اور دینِ مصطفوی علیہما الصلوٰۃ والسلام کے درمیان ہے کہ اسوقت بھی بوجوہ کلّی ملّتِ ابراہیمی واجب الاتباع ہے، اور دینِ مصطفوی، بعدِ نسخِ یہودیت و نصرانیت برطریقِ جزئیت لازم القبول ہے۔ گویا آج ملّتِ ابراہیمی بصورتِ دینِ مصطفوی متشکل ہے۔ اب دینِ مصطفوی ہی تمام ادیان میں معیارِ حق اور واجب الاتباع ہے۔ یہودیت و نصرانیت وغیرہ سب منسوخ ہوچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اب دینِ حق صرف اسلام ہے، جس میں بقاعدۂ کلیہ دینِ ابراہیمی موجود ہے، اور برطریقِ جزئیت شریعتِ مصطفویہ لازم الاتباع ہے۔ اسی مفہوم، تفصیل کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے تَعَالَوۡا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكُمۡ لوگو! تم سب ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے وہ بقاعدۂ کلیت دینِ ابراہیمی ہے، جس میں نہ یہودیت ہے نہ نصرانیت، اور نہ اور کوئی طریقہ۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ۔ اب اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی دینِ حق ہے، باقی سب باطل و منسوخ۔

غرضکہ منصبِ امامتِ مطلقہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمایا تو قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ، عرض کی اور میری اولاد سے۔ یعنی یہ امامت کا سلسلہ میرے بعد میری اولاد میں بھی جاری رہے اور میری اولاد میں سے ہر زمانہ میں امام ہوتے رہیں، اور روئے زمین کسی وقت بھی میرے سلسلۂ امامت خالی نہ رہے۔ اس دعا سے آپ کی خواہش یہ تھی کہ یہ سلسلۂ امامت، قیامِ قیامت تک جاری رہے، اور ہر دور میں میری اولاد میں سے امام زمانہ ہوتے رہیں۔ اسکے جواب میں ارشاد ہوا، قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ۝ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔

مطلب یہ کہ ازمنۂ مستقبلہ میں بعض زمانہ ایسا بھی گزرے گا جس میں تمہاری اولاد میں سے کوئی بھی دینی امامت کا اہل نہ ہوگا، بالعموم ظالم و کافر ہی ہونگے۔ اور جو کوئی مسلمان ہوئے بھی، تو دینی امامت کے معیار پر وہ پورے نہ اتر سکینگے۔ اسلیے دینی امامت ایسے ظالموں کو کیسے پہنچ سکتی ہے۔ نبوت ہو یا امامت، خلافت ہو یا ولایت، قضاء ہو یا افتاء، بادشاہت ہو یا امارت و حکومت، بحکمِ شریعت ظالم و فاسق اسکے اہل ہی نہیں ہیں۔ (عزیزی)۔ مسئلہ آپ کی اولاد میں جو ظالم (کافر) ہیں، وہ امامت کا منصب نہ پائینگے۔ مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کا پیشوا نہیں ہوسکتا۔ اور مسلمانوں کو اُس کی اتباع جائز نہیں۔ (خزائن العرفان)

مجاہد فرماتے ہیں کہ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ (میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا) کا مطلب یہ ہے کہ میں ظالموں کو امام نہیں بناؤں گا۔ ظالم سے مراد بعض نے مشرک کے بھی لیے ہیں، اور عہد سے مراد امر ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ظالم کو کسی چیز کا والی اور نگرانہ بنایا جائے، اگرچہ وہ اولادِ ابراہیم میں سے ہی ہو۔ حضرتِ خلیل کی دعا اولاد کے نیکوں کے حق میں قبول ہوئی۔ یہ بھی معنی کیے گئے ہیں کہ ظالم کا کوئی عہد کہ اُسکی اطاعت کیجائے، اُسکا عہد توڑ دیا جائے پورا نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا وعدہ اُس سے کچھ نہیں، دنیا میں تو خیر کھا پی رہا ہے، اور عیش و عشرت کررہا ہے۔ عہد سے مراد دین بھی ہے۔ یعنی تمہاری ساری اولاد دیندار نہ ہوگی، چنانچہ فرمایا وَمِنۡ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحۡسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ مُبِیۡنٌ ۝ یعنی انکی اولاد میں بھلے بھی ہیں اور برے بھی۔ اور عہد کے معنی طاعت کے بھی کیے گئے ہیں، یعنی اطاعت صرف معروف و نیکی اور بھلائی میں ہے۔ اور عہد کے معنی نبوت کے بھی آئے ہیں۔ ابن خویز منداد مالکی فرماتے ہیں کہ ظالم شخص نہ تو خلیفہ بن سکتا ہے نہ حاکم نہ مفتی نہ گواہ نہ راوی۔ (ابنِ کثیر) واللہ اعلم

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدۡنَاۤ اِلٰۤی

اور یاد کرو جب ہم نے اِس گھر کو لوگوں کیلیے مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ اور ہم نے تاکید فرمائی

اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰكِفِیۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ۝

ابراہیم و اسمٰعیل کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع و سجود والوں کیلیے

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَیۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا (اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امان بنایا) اَلۡبَیۡتَ سے کعبہ شریف مراد ہے، اور اس میں تمام شریف داخل ہے۔ (خزائن) مَثَابَةً سے مراد بار بار آنا ہے اگرچہ حج کرلیا ہو، مگر دل میں بار بار جانے آنے کی لگن رہتی ہے۔ ہر جگہ ہر مقام اور ہر اقلیم و ملک سے لوگ دوڑے اُس کی طرف جوق در جوق کھچے چلے آتے ہیں،

اس لیے کہ یہ مرجع اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ (ابنِ کثیر) "امن" بنانے سے یہ مراد ہے کہ حرمِ کعبہ میں قتل و غارت حرام ہے۔ یا یہ کہ وہاں شکار تک کو امن ہے، یہانتک کہ حرم شریف میں شیر بھیڑیے بھی شکار کا پیچھا نہیں کرتے، چھوڑ کر لوٹ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مومن اس میں داخل ہو کر عذاب سے مامون ہو جاتا ہے۔ حرم کو حرم اسلیے کہا جاتا ہے کہ اس میں قتل، ظلم، شکار حرام و ممنوع ہے۔ (احمدی) اگر کوئی مجرم بھی داخل ہو جائے، تو وہاں اُس سے تعرض نہ کیا جائیگا۔ (مدارک و خزائن) زمانۂ جاہلیت میں بھی حرم کو امن و امان حاصل تھا، اسکے آس پاس وہ لوٹ مار کرتے تھے، لیکن حرم میں امن رہتا تھا، کسی کو کوئی گالی نہ دیتا، یہ جگہ ہمیشہ متبرک اور شرافت والی رہی ہے۔ نیک روحیں اسکی طرف مشتاق رہتی ہیں، گو ہر سال زیارت کریں، مگر ان میں ذوق و شوق یونہی برقرار رہتا تھا۔ یہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی دعاء کا اثر ہے، کیونکہ آپ نے دعاء مانگی تھی کہ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ ط الآیہ "اے خدا لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف جھکا دے۔" یہاں باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی کوئی دیکھتا تو خاموش ہی رہتا۔ (ابنِ کثیر) اس لیے سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ شخص جو مستحقِ اجراءِ حد اور قتلِ نفس کی بناء پر قصاص کا مستحق ہو، اور وہ حدودِ حرم میں داخل ہو جائے، تو اُس سے تعرض نہ کیا جائے، البتہ اُس پر دائرۂ حیات تنگ کیا جائے، یعنی لوگوں کو منع کیا جائے کہ اُس سے خرید و فروخت نہ کریں، اور نہ اُس سے میل جول، سلام و کلام کریں، یہانتک کہ وہ مجبور ہو کر حدودِ حرم سے باہر آئے۔ پھر اُس سے قصاص لیا جائے۔ (عزیزی)

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط (اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ)۔ مقامِ ابراہیم، وہ پتھر ہے، جس پر کھڑے ہو کر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ معظمہ کی بناء فرمائی، اور اُس میں آپکے قدمِ مبارک کا نشان تھا، اس کو نماز کا مقام بنانے کا امر استحباب کیلیے ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس نماز سے طواف کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ (خزائن) ایک قول یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد کل حرم ہے، اور خاص مقامِ ابراہیم بھی ہے، اور حج کل کا کل بھی، مثلاً عرفات، مشعرالحرام، منیٰ، رمی جمار، صفا و مروہ کا طواف۔ (ابنِ کثیر)

شانِ نزول:- حضرتِ جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طواف خانۂ کعبہ سے فارغ ہوئے، تو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مقامِ ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا، کیا یہی ہمارے باپ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا مقام ہے؟ فرمایا، ہاں۔ عرض کیا، ہم اسے قبلہ کیوں نہ بنالیں؟ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا فاروقِ اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے رب سے تین باتوں میں موافقت کی، جو خدا کو منظور تھا وہی میری زبان سے نکلا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کاش ہم مقامِ ابراہیم کو اپنا قبلہ بنالیتے؟ تو حکم وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى نازل ہوا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کاش آپ امہات المومنین کو پردے کا حکم فرماتے؟ تو اس پر پردے کی آیت اُتری۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ آج حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں سے خفا ہیں، تو میں نے اُن سے جا کر کہا کہ اے ازواج النبی! اگر تم باز نہ آؤگی، تو اللہ تعالے تم سے اچھی بیویاں تمہارے بدلے اپنے نبی کو مرحمت فرمادیگا۔ اس پر یہی فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا، عَسٰی رَبُّهٗٓ الآیہ "ایک روایت میں بدر کے قیدیوں کے بارے میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت مروی ہے، آپ نے رائے دی تھی کہ ان سے فدیہ نہ لیا جائے بلکہ انھیں قتل کر دیا جائے، اس پر آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ اسی طرح جب عبد اللہ ابن اُبی ابن سلول منافق مرا، تو حضور نے اُسکی نمازِ جنازہ پڑھنے کا ارادہ فرمایا، تو میں نے اُس منافق کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کے لیے عرض کیا، حضور نے مجھے روکدیا، اس پر آیتِ کریمہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ نازل ہوئی اور آپ کو منافقوں کے جنازہ سے روکدیا گیا۔ (ابنِ کثیر)

یہ مقامِ ابراہیم پہلے دیوارِ کعبہ سے متصل تھا، کعبہ کے دروازہ کے قریب حجرِ اسود کی جانب، جو کہ دروازہ سے جانیوالے کے دائیں جانب متصل تھا، حضرتِ خلیل اللہ علیہ السلام نے یا تو اسے یہاں رکھوایا تھا، یا بیت اللہ بناتے ہوئے آخری حصہ یہی بنایا ہوگا، اور یہیں یہ پتھر رکھا رہا۔ امیرالمومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسے پیچھے ہٹا دیا۔ پھر ایک مرتبہ سیلاب نے اسے یہاں سے بھی ہٹا دیا تھا، اُسوقت دوبارہ خلیفۂ ثانی نے اپنی جگہ رکھوا دیا تھا۔ حضرتِ ابو سفیان فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ اصل جگہ سے کب ہٹایا گیا، اور یہ کہ دیوارِ کعبہ سے کتنی دور تھا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ خود حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے اپنی جگہ سے ہٹا کر وہاں رکھا تھا جہاں اب ہے واللہ اعلم (ابنِ کثیر)

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم و اسمٰعیل کو میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع و سجود والوں کے لیے) عہد سے مراد، حکمِ باری تعالیٰ ہے۔ قاعدہ ہے کہ عہد کا التعدیہ جب الیٰ سے ہو، تو اُسکے معنی اُس وحی کے ہیں، جو پہلے سے کہدی گئی ہو۔ مطلب یہ کہ کعبۃ اللہ کو پاک رکھنے، گندگی و نجس اور بُری چیزوں سے محفوظ رکھنے، بتوں سے بچانے، غیر اللہ کی پرستش وہاں نہ ہونے دینے، لغو و بیہودہ گوئی، کذب و افتراء، تمسخر و مذاق اور شرک و کفر سے اس جگہ کو محفوظ رکھنے کا حکم بواسطہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام پہلے سے ہی دیدیا گیا تھا۔ طآئف کے ایک معنی تو طواف کرنیوالے کے ہیں، دوسرے معنی باہر سے آنے والوں کے ہیں۔ اس تقدیر پر عاکفین کے معنی مکہ کے باشندے ہونگے۔ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ سے مراد نمازی ہیں۔ فقہاء کا اسمیں اختلاف ہے کہ بیت اللہ میں نماز افضل ہے یا اُسکا طواف۔ کعبۃ اللہ کو پاک رکھنے کا حکم اسلیے دیا گیا کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی بت پرستی رائج تھی، دوسرے یہ کہ یہ بزرگ اپنی نیتوں میں یہ بات رکھیں، اور اپنی اولاد و ذریت کو اس کی وصیت کرتے رہیں۔ اس سے مقصد مشرکین کو تنبیہ و تردید ہے کہ بیت اللہ تو خالص خدا کی عبادت کرنیوالوں کیلیے بنایا گیا تھا، مسلمانوں کو اس سے روکنا کتنی صریح بے انصافی اور ظلم ہے۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا گیا کہ ایسے ظالموں کو ہم دردناک عذاب چکھائینگے۔ (ابنِ کثیر)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ

اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب اس شہر کو امان والا کردے اور اسکے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے جو اُن میں سے اللہ

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝

اور پچھلے دن پر ایمان لائیں فرمایا اور جو کافر ہوا تھوڑا برتنے کو اُسے بھی دونگا پھر اُسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کر دونگا اور وہ بہت بُری جگہ ہے پلٹنے کی

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ یعنی اے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُسوقت کو یاد فرمائیے جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر و بناء کا عزم فرمایا تھا، تو دعا کی تھی رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا، یعنی اے میرے پروردگار، اس لق و دق صحرا کو جس میں آج صرف میرے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور میری بی بی آباد ہیں، اسے شہر بنا دے، تاکہ اس سے بنائے بیت اللہ کا مقصود حاصل ہو، کیونکہ اگر اسکے گرداگرد آبادی نہ ہو، تو کون اسکا طواف کریگا، اور کون یہاں اعتکاف کریگا، اور کون نمازیں ادا کریگا۔ اٰمِنًا پھر یہ شہر امن و سلامتی والا ہو، تاکہ دور دراز سے لوگ آکر امن و بے خوفی کے ساتھ اسکی زیارت و طواف اور نماز ادا کریں۔ اگر یہ ایسا ہی ویران، بے آباد اور خوف زا مقام رہا تو مَثَابَةً لِّلنَّاسِ یہ مقام مرجع خلائق کیسے ہوگا، کیونکہ یہ صحرا نہ تو قابلِ کاشت و زراعت ہے، نہ یہاں باغات اُگ سکتے ہیں، اور نہ یہاں قافلے والوں کی رہائش کی آسودگی کا سامان میسر ہے، اور نہ اُنکے جانوروں کیلیے پانی و چارے کا سامان ہے، اور سنگلاخ مقام ہونے کے لحاظ سے انسان کی بود و باش بھی دشوار ہے۔ اسلیے جبتک یہاں کامل و وافر امن و سلامتی نہ ہو، تو اطراف و اکناف اور آفاق کے تجار ضروریاتِ حیات کے سامان، غلہ و ثمر وغیرہ کیسے لیکر آئینگے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی۔ اور جس ظالم نے بھی اسکی بربادی و ویرانی اور اسکے امن و سلامتی میں خلل اندازی کی کوشش کی، وہ خائب و خاسر ہو کر ہلاک ہوا۔ غرضکہ حضرتِ خلیل نے مناسکِ حج کی ادائیگی کیلیے آبادی کی استدعا کی اور آبادی کیلیے امن و بیخوفی کی درخواست کی جو کہ مستجاب ہوئی۔ اسکے بعد دوسری دعا کی، وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ط اور اسکے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے "تاکہ یہاں کے لوگ پھلوں کے اشتیاق میں دل اُچاٹ کرکے دیگر ممالک و امصار میں جانے کی

خواہش نہ کریں۔ چنانچہ اس دعا کی قبولیت اسطرح ہوئی کہ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام ایک خطۂ ارضی سر سبز و شاداب فلسطین و شام سے اپنے پروں پر اٹھا کر لائے، پہلے خانۂ کعبہ کا طواف کرایا، پھر مکّہ سے بالائے کوہ تین دن کی مسافت پر بمقام "طائف" اُسے رکھا، اور اُسکی آب وہوا اُسکے گرد ونواح کے سنگلاخ وکوہستان کی آب وہوا کے برعکس نہایت خوشگوار سرد اور دلنواز ہے، اور سرد مقامات کے مطابق وہاں ہر قسم کے پھل ہمہ وقت موجود رہتے ہیں، اور وہاں انگور وانار بے دانہ رسیلے اور ازحد شیریں ہوتے ہیں۔ (عزیزی)

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ جو اُن میں سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں"۔ چونکہ امامت کے باب میں لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا) ارشاد ہو چکا تھا، اسلیے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا میں مومنین کو خاص فرمایا، اور یہی شانِ ادب تھی، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، دعا قبول فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ رزق سب کو دیا جائیگا، مومن کو بھی کافر کو بھی، لیکن کافر کا رزق تھوڑا ہے، یعنی صرف دنیاوی زندگی میں وہ بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ (خزائن العرفان)

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (فرمایا اور جو کافر ہوا تھوڑا برتنے کو اُسے بھی دونگا، پھر اُسے عذابِ دوزخ کی طرف مجبور کر دونگا اور وہ بہت بُری جگہ ہے پلٹنے کی) یعنی رزقِ الٰہی سے جہاں اُسکے فضل سے مومن بہرہ مند ہونگے، وہاں کافر کو بھی دیا جائیگا، لیکن کافر کو رزق صرف دنیاوی زندگی میں ملیگا، آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں، وہاں نعمِ الٰہیہ سے سرتاسر محروم و بدنصیب رہینگے، بلکہ وہ عذابِ دوزخ کے سزاوار ہونگے، جہاں انکے کفر و ناشکری کے بدلے دردناک عذاب دیا جائیگا۔ آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیاوی نعمتیں قلیل و بہت کم ہیں، کیونکہ دنیاوی زندگی محدود اور مختصر ہے، اور اُخروی زندگی ابدی ولا محدود ہے۔ کافر صرف دنیاوی نعمتوں پر ہی گھمنڈ وتکبّر کر سکتے ہیں، لیکن مومن کے لیے دنیاوی نعمتوں کے ساتھ آخروی لا محدود ابدی نعمتیں ہوں گی۔

حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بنائے کعبۂ معظمہ کے وقت یہ دعائیں مانگیں جنکو رب العزت نے شرفِ قبولیت بخشا، اور حق تعالیٰ نے اس گھر کو اپنی طرف منسوب فرما کر "بیت اللہ" سے موسوم کیا۔ اسی طرح حضورِ اکرم سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اپنے شہرِ پاک مدینۂ منورہ کے لیے دعا مانگی، جو شرفِ قبولیت سے نوازی گئی۔ چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرتِ ابراہیم نے مکّہ کو حرم بنایا، میں مدینہ کو حرم کرتا ہوں، اسکا شکار نہ کھیلا جائے، یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں، یہاں ہتھیار نہ اُٹھائے جائیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ صحابۂ کرام فصل کے تازہ بتازہ، نو بنو پھل لیکر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا کرتے تھے، حضور اُنھیں لیکر دعا کرتے کہ خدایا ہمارے پھلوں میں، ہمارے شہر میں، ہماری ناپ تول میں برکت دے، خدایا ابراہیم تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے رسول تھے۔ میں تیرا بندہ، تیرا رسول (اور تیرا حبیب) ہوں، اُنھوں نے تجھ سے مکّہ کے لیے دعا کی تھی، میں تجھ سے مدینہ کیلیے دعا کرتا ہوں، جیسے اُنھوں نے مکّہ کے لیے کی تھی، بلکہ ایسی ہی ایک اور بھی۔ پھر آپ کسی خورد سال بچّہ کو بلا کر وہ پھل اُسے عطا فرما دیا کرتے۔

اَنس بن مالک فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا، جاؤ اپنے بچّوں میں سے کوئی بچّہ میری خدمت میں لے آؤ۔ ابو طلحہ مجھے لیچلے۔ میں اب سفر و حضر میں حاضرِ خدمت رہنے لگا، ایک مرتبہ حضور باہر سے تشریف لا رہے تھے، جب آپ کی نظرِ مبارک اُحد پہاڑ پر پڑی، تو فرمایا یہ پہاڑ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ جب مدینۂ منورہ نظر آیا، تو فرمانے لگے، اے اللہ! میں اسکے دو کناروں کے درمیان کی جگہ کو حرم کرتا ہوں، جیسے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکّہ کو حرم بنایا۔ اے خدا! انکے مُد، صاع اور ناپ میں برکت دے۔ ایک روایت میں ہے کہ اے اللہ! جتنی برکت تو نے مکّہ میں دی ہے اُس سے دوگنی برکت مدینہ میں دے"۔ حُرمتِ مدینۂ منورہ میں انکے علاوہ اور بھی بکثرت احادیث مروی ہیں۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مکّہ مکرمہ کی حُرمت تخلیقِ ارض کے وقت سے ہی ہے، یا حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد سے، لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ہے کہ فتحِ مکّہ کے دن حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جب سے اللہ نے آسمان و زمین پیدا فرمائے، اُسوقت سے اس شہر کو عزت و حُرمت والا بنایا ہے، اب یہ قیامت تک عزت و حُرمت والا ہی رہیگا۔ اس میں جنگ و قتال کسی کیلیے حلال نہیں، صرف میرے لیے ہی آج کے دن تھوڑی سی دیر کے لیے حلال کیا گیا تھا، اسکے بعد حرام ہی حرام ہے الحدیث۔ ہمارے نزدیک علماء کے اس اختلاف کو اسطرح اُٹھایا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے تخلیقِ ارض و سماء کے وقت شہرِ مکّہ مکرمہ کو حُرمت و عزت والا ہی پیدا فرمایا تھا، لیکن اسکی تبلیغ و شہرت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمائی، جسطرح کہ ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اُسوقت بھی نبی تھے جبکہ حضرتِ آدم علیہ السلام کا ابھی خمیر ہی تیار ہوا تھا، بلکہ اُسوقت آپ کا خاتم النبیین ہونا بھی مکتوب تھا، لیکن اسکے باوجود حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا الآیہ میں حضور کی نبوّت کی دعا کی۔

وَمَنْ كَفَرَ سے آخر تک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مگر بعض مفسرین نے اسے بھی دعائے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا جُزو کہا ہے، اس تقدیر پر معنی یہ ہونگے کہ اُنھوں نے کفّار کے لیے تھوڑے سے رزق پانے کی دعا کی، اور انجام کار اُنھیں عذابِ آخرت کی طرف بے بس کر"۔ اِس میں بھی اُنکی خُلّت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ وہ کافر و نافرمان اولاد سے بیزار و نفور ہیں۔ اس کے بعد بیت اللہ کی تعمیر کا تذکرہ رب العزت فرماتا ہے:۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا

اور جب اُٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی نیویں اور اسمٰعیل یہ کہتے ہوئے اے رب ہمارے ہم سے قبول فرما بیشک تو ہی ہے سنتا جانتا اے رب ہمارے

وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ

اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا اور ہماری اولاد میں سے ایک اُمت تیری فرمانبردار اور ہمیں ہماری عبادت کے قاعدے بتا اور ہم پر اپنی رحمت کیساتھ رجوع فرما بیشک تو ہی ہے بہت توبہ قبول کرنیوالا

الرَّحِيْمُ ۝

مہربان

پہلی مرتبہ کعبۂ معظّمہ کی بنیاد حضرتِ آدم علیہ السلام نے رکھی، اور بعد طوفان حضرتِ نوح علیہ السلام پھر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اُسی بنیاد پر تعمیر فرمائی۔ یہ تعمیر خاص آپ کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ اسکے لیے پتھر اُٹھا کر لانے کی خدمت و سعادت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو میسر ہوئی۔ دونوں حضرات نے اُسوقت یہ دعا کی کہ یارب ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ (خزائن العرفان)

پہلی آیتِ کریمہ میں حضرتِ ابراہیم اور حضرتِ اسمٰعیل علیہما السلام نے تعمیر و بنائے کعبہ کی خدمت و سعادت کی قبولیت کی دعا فرمائی، اور دوسری آیت میں اِن دونوں حضرات نے اپنی استقامت اور اپنی اولاد کے اسلام کے لیے دعا مانگی، چنانچہ عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ یعنی اے رب ہمارے اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا (باوجودیکہ) وہ حضرات اللہ تعالیٰ کے مطیع و مخلص بندے تھے پھر بھی یہ دعا اسلیے ہے کہ طاعت و اخلاص میں اور زیادہ کمال کی طلب رکھتے ہیں، ذوقِ طاعت سیر نہیں ہوتا، سبحان اللہ! ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ (خزائن العرفان)

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تیری فرمانبردار (بنا) اور ہمیں ہماری عبادت کے قاعدے بتا، اور ہم پر اپنی رحمت کیساتھ رجوع فرما" (چونکہ) حضرتِ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام معصوم ہیں، آپ کی طرف سے توبہ تواضع ہے، اور اللہ والوں کے لیے تعلیم ہے۔ مسئلہ یہ مقام قبولِ دعا کا ہے، اور یہاں دعا و توبہ سُنّتِ ابراہیمی ہے۔ (خزائن العرفان)

اصل واقعہ کی تفصیل یہ آیاتِ کریمہ اپنے اندر دفترِ بے پایاں پنہاں رکھتی ہیں، اس بحرِ زخار میں جتنی بھی غواصی کیجائے اُتنے ہی دُرہائے نایاب سے بندہ ہمکنار ہوتا جائیگا۔ مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے نارِ نمرود سے بحکمِ ربِّ جلیل نجات پائی، اور وہ آگ آپ پر سلامتی کے ساتھ نہ صرف ٹھنڈی ہو گئی بلکہ گلزار بنگئی، تو آپ نے وہاں سے ہجرت فرمانے کا قصد کیا۔

آپ کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ بن تارخ بن ناخور بن شاروخ بن ارغو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام (مسالک الحنفاء)

آپ بابل کے بادشاہ نمرود بن کوش بن کنعان بن حام بن حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں رونق افروز تھے۔ حضرتِ نوح علیہ السلام کے بعد نمرود ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے قوم کو بت پرستی کیطرف بلایا۔ ورنہ جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے اُترے تھے، تو آپکے ساتھ جو نجات یافتہ اسّی مسلمانوں کی جماعت تھی، وہ ایک گاؤں میں اُترے ہر ایک نے ایک ایک گھر تعمیر کیا، اور آبادی کا نام "سوق الثمانین" یعنی اسّی آدمیوں کا بازار" رکھا۔ پھر جب "سوق الثمانین" کا علاقہ اُنکی اولاد پر تنگ ہوگیا، تو پھر اُنھوں نے بابل کی طرف رُخ کیا، اور وہاں مکانات بنائے حتیٰ کہ وہ ایک لاکھ تک پہنچگئی، یہ سب کے سب اسلام پر تھے، اور اُسوقت تک اسلام پر قائم رہے جبتک کہ بابل میں نمرود ان کا بادشاہ بنا۔ (طبقات ابنِ سعد بر سند کلبی) انہ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما) قرآنِ پاک میں جو یہ ارشاد ہے کہ "اِذْقَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ" جب ابراہیم نے اپنے اَب آزر سے فرمایا، تو یہ آزر آپ کا والد نہ تھا، بلکہ چچا تھا، مجازاً لغت اہلِ عرب کے مطابق چچا کو باپ کہدیا جاتا تھا، تفصیل کیلیے رسالہ "مسالک الحنفاء" للسیوطی کو ملاحظہ کریں۔

چنانچہ جب نمرود نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو بوساطت اُنکے چچا آزر، بُت پرستی کی طرف بلانا چاہا، اور آپ نے نمرود کے دربار میں احقاقِ حق فرمایا، اور دلائل و براہین سے توحیدِ باری کا اثبات کیا، اور ابطالِ باطل کی خاطر شاہی بتخانہ کے تمام بتوں کو توڑا، اور کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھا، اور بوقتِ مجادلہ ان سب کا عجز و بے دلیل و بُرہان ہونا ثابت ہوگیا تو نمرود نے بمشورہ اعیانِ سلطنت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالدینے کا حکم دیا۔ چنانچہ بارہ[12] فرسخ چوکور علاقہ میں آگ جلائی گئی، اور منجنیق میں رکھکر آگ میں آپ کو ڈالا گیا اور حق تعالیٰ نے سلامتی کے ساتھ آپ کو آگ سے محفوظ رکھا، تو آپ کی عمر شریف اُسوقت سینتیس[37] سال کی تھی۔ اسکے بعد حق تعالیٰ نے آپ کو بابل سے ہجرت کا حکم فرمایا۔ چنانچہ طبقاتِ ابنِ سعد میں بروایت کلبی ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے سینتیس[37] سال کی عمر میں بابل سے شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ چنانچہ مقام حرّان میں مدّت تک اقامت فرمائی، اسکے بعد اُردن تشریف لیگئے وہاں بھی مدّت تک اقامت فرمائی، پھر مصر تشریف لیگئے وہاں بھی ایک عرصہ تک اقامت فرمائی، پھر شام کی طرف لوٹے، تو زمینِ سبع میں جو ایلیا اور فلسطین کے درمیان واقع ہے قیام کیا۔ پھر جب وہاں کے لوگوں نے آپ کو ایذا دی، تو آپ نے اُن سے رُخ پھیر کر رملہ اور ایلیا کے درمیان اقامت فرمائی۔ واقعۂ نار کے بعد بابل سے ہجرت کرنے اور مکّہ مکرمہ میں مذکورہ دعا مانگنے کے درمیان کا زمانہ تقریباً کچھ اُوپر پچاس سال کا ہے۔ (مسالک الحنفاء)

غرضکہ آپ نے واقعۂ نار کے بعد قصدِ ہجرت بحکمِ رب فرمایا، تو مقام حرّان میں اپنے چچا ہاران نامی کے یہاں قیام فرمایا۔ ہاران نے اپنی دختر سارہ نامی کو آپ کے حبالۂ عقد میں دیدیا۔ اور آپ کو بڑی خاطر مدارات کے ساتھ اقامت پر آمادہ کرلیا۔ اس سے ہاران کا مقصد یہ تھا کہ آپ زن و فرزند کی جکڑبندیوں اور مال و متاع کی طمع میں اپنے دین کی تبلیغ سے باز آجائینگے، اور نمرودیوں کے دین کی طرف راغب ہوجائینگے، مگر آپ نے توحید پر نہ صرف اصرار فرمایا بلکہ بدستور اسکی تبلیغ فرماتے رہے۔ اور اس میں آپ کی بیوی حضرتِ سارہ نے موافقت کرکے بُت پرستوں کے دین کی عیب چینی شروع کردی۔ ہاران کو اس پر بہت غصّہ آیا، اُس نے دونوں کو تمام مال و اسباب چھینکر گھر سے نکالدیا۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ سارہ کو ہمراہ لیا، اور اُن سے عہد لیا گیا کہ وہ کبھی بھی اپنے شوہر کی نافرمانی نہ کرینگی۔ اور نہ وہ انکی دلجوئی میں کمی فرمائینگے۔ چنانچہ اس باہمی معاہدہ کے بعد دونوں، اور آپ کے برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام کے سوا اور کوئی ہمراہ نہ ہُوا۔ آپ نے مصر کی طرف ہجرت کا قصد فرمایا۔ اتفاق سے وہاں کا بادشاہ نہایت ظالم و جابر اور سرکش وکافر مسلط تھا، اور اُس میں ایسی بدعادت تھی کہ جس کی بیوی خوبرو، خوبصورت ہوتی تھی اُسے چھین لیتا تھا، اور اُسکے شوہر کو قتل کردیتا تھا۔ اور اگر عورت کے ساتھ بھائی یا اور کوئی رشتہ دار ہوتا تھا، اُسے قتل نہیں کرتا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بی بی کے ساتھ داخل ہوئے اور یہ شُہرہ سنا، تو خوف لاحق ہُوا، کیونکہ حضرت سارہ حُسن و جمال میں تمام عورتوں سے ممتاز و فائق تھیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہُوا کہ "جتنا حُسن و جمال حضرت آدم علیہ السلام کو دیا گیا تھا اُسکا نصف حصہ حضرتِ یوسف علیہ السلام کو دیا گیا، اور چھٹا حصہ حضرتِ سارہ کو، اور مابقی حصّے ساری دنیا کے لوگوں کو مرحمت ہوا"۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بی بی سے فرمایا "یہاں کے بادشاہ کی یہ بُری خصلت ہے کہ وہ جس حسین و جمیل عورت کو دیکھتا ہے، زبردستی بکڑ بلاتا ہے، اور اگر شوہر ساتھ ہو، تو اُسے قتل کردیتا ہے، اور اگر بھائی یا کوئی اور عزیز ساتھ ہوتا ہے، تو اُس سے تعرض نہیں کرتا۔ لہٰذا تم سے جب وہ پوچھے تو کہدینا کہ یہ بھائی ہے، چونکہ میں دین کے لحاظ سے تمہارا بھائی بھی ہوتا ہوں، میں دعا کروں گا کہ حق تعالیٰ تمہاری عزت و ناموس کو اُس ظالم کے ہاتھ سے محفوظ رکھے یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ بادشاہ کو اُسکے جاسوسوں نے خبر دی کہ ایک ایسی عورت یہاں داخل ہوئی ہے جسکے حُسن و جمال کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بادشاہ نے سنتے ہی پکڑ کر لانے کا حکم دیدیا۔ جب بادشاہ کے ہرکارے آئے اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے اُنکے رشتہ کے بارے میں دریافت کیا، تو فرمایا یہ میری دینی بہن ہے۔ وہ سپاہی آپ کو چھوڑ کر حضرتِ سارہ کو لیگئے۔ اور آپ بارگاہِ الٰہی میں نماز کے لیے کھڑے ہوکر مشغول بدعا ہوگئے۔ جب حضرتِ سارہ بادشاہ کے روبرو پہنچیں، تو وہ دیکھتے ہی فریفتہ ہوگیا۔ اُس نے قصد کیا کہ وہ بے ادبی کرے، تو حضرتِ سارہ نے فرمایا "میں دُور دراز علاقہ سے سفر کرکے آرہی ہوں میرا سر اور جسم گرد و غبار سے اٹا پڑا ہے، مجھے نہا دھو کر اپنے طریق پر عبادت کرنے دو، پھر تجھے اختیار ہے۔ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ غسل کیلیے پانی وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ حضرتِ سارہ نے غسل و وضو کرکے مُصلّے پر کھڑے ہوکر نماز میں مشغول ہوگئیں، اور اُنھوں نے نماز کو دراز کردیا، اور دل میں مشغول بدعا رہیں۔ بادشاہ نے دیکھا کہ یہ نماز کو ختم کرتی ہی نہیں، تو اُس نے دست درازی کا قصد کیا، اور وہیں خلوت کا حکم دیا۔ جب خلوت ہوگئی، تو بدنیتی کے ساتھ ہاتھ بڑھائے، اُسی وقت اُسکے دونوں ہاتھ شل ہوگئے اور وہ بیہوش ہوکر گرپڑا، اور مُونھ سے جھاگ ڈالنے لگا، اور اُسکی سانس گھٹنے لگی۔ جب حضرتِ سارہ نے دیکھا کہ یہ مررہا ہے، تو خوف زدہ ہوئیں کہ کہیں یہ لوگ مجھے ہی قاتل نہ ٹھہرائیں، بارگاہِ الٰہی میں دعا کری، اے خدا اسے چھوڑ دے تاکہ یہ عبرت پکڑے۔ جب اُسے افاقہ ہوا، تو اُس نے پھر بدنیتی کے ساتھ دست درازی کا ارادہ کیا۔ پھر اُسکی ویسی ہی حالت ہوگئی۔ اُنھوں نے بار دیگر دعا مانگی، خدا نے اُس ظالم کو چھوڑ دیا۔ جب افاقہ ہُوا، تو پھر قصد کیا۔ پھر یہی ہُوا۔ تیسری بار اُس نے حکم دیا کہ اس عورت کو لیجاؤ، یہ آدمی نہیں، جنّیہ ہے، یا جادوگرنی، اس سے پہلے میں نے ایک مصری عورت کو بھی ایسا ہی پایا تھا، اور میں اُس پر بھی قادر نہ ہوسکا تھا، اُس مصری عورت کو بھی اسکے ساتھ کردو، اور میری حدودِ ولایت سے اِن سب کو نکالدو۔ وہ مصری عورت حضرتِ ہاجرہ تھیں۔ چنانچہ جب حضرتِ سارہ حضرتِ ہاجرہ کو لیکر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں، تو دیکھا کہ آپ نماز میں مشغول ہیں۔ آپ انھیں دیکھکر نماز سے فارغ ہوئے، اور حال دریافت کیا۔ عرض کیا سب ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ نے اُس ظالم کے ہاتھوں کو باندھ دیا، اور سارا ماجرا سُنا دیا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خوش ہوئے اور شکرِ الٰہی بجالائے، اور وہاں سے کوچ فرمایا، اور فلسطین میں اقامت گزیں ہوگئے، وہاں کے لوگوں نے آپکے وجودِ گرامی کو نعمتِ الٰہی جانا، اور بہت سی زمینیں آپ کو نذر کیں، جس سے آپ کو بڑی فراخی حاصل ہوئی، بکثرت غلام خریدے، کاشتکاروں کو آباد کیا، بہت سے مویشی جمع فرمائے مہمان نوازی اور غربا پروری شروع فرمادی۔ اور آپ نے رُوم کی طرف حضرتِ لوط علیہ السلام کو بکارِ نبوّت و رسالت بھیجا۔ اسی دوران میں حضرتِ سارہ کو اولاد کا شوق غالب آیا، چونکہ اُسوقت تک کوئی فرزند تولد نہ ہُوا تھا، عرض کیا "اے میرے سرتاج! غالباً میرے بطن سے کوئی فرزند تقدیر میں نہیں ہے، میں آپ کی خدمت میں حضرتِ ہاجرہ کو پیش کرتی ہوں، آپ اِن سے تزوّج فرمائیں، شاید کہ اللہ تعالیٰ اسطرح مجھے فرزند عطا فرمائے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "اے سارہ تمہارے مزاج میں غیرت و رشک کا مادّہ غالب ہے، مبادا کہ حضرتِ ہاجرہ سے کوئی فرزند تولد ہو، اور تم اُس پر کوئی زیادتی کرو؟ مگر حضرتِ سارہ نے اپنے مدعا پر اصرار کیا اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ ہاجرہ سے تزوّج فرمایا، اور حق تعالیٰ نے انکے بطنِ اقدس سے سیدنا اسمٰعیل علیٰ نبینا و علیہ السلام کو تولد فرمایا حضرتِ سارہ اور حضرتِ ہاجرہ چونکہ یکجا ہی رہتی تھیں، اور حضرتِ ہاجرہ ہی حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کو دُودھ پلاتی تھیں، مگر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو رشک و غیرتِ سارہ کی خاطر حضرت ہاجرہ اور حضرتِ اسمٰعیل کی طرف نظر نہ اُٹھاتے تھے۔ ایک دن حضرتِ ابراہیم علیہ السلام، حضرتِ ہاجرہ اور حضرتِ اسمٰعیل کو تنہا دیکھ کر شوقِ پدری میں آکر فرزند کے چند بوسے لیے، اچانک حضرتِ سارہ بھی وہاں آگئیں، یہ دیکھ کر

اُن پر رشک نے غلبہ کیا، اور فوراً کہنے لگیں کہ اس بچّہ اور اس کی ماں کو کسی ایسی جگہ لیجاکر چھوڑ آؤ جہاں آب و گیاہ تک نہ ہو۔ ہر چند حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، مگر وہ نہ مانیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جنابِ باری میں التجا کی، حکمِ رب ہُوا کہ جو سارہ کہیں اُسکے موافق عمل بجالاؤ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دونوں کو سوار کیا اور چل دیئے۔ (تفسیر عزیزی) اور منزل بمنزل طے کرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچے جہاں اب بیت اللہ بنا ہُوا ہے۔ یہاں ایک ٹیلہ تھا، اور سنسان بیابان پڑا ہُوا تھا، یہاں لاکر ماں بیٹے کو بٹھاکر تھوڑی سی کھجوریں اور ایک مشکیزہ پانی کا رکھکر واپس چل دیئے۔ اُسوقت حضرتِ ہاجرہ نے کہا' اے خلیل اللہ! ہمیں اس دہشت و وحشت والے بیابان میں یکہ و تنہا چھوڑ کر، جہاں ہمارا کوئی مونس و ہمدم نہیں ہے، آپ کہاں تشریف لیے جارہے ہیں؟ لیکن حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اُسطرف توجہ تک نہ دی اور رُخِ انور پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ حضرت ہاجرہ کے بار بار کہنے، پکارنے اور فریاد کرنے پر بھی جب التفات نہ کیا تو کہنے لگیں، آپ ہمیں کس کے سپرد کرکے تشریف لیے جارہے ہیں؟ آپ نے فرمایا' اللہ تعالےٰ کے۔ پھر کہا' اے خلیل اللہ! کیا اسکا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا؟ آپ نے فرمایا' ہاں مجھے خدا کی طرف سے یہی حکم تھا! یہ سُنکر حضرتِ ہاجرہ کو تسکین ہوئی، اور کہنے لگیں، پھر آپ تشریف لیجاسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ہرگز ضائع نہ فرمائیگا، اب اُسی کا بھروسہ اور اُسی کا سہارا ہے۔ حضرتِ ہاجرہ رضی اللہ عنہا لوٹ گئیں اور اپنے لختِ جگر، نورِ نظر ابن نبی اللہ کو گود میں لیکر اُس سنسان بیابان میں اسی ہُو کے عالم میں لاچار و مجبور ہوکر بیٹھ گئیں۔ جب حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ثنیۃ الوداع کے مقام پر پہنچے اور یہ دیکھ لیا کہ اب حضرت ہاجرہ تعاقب نہیں کررہی ہیں' اور وہاں سے یہانتک اُنکی نگاہ کام بھی نہیں کرسکتی، تو بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ ہوکر ہاتھ اُٹھاکر دعا کی رَبَّنَا اِنِّیٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ الآیہ اے رب! میں نے اپنے بال بچوں کو ایک غیر آباد جنگل میں تیرے برگزیدہ گھر کے پاس چھوڑا ہے۔ تاکہ وہ نماز قایم کریں۔ تو لوگوں کے دلوں کو اُنکی طرف جھکادے، اور اُنھیں پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ شکر گزار بندے بنیں۔" آپ تو حکمِ الٰہی بجالاکر اور یہ دعا کرکے اور اپنے اہل و عیال کو سپردِ خدا کرکے تشریف لے گئے۔ ابن سعد بروایت واقدی نقل کرتے ہیں کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے جسوقت حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، تو اُسوقت آپ کی عمر شریف نوّے (۹۰) سال تھی)۔ ادھر حضرتِ ہاجرہ صبر و شکر کے ساتھ اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل سے دل بہلانے لگیں۔ جب وہ تھوڑی کھجوریں اور ذرا سا پانی ختم ہوگیا، اور غذا کا نہ ایک دانہ رہا اور نہ پانی کا ایک گھونٹ رہا، خود بھی بھوکی پیاسی ہیں، اور بچّہ بھی بھوک و پیاس سے بیتاب ہے یہانتک کہ اس معصوم نبی زادے کا پھول سا چہرہ کُمھلانے لگا، اور وہ بھوک و پیاس سے تڑپنے اور بلکنے لگا۔ مامتا بھری ماں کبھی اپنی تنہائی اور بے کسی کا خیال کرتی ہے، کبھی اپنے ننھے سے اکلوتے فرزند کا یہ حال بغور دیکھتی ہے، اور سہمی جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ کسی انسان کا اس بھیانک جنگل میں گزر ہو نہیں سکتا۔ میلوں تک آبادی کا نام و نشان نہیں، کھانا تو کہاں؟ پانی کا ایک قطرہ تک بھی ملنا نہیں آسکتا۔ بالآخر اس ننھی سی جان کا یہ ابتر حال نہیں دیکھا جاتا۔ وہ اُٹھتی ہیں' قریبی پہاڑ صَفَا پر چڑھ کر پہلے ایک نظر بچّے پر ڈالتی ہیں' اسکے بعد چاروں طرف میدانوں پر نظر دوڑاتی ہیں کہ کوئی آ' جاتا نظر آجائے، لیکن مایوسی کے ساتھ نگاہیں ہر چہار طرف سے واپس آتی ہیں۔ پھر وادی میں اُتر کر بچّے پر نظر ڈالتی ہوئیں مَرْوَہ پہاڑ پر دوڑتی ہوئی جاتی ہیں' اُس پر چڑھ کر پہلے بچّے پر نظر ڈالتی ہیں پھر چاروں طرف نظر دوڑاتی ہیں' یہاں بھی مایوسی کا سامنا ہوتا ہے، وہاں سے اُتر کر وادی میں پہنچکر تھوڑی دور دوڑ کر تیز رفتاری سے کوہِ صفا پر پہنچتی ہیں' چڑھ کر پہلے فرزند کو دیکھتی ہیں پھر چاروں طرف میدانوں پر نظر ڈالتی ہیں' اسطرح سات مرتبہ کرتی ہیں' اور ہر بار بچّے پر نظر ڈال کر دیکھتی ہیں کہ لحظہ بلحظہ بچّہ کی دگرگوں حالت ہوتی جاتی ہے۔ حضورِ اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حجاج جو صفا و مروہ کی سعی کرتے ہیں اسکی اصل یہی ہے (اور یہ ایک صالحہ خدا کی نیک بندی کی یادگار ہے)۔ غرضکہ جب حضرتِ ہاجرہ ساتویں مرتبہ کوہِ مروہ پر چڑھ کر اپنے فرزند کی طرف نگاہ ڈالی، تو اُنھیں ایک خاص قسم کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ آپ خاموش ہوکر احتیاط سے اُس آواز کی طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ آواز کیسی ہے؟ آواز پھر آتی ہے، اور اس مرتبہ آواز زیادہ صاف سُنائی دیتی ہے، تو آپ آواز کی طرف لپک کر آتی ہیں، اور اب جہاں زمزم ہے وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو پاتی ہیں۔ حضرتِ جبرئیل دریافت کرتے ہیں' تم کون ہو؟ آپ فرماتی ہیں' میں ہاجرہ، حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے فرزند کی والدہ ہوں۔ وہ پوچھتے ہیں' ابراہیم تمہیں اس سنسان بیابان میں کس کے سپرد کرکے گئے ہیں؟ آپ فرماتی ہیں' اللہ تعالیٰ کے! فرشتے نے کہا' پھر تو وہ کافی ہے! حضرتِ ہاجرہ نے فرمایا' اے غیبی شخص آواز تو میں نے سُن لی، کیا کچھ میرا کام بھی نکلے گا؟ حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے اپنی ایڑی زمین پر رگڑی، وہیں زمین سے ایک چشمہ پانی کا اُبلنے لگا۔ حضرتِ ہاجرہ نے ہاتھوں سے اُس پانی کو مشکیزہ میں بھرنا شروع کیا، مشکیزہ جب بھر گیا تو اِس خیال سے کہ پانی اِدھر اُدھر بہہ کر نہ نکل جائے آس پاس باڑھ باندھنی شروع کردی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں' اللہ تعالیٰ حضرتِ اسمٰعیل کی والدہ پر رحم فرمائے! اگر وہ اسطرح پانی کو نہ روکتیں' تو زمزم آج کنوئیں کی شکل میں نہ ہوتا، بلکہ وہ ایک جاری نہر کی صورت میں ہوتا۔" اسکے بعد حضرتِ ہاجرہ نے پانی کو خود بھی پیا اور بچّہ کو بھی پلایا، اور دودھ پلانے لگیں۔ حضرت جبرئیل نے کہا تم بے فکر رہو، خدا تمہیں ضائع نہ کریگا؛ جہاں تم بیٹھی ہو، یہاں خدا کا ایک گھر اس بچّہ اور اسکے والدِ ماجد کے ہاتھوں تعمیر ہوگا۔ اسکے بعد حضرت ہاجرہ اطمینان و سکوں کے ساتھ رہنے لگیں، زمزم کا پانی پیتیں اور بچہ سے دل بہلاتیں۔ بارش کے دنوں میں پانی کے سیلاب چاروں طرف سے آتے، چونکہ یہ جگہ ذرا بلند تھی اِدھر اُدھر سے پانی گزر جاتا، اور یہ جگہ محفوظ و مامون رہتی۔ کچھ مدت کے بعد جرہم کا قبیلہ کدا کی راستہ کی طرف سے اتفاقاً گزرا، اور مکّہ شریف کے زیریں حصہ میں اُترا۔ اُنکی نظریں ایک آبی پرندہ پر پڑیں، تو آپس میں کہنے لگے یہ پرندہ تو پانی کا ہے، اور یہاں پانی کبھی نہ تھا' ہم متعدد بار اِدھر سے گزرے ہیں دُور دُور تک پانی کا نام و نشان تک نہیں۔ یہ تو خشک و چٹیل میدان ہے یہاں پانی کہاں؟ چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو جستجو و تلاش میں بھیجا۔ اُس نے آکر خبر دی کہ وہاں تو بہترین اور کثیر پانی ہے۔ اب وہ سب آئے اور سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی والدہ سے عرض کرنے لگے، اے محترمہ! اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی یہاں اقامت گزیں ہو جائیں، کیونکہ یہ پانی جگہ ہے۔ آپ نے فرمایا' شوق سے رہو، لیکن پانی پر ہمارا ہی قبضہ ہوگا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہاجرہ تو یہ چاہتی ہی تھیں کہ کوئی ہمجنس یہاں آکر آباد ہو جائے۔ چنانچہ وہ قبیلہ وہاں رہ پڑا۔ اور حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام بھی اب بڑے ہو گئے تھے، آپ کو ان لوگوں سے بڑی ہی اُنس و محبت ہو گئی تھی' یہانتک کہ بعد بلوغ آپ نے اسی قبیلہ کی ایک لڑکی سے شادی کرلی، اور انہی سے زبانِ عرب سیکھی۔ آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بھی یہیں ہُوا۔

ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بی بی سارہ سے فرمایا، میری خواہش ہے کہ میں اپنے فرزند اور بی بی ہاجرہ کو جاکر ایک نظر دیکھ آؤں۔ اُنھوں کہا، ضرور تشریف لیجائیں، مگر سواری سے اُتریئے نہیں۔ پھر آپ نے باری تعالیٰ سے اذن چاہا۔ بحکمِ الٰہی آپ مکۂ مکرمہ تشریف لائے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ کا آنا جانا بُراق پر تھا۔ (ابنِ کثیر) جب آپ تشریف لائے، تو معلوم ہُوا کہ سیدہ ہاجرہ کا انتقال ہو چکا ہے، اور حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام شکار کو تشریف لے گئے ہیں، تاکہ کھانے پینے کا سامان حاصل کریں۔ آپ نے بہُو سے دریافت فرمایا تمہارا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا بُرا حال ہے' بڑی تنگی اور سختی ہے۔ آپنے فرمایا جب وہ آئیں' تو میرا اسلام کہنا اور پیغام دینا کہ اپنی دہلیز (چوکھٹ) بدل دیں۔ جب حضرتِ اسمٰعیل ذبیح اللہ شکار سے واپس تشریف لائے، تو گھر میں ایک عجیب و غریب' دلنواز خوشبو محسوس فرمائی۔ آپ نے اپنی بی بی سے دریافت فرمایا، کیا کوئی آیا تھا؟ کہا ہاں ایک معمّر شخص گھوڑے پر سوار آیا تھا' اُس نے آپ کو سلام کہا ہے۔ پھر دریافت کیا' کچھ پیغام دیا ہے؟ کہا ہاں یہ فرماگئے ہیں کہ اپنی دہلیز بدل دو۔ آپ نے پوچھا' تم سے کچھ پوچھا تھا؟ کہا ہاں اُنھوں نے ہماری لبراوقات کے بارے میں دریافت کیا تھا' میں نے کہا ہماری گزر اوقات بڑی سختی اور تنگی سے ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا اے بی بی سُن! وہ میرے والدِ ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، چونکہ تم نے اُن سے اپنی ناشکری و ناسپاسی کا شکوہ کیا، اسلیے وہ مجھے حکم دیگئے کہ دہلیز یعنی تمکو بدل دوں۔ لہٰذا ارشاد کے بموجب میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اسکے بعد اسی قبیلہ سے ایک اور صاحبزادی سے نکاح فرمالیا۔ پھر ایک مدت کے بعد بحکمِ الٰہی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام تشریف لاتے ہیں، اتفاق سے اس مرتبہ بھی آپ شکار کو تشریف لیگئے تھے۔ حضرتِ خلیل اللہ نے اپنی بہُو سے دریافت کیا، تمہارے شوہر کہاں ہیں؟ کہا وہ ہمارے لیے روزی کی تلاش میں گئے ہیں۔ آپ آئیے، تشریف رکھیئے اور جو حاضر ہے تناول فرمائیے۔ آپ نے فرمایا' یہ تو بتاؤ گزر بسر کیسی ہوتی ہے؟ کیا حال ہے؟ کہا الحمدللہ! ہم سب بخیریت ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے خوب فراخی و خوشحالی ہے، اُسکا بڑا شکر ہے۔ اور آپ کے سامنے گوشت اور دُودھ پیش کیا، آپنے اُن میاں بیوی' اور دُودھ اور گوشت میں برکت کیلیے دُعا فرمائی۔ اگر وہ اُسوقت گندم یا جَو کی روٹی' اور کھجوریں پیش کرتیں' تو آپ کی دعا کے سبب وہاں کی زمین گندم اور جَو اور کھجوریں زیادہ پیدا کرتی۔ اب اس دعا کی برکت سے اہلِ مکّہ گوشت اور پانی پر ہی گزارہ کرسکتے ہیں۔ اسکے بعد حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کی زوجہ نے عرض کیا' آپ سواری سے اُتریئے تاکہ آپ کا سرِ مبارک دھوؤں' راہ کی گرد و غبار سے بالوں کو صاف کردوں، لیکن آپ سواری سے نہ اُترے اُنھوں نے ایک پتھر (جسے مقام ابراہیم کہا جاتا ہے) لاکر آپ کی دائیں جانب رکھدیا، آپ نے اُس پر قدمِ مبارک رکھدیئے، اُنھوں نے سرِ مبارک کو دائیں جانب سے دھویا، پھر بائیں جانب پتھر رکھا، اور بائیں جانب سے

مبارک دھویا اور کنگھی کی۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام بہو کی اس خدمت گزاری) اور شکرِ الٰہی بجالانے پر بہت مسرور ہوئے۔ واپسی پر فرمایا جب تمہارے شوہر تشریف لائیں تو اُن سے میرا سلام کہنا اور پیغام کہ تمہاری یہ دہلیز (چوکھٹ) بہت عمدہ ہے اسے نہ اُکھاڑنا۔ جب حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام تشریف لائے، تو اپنے والدِ ماجد کی بھینی بھینی خوشبو سے گھر کو معطر پایا۔ بی بی نے سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا، رے والدِ ماجد تھے، تمہیں مبارک ہو، وہ مجھے حکم دے گئے ہیں کہ تمہیں اپنے سے جُدا نہ کروں (چونکہ تم نے خدا کی نعمتوں پر شکر اور اُن کی خدمت گزاری کی ہے)۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد حضرتِ ابراہیم علیہ السلام رِ جلیل تشریف لائے، اور حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کو چاہِ زمزم کے قریب تیر سیدھا کرتے ہوئے ملاحظہ فرمایا، حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام والدِ ماجد کو دیکھتے ہی تعظیم و تکریم میں ایستادہ ہوگئے، باادب سلام عرض کیا ند و پدر کی ملاقات ہوچکی، تو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اے فرزند! مجھے رب تعالیٰ کا حکم ہوا ہے کہ میں خدا کے اس گھر (خانۂ کعبہ) کو تعمیر کروں۔ تمہیں بھی میری معاونت کرنی پڑے گی۔ حضرتِ اسمٰعیل لسلام نے سرِ اطاعت خم کردیا۔ اب پدر و فرزند نے بیتُ اللہ کی بنیاد رکھی، اور دیواریں بلند کرنی شروع کردیں۔ حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام پتھر لاتے جاتے اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام جماتے جاتے تھے ب دیواریں کچھ بلند ہوگئیں، تو وہ پتھر جسے مقامِ ابراہیم کہا جاتا ہے، لاکر رکھدیا، اُس پر کھڑے ہوکر پتھر چُننے شروع کردیئے۔ یہ دونوں تعمیرِ کعبہ کرتے جاتے تھے اور زبانِ مبارک سے یہ دعا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا كَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ اے ہمارے خدا ہماری اِس خدمت کو قبول فرما بیشک تو سنتا جانتا ہے" مانگتے جاتے تھے۔ (ابنِ کثیر و مظہری)

امام مالک نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا رکن اور مقام جنتی یاقوتوں میں سے دو یاقوت ہیں۔ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ فرمایا جنتی دو یاقوتوں کے نور کو اللہ تعالیٰ نے سلب کرکے اُتارا۔ اگر ان کا نور باقی رہتا، تو یہ مشرق سے مغرب تک روشن کردیتے۔ بزرگانِ دین نے یہاں سے یہ استنباط فرمایا ہے کہ جس جگہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مقرب ہ ولی ایک عرصہ قیام فرمائے، تو اُس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبرکات اور سکینہ اُترتا ہے، اور اُسکے سبب اللہ تعالیٰ کی طرف منجذب اور اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اور وہاں جسطرح نیکی پر بے حساب ثواب ملتا ہے، اُسی طرح بدی پر بھی دونا عذاب ملتا ہے۔ (مظہری)

احادیث میں ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے لوگوں نے بناءِ بیت اللہ کی شروع کیفیت کا حال دریافت کیا، تو فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ میرا گھر بناؤ۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام رائے کہ مجھے کہاں بنانا چاہیئے کسطرح اور کتنا بڑا بنانا چاہیئے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر سکینہ (سکونِ قلب، تائیدِ الٰہی اور رہنمائی) نازل فرمائی، اور بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا، فرمایا گیا جہاں یہ ٹھہرے وہاں تم میرا ر بناؤ۔ آپ نے بنانا شروع کیا، جب حجرِ اسود کی جگہ پہنچے، تو حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام سے فرمایا بیٹا کوئی اچھا سا پتھر ڈھونڈ لاؤ، جب پتھر لیکر آئے تو آپ اُس جگہ پتھر نصب کرچکے تھے۔ دریافت کیا یہ پتھر ن لایا؟ فرمایا، خدا کے حکم سے یہ پتھر حضرتِ جبرئیل آسمان سے لائے ہیں۔ کعبِ احبار فرماتے کہ اب جہاں بیت اللہ وہاں زمین کی پیدائش سے پہلے پانی پر بلبلوں کے ساتھ جھاگ سا تھا، اللہ تعالیٰ نے یں سے زمین کو پھیلایا۔ حضرتِ علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ بنانے کے لیے حضرتِ خلیل اللہ ارمینیہ سے تشریف لائے تھے۔ سدّی کہتے ہیں کہ حجرِ اسود حضرتِ جبرئیل ہند سے لائے تھے اُسوقت ہ سفید چمکدار یاقوت تھا، جو حضرتِ آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اُتار اگیا تھا۔ پھر لوگوں کے گنہگار ہاتھوں کے مَس کرنے کی وجہ سے اس کا رنگ سیاہ ہوگیا۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ نیو اور بیادیں پہلے سے موجود تھیں، اُن ہی پر حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے بناء فرمائی۔

مُسندِ عبد الرزاق میں ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام جنّت سے ہند میں اُتارے گئے تھے، اُسوقت اُن کا قد لمبا تھا، زمین پر آنے کے بعد فرشتوں کی تسبیح، نماز و دعا سنتے تھے، اور گریہ وزاری اور استغفار سے بدن مضمحل اور قد کم ہوگیا۔ فرشتوں کی تسبیح کی محبوب و دلنواز آوازیں مسموع ہونا بند ہوگئیں، اُسوقت آپ گھبرانے لگے۔ حکمِ باری ہُوا کہ مکّہ کی طرف جاؤ، پ چلے، جہاں جہاں آپ کا قدم پڑا وہاں آبادی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک یاقوت جنّت سے اُتارا اور بیت اللہ کی جگہ رکھا، اور اُسے اپنا گھر قرار دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام یہاں طواف کرنے لگے، طبعِ مبارک مانوس ہوئی اور گھبراہٹ جاتی رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانہ میں پھر اُٹھالیا گیا۔ اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں پھر اللہ تعالیٰ نے بنوایا۔ حضرتِ آدم علیہ السلام نے یہ گھر حرا، طورِ زیتا، طورِ سینا اور جودی، اِن پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بنایا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، کیا تم نہیں دیکھتیں کہ تمہاری قوم نے جب بیت اللہ بنایا، تو قواعدِ ابراہیم سے گھٹا دیا۔ میں نے کہا، حضور آپ اسے بڑھا کر اصلی بناء پر کردیں۔ فرمایا، کہ اگر تمہاری قوم کا اسلام تازہ، اور اُن کا زمانہ کفر قریب کا نہ ہوتا، تو یں ایسا کرلیتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو جب یہ حدیث پہنچی، تو فرمانے لگے شاید یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حجرِ اسود کے پاس کے دو ستونوں کو چھوتے نہ تھے۔ صحیح مسلم شریف میں ہے حضور فرماتے ہیں، اے عائشہ! اگر تمہاری قوم کا جاہلیت کا زمانہ نیا نہ ہوتا، تو میں کعبہ کے خزانے کو للہ خیرات کر ڈالتا، اور دروازہ کو زمین دوز کردیتا، اور حطیم کو بیت اللہ میں داخل کردیتا۔ صحیح بخاری کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ میں اسکا دوسرا دروازہ بھی بنا دیتا، ایک آنے کے لیے اور دوسرا جانے کے لیے۔ چنانچہ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایسا ہی کیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اِسے میں دوبارہ بناءِ ابراہیمی پر بناتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک دروازہ مشرق رُخ کرتا اور دوسرا مغرب رُخ، اور چھ ہاتھ حطیم کو اس میں داخل کرلیتا جسے قریش نے باہر کردیا ہے۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت سے پانچ سال پہلے قریش نے نئے سرے سے کعبہ بنایا تھا، اسکا مفصل ذکر ملاحظہ ہو۔ اس بناء میں خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی شریک تھے۔ پینتیس ۳۵ سال کی آپ کی عمر تھی، اور پتھر آپ بھی اُٹھاتے تھے۔ محمد بن اسحاق بن یسار رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک پینتیس ۳۵ سال کی ہوئی، اُسوقت قریش نے کعبۃ اللہ کو نئے سرے سے بنانے کا ارادہ کیا۔ ایک تو اسلیے کہ اسکی دیواریں بہت چھوٹی تھیں، چھت نہ تھی، دوسرے اسلیے بھی کہ بیت اللہ کا خزانہ چوری ہوگیا تھا، جو بیت اللہ کے بیچ میں ایک گہرے گڑھے میں رکھا ہوا تھا، یہ مال دُوَیک کے پاس ملا تھا، جو خزاعہ کے قبیلہ بنی ملیح بن عمرو کا مولیٰ تھا، ممکن ہے چوروں نے یہاں لارکھا ہو، لیکن اسکے ہاتھ اس چوری کی وجہ سے کاٹے گئے۔ ایک اور قدرتی سہولت بھی انکے لیے ہوگئی تھی کہ روم کے تاجروں کی ایک کشتی جس میں بہت اعلیٰ درجہ کی لکڑیاں تھیں، وہ طوفان کی وجہ سے جدّہ کے کنارے آلگی تھی، یہ لکڑیاں چھت میں کام آسکتی تھیں، اسلیے قریشیوں نے انھیں خریدکیا، اور مکّہ کے ایک بڑھئی کو جو قبطی قبیلہ میں سے تھا چھت کا کام سونپا، یہ سب تیاریاں تو ہو رہی تھیں، لیکن بیت اللہ کو گرانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، اسکے قدرتی اسباب بھی مہیا ہوگئے، بیت اللہ کے خزانہ میں ایک بہت بڑا اژدہا تھا جب کبھی لوگ اُسکے قریب بھی جاتے، تو وہ مُونھ پھاڑ کر اُنکی طرف لپکتا تھا۔ یہ سانپ ہر روز اُس کنوئیں سے نکل کر بیت اللہ کی دیوار پر آ بیٹھتا تھا۔ ایک روز وہ بیٹھا ہوا تھا، جو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا پرند بھیجا، وہ اُسے پکڑ کرلے اُڑا، قریشیوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا ارادہ مرضیِ مولیٰ کے مطابق ہے، لکڑیاں بھی ہمیں مل گئیں، بڑھئی ہمارے پاس موجود ہے، سانپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے دفع کیا۔ اب انھوں نے مستقل ارادہ کرلیا کہ کعبۃ اللہ کو گرا کر نئے سرے سے بنائیں۔ سب سے پہلے ابنِ وہب کھڑا ہُوا اور ایک پتھر کعبۃ اللہ کا اُتارا، جو اُسکے ہاتھ سے اُڑ کر پھر وہیں جاکر نصب ہوگیا۔ اُس نے تمام قریش کو خطاب کرکے کہا، سنو بیت اللہ کے بنانے میں ہر شخص اپنا طیب اور پاک مال ہی خرچ کرے، اُسمیں زناکاری کا روپیہ، سُودی بیوپار کا روپیہ، ظلم سے حاصل کیا ہوا مال نہ لگانا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مشورہ ولید بن مغیرہ نے دیا تھا۔ اب بیت اللہ کے حصّے بانٹ لیے گئے دروازہ کا حصہ بنو عبدِ مناف اور زہرا بنائیں، حجرِ اسود اور رُکنِ یمانی کا حصّہ بنو مخزوم بنائیں قریش کے اور قبائل بھی انکا ساتھ دیں، کعبہ کا پچھلا حصہ بنو جمیح اور سہم بنائیں، حطیم کے پاس کا حصہ بنو عبدالدار بن قصی اور بنو اسد بن عبدالعزیٰ اور بنو عدی بن کعب بنائیں۔ یہ مقرر کرکے اب بنی ہوئی عمارت کو ڈھانے کے لیے چلے، لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ اسے ڈھانا شروع کرے۔ آخر ولید بن مغیرہ نے کہا لو میں شروع کرتا ہوں۔ کدال لیکر اُوپر چڑھ گئے اور کہنے لگے، اے اللہ! تجھے خوب علم ہے کہ ہمارا ارادہ بُرا نہیں، ہم تیرے گھر کو اُجاڑنا نہیں چاہتے، بلکہ اسکے آباد کرنے کی فکر میں ہیں، یہ کہکر کچھ حصہ دونوں رُکن کے کناروں کا گرا دیا۔ قریشیوں نے کہا بس اب چھوڑ دو، اور رات بھر انتظار کرو، اگر اس شخص پر کوئی وبال آجائے، تو یہ پتھر اُسی جگہ پر لگادینا، اور خاموش ہوجانا۔ اور اگر کوئی عذاب نہ آئے تو سمجھ لینا کہ اسکا گرانا خدا کو ناپسند نہیں، پھر کل سب ملکر اپنے اپنے کام میں لگ جانا۔ چنانچہ صبح ہوئی اور ہر طرح خیریت رہی، اب سب آگئے اور بیت اللہ شریف کی اگلی عمارت کو گرادیا، یہانتک کہ اصلی نیو یعنی بناءِ ابراہیمی تک پہنچ گئے۔ یہاں سبز رنگ کے پتھر تھے، اور ایک دوسرے میں گویا پیوست تھے، ایک شخص نے دو پتھروں کو الگ کرنا چاہا، اُن میں کدال ڈال کر زور لگایا، تو پتھر کے ہلنے کے ساتھ ہی تمام مکّہ کی زمین ہلنے لگی، تو انھوں نے سمجھ لیا کہ انھیں جدا کرکے اور پتھر انکی جگہ لگانا خدا کو منظور نہیں، اسلیے ہمارے بس کی بات نہیں، اس ارادہ سے باز رہے، اور اُن پتھروں کو اُسی طرح رہنے دیا۔ پھر ہر قبیلے نے اپنے اپنے حصّے کے مطابق علیحدہ علیحدہ پتھر جمع کیئے، اور عمارت بننی شروع ہوئی، یہانتک کہ حجرِ اسود رکھنے کی جگہ تک پہنچے۔ اب ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے ملے، آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے یہانتک کہ باقاعدہ جنگ کی نوبت آگئی،

فرقے آپس میں کھنچ گئے، اور لڑائی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ بنو عبدِ دار، اور بنو عدی نے ایک لگن میں خون بھر کر، اُس میں ہاتھ ڈبو کر حلف اُٹھایا کہ سب کٹ مرینگے لیکن حجرِ اسود کسی کو نہیں رکھنے دینگے اسی طرح چار پانچ دن گزر گئے۔ پھر قریش مسجد میں جمع ہوئے کہ آپس میں مشورہ اور انصاف کریں، تو ابو اُمیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمّر اور عقلمند تھے کہا، سنو لوگو! تم اپنا حکَم کسی کو بنالو، وہ جو فیصلہ کرے تم سب منظور کرلو، لیکن پھر حکَم بنانے میں بھی اختلاف ہوگا، اسلیے ایسا کرو کہ اب جو سب سے پہلے یہاں مسجد میں آئے وہ ہی ہمارا حکَم و منصف ہے۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کرلیا، اب منتظر ہیں کہ دیکھیں سب سے پہلے کون آتا ہے؟ پس سب سے پہلے حضورِ اکرم سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کو دیکھتے ہی یہ لوگ خوش ہو گئے، اور کہنے لگے ہمیں آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ ہم آپ کے حکَم ہونے پر رضامند ہیں، یہ تو اَمین ہیں، یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ پھر سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور سارا واقعہ آپ کو کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا، جاؤ کوئی موٹی اور بڑی سی چادر لاؤ، وہ لے آئے۔ آپ نے حجرِ اسود اُٹھا کر اپنے دستِ مبارک سے اُس چادر میں رکھا، پھر فرمایا ہر قبیلہ کا سردار آئے اور اس چادر کا کونہ پکڑلے اور اسطرح ہر ایک حجرِ اسود کے اُٹھانے کا حصّہ دار بنے۔ اس پر سب لوگ بہت ہی خوش ہوئے، اور تمام سرداروں نے چادر کو پکڑ کر اونچا کیا۔ جب اُسکے رکھنے کی جگہ تک پہنچے، تو اللہ کے نبی نے اُسے لیکر اپنے ہاتھ سے اُس کی جگہ رکھدیا، اور وہ نزاع و اختلاف بلکہ جدال و قتال رفع ہو گیا، اور اسطرح اللہ نے اپنے رسول کے ہاتھ سے اپنے گھر میں اُس مبارک پتھر کو نصب کرایا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے سے پہلے قریش آپ کو اَمین کہا کرتے تھے۔ اب پھر اوپر کا حصّہ بنا اور کعبۃ اللہ کی عمارت تمام ہوئی۔ ابنِ اسحاق مورّخ فرماتے ہیں کہ حضور کے زمانہ میں کعبہ اٹھارہ ہاتھ کا تھا، قباطی کا غلاف چڑھایا جاتا تھا، پھر چادر کا غلاف چڑھنے لگا، ریشمی غلاف سب سے پہلے حجاج ابنِ یوسف نے چڑھایا، کعبہ کی یہی عمارت رہی یہانتک کہ حضرتِ عبداللہ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ساٹھ سال کے بعد یہاں آگ لگی، اور کعبہ جل گیا۔ یہ یزید بن معاویہ کی ولایت کا آخری زمانہ تھا، اور اس نے مکہ میں ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اِن دنوں میں خلیفۂ مکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خالہ حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو حدیث سُنی تھی، اُسی کے مطابق حضور کی تمنا پر بیت اللہ کو گرا کر ابراہیمی قواعد پر بنایا، حطیم اندر شامل کرلیا، مشرق و مغرب دو دروازے رکھے، ایک اندر آنے کا دوسرا باہر جانے کا، اور دروازوں کو زمین کی برابر رکھا۔ آپ کی امارت کے زمانہ تک کعبۃ اللہ یونہی رہا، یہانتک کہ ظالم حجاج کے ہاتھوں آپ شہید ہوئے۔ اب حجاج نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے کعبہ کو پھر توڑ کر پہلے کی طرح بنالیا۔ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ یزید بن معاویہ کے زمانہ میں جبکہ شامیوں نے مکّہ مکرمہ پر چڑھائی کی اور جو ہونا تھا وہ ہوا، اُسوقت حضرت عبداللہ نے بیت اللہ کو یونہی چھوڑ دیا، موسمِ حج کے موقع پر لوگ جمع ہوئے، اُنھوں نے یہ سب کچھ دیکھا، زاں بعد آپ نے لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا سارے کعبہ کو گرا کر نئے سرے سے بناؤں، یا جو ٹوٹا ہوا ہے اُسکی مرمت کرلوں؟ تو حضرتِ عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، میری رائے ہے کہ آپ جو ٹوٹا ہوا ہے اُسی کی مرمت کردیں، باقی سب پُرانا ہی رہنے دیں۔ آپ نے فرمایا، اگر تم میں سے کسی کا گھر جل جاتا، تو وہ تو خوش نہ ہوتا جبتک اُسے نئے سرے سے نہ بنائے، پھر تم اپنے رب عزّ و جل کے گھر کی نسبت اتنی کمزور رائے کیوں رکھتے ہو؟ اچھا میں تین دن تک اپنے رب سے استخارہ کرونگا، پھر جو سمجھ میں آئیگا وہ کرونگا۔ تین دن کے بعد آپ کی رائے یہی ہوئی کہ باقی ماندہ دیواریں بھی توڑ دی جائیں، اور از سرِ نو کعبہ کی تعمیر کیجائے۔ چنانچہ یہ حکم دیدیا، لیکن کعبہ کو توڑنے کی کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی ہر ایک ڈرتا تھا کہ جو پہلے توڑنے کے لیے چڑھے گا، اُس پر عذاب نازل ہوگا، لیکن ایک باہمت شخص چڑھ گیا، اور اُس نے ایک پتھر توڑا، جب لوگوں نے دیکھا کہ اسے کوئی ایذا نہیں پہنچی، تو اب ڈھانا شروع کیا، اور زمین تک برابر یکساں صاف کردیا۔ اُسوقت چاروں طرف ستون کھڑے کردیئے گئے تھے، اور ایک کپڑا تان دیا تھا۔ اب بناءِ بیت اللہ شروع ہوئی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے اُم المومنین حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سُنا ہے، وہ فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، اگر لوگوں کے کفر کا زمانہ قریب نہ ہوتا، اور میرے پاس خرچ بھی ہوتا جس سے میں بنا سکتا، تو حطیم میں سے پانچ ہاتھ بیت اللہ میں شامل کردیتا، اور کعبہ کے دو دروازے کردیتا، ایک آنے کا اور ایک جانے کا۔" حضرتِ عبداللہ نے یہ روایت بیان کرکے فرمایا، اب لوگوں کے کفر کا زمانہ قریب کا نہیں رہا، اُن سے خوف جاتا رہا، اور خزانہ بھی معمور ہے، میرے پاس کافی روپیہ ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ میں حضور کی تمنا پوری نہ کروں۔ چنانچہ پانچ ہاتھ جگہ حطیم میں سے اندر لے لی گئی اب جو دیوار تعمیر کی تو ٹھیک ابراہیمی بنیاد نظر آنے لگی، جسے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اور اُسی پر دیوار کھڑی کی۔ بیت اللہ کا طول اٹھارہ ہاتھ کا تھا، اب اس میں پانچ ہاتھ اور بڑھ گیا تو چھوٹا ہو گیا، اسلیے طول میں دس ہاتھ اور بڑھ گیا، اور دو دروازے بنائے گئے، ایک اندر آنے کا دوسرا باہر جانے کا۔ حضرتِ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد حجاج نے عبدالملک کو لکھا، اور اُن سے مشورہ لیا کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ بھی لکھ بھیجا کہ مکّہ مکرمہ کے عادلوں نے دیکھا ہے کہ ٹھیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر کعبہ تیار ہوا ہے۔ لیکن عبدالملک نے جواب دیا کہ طول کو تو باقی رہنے دو، اور حطیم کو باہر کردو، اور دوسرا دروازہ بند کردو۔ حجاج نے اُسکے حکم کے مطابق کعبہ کو توڑ کر پھر اُسی بناء پر اُسکو بنا دیا۔ لیکن سُنّت طریقہ یہی تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی بناء کو باقی رکھا جاتا، اسلیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرضی یہی تھی، لیکن اُسوقت حضور کو اندیشہ یہ تھا کہ کہیں لوگ بدگمانی نہ کریں، کیونکہ یہ ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں، مگر یہ حدیث عبدالملک بن مروان کو نہیں پہنچی تھی، اسلیے اُس نے اسے تڑوا دیا جب اُسے یہ حدیث پہنچی تو مغموم ہوا، اور کہنے لگا کاش کہ میں اسے یونہی رہنے دیتا اور نہ تڑواتا۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حارث بن عبیداللہ جب ایک وفد میں عبدالملک ابنِ مروان کے پاس پہنچے، تو عبدالملک نے کہا، میرا خیال ہے کہ ابو حبیب یعنی حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہما) نے (اپنی خالہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث نہ سُنی ہوگی؟ حارث نے کہا ضرور سُنی تھی، خود میں نے بھی اُم المومنین سے سُنا ہے۔ پوچھا، تم نے کیا سُنا ہے؟ کہا میں نے سُنا ہے آپ فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ اے عائشہ! تمہاری قوم نے بیت اللہ کو تنگ کردیا، اگر تمہاری قوم کا زمانہ شرک قریب کا نہ ہوتا، تو میں نئے سرے سے اسکی کمی کو پورا کردیتا، لیکن آؤ میں تمہیں اصلی بنیاد بتادوں، شاید کسی وقت تمہاری قوم پھر اسے اسکی اصلی بنیادوں پر بنانا چاہے۔ تو آپ نے حضرتِ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حطیم میں سے قریباً سات ہاتھ اندر داخل کرنے کو فرمایا، اور فرمایا میں اسکے دو دروازے کردیتا، ایک آنے کا اور ایک جانے کا، اور دونوں دروازے زمین کی برابر رکھتا، ایک مشرق رخ رکھتا دوسرا مغرب رُخ۔ جانتی بھی ہو کہ تمہاری قوم نے دروازہ کو اتنا اونچا کیوں رکھا ہے؟ آپ نے عرض کیا، حضور مجھے خبر نہیں۔ فرمایا، محض اپنی اونچائی اور بڑائی کے لیے کہ جسے چاہیں اندر جانے دیں اور جسے چاہیں داخل نہ ہونے دیں۔ جب کوئی شخص اندر جانا چاہتا، تو اُسے اوپر سے دھکا دیدیتے وہ گر پڑتا، اور جسے داخل کرنا چاہتے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے لیتے۔ عبدالملک نے کہا، اے حارث تم نے خود اس حدیث کو حضرتِ عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے سُنا ہے؟ اُنھوں نے کہا ہاں میں نے خود سُنا ہے۔ تو تھوڑی دیر تک عبدالملک اپنا عصا ٹیکے سوچتا رہا، پھر کہنے لگا، کاش! میں اُسے یونہی چھوڑ دیتا۔ صحیح مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک مرتبہ طواف کرتے ہوئے حضرتِ عبداللہ کو کوس کر کہا کہ وہ حضرتِ عائشہ (رضی اللہ عنہا) پر اس حدیث کا بہتان باندھتا تھا، تو حضرت حارث نے روکا اور شہادت دی کہ وہ سچے تھے، میں نے بھی حضرت صدیقہ (رضی اللہ عنہا) سے یہ سنا ہے، اب عبدالملک افسوس کرنے لگا اور کہنے لگا، اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا، تو میں ہرگز اسے نہ توڑتا۔ قاضی عیاض اور امام نووی رحمہما اللہ نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے حضرتِ امام مالک رحمۃ اللہ سے پوچھا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں، تو میں پھر کعبہ کو حضرتِ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہما کے بنائے ہوئے کے مطابق بنادوں؟ امام مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا آپ ایسا نہ کیجئے، ایسا نہ ہو کہ کعبہ بھی بادشاہوں کا ایک کھلونا بنجائے، جو آئے اپنی طبیعت کے مطابق توڑ پھوڑ کرتا رہے۔ چنانچہ خلیفہ اپنے ارادہ سے باز رہے۔ یہی بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے، کہ کعبہ کو بار بار چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کعبہ کو دو چھوٹی پنڈلیوں والا ایک حبشی پھر خراب کریگا۔ حضور فرماتے ہیں، گویا میں اُسے دیکھ رہا ہوں، وہ سیاہ فام ایک ایک پتھر الگ الگ کردیگا، اسکا غلاف لیجائے گا اور اسکا خزانہ بھی، وہ ٹیڑھے ہاتھ پاؤں والا گنجا ہوگا، میں دیکھ رہا ہوں کہ گویا وہ کدال بجا رہا ہوں اور برابر ٹکڑے کر رہا ہے۔ یہ ناشدنی واقعہ (جسکے دیکھنے سے خدا ہمیں محفوظ رکھے) یاجوج ماجوج کے نکل چکنے کے بعد ہوگا۔ صحیح بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی بیت اللہ شریف کا حج کروگے۔

حضرتِ ابراہیم اور حضرتِ اسمٰعیل علیہما السلام اپنی دعا میں فرماتے ہیں کہ ہمیں مسلمان بنائے یعنی مخلص بنالے مطیع بنالے، موحد بنا، شرک سے بچا، ریا کاری سے محفوظ رکھ، خشوع و خضوع عطا فرما۔ حضرتِ سلام بن ابی مطیع رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلمان تو تھے ہی لیکن اسلام کی ثابت قدمی طلب کرتے ہیں، جسکے جواب میں ارشادِ باری ہوا قَدْ فَعَلْتُ میں نے تمہاری یہ دعا قبول فرمائی۔ پھر

اپنی اولاد کے لیے بھی یہی دعا کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل بھی آپ کی اولادیں ہیں اور عرب بھی، قرآن میں ہے وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک جماعت حق و عدل پر تھی، لیکن روانی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لیے یہ دعا ہے، گو عام طور پر دوسروں کو بھی شامل ہو، اسلیے کہ اسکے بعد دوسری دعا میں ہے کہ ان میں ایک رسول بھیج، اور رسول سے مراد حضور سید عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، چنانچہ یہ دعا بھی پوری ہوئی، جیسے کہ فرمایا هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ لیکن اس سے آپ کی رسالت خاص نہیں ہوتی بلکہ آپ کی رسالت عام ہے، عرب و عجم سب کے لیے، جیسے کہ فرمایا قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا، فرما دیجیے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ ان دونوں نبیوں کی یہ دعا جیسی ہے، الیسی ہی ہر متقی کی دعا ہونی چاہیئے جسطرح کہ قرآنی تعلیم ہے کہ مسلمان یہ دعا کریں رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ○ اے ہمارے رب ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ محبت کی دلیل ہے کہ انسان یہ چاہے کہ میری اولاد میرے بعد بھی خدا کی عابد رہے۔ دوسری جگہ اس دعا کے الفاظ یہ ہیں وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○ خدایا مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انسان کے مرتے ہی اُسکے اعمال ختم ہو جاتے ہیں، مگر تین کام جاری صدقہ، علم جس سے نفع حاصل کیا جائے اور نیک اولاد جو دعا کرتی رہے۔ (مسلم) پھر آپ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں مناسک دکھا، یعنی احکام حج، ذبح وغیرہ سکھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کو لیکر کعبہ کی عمارت پوری ہو جانے کے بعد صفا پر آتے ہیں، پھر مروہ پر جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ شعائر اللہ ہیں، پھر منیٰ کی طرف لے چلے، عقبہ پر شیطان درخت کے پاس کھڑا ہوا ملا، تو کہا تکبیر کہکر اسے کنکر ماریئے، ابلیس یہاں سے بھاگ کر جمرۂ وسطیٰ کے پاس جا کھڑا ہوا، یہاں بھی آپ نے اسے کنکریاں ماریں، تو یہ خبیث نا اُمید ہو کر چلا گیا۔ اسکا ارادہ تھا کہ حج کے احکام میں کچھ دخل دے، لیکن موقع نہ ملا اور مایوس ہو گیا۔ یہاں سے آپ کو مشعر الحرام میں لائے، پھر عرفات میں پہنچایا، پھر تین مرتبہ پوچھا کہو سمجھ لیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! دوسری روایت میں تین جگہ شیطان کو کنکریاں مارنی مروی ہیں، اور ہر شیطان کو سات سات کنکریاں ماری ہیں۔ (ابن کثیر)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ

اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور

یُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

انھیں خوب ستھرا فرمائے بیشک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ اے رب ہمارے، اور بھیج ان میں (یعنی حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی ذریت میں) ایک رسول انہی میں سے۔ یہ دعا سید انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے تھی، یعنی کعبۂ معظمہ کی تعمیر کی عظیم خدمت بجالانے اور توبہ و استغفار کرنے کے بعد حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے یہ دعا کی کہ اے رب اپنے محبوب نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہماری نسل میں ظاہر فرما، اور یہ شرف ہمیں عنایت کر۔ یہ دعا قبول ہوئی، اور ان دونوں صاحبوں کی نسل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نبی نہیں ہوا۔ اولادِ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں باقی انبیاء حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ مسئلہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا میلاد شریف خود بیان فرمایا۔ امام بغوی نے ایک حدیث روایت کی کہ حضور نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک، خاتم النبیین لکھا ہوا تھا، بحالیکہ حضرت آدم کے پتلہ کا خمیر ہو رہا تھا۔ میں تمہیں اپنے ابتداءِ حال کی خبر دوں، میں دعائے ابراہیم ہوں، بشارتِ عیسیٰ ہوں، اپنی والدہ کے اُس خواب کی تعبیر ہوں، جو انھوں نے میری ولادت کے وقت دیکھی، اور اُنکے لیے ایک ساطع ظاہر ہوا، جس سے ملکِ شام کے ایوان و قصور اُنکے لیے روشن ہو گئے۔ اس حدیث میں دعائے ابراہیم سے یہی دعا مراد ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، اور آخر زمانہ میں حضور سید انبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ الحمد للہ علی احسانہ (جمل، خازن، خزائن العرفان) سیدتنا آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جو قربِ ولادتِ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، نورِ ساطع کے ظہور سے ملک شام کے ایوان و قصور ملاحظہ فرمائے اس میں اسطرف اشارہ ہے کہ وہاں دینِ اسلام مستحکم ہوگا، بلکہ بعض روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ آخر زمانہ میں ملکِ شام، اسلام اور اہلِ اسلام کا مرکز بنجائیگا۔ شام کے مشہور شہر دمشق ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرقی سفید منارہ پر آسمان سے نزول فرمائینگے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ میری اُمت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قایم رہیگی، انکے مخالفین انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے یہانتک کہ امر اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور الامام المہدی) آجائے۔ صحیح بخاری میں اتنا اور زیادہ ہے کہ وہ شام میں ہونگے۔ (ابن کثیر)

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ یہ رسولِ پاک، ذریتِ ابراہیم و اسمٰعیل اور تمام خلق پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انہیں تیری کتاب (قرآن) اور پختہ علم سکھائے یعنی قرآنِ پاک اور اس کی تعلیم سے اسکے حقائق و معانی سکھائے۔ حکمت کے معنی میں بہت اقوال ہیں، بعض کے نزدیک، حکمت سے فقہ مراد ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ حکمت، سنت کا نام ہے بعض کہتے ہیں کہ حکمت، علم و احکام کو کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حکمت، علم اسرار ہے۔ (خزائن العرفان) مطلب یہ ہے کہ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علمِ ظاہر اور علمِ باطن دونوں کی تعلیم دینگے اور آپ دونوں قسم کے علوم کے جامع ہونگے، کیونکہ علمِ باطن، بغیر علمِ ظاہر کے موجب زندقہ و الحاد ہو جاتا ہے، اور علمِ ظاہر، بغیر علمِ باطن کے تقشف اور حیلہ سازی کی طرف منجر ہوتا ہے۔ (عزیزی)

وَیُزَكِّیْهِمْ اور انہیں خوب ستھرا فرمادے۔ ستھرا کرنے کے یہ معنی ہیں کہ لوحِ نفوس اور ارواح کو کدورت سے پاک کر کے حجاب اٹھادیں، اور آئینۂ استعدادات کی جلا فرما کر انھیں اس قابل کردیں کہ ان میں حقائق کی جلوہ گری ہو سکے۔ (خزائن العرفان) مطلب یہ کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام اس امر سے واقف تھے کہ ان اوصافِ حمیدہ فضائلِ جمیلہ کا حامل جو رسول مبعوث ہوگا وہ خاتم النبیین والمرسلین ہوگا، اور اُس پر سلسلۂ نبوت تمام ہو جائیگا، اُسکے بعد کوئی اور نبی پیدا نہ ہوگا۔ لامحالہ اُس نبی آخر الزماں کی اُمت میں ایسے افراد ہونے چاہئیں جو کارہائے نبوت کی نیابت کر سکیں، اور جہاں سے نبی کے لوحِ مدرکہ پر القائے غیبیہ ہوتی ہیں، ان پر بھی ہوں، اور ان میں بجز منصبِ نبوت کے تحتِ نبوت تمام فضائل و خصائل موجود ہوں، اور جملہ علومِ ظاہرہ و باطنہ کے وہ حامل ہوں، تاکہ جہان اور اہلِ جہان کی ہر معاملہ میں رہنمائی و دستگیری کر سکیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اثرِ نبوت، بصورتِ ولایت ظاہر و باہر ہو، تاکہ اُمت بقدرِ امکان، فیضِ نبوت سے بے بہرہ نہ رہے۔ ؎ چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب ✽ بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب۔ اس مقصد سے انھوں نے یہ دعا مانگی، جسے رب العزت نے شرف قبول سے نوازا۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ بیشک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔ چونکہ تیری عزت تقاضا نہیں کرتی کہ ہر کسی کو بلا واسطہ علوم کی تعلیم فرمائے، اور اُس سے ہمکلامی کے شرف سے بہرہ ور بنائے اور اُس پر وہ اپنی آیات نازل فرمائے۔ لیکن تیری حکمت تقاضا کرتی ہے کہ کوئی فردِ بشر، ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کی معرفت سے خالی نہ رہے، اور صالح معاش و معاد کے نظام کی شناخت سے محروم نہ رہے لہٰذا ان دونوں اقتضاء کے اجتماع کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی ایک وجودِ گرامی، ان افرادِ بشر کے درمیان خاص ہو کر ایسے منصبِ رسالت پر فائز ہو، جو اللہ تعالیٰ سے بے واسطہ اکتسابِ علوم کر کے وہ مخلوقِ خدا کو پہنچائے، اسی صورت میں تیری عزت کا اقتضاء بھی برقرار رہتا ہے، اور تیری حکمت کا اقتضاء بھی معطل نہیں ہوتا۔ (عزیزی)

اس آیت کریمہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ پہلے انبیاءِ کرام علیہم السلام نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعائیں مانگیں اور تمنائیں کیں۔ دوسرے یہ کہ خانۂ کعبہ حضرت خلیل نے تعمیر فرمایا، مگر صحیح معنی میں اسکی عظمت و تعظیم حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دم قدم سے وابستہ ہے، اور اس گھر کی آبادی حضور کی بدولت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری سے قبل، مشرکینِ مکہ نے خاص خانۂ کعبہ میں بت رکھ کر اُنکی پوجا جاری کر رکھی تھی۔ اللہ کے گھر میں غیر کی عبادت ہوتی تھی۔ بیت اللہ بھی رسول اللہ کی آمد کا منتظر تھا۔ آپ کے آتے ہی قیامت تک کیلیے وہ گھر

بتوں کی گندگی سے پاک ہوگیا۔ بات بھی یہ ہے کہ کعبہ تو ہے بیت اللہ، اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں نور اللہ۔ بیت میں نور ہی کا تو اُجالا ہوتا ہے۔ خانۂ کعبہ تو کیا، خلد بریں کو بھی حضور ہی کے دم قدم سے آبادی ملی ——— اس آیت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے بندوں کو پاک کرتے ہیں کفر سے، شرک سے، گناہوں سے، اور ہر اخلاقی گندگی سے اگر پاکی چاہتے ہو، تو اس دریائے رحمت میں غوطہ لگاؤ پاک ہو جاؤ گے۔ پانی صرف ظاہر کو پاک وصاف کرتا ہے۔ مگر رحمۃ للعالمین کی نظر، قلب وجگر، ظاہر وباطن سب کو پاک صاف فرماتی ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ

اور ابراہیم کے دین سے کون مونھ پھیرے سوا اُسکے جو دل کا احمق ہے اور بیشک ضرور ہم نے دنیا میں اُسے چن لیا

وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے جبکہ اُس سے اُسکے رب نے فرمایا گردن رکھ عرض کی میں نے گردن رکھی اُسکے لیے جو رب ہے سارے جہان کا

شانِ نزول:۔ علماء یہود میں سے حضرت عبد اللہ بن سلام نے اسلام لانے کے بعد اپنے دو بھتیجوں مہاجر وسلمہ کو اسلام کی دعوت دی، اور ان سے فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توریت میں فرمایا ہے کہ میں اولادِ اسمٰعیل سے ایک نبی پیدا کرونگا جن کا نام احمد ہوگا، جو اُن پر ایمان لائیگا راہ یاب ہوگا، اور جو ایمان نہ لائیگا ملعون ہے۔ یہ سُنکر سلمہ ایمان لے آئے، اور مہاجر نے اسلام سے انکار کردیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرماکر ظاہر کردیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اس رسول معظم کے مبعوث ہونے کی دعا فرمائی، تو جو انکے دین سے پھرے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے پھرا۔ اس میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب پر تعریض ہے، جو اپنے آپ کو افتخاراً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے جب انکے دین سے پھر گئے، تو شرافت کہاں رہی۔ (خزائن العرفان)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ (اور ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کون مونھ پھیرے سوا اُسکے جو دل کا احمق ہے)۔ سَفِہَ کے اصلی معنی خفت یعنی ہلکا پن کے ہیں۔ جو شخص بغیر نفع ونقصان سوچے اپنی خواہشات کی پیروی کرتا رہے اُسے خفیف، احمق اور سفیہ کہتے ہیں، اسکی ضد حلیم ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے سَفِہَ کی نسبت خود کسی شخص معین کی ذات کی طرف بھی اور اس کی رائے کی طرف بھی کیجاتی ہے، چنانچہ بولتے ہیں کہ سَفِهَ زَيْدٌ فِيْ نَفْسِهٖ وَفِيْ رَاْيِهٖ (زید اپنی ذات میں اور اپنی رائے میں بیوقوف اور لبودا ہے) اور جب بیوقوفی سے کسی موقع پر بے حرمتی اور اہانت یا ہلاکت لازم آجائے، اور رائے میں خفت وجہل شامل ہوجائے، تو اسوقت سَفِہَ کے معنی، اہانت یا ہلاکت یا جہل کے معنی میں مستعار لے لیا جاتا ہے۔ چنانچہ سَفِهَ نَفْسَهٗ کے یہ معنی کہ اُس نے اپنے نفس کی آپ اہانت کی یا اُسے ہلاک کردیا، اور اُسے اپنی اس ہلاکت کا شعور بھی نہ ہوا۔ اس صورت میں سَفِہَ کے بعد مفعول آئیگا، اور یا یہ کہا جائے کہ ان صورتوں میں سَفِہَ اہانت اور ہلاکت اور جہل کے معنوں میں ہوگا۔ اسی لیے اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ کی تفسیر میں بعض نے کہا کہ اسکے معنی ہیں "اُس نے اپنے نفس کو ذلیل بنالیا" کیونکہ اُس نے اپنے خالق کا انکار کرکے اپنی جیسی مخلوق کی عبادت وپرستش کی ذلّت میں گرفتار کرلیا۔ اور ابوعبیدہ نے کہا کہ سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی ہیں کہ اُس نے اپنے آپ کو ہلاک کردیا۔ اور اخفش نے کہا کہ سَفِهَ نَفْسَهٗ در اصل سَفِهَ فِيْ نَفْسِهٖ تھا، لفظ فی کو بقاعدہ نصب بنزع خافض حذف کرکے نَفْسَهٗ کو نصب دیدیا۔ اور فراء نے کہا کہ سَفِهَ نَفْسَهٗ در اصل نفسہ کے پیش سے تھا، جب فعل کی اسناد صاحب نفس کی طرف کردی گئی، تو نفسہ کو تمیز ہونے کے سبب نصب دیدیا گیا۔ اور کیسان اور زجاج کہتے ہیں کہ سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی ہیں کہ "وہ اپنے نفس سے انجان ونادان رہا" کیونکہ جس نے غیر اللہ کی عبادت کی اُس نے اپنے نفس کو نہ جانا، اسلیے کہ اللہ تعالیٰ جو نفس کا خالق ہے وہ اُس سے جاہل وانجان رہا، اور اُسے نہ پہچان سکا، چونکہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ مُسلّم ہے۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے اپنے رب کو پہچانا۔ صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ کے یہ معنی ہیں کہ جس نے اپنے نفس کی حقیقت جان لی کہ یہ ایک ممکن شے ہے، خود بالذات وجود کو مقتضی نہیں، فی نفسہٖ اسکا وجود وقیام اور بقاء متصور نہیں، اور اسکی ذات پر اسکا حمل اولیٰ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً کہا جائے کہ زید زید ہے، یہ جو کچھ اسکا وجود وقیام اور بقاء نظر آرہا ہے، یہ اُسی وقت تک ہے جبتک کہ واجب الوجود، جو کہ قیوم اور قائم بالذات کی جانب سے بندے کی طرف اسناد ہے۔ اور جو اپنے نفس سے اس معنی کا جاہل رہا اُسے حق تعالیٰ کی معرفت ہو ہی نہیں سکتی۔ منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اے داؤد! تم اپنے نفس کو پہچانو، پھر تم مجھے پہچان لوگے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے خدا میں تجھکو کیسے پہچانوں، اور اپنے کو کیسے پہچانوں؟ حکم ہوا کہ اپنے نفس کو ایسے پہچانو کہ اپنا عجز اور اپنی فنا اور اپنا ضعف پیش نظر رکھو، اور پھر مجھکو اسطرح پہچانو کہ ہماری قدرت وبقاء اور قوت ملاحظہ کرو۔ (مظہری)

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا، اور بیشک ضرور ہم نے دنیا میں اسے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چن لیا، رسالت وخلت کے ساتھ رسول وخلیل بنایا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے، جنکے لیے بلند درجے ہیں۔ تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کرامات دارین کے جامع ہیں، تو ان کی طریقت وملت سے پھرنے والا ضرور نادان واحمق ہے۔ (خزائن العرفان)

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

اور اُسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چن لیا تو نہ مرنا مگر مسلمان

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ

بلکہ تم میں کے خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جبکہ اُس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کروگے بولے ہم پوجینگے اُسے جو خدا ہے آپ کا

وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا

اور آپ کے آباء ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق کا ایک خدا اور ہم اُسکے حضور گردن رکھے ہیں یہ ایک اُمت ہے کہ گزر چکی اُنکے لیے ہے جو

كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

اُنھوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہے جو تم کماؤ اور اُن کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ۔ اور اُسی دین یا ملت کی وصیت کی ابراہیم نے۔ مدینہ اور شام کے قراء نے وَوَصّٰى کو وَاَوْصٰى باب افعال سے پڑھا ہے، اور انکے مصاحف میں بھی اسی طرح مرقوم ہے، اور باقی قاریوں نے وَوَصّٰى پڑھا ہے۔ جس فعل میں صلاحیت اور قربت ہو اُسے دوسرے کے سامنے پیش کرنے کو "توصیہ" کہتے ہیں، اور اسکے اصلی لغوی معنی وصل یعنی ملانے

کے ہیں۔ اور "وصیت" میں چونکہ اپنے قرابت داروں کو امرِ وصیت میں ملانا ہوتا ہے، اسلیے اسے وصیت کہتے ہیں۔ بِهَا کی ضمیر یا تو ملّت کی طرف ہے، یا بتاویل کلمہ اَسْلَمْتُ کی طرف راجع ہے، جو کہ دینِ اسلام مراد ہے۔ صاحبِ مترجم قدس سرہٗ اسی طرف گئے ہیں۔

بَنِيْهِ اپنے بیٹوں کو۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ پہلے فرزند حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، جو کہ سیدہ ہاجرہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ہیں۔ دوسرے فرزند حضرتِ اسحاق علیہ السلام ہیں، جو کہ حضرتِ سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ہیں، اور باقی چھ فرزند مدین، مدان، لیقان، زموان، اسبق اور شوخ، قنطورہ دختر یقطن کنعانیہ کے بطن سے ہیں، جو کہ عرب عاربہ کی نسل سے تھیں۔ ان سے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ سارہ کے انتقال کے بعد نکاح فرمایا تھا۔

ابنِ سعد نے کلبی سے روایت کی کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ مکرمہ میں ساکن فرمایا اور وہاں انکی نسل پھیلی۔ اور حضرتِ اسحاق علیہ السلام کو کنعان میں اپنے ہمراہ ساکن فرمایا، اور تیسرے فرزند مدین کو شہر مدین میں، جو کہ انہی کے نام سے موسوم ہے، آباد فرمایا اور وہاں انکی نسل پھیلی، ان ہی سے حضرتِ شعیب علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے۔ اور چوتھے فرزند مدان کو اور دیگر صاحبزادگان کو شام اور روم کے مختلف شہروں میں بسایا، اور ان کی نسل وہاں چلی۔

وَيَعْقُوْبُ اور یعقوب نے۔ مطلب یہ کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آٹھوں فرزندوں کو یہ وصیت فرمائی، اور آپ کے بعد حضرتِ یعقوب علیہ السلام نے بھی، جو کہ حضرتِ اسحاق علیہ السلام کے فرزند ہیں، اپنے بارہ فرزندوں کو یہی وصیت کی۔ اور حضرتِ یعقوب علیہ السلام نے حضرتِ یوسف علیہ السلام کے زمانۂ حکومت میں مصر میں بقیہ گیارہ فرزندوں کو جمع کر کے وصیت فرمائی کہ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ، اے میرے بیٹو! بیشک اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چن لیا۔ اَلدِّيْنَ سے مراد، دینِ اسلام ہے، فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَؕ تو نہ مرنا مگر مسلمان۔ یعنی تمہاری موت، اسلام پر قائم رہتے ہوئے واقع ہو۔ یہ وصیت بظاہر تو موت پر واقع ہے، لیکن حقیقت میں یہ نہیں ہے، کیونکہ نہی امرِ اختیاری میں ہوتی ہے اور موت غیر اختیاری امر ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے میرے بیٹو! خبردار اور ہوشیار رہو، اسلام اور تفویض امور الی اللہ کا دامن کسی وقت بھی تمہارے ہاتھ سے نہ چھوٹے، مبادا کہ تم غفلت سے اسکو چھوڑ بیٹھو، اور اس حالت میں تم پر موت آجائے، تو خبردار رہنا چاہیے کہ ایسی موت میں کچھ بھلائی اور خیر نہیں ہے۔ (مظہری)

شانِ نزول:۔ یہ آیت یہود کے حق میں نازل ہوئی، انھوں نے کہا تھا کہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے روز اپنی اولاد کو یہودی رہنے کی وصیت کی تھی، اللہ تعالیٰ نے انکے اس بہتان کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (خازن) اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ، بلکہ تم میں کے خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی۔ معنی یہ ہیں کہ اے بنی اسرائیل تمہارے پہلے لوگ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے آخر وقت انکے پاس موجود تھے، جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں کو بلا کر ان سے اسلام و توحید کا اقرار لیا، اور یہ اقرار میں تھا جو آیت میں مذکور ہے۔ (خزائن العرفان) حَضَرَ کے معنی ہیں "موت قریب ہوئی" یعنی دنیا سے رحلت فرمانے کے لیے جب موت کا وقت قریب آیا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ اے یہودیو! جسطرح تم کہتے ہو، اسطرح نہیں ہوا، کیا تم وہاں موجود تھے؟ یعنی تم تو موجود نہ تھے، تو پھر کیوں ایسی بے دلیل بات، اور دعویٰ کرتے ہو۔ بعض مفسرین نے کہا کہ اَمْ كُنْتُمْ میں مومنین کو خطاب ہے اور معنی یہ ہیں کہ اسوقت تم وہاں موجود نہ تھے، بلکہ یہ قصہ تمکو وحی سے معلوم ہوا ہے۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ جبکہ اس (حضرتِ یعقوب علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں سے فرمایا مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْؕ میرے بعد کس کی پوجا کرو گے؟ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں سے یہ دریافت کرنا کہ میرے بعد کس کو پوجو گے "در اصل انکو اسلام و توحید پر مضبوط کرنا اور ان سے عہد و اقرار لینا منظور تھا۔ عطاء فرماتے ہیں کہ جب کسی نبی کا وقتِ آخر قریب آتا ہے، تو موت سے پہلے حق تعالیٰ انھیں زندگی اور موت میں اختیار عطا فرماتا ہے کہ تمہیں اختیار ہے چاہو دنیا میں رہو یا عالمِ بقاء میں تشریف لیجاؤ۔ چنانچہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کو جب یہ اختیار ملا، تو انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ مجھے اتنی دیر کی مہلت عطا فرمائی جائے کہ میں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جمع کر کے کچھ وصیت کر سکوں۔ حق تعالیٰ کی جانب سے انھیں مہلت عنایت فرمائی گئی، اور انھوں نے اپنے فرزندوں سے یہ عہد و اقرار لیا۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ٥ بولے ہم پوجینگے اُسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق کا ایک خدا، اور ہم اسکے حضور گردن رکھے ہیں۔ حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے آباء میں داخل کرنا تو اسلیے ہے کہ آپ انکے چچا ہیں، اور چچا بمنزلہ باپ کے ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اور آپ کا نام حضرتِ اسحاق علیہ السلام سے پہلے ذکر فرمانا دو وجہ سے ہے، ایک تو یہ کہ آپ حضرتِ اسحاق علیہ السلام سے چودہ سال بڑے ہیں۔ دوسرے اسلیے کہ آپ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد ہیں۔ (خزائن العرفان) اہلِ عرب بالعموم چچا کو بھی باپ ہی کہتے ہیں، جیسے خالہ کو ماں کہدیتے ہیں۔ چنانچہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ چچا اپنے باپ کی مثل ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے علی مرتضیٰ سے اور طبرانی نے سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیا۔ نیز حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے چچا سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ میرے باپ یعنی سیدنا عباس چچا کو میرے پاس لے آؤ، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ قریش کہیں ان سے بھی وہی سلوک نہ کریں جو ثقیف نے عروہ بن مسعود سے کیا تھا" کہ ثقیف نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا تھا۔ (مظہری)

تِلْكَ اُمَّةٌ یہ یعنی حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام اور انکی مسلمان اولاد، ایک امت ہے۔ قَدْ خَلَتْ کہ گزر چکی۔ اے یہود تم ان پر بہتان مت اٹھاؤ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ انکے لیے جو انھوں نے کمایا اور تمہارے لیے جو تم کماؤ۔ مطلب یہ کہ جب یہ امر مسلّم ہے کہ جو جس نے کیا وہی اسکے سامنے آئے گا، پھر تم جو اے یہودیو! اپنے آپ کو اس شرفِ نسبت کی وجہ سے ناجی اور رستگار سمجھتے ہو، یہ سراسر حماقت ہے۔ یاد رکھو جبتک تم انکی اطاعت نہ کرو گے، وہ اور انکی نیکیاں تمہارے کچھ کام نہ آئینگی۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ٥ اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی، بلکہ ہر شخص اپنے ہی اعمال کا جوابدہ ہوگا۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥

اور کتابی بولے　یہودی　یا نصرانی ہو جاؤ　راہ پاؤ گے　تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے　اور مشرکوں سے نہ تھے

شانِ نزول:۔ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت رؤساء یہود اور نجران کے نصرانیوں کے جواب میں نازل ہوئی۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام، تمام انبیاء میں سب سے افضل ہیں، اور توریت تمام کتابوں سے افضل ہے، اور یہودی دین تمام ادیان سے اعلیٰ ہے۔ اسکے ساتھ انھوں نے حضور سیدِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور انجیل و قرآن کے ساتھ کفر کر کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ "یہودی بن جاؤ"۔ اسی طرح نصرانیوں نے بھی اپنے ہی دین کو حق بتا کر مسلمانوں سے نصرانی ہونے کو کہا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خزائن العرفان) وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ٥ اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" اس آیت میں یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے کہ تم مشرک ہو، اسلیے ملّتِ ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ جو تم کرتے ہو، وہ باطل ہے۔ اسکے بعد مسلمانوں کو خطاب فرمایا جاتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے یہ کہدیں کہ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا الآیہ (خزائن العرفان)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ

یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا　اور جو اتارا گیا　ابراہیم　و اسمٰعیل　و اسحاق　و یعقوب　اور انکی اولاد پر　اور جو عطا کیے گئے

مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ٥ فَاِنْ

موسیٰ و عیسیٰ　اور جو عطا کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے　ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے　اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں　پھر اگر وہ بھی

اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ

یونہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر مونھ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب اللہ انکی طرف سے کفایت کریگا اور وہی ہے

السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ ۝ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝

سنتا جانتا ہمنے اللہ کی رینی لی اور اللہ سے بہتر کس کی رینی اور ہم اُسی کو پوجتے ہیں

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا، اے مسلمانو! تم یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اُس پر جو ہماری طرف اُترا۔" اس سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ اسے اس لیے مقدم فرمایا کہ قرآن ہی اور کتابوں پر ایمان لانے کا سبب ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ، اور جو اُتار اگیا ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب اور اُن کی اولاد پر" اس سے وہ دس صحیفے مراد ہیں جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے، ان ہی دس پر اُنکی اولاد کا عمل درآمد رہا۔ اسی واسطے انکے نزول کو اولاد کی طرف بھی منسوب فرمایا، جیساکہ قرآنِ پاک کا نزول حضور سیدِ عالم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی متابعت سے ہماری طرف بھی منسوب ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم ہم پر نازل ہوا ہے۔

اَسْبَاط بنی اسرائیل کی جماعتوں کو کہتے ہیں، جیسے "قبائل" عرب کے گروہوں اور "شعوب" عجم کے فرقوں کو بولا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی بارہ جماعتیں تھیں، کیونکہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، ہر بیٹے کی اولاد ایک مستقل جماعت علیحدہ گنی جاتی تھی۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اسباط سے مُراد خود حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہیں، اور انھیں اسباط یا تو اسلیے کہا گیا کہ ان میں سے ہر ایک کی اولاد ایک سبط اور جماعت تھی اور یا اسلیے کہ "سبط" پوتے کو کہتے ہیں۔ اسی بناء پر سیدنا امام حسن وحسین رضی اللہ تعالٰی عنہما کو رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم سبطین فرماتے ہیں۔ چونکہ حضرتِ یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے، اسلیے اُنھیں اسباط فرمایا گیا۔ (مظہری)

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی۔ اور جو عطا کیے گئے موسیٰ کو، اس سے مُراد توریت ہے۔ وَعِیْسٰی اور عیسیٰ کو، اس سے مُراد انجیل ہے۔ وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ اور جو عطا کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے (ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں) لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔ یعنی ہم یہود و نصاریٰ کی طرح کسی نبی اور اُنکے دین و کتاب میں فرق نہیں کرتے کہ کسی پر ایمان کا اقرار کریں، اور کسی کا انکار کریں، بلکہ سب ہمارے دین و ایمان کے مقتدا و پیشوا ہیں وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں۔ اور یہ ہمارا دین اسلام، ملّتِ ابراہیمی، اور ہر نبی بالعموم اور سیدِ عالم صلی اللہ تعالٰی وسلم کا بالخصوص دین ہے۔ اور یہود و نصاریٰ جس طریقہ پر ہیں، وہ کھلا شرک ہے۔ (مظہری)

بخاری و مسلم میں بروایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ رسول صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا و آخرت میں عیسیٰ علیہ السلام سے مجھے زیادہ تعلق اور قُرب ہے۔ اور انبیاء سب بھائی بھائی ہیں، اگرچہ مائیں انکی مختلف ہیں، مگر دین سب کا ایک ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام، اور ہمارے درمیان کوئی نبی نہیں۔

نیز بخاری میں بروایت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ اہلِ کتاب توریت کو عبرانی میں پڑھا کرتے تھے، اور مسلمانوں کے سامنے وہ عربی میں اس کی تفسیر کیا کرتے تھے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو، بلکہ یہ کہو کہ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا الآیہ

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ پھر اگر وہ بھی یُوں ہی ایمان لائے جیساکہ تم لائے۔ اور ان کا ایمان تمہارے ایمان و تصدیق کے ہم مثل ہوجائے فَقَدِ اهْتَدَوْا جب تو وہ ہدایت پا گئے۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ اور اگر وہ مُونھ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں، اور ان میں طلبِ حق کا شائبہ بھی نہیں۔

فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ تو اے محبوب! عنقریب اللہ اُنکی طرف سے تمہیں کفایت کریگا، اور وہی سنتا جانتا ہے" یہ اللہ کی طرف سے ذمہ ہے کہ وہ اپنے حبیب صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو غلبہ عطا فرمائے گا، اور اس میں غیب کی خبر ہے۔ کہ آئندہ ہونیوالی فتح وظفر کا پہلے سے اظہار فرمایا۔ اس میں نبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ اللہ تعالٰی کا یہ ذمہ پورا ہوا، اور یہ غیبی خبر صادق ہو کر رہی۔ کفار کے حسد و عناد، اور اُن کے مکائد سے حضور کو ضرر نہ پہنچا، حضور کی فتح ہوئی، بنی قریظہ قتل ہوئے، بنی نضیر جلاوطن کیے گئے۔ یہود و نصاریٰ پر جزیہ مقرر ہوا۔ (خزائن العرفان)

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ ہم نے اللہ کی رینی لی"۔ یعنی جسطرح رنگ کپڑے کے ظاہر و باطن میں نفوذ کرتا ہے، اُسی طرح دینِ الٰہی کے اعتقاداتِ حقہ ہمارے رگ و پے میں سما گئے۔ ہمارا ظاہر و باطن، قلب و قالب اسکے رنگ میں رنگ گیا۔ ہمارا رنگ، ظاہری رنگ نہیں، جو کچھ فائدہ نہ دے، بلکہ یہ نفوس کو پاک کرتا ہے، ظاہر میں اسکے آثار، اوضاع و افعال سے نمودار ہوتے ہیں۔ نصاریٰ جب اپنے دین میں کسی کو داخل کرتے، یا اُنکے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا، تو پانی میں زرد رنگ ڈال کر اُس میں اُس شخص یا بچہ کو غوطہ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب یہ سچا نصرانی ہوا۔ اس کا اِس آیت میں رد فرمایا کہ یہ ظاہری رنگ کسی کام کا نہیں۔ (خزائن العرفان)

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ اور اللہ سے بہتر کس کی رینی"۔ یعنی تمام رذائل سے نفوس کو پاک کرنے میں اللہ کے دین سے کوئی طریقہ اچھا نہیں، اسلیے کہ مخلوقات کے رنگ میں نہ احاطہ ہے اور نہ بقاء، کیونکہ مخلوق کا جو ظاہری رنگ ہوتا ہے، وہ صرف جسم و بدن پر ہی رہتا ہے، اور جو باطنی رنگ مخلوق کا ہوتا ہے، وہ ایک مخصوص باطنی قوت کیساتھ رہتا ہے مثلاً فلسفہ کا رنگ، وہ صرف قوتِ عقلیہ کے ساتھ ہے۔ یا بدعت کا رنگ، وہ صرف قوتِ وہمیہ کے ساتھ ہے، جو کہ شیطان سے مرکّب ہے۔ یا مِلَلِ منسوخہ کا رنگ، وہ صرف عادت و رسم کے ساتھ ہے۔ یا عشق و محبت کا رنگ، وہ صرف قوتِ شہوانیہ کے ساتھ ہے۔ یا حکومت و سلطنت کا رنگ، وہ صرف قوتِ غضبیہ جبریہ کے ساتھ ہے۔ اس قسم کے تمام رنگ ادنیٰ صدمہ و تصرف سے زائل و فنا ہوجاتے ہیں، اصلاً ان میں پائیداری نہیں ہوتی، اور حوادث و تغیرات اور مصائب ہمہ وقت قبول کرتے رہتے ہیں، اور دوسرا رنگ پہلے کو زائل کرکے غالب آتا رہتا ہے۔ لیکن خدا کا رنگ باقی و پائیدار رہنے والا ہوتا ہے۔ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ اور ہم اُسی کو پوجتے ہیں" یہ اہلِ کتاب پر تعریض ہے، یعنی ہم تمہاری طرح شرک میں مبتلا نہیں ہیں، ہم اُسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالٰی حضورِ اکرم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کو خطاب فرماتا ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۙ ۝ اَمْ تَقُوْلُوْنَ

تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی اور ہماری کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ اور ہم نرے اُسی کے ہیں بلکہ تم یوں کہتے ہو

اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ

بلشبک ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب اور اُن کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے، تم فرماؤ کیا تمہیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ

اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون جسکے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائے اور خدا تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ ع ١٦

اُنکے لیے اُنکی کمائی اور تمہارے لیے تمہاری کمائی اور اُنکے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہو گی۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ، تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو" شانِ نزول:۔ یہود نے مسلمانوں سے کہا، ہم پہلی کتاب والے ہیں، ہمارا قبلہ پرانا ہے، ہمارا دین قدیم ہے، انبیاء ہم میں سے ہوئے ہیں، اگر سیدِ عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی ہوتے، تو ہم میں سے ہی ہوتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْۚ حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔ اُسے اختیار ہے کہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے نبی بنائے، عرب میں سے ہو یا دوسروں میں سے۔ (خزائن) رب تبارک وتعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، اُسے کسی خاص قوم سے زیادہ خصوصیت نہیں۔ انتخابِ نبوت میں وہ مالک ومختار ہے، اس میں تمہاری کوئی اجارہ داری نہیں۔

وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْۚ ہماری کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ" ہر شخص کو اُسکے کیے کی جزا ملے گی۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ۝ اور ہم نِرے اُسی کے ہیں۔ کسی دوسرے کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں کرتے، اور عبادت وطاعت خالص اُسی کیلئے کرتے ہیں، تو ہم مستحقِ اکرام ہیں۔ (خزائن العرفان) اور اے اہلِ کتاب تم مشرک ہو۔ حضرت سعید بن جُبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنے عمل محض اللہ کے لیے کرے کوئی غرض اور نمائش اُس میں نہ ہو۔ اور فضیل، فرماتے ہیں کہ لوگوں کے دیکھنے کی وجہ سے عمل کو چھوڑ دینا یہ ریا ہے، اور لوگوں کے دکھاوے کے لیے عمل کرنا یہ شرک ہے۔ اخلاص تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ان دوں سے نجات بخشے۔ (مظہری)

غرضکہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو مشرکوں، یہودیوں اور نصرانیوں کے جھگڑے کو رفع کرنے کا حکم دے رہا ہے کہ تم ہم سے اللہ کی توحید اور اخلاصِ طاعت وغیرہ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ وہ صرف ہمارا ہی رب نہیں، بلکہ تمہارا بھی تو وہی رب ہے۔ ہم پر اور تم پر صرف وہی اکیلا ہی تو قابض ومتصرف ہے، ہمارے عمل ہمارے ساتھ ہیں، اور تمہارے عمل تمہیں کام آئینگے۔ ہم تم سے اور تمہارے شرک وکفر سے بیزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ الآیہ اگر اے محبوب یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں، تو تم ان سے فرما دو، میرے لیے میرا عمل ہے، اور تمہارے لیے تمہارا عمل۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا فَاِنْ حَآجُّوْكَ الآیہ اے محبوب! اب اگر یہ تم سے جھگڑتے ہیں، تو فرما دو کہ میں نے اور میرے فرمانبرداروں نے اپنے مُونھ کو خدا ہی کی طرف کیے ہیں۔ الخ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ الآیہ کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو؟

ایک اور جگہ فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ الآیہ اے محبوب! کیا تم نے اُن لوگوں کو ملاحظہ نہ فرمایا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے رب کے بارے میں جھگڑتے تھے۔

لہٰذا اس جگہ ایسے جھگڑالو لوگوں سے فرمایا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے، اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہم تم سے بیزار، اور تم ہم سے الگ۔ ہم عبادت اور توجہ الی اللہ میں اخلاص اور یکسوئی کرنے والے ہیں۔ (ابنِ کثیر)

اَمْ تَقُوْلُوْنَ، بلکہ تم تو یوں کہتے ہو" یعنی از راہِ کمالِ جہل اور سخن پروری، یہ ادعا کرتے ہو کہ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى" بیشک ابراہیم واسمٰعیل واسحاق ویعقوب اور انکے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے۔ حالانکہ توریت وانجیل کے نازل ہونے اور یہودیت ونصرانیت کے تقرر ہونے سے پہلے یہ حضراتِ قدس دنیا سے گزر چکے تھے۔ پھر وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہو گئے؟ لہٰذا یہ دونوں باتیں باطل ہیں۔ ایسے ظاہر البطلان باتوں کے قائل متعصب ومعاند اہلِ کتاب ہے۔

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُؕ اے حبیب! تم فرما دو، کیا تمہیں علم زیادہ ہے، یا اللہ کو؟ اس کا قطعی جواب یہی ہے کہ اللہ ہی اَعْلَم ہے، تو جب اُس نے فرمایا مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا (ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی) تو تمہارا یہ قول باطل ہوا۔ (خزائن العرفان)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِؕ" اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف کی گواہی ہو، اور وہ اُسے چھپائے" یہ یہود کا حال ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ شہادتیں چھپائیں، جو توریت میں مذکور تھیں کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اُس کے نبی ہیں اور ان کے یہ نعت وصفات ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلمان ہیں، اور دینِ مقبول اسلام ہے، نہ یہودیت اور نہ نصرانیت۔ (خزائن العرفان)

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ اور خدا تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں" یہ اہلِ کتاب کو دھمکی ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی تمام کرتوتوں سے واقف ہے اس کی انکو سزا ملے گی۔ تِلْكَ اُمَّةٌ الآیہ وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا۔ اُنکے لیے اُنکی کمائی، اور تمہارے لیے تمہاری کمائی، اور اُن کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہو گی۔

اس آیتِ کریمہ میں خبردار کیا جارہا ہے کہ یہ پاکباز جماعت، حضرتِ ابراہیم اور اُن کی اولاد میں سے انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام، اور اُن کی فرمانبردار اُمتیں خدا کے حضور پہنچ چکی ہیں، تم جبتک اُن کے نقشِ قدم پر نہ چلوگے، صرف اُن کی اولاد میں سے ہونا تمہیں خدا کے حضور کوئی عزت ومرتبت اور نفع نہیں دے سکتا۔ اُنکے نیک اعمال میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اور تمہاری بداعمالیوں کا اُن پر کوئی بوجھ نہیں۔ "جو جیسا کریگا ویسا بھریگا" تم نے جب ایک نبی کی تکذیب کی، تو گویا تم نے سارے نبیوں کو جھٹلایا۔ بالخصوص وہ لوگ، جو نبیِ آخر الزماں سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک اور زمانۂ خیر وبرکت میں ہیں، اور انھوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو جھٹلایا ہے وہ تو بڑے ہی وبال میں ہیں، یہ اُس نبیِ مکرم کو جھٹلاتے ہیں، جو سید الانبیاء ہیں، جو ختم المرسلین ہیں، جو رسولِ رب العالمین ہیں، جن کی رسالت تمام انسانوں اور جنوں کی طرف ہے جن کی رسالت کے ماننے کا ہر ایک شخص مکلف ہے۔ (ابنِ کثیر)

اس مضمون کو اس جگہ مبالغہ کے لیے مکرر بیان فرمایا، تاکہ اپنے آباء واجداد کے بھروسہ میں نہ رہیں۔ اور بعض نے کہا کہ پہلے مضمون میں تو خطاب اہلِ کتاب کو تھا، اور اس میں ہمکو، کہ مبادا یہ مسلمان اُن کی اقتدا نہ کرنے لگیں۔ اور بعض نے کہا کہ پہلی آیت سے انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں، اور دوسری سے یہود ونصاریٰ کے آباء واجداد۔ واللہ اعلم وباللہ التوفیق وعلیہ التکلان وبہ نستعین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

﴿پہلا پارہ ختم ہوا﴾

پارہ اوّل

نعیم البیان فی تفسیر القرآن

مع

کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن

۱۳۳۰ھ

ازاعلیحضرۃ امام اہلسنت، مجدد مائۃ حاضرۃ مولانا مفتی احمد رضا خان صاحب بریلوی قدس سرہٗ

و

خزائن العرفان فی تفسیر القرآن

از صدر الافاضل استاذ العلماء حضرت مولانا حافظ حکیم سید محمد نعیم الدین صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ

جامع التفاسیر

فاضل جلیل حضرت علامہ مولانا مفتی حکیم سید غلام معین الدین نعیمی دامت برکاتہم

یکے از مطبوعات

ادارہ نعیمیہ رضویہ ـ سوادِ اعظم ـ بازار لال کھوہ موچی گیٹ لاہور

3/50
ہدیہ ساڑھے تین روپے

مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

فضائلِ قرآنِ مجید

قرآنِ مجید کتاب اللہ ہے، جو اللہ تعالٰے نے بندوں کی ہدایت کے لیے اپنے حبیبِ اکرم رحمتِ عالم سیدِ انبیاء محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم پر نازل فرمائی، جس طرح یہ کتابِ مقدس تمام علوم کی جامع ہے، اسی طرح اس کا ایک ایک کلمہ، اور ایک ایک حرف بے نہایت برکات کا سرچشمہ ہے، مُسلم شریف کی حدیث میں ہے سیدِ عالم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے فرمایا قرآنِ کریم کی قراءت کرو، وہ روزِ قیامت اپنے رفیقوں کا شفیع ہوگا۔ حضرتِ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالٰے عنہ کی حدیث میں ہے، جس شخص نے قرآنِ کریم ایک حرف پڑھا اُس کے لیے نیکی ہے دس نیکیوں کی برابر۔ (ترمذی)

حدیث:۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالٰے فرماتا ہے کہ جس شخص کو قرآن اور میرا ذکر ایسا مشغول کرے کہ وہ مجھ سے مانگنے اور سوال کرنے کی فُرصت بھی نہ پائے، میں اُس کو مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں۔

حدیث:۔ جس گھر میں قرآن پاک پڑھا جاتا ہے، وہ اہلِ آسمان کے لیے زینت ہوتا ہے، جیسے ستارے زمین والوں کے لیے۔ (بیہقی)

حدیث:۔ اپنے مکانوں کو نماز سے اور قرآنِ کریم کی قراءت سے منور کرو۔

حدیث:۔ میری اُمت کی بہترین عبادت قرآن کی قراءت ہے۔ (بیہقی)

قرآنِ کریم کی تعلیم اور اُسکا تعلّم

بخاری شریف کی حدیث میں ہے، سیدِ عالم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سے بہتر وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔

حفظِ قرآن

اتقان میں ہے کہ تمام قرآنِ کریم کا حفظ کرنا اُمت پر فرضِ کفایہ ہے تاکہ قرآنِ کریم کا تواتر باقی رہے اور تبدیل و تحریف کو اس میں راہ نہ ہو پائے اگر اس فرض کی ادائیگی کے لیے اتنے لوگ قائم ہوں جن کی تعداد کثرت وتواتر کو پہنچتی ہے تو اُن کے حفظ کر لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ فرض نہیں رہیگا اگر حافظوں کی تعداد اس حد سے کم ہو تو سب لوگ گنہگار ہونگے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم بھی فرضِ کفایہ اور افضل ترین قربات وطاعات ہے، جیسا کہ حدیثِ مُسلم میں ارشاد ہوا جو اُوپر گزر چکی۔

قرآنِ کریم کی قراءت

تجوید کی رعایت قرآنِ کریم میں بہت ضروری ہے۔ حضرتِ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالٰے عنہ نے فرمایا کہ قرآنِ کریم کو تجوید سے ادا کرو قُرّاء کا قول ہے کہ تجوید یعنی حروف کو اُن کے صحیح مخارج سے جیسا چاہیئے ویسا ادا کرنا، یہ قرآنِ مجید کی زینت ہے۔

آدابِ تلاوت

قرآنِ کریم کی تلاوت بکثرت کرنا مستحب ہے۔ حدیث شریف میں ہے، دو ہی چیزیں رشک کے قابل ہیں، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جسے اللہ تعالٰے قرآنِ کریم عطا فرمایا اور وہ صبح وشام اُس کی تلاوت کرتا ہے (بخاری ومسلم)

قراءتِ قرآن میں اسلاف کی عادتیں جُداگانہ تھیں، بعض تو اتنی کثرت کرتے تھے کہ رات دن میں آٹھ ختم کر لیتے تھے، چار دن میں اور چار رات میں۔ بعض حضرات شب وروز میں چار ختم کرتے تھے۔ بعض تین، بعض دو، بعض ایک۔ بعض حضرات دو راتوں میں ایک ختم کرتے تھے، بعض تین میں، بعض چار میں، بعض پانچ میں، بعض چھ میں، بعض سات میں، اور یہ اکثر صحابہ کا معمول تھا۔ احوال اور ذوق مختلف ہیں۔ بعض حضرات اس پر قادر ہیں کہ قرآنِ کریم کو نہایت جلد پڑھنے میں بھی حروف کو اُنکے مخارج سے صحیح ادا کریں اور معانی پر بھی لحاظ کرتے جائیں۔ بعض کو اس مقصد کے لیے زیادہ وقت صرف کرنا، اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔

مسئلہ قرآنِ کریم کی تلاوت اگرچہ بے وضو بھی جائز ہے، لیکن اس کے لیے وضو کرنا مستحب ہے، کیونکہ قرآنِ پاک کی قراءت افضل اذکار ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم ذکرِ الٰہی کو باطہارت پسند فرماتے تھے۔

مسئلہ جُنب یعنی وہ شخص جسے غُسل کی حاجت ہو، اور حیض ونفاس والی عورت، اِن سب کو قرآنِ کریم کی قراءت حرام ہے۔ بغیر ہاتھ لگائے دیکھنا، اور دل میں تصور کرنا جائز ہے۔

مسئلہ جس کا مُونھ ناپاک ہو، جیسے کہ شرابی، اس کو بھی قرآنِ کریم کی تلاوت جائز نہیں۔

مسئلہ ناپاک شخص کو قرآنِ کریم کا چھونا جائز نہیں۔

مسئلہ سُنّت ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت پاک جگہ میں ہو، اور مسجد میں زیادہ بہتر ہے۔

مستحب ہے کہ تلاوت کرنے والا قبلہ رو ہو، اور نہایت عجز وانکسار اور خشوع وحضورِ قلب سے سر جُھکا کر باطمینان پڑھے۔

پڑھنے سے قبل مسواک سے مُونھ کو خوب صاف کرے۔

تلاوت سے قبل اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے۔

اور سوائے سُورۂ براءت کے ہر سورت کے اول میں بسم اللہ پڑھا کرے، سننے والا خاموش دل لگائے سُنے

(خزائن العرفان)

قرآن شریف پڑھنے کا طریقہ

قراءت میں ترتیل سُنّت ہے۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اسطرح قراءت فرماتے تھے کہ ایک ایک حرف صاف معلوم ہوتا تھا (ابوداؤد) حضرتِ ابنِ مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، قرآن شریف جب دل میں اُترتا ہے، اُس میں جمتا ہے اور نفع دیتا ہے۔ (بخاری ومسلم) حدیث شریف میں ہے کہ روزِ قیامت، قاریِ قرآن سے کہا جائیگا کہ قرآن پڑھ اور درجات میں ترقی کرتا چلا جا، جس سکون و اطمینان کے ساتھ دنیا میں آہستہ آہستہ پڑھتا تھا ویسا ہی پڑھ، پڑھتے پڑھتے جہانتک پہنچے گا، وہ سب ملک تجھے عطا کیا جائیگا۔ **مسئلہ** قرآنِ کریم کو تدبّر و تفہّم کے ساتھ پڑھنا، اور اُسکے معنی پر نظر رکھنا مقصودِ اعظم ہے۔ اسی سے شرحِ صدر اور نورانیتِ قلب حاصل ہوتی ہے، اور معنی پر نظر رکھنے سے مُراد یہ ہے کہ جو پڑھتا ہے اُسکے معنی سمجھے، اور امر و نہی میں غور کرے، اور دل میں اُس کے ماننے اور اطاعت کرنے کا اعتقاد جمائے، اور گزرے ہوئے زمانہ میں جو تقصیر ہوئی ہو، اُس سے استغفار کرے، اور جب آیتِ رحمت آئے تو خوش ہو، اور اللہ تعالےٰ سے رحمت طلب کرے۔ اور جب آیتِ عذاب آئے تو ڈرے اور اُس سے پناہ مانگے۔ **مسئلہ** قرآنِ کریم کی تلاوت کے وقت دل حاضر کرے اور خشوع کے ساتھ پڑھے یہانتک کہ رقت آئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوں **مسئلہ** قرآن مجید کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھے، اگر خوش آواز نہ ہو تو کوشش کرے کہ خوبی سے ادا ہو، مگر یہ لحاظ رکھے کہ حروف اپنی حد سے متجاوز نہ ہو جائیں کہ ممنوع ہے **مسئلہ** خوش آوازوں سے قرآن شریف پڑھوانا، اور سننا مستحب ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک جماعت قراءت کے لیے جمع ہو، اور تھوڑا تھوڑا سب لوگ پڑھیں جیسا کہ پنج آیت میں معمول ہے۔ **مسئلہ** قرآن شریف میں دیکھ کر پڑھنا، حفظ پڑھنے سے افضل ہے، کیونکہ قرآنِ کریم کا دیکھنا بھی عبادت ہے۔ **مسئلہ** قرآنِ کریم کی قراءت کو کسی سے بات کرنے کے لیے قطع کرنا مکروہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرتِ ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما قرآنِ کریم کی قراءت کے دوران میں کلام نہ فرماتے جبتک فارغ نہ ہو جاتے کسی سے بات نہ کرتے۔ **مسئلہ** قراءت کے درمیان ہنسنا، بیفائدہ عبث حرکات کرنا اور لہو کی طرف نظر کرنا مکروہ ہے۔

ختمِ قرآن جس روز قرآنِ کریم ختم ہو، اُس دن روزہ رکھنا سُنّت ہے، اور یہ بھی سُنّت ہے کہ اپنے گھر والوں اور دوستوں کو جمع کرے۔ حدیث حضرتِ انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب قرآن ختم کرتے، اپنے اہل کو جمع فرماتے اور دعا کرتے۔ (طبرانی) حکم بن عیینہ سے مروی ہے کہ مجاہد نے انھیں بلایا، اور اُنکے پاس ابنِ ابی اُمامہ بھی تھے، اُن دونوں حضرات نے فرمایا ہم نے تمہیں اس لیے بلایا کہ ہمارا ارادہ قرآن ختم کرنے کا ہے، اور ختمِ قرآن کے وقت دعا مستجاب ہے۔ مجاہد سے منقول ہے کہ اسلاف کی عادت تھی کہ وہ ختمِ قرآن کے وقت جمع ہوتے تھے۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہ وقت نزولِ رحمت کا ہے۔ **حدیث** حضرتِ عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے قرآن ختم کیا اُس کی دعا مستجاب ہے۔ **حدیث** حضرتِ انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہر ختم کے ساتھ ایک دعا مقبول ہوتی ہے۔ (شعب الایمان) **حدیث** حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے مروی ہے، جس نے قرآن پڑھا، اور ربِ تبارک و تعالےٰ کی حمد کی اور نبیِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دُرود پڑھا اور اپنے رب سے مغفرت چاہی، تو خیر اُس کو تلاش کرتی ہے۔

فائدہ:۔ اِن احادیث سے ثابت ہُوا کہ قرآن کے لیے اجتماع اور اپنے احباب و اقارب کو بلانا، اور ذکرِ الٰہی، اور دُرود شریف پڑھنا، اور دعائے مغفرت کرنا مسنون ہے۔ سوئم یعنی تیجہ بھی اِن ہی احادیث سے اخذ کیا گیا۔ اور قراءت کا ثواب مَیّت کو پہنچنے پر حضرتِ امام اعظم و امام مالک و امام احمد حنبل رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے قرآنِ کریم ختم کرنے کے بعد قاری کو چاہیئے کہ دوسرا قرآن شروع کردے، یعنی سورۂ فاتحہ پڑھ کر سورۂ بقرہ ھُمُ الْمُفْلِحُوْن تک پڑھے، پھر دعا کرے۔ ایسا ہی اُبی بن کعب کی حدیث میں ہے۔ (دارمی)

مسئلہ:۔ ختمِ قرآن کے وقت معمول ہے کہ سورۂ اخلاص کو تین مرتبہ پڑھتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ حدیث شریف میں وارد ہُوا کہ سورۂ اخلاص ثواب میں ایک تہائی قرآن کی برابر ہے، تو تین مرتبہ پڑھنے سے ایک ختم کا ثواب ملجائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ اگر ختم میں کسی طرح کی کوتاہی واقع ہوئی ہو، تو سورۂ اخلاص کو تین مرتبہ پڑھنے سے وہ کمی پوری ہو جائے۔ بسم اللہ شریف بھی آیتِ قرآن ہے، لہٰذا ختم میں ایک مرتبہ اس کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔

مسئلہ:۔ قرآنِ کریم کو ذریعۂ معاش بنانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے جس شخص نے قرآن شریف پڑھا چاہیئے کہ وہ اللہ سے مانگے، عنقریب ایسے لوگ آئینگے جو قرآن پڑھ کر لوگوں سے مانگینگے۔

قرآن شریف معجزہ ہے!

معجزات دو طرح کے ہوتے ہیں، حسّی و عقلی۔ بنی اسرائیل کے اکثر معجزات حسّی تھے، کیونکہ اُس قوم کے لوگ بیشتر کم فہم و قلیل البصیرت تھے۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اُمّت چونکہ ذکی اور صاحبِ فہم ہے، اس لیے اُنکے اکثر معجزات عقلی ہیں، اور چونکہ یہ شریعت روزِ قیامت تک باقی رہنے والی ہے، اس لیے مخصوص طور پر اسکے واسطے باقی رہنے والے معجزے بھی عطا ہوئے جو روزِ قیامت تک باقی رہیں۔ اُن میں سے بڑا معجزہ قرآنِ عظیم ہے اس کے وجوہِ اعجاز میں سے ایک تو اس کی بلاغت ہے، دوسرے غیبی خبریں ہیں، جن کا ہر زمانہ میں ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اس کے وجوہِ اعجاز کے بیان میں ائمہ و علماء نے مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔

علومِ قرآن

قرآنِ کریم جمیع علوم کا جامع ہے، آیت مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ ہم نے کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہ دی۔ آیت وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ اے سیدِ انبیاء! ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جو ہر چیز کا بیان واضح ہے۔ **حدیث** جو علم کی خواہش رکھے، اُسے چاہیئے قرآن کو لازم کرلے، اس میں اولین و آخرین کی خبریں ہیں۔ حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں فرمایا، جو چاہو مجھ سے دریافت کرو، میں تمہیں کتاب اللہ سے اُس کی خبر دونگا۔ ابن سراقہ نے کتاب الاعجاز میں ابوبکر ابنِ مجاہد سے نقل کیا کہ انھوں نے ایک روز فرمایا کہ جہان میں کوئی چیز ایسی نہیں، جو کتاب اللہ میں نہ ہو اس پر اُن سے کہا گیا، سراؤں کا ذکر کہاں ہے؟ فرمایا اِس آیت میں لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْکُوْنَةٍ فِیْهَا مَتَاعٌ لَّکُمْ۔

(خزائن العرفان!)

ہدیہ